بالِ جبریلؑ

مع شرح

(علّامہ اقبال)

مؤلّفہ

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اعتقاد پبلشنگ هاؤس
۱۵۱۸- کوچہ چیلان اسٹریٹ، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بالِ جبریل

مع شرح

مؤلفہ

(پروفیسر) یوسف سلیم چشتی

ناشر

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس

۱۵۶۱۔ کوتانہ اسٹریٹ، سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

باہتمام اعتقاد حسین صدیقی

دوسری بار سنہ ء

مرتبہ اعتقاد حسین صدیقی

قیمت روپے

سنہ ء

فون : ۳۲۷۶۸۷۹

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس

۱۵۶۱- گلی کوتانہ- سوئیوالان - دہلی -۲-۱۱۰۰۰۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

بال جبریل، علامہ اقبال مرحوم کی مقبول ترین تصنیف ہے۔ یہ کتاب جنوری ۱۹۳۵ء میں علامہ کی وفات سے تین سال پہلے شائع ہوئی تھی۔ اب تک سات مرتبہ شائع ہو چکی ہے اور اس کے نسخوں کی مجموعی تعداد ۳۷ ہزار ہے۔ اس کی اشاعت کا مقابلہ اگر جاوید نامہ سے کیا جائے تو قوم کے مذاق کا اندازہ بآسانی ہو سکتا ہے۔ آخر الذکر بلا مبالغہ ان کا شاہکار ہے لیکن بیس سال میں اس کے صرف دو ہزار نسخے طبع ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔

بال جبریل، اردو زبان میں ہے اور شاعرانہ ہے۔

جاوید نامہ، فارسی زبان میں ہے اور فلسفیانہ ہے۔

اردو زبان میں مرحوم کے قلم سے چار کتابیں نکلی ہیں۔ بانگ درا۔ بال جبریل۔ ضرب کلیم اور ارمغان حجاز حصہ اردو۔ اور اس میں شک نہیں

کہ ان چاروں میں بالِ جبریل، گلِ سر سبد ہے۔

بالِ جبریل اور ضربِ کلیم، دونوں اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ ان کا باہمی موازنہ بہت تفصیل طلب نہیں ہے۔ صرف اس قدر کافی ہے کہ۔

بالِ جبریل میں، فلسفہ کم ہے۔ شاعری زیادہ ہے۔

ضربِ کلیم میں، فلسفہ زیادہ ہے، شاعری کم ہے۔

اس فرق کو ان کتابوں کے اشعار سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ضربِ کلیم میں اس قسم کے اشعار بہت کم ہیں۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے ضربِ کلیم میں "گیسو" کا لفظ کہیں نہیں آیا اور بالِ جبریل میں اس قسم کے اشعار بہت کم ہیں۔

تو معنیٔ وَالنَّجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن

ارتباطِ حرف و معنی؟ اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنے پیراہن میں ہے

ناظرین ان اشعار کو غور سے پڑھیں تو دونوں کتابوں کے اسلوب میں جو فرق ہے وہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کتابوں کے نام سے بھی ان کے مضامین کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

"بال جبریل" کی ترکیب اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ اس کتاب میں بلند اور پاکیزہ مضامین قلمبند کئے گئے ہیں جو روحانی تسکین عطا کر سکتے ہیں۔

"ضربِ کلیم" کی ترکیب اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اس کتاب میں باطل کے طلسم کو پاش پاش کیا گیا ہے۔ بالفاظ دگر۔

بال جبریل کا مقصد اعلیٰ روحانی حقائق کا اثبات ہے۔ اور ضرب کلیم کا مقصد، غلط عقائد اور باطل افکار کا ابطال ہے

بال جبریل کی ترتیب

اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ کے شروع میں غزلیں ہیں۔ جن میں سے پہلی پانچ غزلوں میں اقبال نے معشوق حقیقی سے خطاب کیا ہے۔ اس کے بعد ایک نظم ہے جو دراصل شکوہ ہے۔ باری تعالیٰ کی جناب میں۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

یارب یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفاکیش و ہنرمند

شکوہ کرتے کرتے شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی سرحد گستاخی سے قریب ہوتی جاتی ہے اس لئے اس نے اس اثر آفریں شعر پر سکوت اختیار کرلیا۔

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اس شکوہ کے بعد ایک بلند پایہ نظم ہے۔ اس کے بعد اکسٹھ[۶۱] غزلیں ہیں۔ ان کے بعد بائیس[۲۲] رباعیات ہیں۔

دوسرے حصہ میں نظمیں ہیں۔ ایک ساقی نامہ ہے جو شاعری اور حقائق نگاری کے امتزاج کا ایسا دلکش نمونہ ہے جس کی مثال اردو ادب میں بہت مشکل سے ملے گی اس کے علاوہ کچھ قطعات بھی ہیں جن میں حقائق و معارف بیان کئے گئے ہیں۔

بالِ جبریل کی خصوصیات

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کتاب بانگ درا کے بعد علامہ کے اردو کلام کا دوسرا مجموعہ ہے جو اول الذکر کی اشاعت کے گیارہ سال بعد شائع ہوا۔ بانگ درا سے پہلے بھی انھوں نے اسرار خودی[۱۹۱۴ء]، رموز بیخودی[۱۹۱۵ء] اور پیام مشرق[۱۹۲۳ء] تینوں کتابیں فارسی میں لکھی تھیں۔ اور اس کے بعد بھی انھوں نے زبور عجم[۱۹۲۷ء]، جاوید نامہ[۱۹۳۲ء] اور مسافر[۱۹۳۳ء]۔ یہ تینوں کتابیں فارسی ہی میں لکھیں اندریں حالات اردو داں طبقہ اپنی جگہ کچھ مایوس سا ہو چکا تھا اس لئے جب ۱۹۳۵ء میں بالِ جبریل شائع ہوئی تو ان لوگوں نے جو فارسی سے بے بہرہ تھے

نہایت ذوق وشوق کے ساتھ اس کتاب کی پذیرائی کی۔ اور چونکہ اقبال نے اس میں اپنی فارسی کتابوں کے اکثر بنیادی تصورات کو اردو زبان میں پیش کیا ہے اس لئے اردو داں طبقہ اقبال کی زندگی میں پہلی مرتبہ ان خیالات سے کسی قدر آشنا ہوا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بال جبریل اردو میں اقبال کی پہلی تصنیف ہے جس میں انہوں نے خودی کے فلسفہ کو کسی حد تک واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے دوسرے بنیادی تصورات مثلاً عشق فقر، علم، خرد۔ حیات اور مومن کی بھی تشریح کی ہے۔ یہ حقائق سب سے زیادہ جاوید نامہ میں مذکور ہیں لیکن اس کی زبان فارسی اور طرزِ ادا فلسفیانہ ہے۔ بال جبریل کی زبان اردو اور اسلوب بیان شاعرانہ ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بال جبریل کی بعض بہترین نظمیں افغانستان۔ اسپین۔ انگلستان اور اٹلی کے دورانِ قیام میں لکھی گئی ہیں اگر مرحوم کو راونڈ ٹیبل کانفرنس منعقدہ لندن ۱۹۳۱ء کے سلسلہ میں یورپ کے سفر اور اسپین کی سیاحت کا موقع نہ ملتا تو شاید وہ مسجدِ قرطبہ پر ایسی الٰہ آفریں نظم نہیں لکھ سکتے تھے۔ اسی طرح جو نظم انہوں نے حکیم سنائیؒ کے مزار کی زیارت کے بعد لکھی وہ بھی اسی لئے معرضِ وجود میں آئی کہ نادر شاہ کی دعوت پر انہیں افغانستان جانے کا موقع مل سکا۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں قدیم اور جدید طرز کی شاعری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس میں تغزل اور تصوف بھی ہے اور فلسفیانہ اور سیاسی نظمیں بھی ہیں۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب کی غزلوں میں چونکہ

اقبال نے کہیں کہیں جامی اور بیدل کا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اس لئے لامحدود وحدۃ الوجود کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا، سینۂ کائنات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا، سینۂ کائنات میں

مگر پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

یہ ہے خلاصۂ علم قلندری کی حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ تغزل کے لحاظ سے یہ کتاب اردو ادب میں بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے میں بعض ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو ۱۹۳۲ء تک علامہ کو اردو زبان کا بلند پایہ شاعر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن جب ۱۹۳۵ء میں بال جبریل شائع ہوئی تو انہوں نے اپنی رائے تبدیل کر دی۔ چند مثالیں لکھتا ہوں۔

میں تو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

نہ چھین لذتِ آہِ سحرگہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا! جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ بالِ جبریل میں اقبال کا اسلوب یا انداز بیان بڑا دلکش ہے اور میری رائے میں اس کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔ چند مثالیں لکھتا ہوں۔

اگرچہ کج رَو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

میری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ، وہ ترا جہانِ بے بنیاد

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

ولیکن بندگی ! اَستَغفِرُاللہ
یہ دردِ سر نہیں ، دردِ جگر ہے

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں اقبالؔ نے زندگی کے بعض اہم مسائل کو مرشد رومیؒ کے اشعار سے حل کیا ہے۔ مثلاً اقبالؔ سوال کرتے ہیں۔

رسترِ دیں ادراک میں آتا نہیں
کس طرح آئے قیامت کا یقیں

مرشد رومیؒ جواب دیتے ہیں۔

پس قیامت شو، قیامت را ببیں
دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

اس کے علاوہ اقبالؔ نے متعدد اشعار میں مرشد رومیؒ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے اور ان کی تعلیمات سے استفادہ کی تلقین کی ہے چند شعر لکھتا ہوں۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

نے مہرہ باقی، نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی

نویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں اقبالؔ نے متعدد اشعار اپنے متعلق لکھے ہیں جن کے مطالعہ سے ان کا مقام بآسانی معلوم ہو سکتا ہے چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانہ میں
کہ خانقاہوں میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

زیارت گاہِ اہلِ عزم وہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

بڑا کریم ہے اقبالؔ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں ایک شعر ایسا ہے جس میں اقبالؔ نے قوم کو زبورِ عجم کے مطالعہ کا مشورہ دیا ہے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی نگاہ میں اپنی اس تصنیف کی کیا قدر و قیمت تھی۔

اگر ہو شوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی، بے نوائے راز نہیں!

گیارھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں اقبالؔ نے نہایت واضح طور پر سرمایہ داری (CAPITALISM) کی مذمت کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو ادب میں اس اعتبار سے اس شعر کا جواب نہیں مل سکتا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

بارھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں اقبالؔ نے

جن غزلوں یا نظموں میں معشوق حقیقی سے خطاب کیا ہے وہ رفعت تخیل اور سوز و گداز دونوں کے اعتبار سے اردو زبان کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں اور ان کے مطالعہ سے اقبال کا اللہ کے ساتھ جو روحانی تعلق تھا وہ بالکل واضح ہو سکتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آئندہ اوراق میں ملے گی انشاءاللہ۔

بالِ جبریل کی شاعرانہ خصوصیات

اس کتاب کی شاعرانہ خصوصیات اس قدر گوناگوں اور تفصیل طلب ہیں کہ بجائے خود ایک مستقل تصنیف کا موضوع بن سکتی ہیں اور یہ مختصر مقدمہ اس تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لئے میں اختصار کے ساتھ چند خصوصیات کی طرف اشارہ کر دینے ہی پر اکتفا کروں گا۔ اس سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ناظرین اس کتاب کی خوبیوں کا کچھ اندازہ کر سکیں۔

اس کتاب میں اقبال کی شاعری کی پہلی خصوصیات یہ ہے کہ انہوں نے اکثر اشعار میں خدا کے ساتھ شاعرانہ شوخیاں کی ہیں جو باتیں اس ضمن میں انہوں نے بیان کی ہیں اگر وہ خود یا کوئی اور شخص ان کو نثر میں ادا کرتا تو یقیناً وہ سنجیدہ طبائع پر گراں گزرتیں لیکن شاعری کی یہ بھی ایک کرامت ہے کہ ہم ان باتوں کو برداشت ہی نہیں کرتے بلکہ پسند کرتے ہیں۔ چند شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

بال جبریل کی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں طنز کا رنگ اکثر مقامات پر بہت نمایاں ہے جس کی بدولت کلام میں غضب کی دلکشی اور تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ چند شعر لکھتا ہوں۔

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی

نہ خودی ہے۔ نہ خدا ہے۔ نہ جہاں ہے
یہی شہ کار ہے تیرے ہُنر کا

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظ و پند

مرے لئے تو ہے اقرار باللّسان بھی بہت
ہزار شکر کہ مُلّا ہیں صاحب تصدیق

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی غزلوں میں حافظ اور جامی کا رنگ پایا جاتا ہے یعنی ان اشعار کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد ہو سکتے

ہیں اور چونکہ ہماری قوم اس قسم کے اشعار کو بہت پسند کرتی ہے اس لئے بال جبریل اقبال کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول ہے چند اشعار درج کرتا ہوں تاکہ ناظرین لطف اندوز ہو سکیں۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

اس شعر کا ایک معنی تو حقیقی ہے یعنی شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے کہ مجھے بالکل ہی دیوانہ بنا دے۔ دوسرا معنی مجازی بھی مراد ہو سکتا ہے کہ شاعر خدا سے کہتا ہے کہ مجھے اپنی محبت عطا فرما۔ ایسی شدید محبت کہ میں ماسویٰ سے بیگانہ ہو جاؤں۔

اس مفہوم کے پیدا کرنے کے لئے ہمیں "گیسو" کے مفہوم میں تاویل کرنی پڑے گی۔ اور اس شعر میں جو لطف پنہاں ہے وہ یہی تو ہے کہ ہم اپنے ذہن کو "عورت" کی طرف سے ہٹا کر "خدا" کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس انتقال تصورات ذہنی ہی کا دوسرا نام، وہ کیف و سرور ہے جو اس طرف سے پیدا ہوتا ہے اور حافظ اور جامی د سعدی اور خسرو، عرفی اور نظیری، غالب اور بیدل کی غزلوں میں جو دلکشی ہے وہ اسی سبب سے تو ہے کہ اکثر اشعار ایسے ہیں کہ جن کے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظیری کا ایک نہایت بلند پایہ شعر درج کرتا ہوں جو سہل ممتنع کی ایک عمدہ مثال ہے۔

جہانِ مختصر خواہم کہ در وے
ہمیں جائے من و جائے تو باشد

اب اس شعر میں سارا لطف لفظ "تو" میں پوشیدہ ہے کہ در گفتن

نمی آید جب ایک رند شاہد باز، جو کسی عورت کی محبت میں مبتلا ہے اس شعر کو پڑھتا ہے تو وہ اپنے ذہن میں اس دو حرفی لفظ کا مخاطب اپنی معشوقہ کو قرار دیتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے اور جب ایک صوفی باصفا جو اللہ کی محبت میں دیوانہ ہے۔ اس شعر کو پڑھتا ہے تو وہ اس لفظ "تو" کا مخاطب اللہ کو قرار دیتا ہے اور بار بار اس شعر کو پڑھتا ہے۔ الغرض حافظ اور جامی کی شراب شاعری میں جو نشہ اور مستی ہے وہ اسی بات سے پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے ایک دنیا حافظ اور جامی کے کلام کی شیدائی ہے

اس وضاحت کے بعد اب میں بال جبریل سے اس رنگ کے چند اشعار اور نقل کرتا ہوں۔

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

حجاب اکسیر ہے، آوارۂ کوئے محبت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانہ میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد خلیق

وہ ملتفت ہوں تو کنج قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحن چمن بھی مقام مجبوری

اس شعر میں ضمیر غائب "وہ" نے جو قیامت برپا کی اس کا لطف

لفظوں کے ذریعہ سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

نگاہ سے کسی مست شباب کی نگاہِ ہوشربا بھی مراد ہو سکتی ہے اور کسی مرشد کامل کی نگاہ کیمیا اثر بھی۔

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

یہ شعر بال جبریل کے چند بہترین اشعار میں سے ہے کیونکہ اس میں بلاغتِ مضمون آفرینی، رمز و ایماء، تغزل اور رفعتِ تخیل کے علاوہ اسلوب بیان اس قدر دلکش ہے کہ شعر میں بلا کی جاذبیت اور کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ دراصل شعر نام ہے۔ دو خوبیوں کے مجموعہ کا۔

پہلی خوبی تو نفس مضمون سے متعلق ہے یعنی کوئی ایسی بات کہنا جو دل میں اتر جائے۔

دوسری خوبی اس دل پذیر بات کو مناسب لفظوں میں ادا کرنے کا سلیقہ جسے اندازِ بیان یا اسلوب بیان کہتے ہیں۔

غالب نے لکھا ہے کہ "شاعری" دراصل مضمون آفرینی کا نام ہے یہ تو شعر کی روح ہے اور اسلوب (جس انداز سے وہ مضمون باندھا جائے) یہ شعر کا جسم ہے ظاہر ہے کہ جسم بغیر روح کے بیکار ہے اور روح بغیر جسم مؤثر نہیں ہو سکتی۔

مصحفی، درد، میر، مومن اور غالب کو گذشتہ صدی میں اور حسرت، فانی، اصغر، جگر اور فراق کو ہمارے زمانہ میں جو بلند مقام

حاصل ہوا وہ اسی لئے کہ ان کے یہاں مضمون آفرینی بھی ہے اور انداز بیان بھی۔ آخر میں ایک شعر اور درج کرتا ہوں اور یہ بھی بے نظیر ہے۔

حدِ ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی
سمجھ میں اس قدر آیا ہے دل کی موت ہے دوری

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بالِ جبریل میں بہت سے اشعار اس قدر بلیغ ہیں کہ غور سے دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ اس قسم کے اشعار صرف وہ شاعر ہی لکھ سکتا ہے جو اسلوب بیان پر قدرت رکھنے کے علاوہ عمیق فکر اور بلند تخیل بھی رکھتا ہو۔ چند شعر لکھتا ہوں تاکہ میرا مفہوم واضح ہو سکے۔

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰؐ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصوّرات

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ بالِ جبریل میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن میں زندگی کے حقائق و معارف کو ایسے دل پذیر انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ پڑھتے ہی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ اشعار زبان زدِ خلائق ہو گئے ہیں چند شعر ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اے طائرِ لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی، اور کافری کیا ہے

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اقبالؔ نے اکثر اشعار میں رمز و ایما سے کام لیا ہے اور ناظرین سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اس صنعت کی بدولت شعر میں اس قدر دلکشی پیدا ہو جاتی ہے کہ لفظوں سے اس کا بیان ناممکن ہے یوں سمجھئے کہ دل اور دماغ دونوں متاثر ہو جاتے ہیں اور آدمی گھنٹوں لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔ رمز و ایما سے شعر میں وہی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے جو نقاب سے محبوبہ میں۔

رمز و ایما سے شاعر اس طرح کام لیتا ہے کہ بہت کچھ واضح کر دیتا ہے لیکن ایک بات قصداً نہیں کہتا اور پڑھنے والے سے توقع کرتا ہے کہ وہ خود اس نکتہ کو معلوم کرے گا۔ ایسے اشعار جب ایک شخص پڑھتا ہے تو وہ غور و فکر پر مجبور ہو جاتا ہے مثلاً

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

ناممکن ہے کہ آپ اس شعر کو پڑھیں اور اس سوال کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھ سکیں کہ شریعت اسلامیہ نے نصاب زر و سیم کس کی خاطر مقرر کیا ہے ؟

واضح ہو کہ رمز و ایما بڑی اچھی صنعت ہے لیکن اگر اس میں کوئی شاعر مبالغہ سے کام لینے لگے تو پھر اس کے اشعار معمّا یا چیستاں بن جائیں گے چونکہ اقبالؔ نے اس صنعت کو اعتدال کے ساتھ استعمال کیا ہے اسی لئے اس کلام میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے نمک اگر اعتدال کے ساتھ استعمال کیا جائے تو کھانا لذیذ ہو جاتا ہے لیکن زیادہ ہو جائے تو قابل خورش ہی نہیں رہتا اب میں اس قبیل کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ۔

گاہ مری نگاہ تیز، چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا!

متاعِ دین و دانش، لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

خضر کیونکر بتائے، کیا بتائے ؟
اگر ماہی کہے، دریا کہاں ہے ؟

میرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

اس پیکرِ خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شئے کی نگہبانی

وہ شب دردو سوزو غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ اقبال نے فارسی ترکیبیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کی ہیں۔ خوبصورتی کا لفظ میں نے اس لئے لکھا کہ ان تراکیب کے باوجود اشعار کی سلاست اور روانی میں فرق نہیں آیا اور فائدہ یہ ہوا کہ تین لفظوں میں تین جملوں کا مفہوم ادا ہو گیا۔

واضح ہو کہ اردو زبان میں فارسی تراکیب وہی شاعر کامیابی کے ساتھ استعمال کرسکتا ہے جو زبان اور اسلوب بیان دونوں پر قدرت رکھتا ہو اقبال کا کمال یہ ہے کہ سہ لفظی ترکیبوں کے باوجود سلاست دلکشی اور تاثیر میں کمی پیدا نہیں ہوتی۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ روانی بسلاست۔ دلکشی اور تاثیر کے لئے بہت سادہ اور آسان زبان لکھنی چاہئے۔ مثلاً :-

مصحفیؔ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

اس شعر میں جو بے پناہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے اس کا ایک سبب یہ ہے کہ شاعر نے اپنے مفہوم کو نہایت آسان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ لیکن اقبال نے یہ کمال دکھایا ہے کہ ساری کتاب از اول تا آخر فارسی ترکیبوں سے معمور ہے۔ اس کے باوجود اشعار کی دل آویزی، دلکشی اور اثر آفرینی میں کہیں کمی نہیں ہوئی ہے۔ چند منتخب اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

یہ حوریانِ فرنگی، دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں، جلوہ ہائے پا بہ رکاب

سوالِ مے نہ کروں، ساقیٔ فرنگ سے میں
کہ یہ طریقۂ رندانِ پاک باز نہیں

نخچیرِ محبت کا قصہ نہیں طولانی
لطفِ خلشِ پیکاں، آسودگیٔ فتراک

سنے نہ ساقی مہوش تو اور بھی اچھا
عیار گرمیٔ صحبت ہے حرف معذوری

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ اقبال نے اپنے بنیادی تصورات کی تشریح کے لئے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں۔ پوری غزل میں ایک ہی مرکزی خیال پیش کیا ہے جس کی مختلف طریقوں سے وضاحت کی ہے۔ مثلاً

(۱) پہلی پانچوں غزلیں مسلسل ہیں ہر غزل میں حمد کا رنگ ہے۔

(۲) عالم آب و خاک و باد! سرّ عیاں تو کہ

(۳) اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

اور اس کے بعد کے اشعار۔

(۴) پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی

(۵) یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر اک دانہ

(۶) فقر کے ہیں معجزات، تاج و سریر و سپاہ

یہ سب غزلیں جن کے پہلے مصرعے اوپر لکھ دیے ہیں مسلسل ہیں۔ مثلاً اس غزل میں جو اس مصرع سے شروع ہوتی ہے۔

فقر کے ہیں معجزات، تاج و سریر و سپاہ " اقبال نے علم اور فقر کا موازنہ پیش کیا ہے اور اپنے مخصوص نظریہ کی کہ فقر یا عشق کو علم یا عقل پر تفوق حاصل ہے۔ تبلیغ کی ہے۔

اس طرزِ ادا کی بدولت، ناظرین بآسانی اس حقیقت سے واقف ہو سکتے ہیں کہ اقبال شاعر بھی ہیں اور پیغام گو بھی ہیں اور یہی بات ان کو میر، مومن اور غالب سے متمیز کرتی ہے۔

نویں خصوصیت یہ ہے کہ بال جبریل کی غزلوں میں بڑا سوز وگداز پایا جاتا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ سوز وگداز شاعری کی جان ہے۔ میر تقی میر کو اردو شاعری میں سوز وگداز کی بدولت وہ مرتبہ حاصل ہوا جس کا اعتراف ان کے بعد تمام اردو شعرا نے کیا ہے۔ اگر اقبال کے کلام کا محض شاعرانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ صفت نمایاں طور پر نظر آئے گی۔ اور اگرچہ اس کے بہترین نمونے پیام مشرق اور زبور عجم کی غزلوں میں ملتے ہیں لیکن بال جبریل میں بھی سوز وگداز کا رنگ کافی موجود ہے اور اس کتاب کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

سوز وگداز، شاعر کی شدت احساس سے پیدا ہوتا ہے اور قادر الکلام شاعر اس جذبہ کو ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اقبال اور میر کے سوز وگداز کی نوعیت تو یکساں ہے یعنی دونوں نے "عاشق صادق" کی واردات قلبی کا بیان کیا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ میر کا محبوب فرد ہے، اقبال کا محبوب "قوم" ہے اور جن لوگوں نے اقبال کو نزدیک سے دیکھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ مرحوم کو قوم سے ویسا ہی عشق تھا جیسا کہ فرہاد کو شیریں سے۔ یا قیس کو لیلیٰ سے تھا۔ چنانچہ ۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کی درمیانی شب میں ۱۱ بجے کے قریب جبکہ ان کی حیاتِ ارضی کے صرف ۶ گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ یکایک ان پر گریہ طاری ہو گیا جب تھوڑی دیر کے بعد افاقہ ہوا تو ان کے اصحاب نے جو اس وقت ان کی چارپائی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ان سے اس گریہ کا سبب دریافت کیا تو مرحوم نے جواب دیا کہ۔

اس بات کا تو مجھے یقین ہے کہ میں نے اپنی قوم کو
سربلندی کا پیغام دیا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن اس وقت
مجھے یہ خیال آگیا کہ اگر قوم نے میرے اس پیغام پر عمل
نہ کیا تو کیا ہوگا۔

بس اسی عشق نے ان کی شاعری میں وہ سوز و گداز پیدا کر دیا تھا جس
کی بدولت انہیں غیر فانی زندگی حاصل ہو گئی اور ان کا کلام بھی زندۂ
جاوید ہو گیا۔ چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

نغمۂ نَو۔ بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرِ اک بہار کر

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ اکثر غزلوں میں بڑی روانی اور
سلاست پائی جاتی ہے روانی سے مراد یہ ہے کہ کلام میں تعقید لفظی یا معنوی

نہ ہو اور سلاست کا مفہوم یہ ہے کہ کلام میں ثقیل اور غیر مانوس الفاظ نہ ہوں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کلام میں الفاظ وہ ہوں جو ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں اور محاورات وہ ہوں جو زبان زد خلائق ہوں اور اشارات وتشبیہات وہ ہوں جن کی طرف ہمارا ذہن بآسانی منتقل ہو سکے علاوہ بریں اضافات بہت کم ہوں اور اگر ہوں تو پیچیدہ نہ ہوں۔

الغرض بحیثیت مجموعی شعر اس قدر سریع الہم ہو کر ادنیٰ اور اعلیٰ ہر شخص اپنی فہم کے مطابق یکساں لطف اندوز ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ بال جبریل میں اور خوبیوں کے علاوہ زبان کی خوبی بھی موجود ہے۔ اسی لئے اقبال کے مجموعہ کلام میں اس کتاب کو قبول عام کی سند حاصل ہو گئی اور جو لوگ انہیں اردو کا شاعر تسلیم کرنے میں تامل کرتے تھے بال جبریل کو پڑھ کر وہ بھی اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے۔

واضح ہو کہ میری نظر میں روانی اور سلاست اس وقت قابل تحسین ہوتی ہے جب شاعر کسی بلند مضمون کو آسان طریقے سے ادا کر سکے اگر شعر میں کوئی بات نہ ہو تو محض سادگی سلاست کوئی قابل تعریف چیز نہیں ہے حسرت موہانی دور حاضرہ میں تمام غزل گو شعرا کے امام ہیں اس کی وجہ یہی تو ہے کہ انہوں نے جذبات عاشقی کو جو غزل کی جان ہیں ایسی شستہ اور سلیس زبان میں ادا کیا ہے کہ پڑھنے والے کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی ادھر شعر پڑھا ادھر دل میں اتر گیا اور اگر پڑھنے والا ذوق شعری سے بھی بہرہ اندوز ہے تو ہمیشہ کے لئے حافظہ میں محفوظ ہو گیا اور یہ میرا ہی خیال نہیں خود حسرت موہانی بھی اس معاملہ میں مجھ سے متفق ہیں چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

ظاہر ہے کہ یہ کلیہ انہی کے اشعار پر صادق آسکتا ہے جن میں سلاست اور روانی پائی جائے۔ اس کے برعکس اگر شعر میں تعقید یا ثقالت ہو تو وہ از خود دل میں نہیں اتر سکتا بلکہ کاوش ذہنی کی مدد سے اسے دل میں اتارنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر اقبالؔ کا یہ شعر پڑھئے۔

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاجؔ کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

جب تک ذہنی کاوش نہ کی جائے دل میں اترنا تو در کنار۔ شعر ہی سمجھ میں نہیں آسکتا اب اس کے بعد یہ شعر پڑھئے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

آخر میں اس حقیقت کی صراحت بھی ضروری ہے کہ جو شاعر اپنے کلام میں فلسفیانہ مضامین نظم کرتے ہیں مثلاً اقبالؔ۔ غالبؔ، عرفیؔ وغیرہ ان کے بعض اشعار میں تعقید معنوی، اغلاق اور دشواری یا پیچیدگی کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے کیونکہ انہیں بہرحال وزن قافیہ اور ردیف کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور ان پابندیوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ سلاست اور روانی کو نفس مضمون کی خاطر قربان کر دیا جائے اس کے بغیر دریا کوزہ میں کیسے سما سکتا ہے۔

ذیل میں سلاست بیان کی چند مثالیں درج کرتا ہوں۔

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

گیارھویں خصوصیت یہ ہے کہ اقبالؔ نے تصوف کے فلسفہ یعنی وحدۃ الوجود کو شعر کے لباس میں پیش کیا ہے۔ وحدۃ الوجود کا کیا مفہوم ہے؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اقبالؔ کس قسم کی وحدۃ الوجود کے قائل یا معتقد ہیں؟ یہ سب مباحث آئندہ لکھوں گا اس جگہ اتنا بتادینا کافی ہے کہ اقبالؔ چونکہ اپنی افتاد طبع کے لحاظ سے صوفی تھے اس لئے اسرارِ خودی سے لے کر ارمغان حجاز تک ہر تصنیف میں تصوّف کا رنگ موجود ہے کسی کتاب میں کم کسی میں زیادہ۔

شاید بعض حضرات کو میری تحریر سے تعجب لاحق ہو کہ اقبالؔ تو فلسفی تھے۔ متکلم تھے اور شاعر تھے۔ انہیں تصوف سے کیا واسطہ؟ بلکہ وہ تو تصوّف اور صوفی دونوں کے خلاف تھے۔ چنانچہ انہوں نے تصوّف

کو مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے اور صوفی اور خانقاہ دونوں کی مذمت کی ہے وغیرہ وغیرہ اس کا جواب یہ ہے کہ اقبالؔ مطلق تصوّف کے خلاف نہیں تھے بلکہ اس تصوف کے خلاف تھے جس کی اصل غیر اسلامی ہے۔ اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ تصوف کی مختلف قسمیں ہیں اور وحدۃ الوجود کی بھی مختلف صورتیں ہیں اس نکتہ کو "اذان" کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ اذان تو ایک ہی ہے لیکن اقبالؔ کہتے ہیں۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

اسی طرح تصوف تو ایک ہی ہے لیکن قرآن کا پیش کردہ تصوف اور ہے۔ شنکراچاریہ کا تصوف اور ہے۔ دوسری مثال سنئے فقر تو ایک ہی ہے لیکن کافر کا اور ہے۔ مومن کا فقر اور ہے۔ ثبوت کے لئے کچھ اقبالؔ ہی کا شعر پیش کرتا ہوں۔

فقرِ کافر خلوتِ دشت و در است
فقرِ مومن لرزہ در بحر و بر است

الغرض تصوف کے لفظ سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبالؔ وحدۃ الوجود کے خلاف ہیں تو اس جملہ کا مفہوم اور ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقبالؔ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں تو اس کا مفہوم اور ہے۔ وحدۃ الوجود کے معنی ہیں "لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ" یعنی اللہ کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے اس کے دو مفہوم ہیں ایک مفہوم وہ ہے جس سے انہیں اختلاف ہے۔ دوسرا مفہوم وہ ہے

جس سے انہیں اتفاق ہے۔ ثبوت میں انہیں کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

از ضمیر کائنات آگاہ اوست
تیغ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ اوست

اگر اقبال پر تصوف کا رنگ غالب نہ ہوتا تو وہ رومی کے بجائے رازی کے شاگرد ہوتے اور مسلمانوں کو یہ تلقین نہ کرتے۔

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

اب میں بال جبریل سے اشعار نقل کرتا ہوں جن میں خالص تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

وہی اصل مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شئے ہے انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے، دریا کہاں ہے

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوْ

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

چمک سورج میں کیا باقی رہے گی　　اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

نگہہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

یہ ہے خلاصۂ علم قلندری کی حیات
خدنگ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

بارھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں اقبال نے جدت طرازی کی بڑی دلکش مثالیں پیش کی ہیں۔ جدت طرازی یا ظرفگیٔ ادا یا ندرت خیال سے میری مراد یہ ہے کہ شاعر اپنی خداداد قوتِ اجتہاد (ORIGINALITY) کی مدد سے نیا مضمون باندھے یا پرانے مضمون کو ایسے انداز سے پیش کرے کہ نیا معلوم ہو۔ یہ بات صرف ان شعرا کے کلام میں مل سکتی ہے جو شاعری کے علاوہ ذہانت سے بھی حصۂ وافر رکھتے ہوں۔ اردو زبان میں پچھلی صدی میں مومن اور غالب اس صنف میں ممتاز نظر آتے ہیں اور موجودہ دور میں حسرت۔ فانی۔ اصغر۔ جگر اور فراق کا نام لیا جا سکتا ہے۔

بال جبریل کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس میں اقبال نے اپنے واردات اور تخیلات کو ایسے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے پر ایک کیف کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں لکھتا ہوں۔

اے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

یہ فیضانِ نظر تھا، یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

نہ کر تقلید اے جبریلؑ میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلاّ

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

تیرھویں خصوصیت یہ ہے کہ بالِ جبریل کے اکثر اشعار میں بلاغت کی شان پائی جاتی ہے۔

بلاغت کے معنی ہیں۔ شاعر یا ادیب کا اپنے خیالات کو وضاحت کے ساتھ صحیح اور فصیح عبارت میں ایسے طریق سے پیش کرے تاکہ پڑھنے والا اس کے مطلب سے آگاہ بھی ہو جائے اور متاثر بھی امام فن علامہ تفتازانی نے مطول میں بلاغت کی تعریف یہ کی ہے کہ کلام فصیح ہو اور مقتضیاتِ حال کے عین مطابق ہو۔ بلاغت کے لغوی معنی ہیں وصولِ انتہا یعنی شاعر کا

اپنے مقصد کو پہونچ جانا یا مافی الضمیر کے اظہار میں کامیاب ہوجانا یہ تمام ماہرین فن کا فیصلہ ہے کہ کلام بلیغ وہ ہے جو مقتضیات حال کے عین مطابق ہو اور اپنے اندر فصاحت کی شان بھی رکھتا ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں گوناگوں خیالات و جذبات پائے جاتے ہیں کبھی غم و غصہ ہے کبھی مسرت و مہربانی ایک وقت بیتابی و بیقراری ہے تو دوسرے وقت راحت و سکون کبھی مستی و بیہوشی ہے اور کبھی خود آگاہی اور ہوشیاری۔ پس جس حالت یا کیفیت کا بیان ہو۔ اگر وہ بیان (کلام) اس حالت میں اس طرح ڈوبا ہوا ہو کہ کہنے والا کہہ رہا ہے اور سننے والے کی آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ کھینچا چلا جاتا ہے۔ حتی کہ سننے والے یا پڑھنے والے کے دل پر وہی کیفیت طاری ہوجائے جو بیان کرنے والے (شاعر) پر طاری ہوتی تھی تو اس کو بلاغت کہتے ہیں۔ عربی زبان میں سحبان بن وائل اور متنبی اور فارسی میں نظامی اور امیر خسرو اور اردو میں میر اور حسرت موہانی کا کلام بلاغت کی بہترین مثالیں ہیں۔ واضح ہو کہ شاعر۔ ادیب یا خطیب کا کمال فن یہ ہے کہ وہ مخاطب کے سامنے۔

(۱) اپنے مافی الضمیر یعنی احساسات و جذبات قلبی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دے۔

(۲) تاکہ مخاطب۔ اس کی بات کو کما حقہ سمجھ لے۔ اور

(۳) پورے طور پر سمجھ لینے کے بعد متاثر ہوجائے۔

غور سے دیکھو تو شاعر یا ادیب یا خطیب کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ دنیا کو اپنا ہم خیال اور ہمنوا بنانا چاہتا ہے وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے بلکہ عین حق ہے اور

یہ مقصد اثر آفرینی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اس مقصد کے حصول کے لئے یعنی اپنی بات سامع یا قاری کے دل میں اتارنے کے لئے شاعر مجبور ہے کہ بغایت موثر طریقہ اختیار کرے۔ موثر ترین طریقہ ایک نہیں ہے بلکہ کئی ہیں۔ چنانچہ وہ حسب ضرورت مختلف طریقے استعمال کرتا ہے تاکہ اپنے احساسات کی شدّت کی تصویر کھینچ سکے۔ بالفاظ دگر پڑھنے یا سننے والے کو متاثر کرسکے۔ بہرحال اس کا مقصود اثر آفرینی ہے۔

فرض کیجئے ایک شخص یا ایک شاعر آپ کو اپنے جذبۂ الم کی شدّت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے اب اگر وہ یہ کہتا ہے کہ

جب میری محبوبہ مجھ سے رخصت ہوئی تو میں بہت غمگین ہوگیا۔

تو اس عبارت سے آپ یقیناً متاثر نہیں ہوسکتے اور نہ اس سے اس شدّت غم کا اظہار ہوسکتا ہے جو محبوبہ کی مفارقت میں شاعر (عاشق) محسوس کر رہا ہے اس لئے شاعر کی فکر فلک رس اس شدّت کے اظہار کا موثر ترین طریقہ تلاش کرتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے۔

جب میری محبوبہ مجھ سے رخصت ہوئی تو مجھ بدنصیب پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

ان دونوں فقروں کا مقابلہ کیجئے۔ بات تو ایک ہی ہے کہ متکلم اپنے غم کا اظہار کرنا چاہتا ہے لیکن آپ خود فیصلہ کرلیجئے کہ غم کے پہاڑ نے جملہ میں کس بلا کی تاثیر پیدا کردی۔

ماہرین فن بلاغت نے جب اثر آفرینی کے ان طریقوں کا مطالعہ کیا تو ان کو ایک مستقل فن کی صورت میں مدوّن کردیا جس کو علم بیان کہتے ہیں اس علم میں حسب ذیل صنائع معنوی سے بحث کی جاتی ہے۔ تشبیہ، مجاز،

لغوی۔ استعارہ۔ استعارہ بالکنایہ۔ مجازمرسل۔ مجازعقلی اور کنایہ اور یہ معنوی خوبیاں کم وبیش ہر متمدن قوم کی شاعری میں پائی جاتی ہیں اور یہ خوبیاں وہ زیورات ہیں جن سے شعراء اور ادباء عروس سخن کو سنوارتے ہیں جس طرح سرمہ۔ مہندی۔ عطر اور غازہ عورت کے حسن کو چار چاند لگا دیتے ہیں اسی طرح تشبیہ۔ استعارہ۔ مجاز اور کنایہ، یہ چار خوبیاں شعر کی شراب کو چہار آتشہ بنا دیتی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ فن شاعری کے لحاظ سے کسی شاعر کے قادرالکلام اور بلیغ ہونے کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ اس صنائع و بدائع معنوی کو کس کس پہلو سے اپنے کلام میں استعمال کرسکتا ہے۔ ہومر۔ کالیداس۔ دانتے۔ گوئٹے۔ ملٹن۔ بیدل اور اقبال ان سب شعراء کا کلام ان محاسن ادبیہ سے لبریز ہے۔

علم بیان میں بنیادی صنائع چار ہیں۔ تشبیہ۔ استعارہ۔ مجازمرسل اور کنایہ۔ مجاز کی دو قسمیں ہیں۔ مجاز عقلی اور مجاز لغوی۔ پھر مجاز لغوی کی دو قسمیں ہیں۔ استعارہ اور مجازمرسل۔ پھر استعارہ کی بھی دو قسمیں ہیں استعارہ بالکنایہ اور استعارہ بالتصریح۔ پھر استعارہ بالتصریح کی تین قسمیں ہیں۔ مطلقہ۔ مجردہ اور مرشحہ۔

ناظرین کی سہولت کی خاطر اس کو شجرہ کی صورت میں لکھتا ہوں۔

مجاز

کنایہ — تشبیہ — مجاز عقلی — مجاز لغوی

مجاز لغوی: مجازمرسل — استعارہ

استعارہ: استعارہ بالکنایہ — استعارہ بالتصریح

استعارہ بالتصریح: مطلقہ — مجردہ — مرشحہ
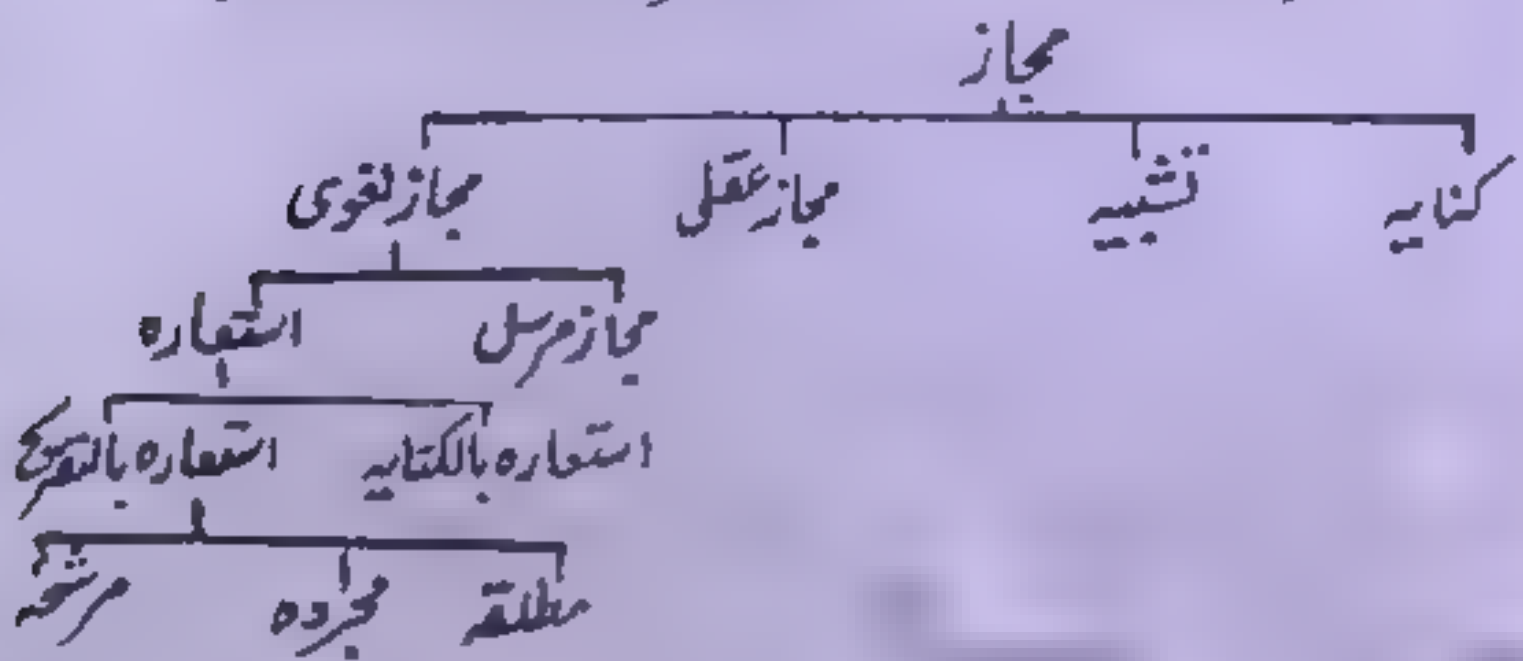
اب میں ان اصطلاحات کی تعریف لکھتا ہوں۔

(۱) تشبیہ۔ کسی شے کو کسی شے کے ساتھ کسی مخصوص وصف میں کسی مخصوص حرف کے ذریعہ سے لاحق کر دینا۔

ارکان تشبیہ چار ہیں۔ مشبّہ، مشبّہ بہ۔ حرف تشبیہ اور وجہ شبہ۔ واضح ہو کہ صنعتِ تشبیہ بلاغت میں بہت اہم مقام رکھتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے پوشیدہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور شاعر کا مفہوم پڑھنے والے کے ذہن میں بآسانی واضح ہو جاتا ہے مثلاً محبوب کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند ہے۔ اس تشبیہ کے ذریعہ سے شاعر یا متکلم اپنے مفہوم کو بآسانی واضح کر سکتا ہے اگر یہ تشبیہ استعمال نہ کی جائے تو محبوب کے چہرہ کا حسن وجمال ایسی خوبی کے ساتھ سامع کے ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔

(۲) مجاز۔ یہ حقیقت کی ضد ہے۔ مثلاً شیر کے حقیقی معنیٰ (جس معنیٰ کے لئے یہ لفظ وضع کیا گیا ہے) ایک خونخوار درندہ کے ہیں۔ جس کا لقب جنگل کا بادشاہ ہے لیکن اگر ہم کسی شخص کو اس کی بہادری کی وجہ سے "شیر" کہہ دیں تو یہ اس لفظ کا مجازی معنیٰ ہوگا۔

(۳) مجاز لغوی کی تعریف۔ مجاز لغوی وہ لفظ جس کو ہم اس شے کے اظہار کے لئے استعمال کریں جس کے لئے وہ نہیں بنایا گیا۔ بشرطیکہ ایسا قرینہ موجود ہو جو معنی حقیقی کے مراد ہونے سے مانع ہو۔ مثلاً بہادر آدمی کو شیر یا سخی کو حاتم کہہ دیں۔

(۴) استعارہ کی تعریف۔ مجاز میں جب معنی حقیقی اور مجازی کے درمیان تشبیہ کا علاقہ ہوتا ہے تو اسے استعارہ کہتے ہیں اس میں شرط

یہ ہے کہ مشبّہ اور مشبّہ بہ۔ دونوں میں سے کسی ایک کو حذف کر دیا جائے غرض استعارہ سے یہ ہوتی ہے کہ مشبّہ کو عین مشبّہ بہ قرار دیں جیسے شیر بول کر مردِ شجاع مراد لیں۔ یہاں مردِ شجاع مستعار لہٗ اور شیر مستعار منہ اور شجاعت وجہ جامع ہے۔

اگر صرف مشبّہ بہ کو ذکر کریں اور مشبّہ کو حذف کر دیں تو اسے استعارہ بالتصریح کہتے ہیں۔ مثلاً۔

لولو از نرگس فرو بارید وگل را آب داد
وز تگرگ روح پرور مالش عناب داد[۱]

دوسری مثال۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اگر صرف مشبّہ کو ذکر کریں اور مشبّہ بہ کو حذف کر دیں تو اسے استعارہ بالکنایہ کہتے ہیں۔

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں[۲]

۱؎ اس شعر میں آنسو کو لولو سے اور آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دی ہے لیکن آنسو جو مشبہ ہے اس کو حذف کر دیا اس کے بجائے۔ لولو۔ کا ذکر کیا ہے۔

۲؎ عشق کوئی حیوان یا انسان نہیں جو اس کے آنکھیں ہوں لیکن شاعر نے عشق کو انسان سے تشبیہ دی ہے تاکہ اس کے لئے نگاہ ثابت کر سکے لیکن۔۔ انسان جو مشبہ بہ ہے اسے حذف کر دیا۔ غالب کا یہ مشہور شعر بھی استعارہ بالکنایہ کی بڑی عمدہ مثال ہے۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھئے ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

(۵) **مجازِ مرسل کی تعریف۔** کسی لفظ کو "علاقہ" غیر تشبیہی کی بناء پر کسی ایسے معنی کے لئے استعمال کرنا جس کے لئے وہ لفظ موضوع نہیں ہے مثلاً مسبب بول کر سبب مراد لینا۔ جیسے اللہ نے آسمان سے رزق اتارا۔ اس جملہ میں "رزق" مجازِ مرسل ہے اور اس سے مراد بارش ہے جو رزق کا سبب ہے سب جانتے ہیں کہ آسمان سے رزق نازل نہیں ہوتا بلکہ بارش نازل ہوتی ہے مجازِ مرسل کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً۔

(ا) سبب بول کر مُسَبَّب مراد لینا۔

(ب) جزو بول کر کل یا کل بول کر جزو مراد لینا۔

(ج) حال بول کر محل یا محل بول کر حال مراد لینا۔

(د) ظرف بول کر مظروف یا مظروف بول کر ظرف مراد لینا۔

(۶) **مجازِ عقلی کی تعریف۔** فعل یا معنی فعل کی نسبت غیر کی طرف کرنا کسی علاقہ کی بناء پر جس میں اس قرینہ کے جو اسناد حقیقی مراد لینے سے مانع ہو۔ مثلاً بادشاہ نے شہر کے تمام کاریگروں کو جمع کیا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ کام بادشاہ نہیں کیا کرتا اس کے خدّام کیا کرتے ہیں۔ لیکن متکلم نے فعل کی نسبت خدّام کے بجائے بادشاہ کی طرف کر دی۔

(۷) **کنایہ کی تعریف۔** یعنی کنایہ وہ ہے جس سے ہم معنی لازم مراد لیتے ہیں اور اس میں اس معنی لازم کے مراد لینے کا جواز بھی شامل ہوتا ہے بالفاظِ دیگر کسی لفظ کو اس کے معنی موضوع لۂ میں اس طرح استعمال کرنا کہ مخاطب یا قاری کا انتقالِ ذہنی خواہ مخواہ اس کے لازم معنی کی طرف ہو جائے۔ مثلاً میری بات سن کر وہ چیں بہ جبیں ہو گیا اس جملہ میں چیں بر جبیں کنایہ ہے۔ عقیدتاً کے ہونے سے اسی قبیل سے یہ شعر ہے۔

لگے زمیں پہ اب سب آتارنے ہم کو
یہ دن دکھائے ترے انتظار نے ہم کو

یہاں زمین پر اتارنا کنایہ ہے قریب مرگ ہو جانے سے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تشبیہ۔ استعارہ۔ مجازہ اور کنایہ سے کلام میں خواہ منظوم ہو یا منثور۔ بلاغت اور دلکشی کی شان پیدا ہو جاتی ہے اور ان صنائع معنوی کی بدولت شاعر اپنے مفہوم یا مافی الضمیر کو بہترین اور مؤثر ترین پیرایہ میں ادا کر سکتا ہے۔

اب میں بال جبریل سے وہ اشعار نقل کرتا ہوں جن میں یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں اور اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ بال جبریل ہی پر کیا منحصر ہے۔ اقبال کی ہر تصنیف میں اسرار خودی سے لے کر ارمغان حجاز تک یہ خوبیاں ہر غزل اور ہر نظم میں موجود ہیں اور اس کی وجہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں یہ ہے کہ اقبال فلسفی ہونے کے علاوہ وہ ایک نہایت بلند پایہ شاعر بھی ہیں ان کا شمار دنیا کے صف اول کے شعراء میں ہے اور ہر قادر الکلام شاعر ان صنائع معنوی کو برمحل استعمال کر کے اپنی شاعرانہ قابلیت کا نقش دلوں پر ثبت کرتا ہے۔

شعر کے دو رُخ یا پہلو ہوتے ہیں۔ الفاظ اور معنی اور ہر قادر الکلام شاعر شعر کے صوری پہلو کو صنائع لفظی سے اور باطنی پہلو کو صنائع معنوی سے آراستہ کرتا ہے اقبال کے یہاں صنائع لفظی کی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں لیکن بخوف طوالت ان سے قطع نظر کر کے صرف صنائع معنوی کی مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) تشبیہ کی مثالیں۔

آدمی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

تیری بنا پائیدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

(ب) مجازِ عقلی کی مثالیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

(ج) استعارہ کی مثالیں۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے

(د) مجازِ مرسل کی مثالیں۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالم گیر ہے مردانِ غازی کا

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

(ج) کنایہ کی مثالیں۔

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے آئینۂ دیوار بھی ہے

(د) استعارہ بالکنایہ کی مثالیں۔

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام بادشاہی

چودھویں خصوصیت یہ ہے کہ بالِ جبریل کی اکثر غزلیں اور نظموں میں شاعری اور موسیقی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثلاً تیسری غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر

یا تیرہویں غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

یا دوسرے حصہ میں چوتھی غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

عالم آب و خاک و باد سرّ عیاں ہے تو کہ میں
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں

یا دوسرے حصہ میں دسویں غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے

یا دوسرے حصہ میں چونتیسویں غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پہ اسرارِ شہنشاہی

پندرھویں خصوصیت یہ ہے کہ بالِ جبریل میں اکثر مقامات پر زورِ بیان کی بہت دلکش مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً یہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ

یا یہ نظم جس کا مطلع یہ ہے۔

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

یا یہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

یا یہ غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

یا یہ نظم (مسجد قرطبہ) جس کا مطلع یہ ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

سولھویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں رفعتِ تخیل کی بہت دلکش مثالیں ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ نے مسلمانوں کو ہر کتاب میں سربلندی عزم و استقلال خودداری عزتِ نفس اور بلند حوصلگی کی تعلیم دی ہے اور چونکہ انہوں نے شاعری کو اپنے پیغام کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے نہ کہ مقصود بالذات اس لئے ان کی ہر کتاب میں یہ رنگ نہایت شدت کے ساتھ موجود ہے۔ ذیل میں بالِ جبریل سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا!
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

بالِ جبریل کا عنوان

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

یہ شعر۔ راجہ بھرتری ہری کی تصنیف کے پہلے حصہ موسومہ نیتی اشتک کے چھٹے اشلوک سے ماخوذ و مقتبس ہے۔ پورا اشلوک اس طرح ہے۔

"کسی شخص کا اپنے عقلی استدلال کے زور سے کسی مورکھ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنا ایسا ہی بے سود ہے جیسا کسی شخص کا مست ہاتھی کو کنول کے ڈنٹھل سے روکنا یا شرش کے نازک ریشوں سے ہیرے میں چھید کرنا۔

اقبالؔ نے اس اشلوک کے پردہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اگرچہ بالِ جبریل میں ایک سے ایک بڑھ کر علمی نکتے بیان کئے گئے ہیں لیکن جو لوگ عقل و فہم سے عاری ہیں ان کو اس کتاب میں کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔

راجہ بھرتری ہری قدیم زمانہ میں مالوہ کا حکمران گذرا ہے اس کی زندگی کا ابتدائی حصہ بہت عیش و عشرت میں بسر ہوا لیکن آخر عمر میں اس نے ویراگ (ترک دنیا) اختیار کر لیا تھا اور مشہور جوگی گورکھ ناتھ کی خدمت میں رہ کر ویراگ کی تکمیل کی تھی اسی زمانے میں اس نے اپنی غیر فانی کتاب شتک ترےیم تصنیف کی پہلے حصہ کا نام نیتی شتک ہے دوسرے کا شرنگار شتک، اور تیسرے کا ویراگ شتک اس کتاب کا مفصل تذکرہ تو میں انشاءاللہ فرہنگ اقبالؔ میں درج کروں گا۔ اس جگہ اس کی عظمت کے لئے اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ اقبالؔ نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بالِ جبریل کی پہلی غزل

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

جیسا کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا ہوں۔ اقبال نے بالِ جبریل کی پہلی پانچ

غزلوں میں معشوق حقیقی سے خطاب کیا ہے اس لحاظ سے یہ غزلیں اس کتاب کی باقی ماندہ غزلوں سے ممتاز ہیں اور ہماری خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ اگرچہ یہ پانچوں غزلیں رفعت تخیل مضمون آفرینی۔ چستیٔ بندش۔ اسلوب بیان ظرافتیٔ ادا۔ صنائع بدائع۔ لفظی ومعنوی اور وجد انگیزی کے اعتبار سے لائق ہزار تحسین ہیں لیکن میری رائے میں یہ پہلی غزل ان میں بہترین ہے بلکہ ساری کتاب کی جان ہے اور اس کو غور سے پڑھنے کے بعد بے اختیار یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے۔ ع

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجا نکال کے

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ ان پانچ مخصوص غزلوں میں سے ہر غزل بجائے خود بھی ایک خصوصیت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس غزل کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ پوری غزل میں خطاب معشوق حقیقی ہی سے ہے لیکن خطاب کا انداز ایسا ہے کہ ہر شعر بلکہ ہر مصرع میں تذکرہ اپنا ہی ہے اور آخری شعر اگرچہ مخاطب کے صیغہ سے شروع ہوتا ہے لیکن خطاب کے بعد پھر اپنا ذکر شروع ہو گیا ہے۔

بظاہر تو یہ اپنا تذکرہ ہے لیکن بباطن اسی کی حمد وثنا ہے کیونکہ مقصود اس تذکرہ سے یہ ہے کہ اے خدا! میں ایک بندۂ ناچیز ہوں میری حقیقت اور ماہیت تو (عدم) ہے اس لئے میری حقیقت درحقیقت کچھ بھی نہیں۔ ہیں اگر موجود ہوں تو محض اس سبب سے کہ تیری صفت تخلیق کی تجلی اس کائنات میں اور میری ذات میں کارفرما ہے۔

بایں ہمہ بے مائیگی و بے چارگی چونکہ تو نے محض اپنے کرم بے پایاں سے مجھے اپنی محبت کے جذبۂ بے پناہ سے بہرہ ور کر دیا ہے اس لئے میں اشرف

المخلوقات کے لقب سے سرفراز ہو گیا ہوں اور تیرے عشق نے مجھ میں وہ قوت اور طاقت پیدا کر دی ہے کہ

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

فی الجملہ یہ غزل ساری کتاب کی جان ہے اور یہ شعر اس غزل کی جان ہے اور "حریم" اس شعر کے پہلے مصرع کی اور "بتکدہ" دوسرے مصرع کی جان ہے۔ اگر یہ شعر اس کتاب میں نہ ہوتا تو اس کتاب کے نام کی موزونیت پر حرف آجاتا کیونکہ "بال جبریل" کی معنویت اس امر کی مقتضی ہے کہ شاعر عشق حقیقی کے پر لگا کر حریم ذات تک پہونچنے کی کوشش ضرور کرے۔ کامیابی ہو یا نہ ہو عاشق کا کمال کوشش ہے نہ کہ وصال اور میرے زاویۂ نگاہ سے وصال کمال نہیں بلکہ زوال ہے کیونکہ وصال کے بعد محبوب میں کوئی کشش یا جاذبیت باقی نہیں رہتی۔

میں نے ۱۹۲۷ء میں حضرت علامہ مرحوم سے عرض کی تھی کہ آپ اپنا کوئی پسندیدہ شعر اپنے قلم سے میرے نسخۂ زبور عجم کی لوح پر تحریر فرما دیجئے مرحوم نے حسب عادت بڑی سنجیدگی سے فرمایا: "مجھے تو اپنے سارے اشعار پسند ہیں" میں نے ہمت کر کے دوبارہ عرض کی کہ یقیناً آپ کو ضرور کوئی ان میں سب سے زیادہ پسند ہو گا جس طرح آپ کو اپنی تمام تصانیف میں زبور عجم سب سے زیادہ پسند ہے یہ سن کر انہوں نے کہا تھا قلمدان اٹھا لاؤ! یہ سن کر میں برآمدہ سے اٹھ کر فوراً کمرے میں گیا اور ان کا عہد و کٹوریہ کا بنا ہوا قلمدان لے کر ان کے پاس واپس آیا مرحوم نے قلم اٹھایا اور بلا تامل میری لوح کتاب پر لکھ دیا کہ شعر میرے پسندیدہ اشعار میں سے ہے۔

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام
محمد اقبال ۱۴ نومبر ۱۹۲۷ء

اس غزل کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر مصرع استعارہ اور مجاز کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور یہ اسلوب شاعر نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ علم بیان یا بلاغت کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ۔

المجاز ابلغ من الحقیقۃ۔ والکنایۃ ابلغ من التصریح و الاستعارۃ ابلغ من التشبیہ۔ یعنی مجاز حقیقت کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ ہوتا ہے اور کنایہ صراحت کے مقابلہ میں۔ اور استعارہ تشبیہ کے مقابل میں زیادہ بلیغ ہوتا ہے

واضح ہو کہ تشبیہ استعارہ اور کنایہ (یہ سب مجاز ہی کی مختلف صورتیں ہیں) کی بدولت اگر ایک طرف کلام میں صرف بلاغت اور دلکشی کی شان پیدا ہو جاتی ہے تو دوسری طرف انہی خوبیوں کی بدولت دشواری کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر شعرا مجاز سے کام لینا چھوڑ دیں تو کسی شعر کے سمجھنے میں کوئی دشواری لاحق نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے میرا مقولہ یہ ہے کہ دنیا میں سارا جھگڑا اس مجاز ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ "حقیقت" کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ مجاز کے بغیر شاعر تو در کنار ایک عامی کا کام بھی نہیں چل سکتا ایک فرقت کا مارا جب اپنی روداد سنائے گا تو لامحالہ یہی کہے گا کہ اس کی بے وفائی نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔ دل میں ناسور ڈال دیا۔ وجہ یہ ہے کہ استعارہ کے بغیر نہ کلام میں زور پیدا ہو سکتا ہے نہ تاثیر اسی لئے غالب نے یہ شعر کہا تھا۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اس غزل کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اشعار میں صنعتِ تنزول (PATHOS) پائی جاتی ہے یعنی شاعر نے سب سے پہلے ارفع حقیقت کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر علی الترتیب ادنیٰ حقائق کو بیان کیا ہے مثلاً پہلے مصرع میں "ذات" کا ذکر ہے دوسرے مصرع میں "صفات" کا تیسرے مصرع میں "عود و فرشتہ" کا۔ چوتھے میں "تجلیات" کا۔ پانچویں مصرع میں "عالم مجردات کے بعد" "دیر و حرم"۔ چھٹے مصرع میں "کعبہ و سومنات" کا۔ ساتویں مصرع میں "وجود کائنات" کا۔ اور آٹھویں مصرع میں "توہمات" کا۔

اس غزل کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقبال نے عقل پر عشق کی برتری واضح کردی ہے۔

فلسفی آخر وقت تک صفات کے بتکدہ سے باہر نہیں نکل سکتا اس لئے حریم ذات تک رسائی کا تصور بھی اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ یا بالفاظ دیگر اقبال نے اس غزل کے پہلے شعر میں اپنا فلسفیانہ مسلک بیان کردیا ہے وہ مرشد رومی کی تقلید پر فخر کرتے ہیں اور رومی کا مسلک جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ یہ ہے کہ "حریم ذات" تک پہونچنے کا ذریعہ عقل نہیں ہے بلکہ عشق ہے اسی لئے اقبال نے یہ کہا۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اس غزل کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پڑھنے سے مجدد شرفِ انسانی کا ایک غیر فانی نقش دل پر ثبت ہو جاتا ہے اور صوفیانہ

شاعری کا ادب پر سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ اس کی بدولت ہمارا ادب اسلام یا قرآنِ حکیم کی اس بنیادی تعلیم سے روشناس ہوگیا کہ انسان "خلیفۃ اللہ علی الارض" ہے اقبالؔ نے اس حقیقت کو بار بار مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ جاویدنامہ سے صرف ایک شعر اس جگہ نقل کرتا ہوں۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

چھٹی خصوصیت اس غزل کی یہ ہے کہ اس میں یعنی اس کے آخری شعر میں انسان کا راز فاش کرتے کرتے۔ اقبالؔ نے اپنا راز بھی فاش کر دیا یعنی بھری محفل میں "وحدۃ الوجود" کا ساغر پی لیا۔

نوٹ:۔ جیسا کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا ہوں یہاں وحدۃ الوجود سے شیخ اکبر کا پیش کردہ "ہمہ اوست" کا نظریہ مراد نہیں ہے (اقبالؔ اس نظریہ سے اختلاف کرتے ہیں۔ بلکہ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کا پیش کردہ "ہمہ ازوست" کا نظریہ یعنی۔

(۱) کائنات کا وجود حقیقی نہیں بلکہ ظلّی ہے۔
(۲) کائنات کی ہر شے اس ذاتِ حقیقی کی "مظہر" ہے۔

ع ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

اب ہم پہلے شعر کا مطلب بیان کرتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ پہلے مصرع میں دو لفظ غور طلب ہیں نوائے شوق اور حریمِ ذات لفظ نوائے اور لفظ حریم سے مصرع میں تغزل کا رنگ بھی پیدا ہوگیا ہے اور چونکہ یہ دونوں استعارہ ہیں اس لئے بلاغت اور دلکشی بھی

پیدا ہوگئی ہے۔ نوائے بمعنی آہ ونالہ یا فریاد وزاری۔ یہ اقبال کے محبوب الفاظ میں سے ہے۔ کیونکہ وہ عشق کے پرستار ہیں اور نوائے عشق کا ذریعہ اظہار ہے عاشق۔ آہ ونالہ پر مجبور ہے جس طرح اذان علامت صلوٰۃ ہے۔ نالہ و فریاد۔ علامت عشق ہے۔ بلکہ عاشق کے لئے لازمۂ حیات ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

ہے درد اپنا سحر کو نالہ و فریاد کر لینا
بہر صورت کسی پردہ میں تجھ کو یاد کر لینا

عاشق جب معشوق کو یاد کرتا ہے تو اسے اس کے فراق کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس آہ و فریاد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور چونکہ عاشق ہر گھڑی محبوب کو یاد کرتا ہے اس لئے ہر گھڑی اس کی جدائی کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر گھڑی نالہ و فریاد کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نالہ و فریاد۔ یا "نوائے شوق" اس کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے۔

مرے ہمصفیر اسے بھی اثر بہار سمجھے
انہیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

یہ نوائے شوق "یا" نوائے عاشقانہ " عاشق کی فطرت کا اقتضا ہے جس کو وہ نہ چھپا سکتا ہے نہ ضبط کر سکتا ہے۔ مرشد رومی نے اسی نوائے کو نَے سے تعبیر کیا ہے۔

از نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

اقبال نے اس لفظ "نوائے" کو جس جس طریقے سے باندھا ہے اگر

اس کی تفصیل لکھنے لگوں تو ایک مستقل کتاب مرتب ہو جائے گی اس لئے مجبورًا قلم روکتا ہوں۔

ذات کے لئے "حریم" کا لفظ لائے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس کی موزونیت کا اظہار لفظوں کے ذریعہ سے ناممکن ہے اور اسی شعر پر کیا موقوف ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ کسی بلند پایہ شعر میں جو لطف مضمر ہوتا ہے اسے ہم لفظوں کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کر سکتے۔ اسی لئے تو کہا ہے۔

قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز و دم درکش
حسن این قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

حریم سے شاعری کی اصطلاح میں وہ محفوظ مقام مراد ہے جہاں کسی کی رسائی نہ ہو سکے پس اس جگہ "حریم" کنایہ ہے اس حقیقت سے کہ ذاتِ باری وراء الورا ہے۔ فہم انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ عاشق دنیا والوں کو مغالطہ دینا نہیں چاہتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب نوائے شوق سے حریم ذات میں شور برپا ہو گیا تو قدرتی طور پر ہر شخص اس قیاس پر مجبور ہو گا کہ شاید عنقریب عاشق "ذات" یا معشوق حقیقی سے واصل ہو جائے گا یا کم از کم وصال کا امکان ضرور پیدا ہو گیا ہے اس امکان کی نفی کے لئے شاعر نے حریم کا لفظ استعمال کیا ہے تاکہ یہ حقیقت مبرہن ہو جائے کہ اگرچہ اس میں تو شک نہیں کہ میری نوائے شوق سے حریم ذات میں شور برپا ہو گیا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ذاتِ حریم میں پوشیدہ ہے اور اس یقین سے معمور ہے کہ ہم تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نہیں کہ ہم بخل کرتے ہیں یا اپنے حسن ذاتی کے جلوہ سے محروم رکھنا چاہتے ہیں بلکہ کوئی اس لائق ہی نہیں کہ ہمیں دیکھ سکے اور پھر اپنی جگہ باقی بھی رہ سکے یا اپنی ہستی کو برقرار رکھ سکے۔

الغرض اس حقیقت نے حریم کو "حریم ناز" یعنی بارگاہ بنادیا جس میں غیر کا گذر نہیں ہو سکتا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب حریم ناز میں گذر ہی نہیں ہو سکتا تو نوائے شوق کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عاشق کا کام تو اپنی سعی کوشش کرنا ہے نتیجہ برآمد ہو یا نہ ہو۔

یہ کمال کچھ کم ہے کہ ایک مشت خاک کی نوائے شوق سے حریم ناز میں شور برپا ہو گیا۔ مانا کہ کامیابی نہ ہو سکی لیکن یہ وہ ناکامی ہے کہ اس پر لاکھوں کامیابیاں نثار ہیں۔

غور سے دیکھو یہ ناکامی بھی عین کرم ہے کیونکہ اگر عاشق حریم ذات میں داخل ہو جائے تو اس کا فنا ہو جانا یقینی ہے کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا زبردست انسان صفت کی تجلّی کی تاب نہ لا سکا تو ایسا کون ہے جو ذات کی تجلّی کی تاب لا سکے۔ الغرض فنا ہو جانا یقینی ہے اور اگر یہ سلسلہ قائم ہو گیا اور یہ ہو جانا چاہئے یعنی اگر ایک عاشق حریم ناز میں بار پا سکتا ہے تو دوسرا بھی پا سکتا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ مخلوقات ختم ہو جائیں گی۔ اور جب عشّاق سب ختم ہو جائیں گے تو معشوق کے حسن کا تقاضا کیسے پورا ہو گا؟ یہ کائنات تو عالم وجود میں آئی ہی تھی اس لئے کہ

حسن کا ذاتی تقاضا اظہار یا نمائش ہے۔ اور نمائش بے معنی ہے۔ جب تک کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ اس لئے عشّاق کا وجود اور بقا دونوں لازمی ہیں۔ اسی لئے وہ اپنے عشاق کو اپنی صفات کی تجلیات سے نوازتے رہتے ہیں تاکہ جذبۂ دروں ناکامی کے یقین سے فنا نہ ہو سکے۔

ع چیست حیاتِ دوام سوختنِ ناتمام

میری نوائے شوق کی تاثیر دیدنی اور شنیدنی ہے کہ حریم ذات میں بھی شور برپا ہو گیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر عاشق حریم ذات میں داخل ہو گیا بالفاظ دیگر اگر ذات آشکار ہو گئی تو یہ کائنات جو تجلّی صفات کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ یقیناً فنا ہو جائے گی۔ اور جب یہ کائنات فنا ہو جائے گی تو پھر "ذات" اپنا جلوہ کسے دکھائے گی؟ معشوق کے لئے عاشق کا وجود لازمی ہے۔

مثلاً ساقی، مے خانہ، صراحی اور جام ان لفظوں کے مفہوم کا تحقق مے نوشوں کے وجود پر موقوف ہے اگر پینے والے نہ ہوں تو "ساقی" کو ساقی کون کہے گا؟ یعنی ساقی کے وجود کا اثبات کیسے ہوگا؟ اسی نکتہ کو اقبال نے گلشن رازِ جدید میں یوں بیان کیا ہے۔

اگر مائیم گرداں جام ساقی است به بزمش گرمیٔ ہنگامہ باقی است
مثالِ دانہ می دارم خودی را برائے او نگہدارم خودی را

یعنی اگر ہم موجود ہیں تو ساقی کا جام بھی گردش میں ہے اور اس کی بزم (میخانہ) میں ہنگامہ بھی باقی ہے اور اگر ہم نہ ہوں گے تو گردش جام بھی ختم ہو جائے گی اور گرمیٔ ہنگامہ بھی۔ اس لئے میں اپنی خودی کی اس طرح پرورش کر رہا ہوں جس طرح کاشتکار دانہ کی پرورش کرتا ہے یعنی اس (محبوبِ حقیقی) کی خاطر اپنی خودی کی حفاظت اور بقا کا سامان کر رہا ہوں۔

واضح ہو کہ یہ کارخانہ ذات مطلق نے اپنی صفات کی تجلّی کے واسطہ سے پیدا کیا ہے ذات کی براہ راست تجلّی اس قدر طاقتور ہے کہ مخلوقات باقی نہیں رہ سکتی اس کی مثال ایسی ہے کہ خالی آنکھ آفتاب کے جلوہ کی

تاب نہیں لا سکتی۔ اگر آفتاب کی تجلّی براہ راست انسان کی آنکھ پر ہو جائے تو انسان کے آنکھ کی بصارت زائل ہو جائے گی۔ اسی طرح ذات کی تجلّی اگر براہِ راست ہو جائے تو مخلوقات فنا ہو جائیں اس لئے ذات حق نے اپنی تجلی بواسطہ صفات فرمائی ہے تاکہ مخلوقات اس تجلی کا تحمل کر سکیں۔ میرے اس خیال کی تائید قرآن حکیم کی ان آیات سے ہو سکتی ہے۔

قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا۔ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (سورۃ الاعراف رکوع ۱۷)

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب تو مجھ کو دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ لیکن تو نظر کر پہاڑ کی طرف اگر وہ اپنی جگہ قائم رہا تو تو مجھ کو دیکھ سکے گا پھر جب اس کے رب نے پہاڑ کی طرف تجلّی فرمائی تو اس کو ڈھا کر برابر کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو کہا کہ تیری ذات پاک ہے میں تیری جناب میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلے یقین لانے والوں میں سے ہوں۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ دنیا میں کسی مخلوق کا یہ فانی وجود اللہ کے دیدار کا تحمل نہیں کر سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ درخواست فرطِ اشتیاق میں کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے حقیقت حال واضح کرنے کے لئے ان سے فرمایا کہ اے موسیٰ! اگرچہ کوئی انسان ہمارے جمال کی تاب نہیں لا سکتا

لیکن اس صداقت کو تمہارے ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم تمہیں مشاہدہ کرادیں تاکہ علم کے بعد تمہارے اندر یقین پیدا ہوسکے کہ واقعی انسان جمالِ خداوندی کا تحمل نہیں کرسکتا پس تم پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو ہم اپنے جمالِ صفت کی ایک جھلک اس پر ڈالتے ہیں اگرچہ پہاڑ جیسی مضبوط اور سخت اور عظیم شئے اس تجلّی کو برداشت کرسکی تو پھر ممکن ہے کہ تمہیں بھی اس کا تحمل کرادیا جائے ورنہ سمجھ لینا کہ جب پہاڑ تاب نہ لاسکا تو انسان ضعیف البنیان کی کیا حقیقت ہے کہ وہ ظاہری آنکھوں سے تجلّی صفات کا تحمل کرسکے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر تجلّی فرمائی تو وہ ریزہ ریزہ ہوگیا اور چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام محل تجلّی کے قریب تھے اس لئے وہ بھی اس سے متاثر ہوگئے اور غش کھاکر گر پڑے اور جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے جناب باری میں اعتراف عجز کیا کہ واقعی کوئی انسان تجلیات الٰہیہ کی تاب نہیں لاسکتا۔

اب دوسرے مصرع پر غور کیجئے۔

اقبالؔ نے "صفات" کے لئے بتکدہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ واضح ہو کہ "بتکدہ" اس مکان کو کہتے ہیں جس میں بت رکھے ہوئے ہوں بت اس جگہ اصطلاحی معنیٰ میں مستعمل ہے یعنی بت سے مراد ہے وہ چیز جو انسان کو اس کے مقصدِ حقیقی سے غافل کردے۔ اقبالؔ کی رائے میں مومن کا مطلوب و مقصود صفات نہیں ہیں بلکہ "ذات" ہے لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سالک صفات (اسماء الٰہیہ) کے مشاہدہ میں ایسا مستغرق ہوجاتا ہے کہ ذات کا تصوّر اس کی نگاہ سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ صفات کے جلوہ ہائے گوناگوں اس کے لئے اس قدر دلکشی کا باعث بن جاتے ہیں کہ وہ انہی کا ہو رہتا ہے اور ذات تک پہنچنے کی

کوشش نہیں کرتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنی محبوبہ کی سرگیں آنکھوں کو دیکھ کر ایسا از خود رفتہ ہو جائے کہ اسے یہ خیال ہی نہ آئے کہ میرا مقصود آنکھیں نہیں ہیں بلکہ وہ ذات ہے جس کی ایک صفت یہ دلکش آنکھیں بھی ہیں۔

چونکہ اکثر سالک صفات (اسماء الٰہیہ) کے مشاہدہ میں برسوں عالم محویت میں بسر کر دیتے ہیں اس لئے اقبالؔ کی نگاہ میں یہ صفات مجازی رنگ میں وہ "بت" ہیں جو ان کی روحانی ترقی میں حائل ہو جاتے ہیں اور اسی لئے انہوں نے ان صفات کو بتکدہ سے تعبیر کیا ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ تصوّف کے باب میں رومیؒ کے شاگرد اور مقلد ہیں اور انہوں نے اس کے جملہ اسرار و رموز صاحب مثنوی ہی سے حاصل کئے ہیں چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں۔

بہ جوں رومی در حرم دادم اذاں من
از و آموختم اسرار جاں من (ارمغان حجاز)

مرشد رومی جیسا کہ سب جانتے ہیں علم تصوّف کے مسلم الثبوت امام ہیں ان کی تعلیم یہ ہے کہ مومن کا مقصود و مطلوب صفات نہیں بلکہ ذات ہے اور اسی میں مومن کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ صفات کا مشاہدہ بھی ضروری ہے لیکن یہ مشاہدۂ صفات واسطہ ہے مقصود بالذات نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ چھت پر چڑھنے کے لئے سیڑھی پر چڑھنا اشد ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص اس سیڑھی کو مقصود سمجھ لے تو چھت تک نہیں پہونچ سکتا چنانچہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را اوست سیّد جملہ موجودات را

رومی کی اتباع میں اقبالؔ نے بھی، ذات، ہی کو مقصود قرار دیا ہے اور خطبات مدراس میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قرآن مجید کی رو سے مؤمن کا آئیڈئیل (نصب العین) ملاقات ہے۔ نہ کہ وصال یا اتحاد۔ اور اس پر یہ آیت شاہد ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ اَحَدًا۔

یعنی پس جو شخص اپنے رب سے ملاقی ہونے کی آرزو رکھتا ہو۔ اسے لازم ہے کہ اعمال صالح (اور عمل صالح وہ ہے جس کی تصدیق پیشوائے عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد قولی یا فعلی سے ہو سکے) بجالائے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی غیر کو شریک نہ کرے[1]۔

واضح ہو کہ قرآن مجید نے لقاء کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے لئے ناظر اور منظور (تصوف کی اصلاح میں عاشق اور معشوق) دونوں کا وجود ضروری ہے۔

وصال یا اتحاد جسے فنا بھی کہتے ہیں۔ غیر اسلامی عقیدہ ہے کیونکہ وصل یا اتحاد میں دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ جداگانہ وجود باقی نہیں رہتا یعنی عاشق فنا ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اس نظریۂ وصال کی مخالفت کی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

---

[1] حضرت صوفیہ فرماتے ہیں کہ جب تک اللہ سے عشق نہ ہو ایسی عبادت (جو مطلوب بارگاہ ایزدی ہے) ممکن نہیں ہو سکتی۔ ۱۲

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی
ترا او بیند و او را تو بینی

اور یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جب دونوں موجود ہوں۔
باز آمدم بر سرِ مطلب۔ اقبالؔ نے بھی مرشد رومؔ کی اتباع میں ذات کو مقصود قرار دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

اور یہ تصور کہ مقصودِ مومن ذات ہے نہ کہ صفات انہوں نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے اخذ کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

مردِ مومن در نسازد با صفات
مصطفےٰ راضی نشد اِلّا بذات

اقبالؔ سے پہلے عارف جامیؒ نے بھی اسی حقیقت کو پیش کیا ہے چنانچہ وہ اپنے اس غیر فانی شعر میں فرماتے ہیں۔

موسیٰؑ ز ہوش رفت بیک پر تو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

دوسرے مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جب عاشق کی نوائے شوق سے حریم ذات میں شور برپا ہو گیا تو لازمی طور پر تبکدۂ صفات میں بھی غلغلہ (شور) الاماں والحفیظ بلند ہو گیا۔
یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حریم ذات میں محض شور برپا ہوا لیکن بتکدۂ صفات سے الاماں کی صدائیں بلند ہونے لگیں یہ کیوں؟ اس لئے کہ الاماں اس وقت زبان پر آتا ہے جب ہستی یا جان خطرہ میں ہوتی ہے

اور چونکہ صفات کو اپنی ہستی یا اپنا وجود معرض خطر میں نظر آیا اس نے قدرتی طور پر صدائے الاماں ان کی زبانوں پر آگئی ۔

اب سوال یہ ہے کہ عاشق کی تو ہائے شوق سے صفات کی ہستی کیسے خطرہ میں پڑ گئی اس کا جواب یہ ہے کہ ۔

(ا) صفات نے دیکھا کہ اگر عاشق حریم ذات میں داخل ہو گیا تو پھر آئندہ ہماری طرف ملتفت ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا اور جب یہ حالت پیدا ہو جائے گی تو ہمارا وجود اور عدم برابر ہو جائے گا ۔

(ب) دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر عاشق حریم ذات میں داخل ہو گیا یعنی اگر ذات مخلوق پر ظاہر ہو گئی تو یہ ساری کائنات ہی ختم ہو جائے گی ایسی صورت میں بھی صفات کا وجود اور عدم یکساں ہو جائے گا ۔

اقبالؔ نے اس مطلع میں عشق شور انگیز کی شدت اور طاقت کا نقشہ کھینچا ہے لہٰذا اس شعر کو منطق کی کسوٹی پر نہیں پرکھنا چاہئے کیونکہ اس میں شروع سے لے کر آخر تک استعارہ ہی استعارہ ہے مراد اس سے یہ ہے کہ میں عاشق ذات ہوں اور اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ ذات تک رسائی ناممکن ہے لیکن اس کو کیا کروں کہ میری عالی ہمتی ذات سے کمتر کسی چیز سے ممکن نہیں ہو سکتی ۔

در دشت جنونِ من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

دوسری توجیہ یہ ہے کہ مومن کو اپنا آئیڈیل یعنی نصب العین اس قدر بلند رکھنا چاہئے جو حاصل نہ ہو سکے تاکہ وہ ساری عمر جدوجہد ہی میں بسر کر دے اور سکون نصیب ہونے کا امکان ہی باقی نہ رہے اسی لئے قرآن مجید نے مومنوں کو یہ حکم دیا کہ وہ اعلان کر دیں ۔

صِبْغَةَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً ۔

"یعنی اے لوگو! ہم نے تو اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگین کرلیا ہے اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے۔

یہ " صبغۃ اللہ " کوئی رنگ نہیں ہے بلکہ وہ بلند نصب العین (آئیڈیل) ہے جو مومن اپنے سامنے رکھتا ہے! اور بقول ہیگل یہ وہ آئیڈیل ہے جو

ہر وقت قابل حصول نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھو تو کبھی حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ بندہ لاکھ کوشش کرے خدا نہیں بن سکتا۔

دوسرا شعر :۔ اس شعر میں دو لفظ قابل غور ہیں۔ تخیّلات اور تجلّیات۔

(۱) تخیلات۔ تخیل کی جمع ہے۔ تخیل۔ باب تفعل سے ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں۔ خیال میں آنا۔

تخیل منطقی اصطلاح بھی ہے اور اس اعتبار سے اس کے معنی ہیں۔ ان صورِ جزئیہ ادراک جو خزانۂ خیال میں محفوظ ہیں یعنی جب نفس مدرک ان صور جزئیہ کا ادراک کرتا ہے جو بوساطت حواس خمسہ ظاہری خزانۂ خیال میں جمع ہو جاتی ہیں تو اس کیفیتِ ادراک کو تخیل کہتے ہیں۔

اقبالؔ نے اس لفظ کو اس شعر میں خیالات کے معنی میں استعمال کیا ہے اور خیال کی حقیقت یہ ہے کہ اس کا وجود صرف ذہنی ہوتا ہے۔ حور اور فرشتہ کو ہم حواس ظاہری سے محسوس نہیں کر سکتے لیکن ہمارے قوت متخیلہ ان کو وجود ذہنی عطا کر سکتی ہے یعنی ہم اپنے ذہن میں ان کا تصور کر سکتے ہیں۔

(۲) تجلّی بھی تخیل کی طرح باب تفعّل سے ہے اور اس کے لغوی معنی بہت روشن ہونا ہے اور باصطلاحِ صوفیہ شئے کے ظہورِ ثانی کو کہتے ہیں جو کسی خاص انداز سے واقع ہو چونکہ ساری کائنات صوفیہ کے نقطۂ نگاہ سے باری تعالیٰ ہی کی گوناگوں تجلیات سے عبارت ہے اس لئے وہ وجود حقیقی ہر مخلوق میں ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

ع ہر دم بلباسِ دگر آں یار بر آمد

ایک کوتاہ بیں کی نظر ان تجلیات میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور انہی کو وہ اصل سمجھنے لگتا ہے یا کم از کم ان تجلیات کا مستقل وجود تصور کرنے لگتا ہے لیکن حقیقت شناس نگاہ تجلیات کے پردہ میں نہیں رکتی بلکہ ان پردوں کو چاک کر کے شاہدِ حقیقت تک پہونچ جاتی ہے یا پہونچنے کی کوشش کرتی ہے شاعر نے تجلیات کے ان پردوں کے چاک ہو جانے کو خلل سے تعبیر کیا ہے۔

ع میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

یعنی شاعر خدا سے کہتا ہے کہ میں چونکہ عاشق ذات ہوں اس لئے میری قوت تخیلہ اس قدر زبردست ہوگئی ہے کہ حور اور فرشتہ اگرچہ مادی نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود وہ میرے تخیلات میں اسیر ہیں یعنی میں ان کی حقیقت کا ادراک کر سکتا ہوں۔ بالفاظ دگر وہ میری نگاہ میں بالکل نہیں بچتے۔ میرے عشق نے میرے ذہن کو اس قدر رفعت عطا کر دی ہے کہ میں حور اور فرشتہ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔

تیرے عشق کی بدولت میری نگاہ اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ تیری تجلیات سے پیدا شدہ یہ طلسمِ رنگ و بو جسے عرفِ عام میں عالم کہتے ہیں میرے لئے کوئی حقیقت یا معنی نہیں رکھتا۔ میری نگاہ کی حقائق بینی کا یہ عالم ہو گیا

ہے کہ اس کی وجہ سے تیری تجلیات میں خلل واقع ہو رہا ہے اس کی توضیح یہ ہے
کہ میں ہر تجلی میں صاحب تجلی کو دیکھتا ہوں یعنی ان تجلیات کے پس پردہ جو
بنیاد تخلیق عالم ہے اسے دیکھتا ہوں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک حسین وجمیل
شئے میرے سامنے آئی عام طور پر لوگ اس شئے کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں
جیسے زنانِ مصر حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر از خود رفتہ ہو گئی تھیں
لیکن تیرے عشق نے مجھے ایسا صاحب نظر بنا دیا ہے کہ میں مصنوع کو دیکھ کر
فوراً صانع کو دیکھنے لگتا ہوں میں اس عالم رنگ و بو پر قناعت نہیں کرتا
بلکہ اس کے بنانے والے کو دیکھتا ہوں اور یہ غور کرتا ہوں کہ جس ذات
نے ایسی حسین وجمیل شئے بنائی ہے وہ خود کتنی حسین وجمیل ہو گی۔ اسی خیال
کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

نقابِ زلف امکانش بچشم ما نظر بازاں
ندارد فائدہ رنگ وُرخش را بر ملا بینم

یعنی اس محبوب حقیقی نے اگرچہ عالم امکان کی زلفوں کو اپنے رُخ
کے لئے نقاب بنا لیا ہے لیکن ہم نظر بازوں کی نگاہ میں یہ نقاب افگنی بیکار
ہے کیونکہ میں پوشیدہ رنگ رُخ کو بر ملا دیکھ سکتا ہوں۔

چونکہ میری نگاہ تجلیات کے پردہ کو ہٹا سکتی ہے اور پس پردہ
حقیقت کا ادراک کر سکتی ہے اس لئے میری نگاہ سے تیری تجلیات میں خلل
ہو جاتا ہے تجلیات میں خلل واقع ہونے سے مراد یہ ہے کہ میری نگاہ تیری
تجلیات کے آر پار دیکھ لیتی ہے شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا جائے
تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اے خدا تیرے عشق کی بدولت میری نگاہ اس قدر تیز
ہو گئی ہے کہ تجلیات کے پردوں سے گذر کر تجھ تک پہونچ جاتی ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

تیسرا شعر:۔ اس شعر میں دو لفظ غور طلب ہیں جستجو اور فغاں۔ جستجو سے مراد ہے قوتِ فکر اور فغاں سے مراد ہے قوت ذکر۔ جستجو نتیجہ ہے فکر کا اور فغاں نتیجہ ہے ذکر کا اور انسان انہی دو قوتوں کے امتزاج کا نام ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اے خدا! اگرچہ انسان نے تیری جستجو کے سلسلہ میں مختلف طریقے اختیار کئے اور دیر و حرم۔ انہی مختلف طریقوں کے نام ہیں یعنی کسی نے تجھے دیر میں مقیم سمجھا۔ کسی نے حرم میں اور اختلاف مکان کی بدولت خیالات میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ دیر والوں نے کہا کہ تو حرم میں نہیں ہے اور حرم والوں نے یہ کہا کہ تو دیر میں نہیں ہے یعنی عقل کا نتیجہ اختلاف آراء کی شکل میں ظاہر ہوا۔

لیکن عشق نے (جو قوتِ ذکر کا ثمرہ ہے) اس اختلاف کو مٹا دیا۔ اور دونوں جگہ یکساں ہنگامہ برپا کر دیا۔ یعنی اسے دیر میں بھی تیرا ہی جلوہ نظر آیا اور حرم میں بھی تجھی کو جلوہ گر پایا۔ اسی خیال کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

عارف ہم از اسلام خراب است ہم از کفر
پروانہ چراغِ حرم و دیر ندا ند

پروانہ شمع پر عاشق ہے اس کا مطلوب شمع ہے جہاں شمع روشن ہو گی پروانہ ضرور اس کا طواف کرے گا اسی طرح عاشق دیر میں بھی اسی کا جلوہ دیکھتا ہے اور حرم میں بھی اسی کو جلوہ گر پاتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میرا جذبۂ عشق ذات سے کمتر کسی چیز سے راضی

نہیں ہوسکتا اور کعبہ وسومنات دونوں مظاہر صفات ہیں یعنی صفات کے آثار ہیں اس لئے عشق ان مادی امتیازات سے بالاتر ہوکر دونوں جگہ اسی کو دیکھتا ہے اور اسی کو پکارتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جستجو (عقل) امتیازات پیدا کرتی ہے لیکن فغان (عشق) ان امتیازات کو مٹا دیتی ہے نیز عقل سے دیر وحرم کی نقشبندی ہوسکتی ہے۔ ہنگامہ پیدا نہیں ہوسکتا۔

چوتھا شعر:۔ دلِ وجود سے مراد کائنات ہے اس جگہ وجود کو موجودات کے معنوں میں استعمال کیا ہے وجود۔ منطق میں بطور اصطلاح بھی مستعمل ہے لیکن یہاں اقبال نے اسے ہستی کے معنی میں استعمال کیا ہے ہر وہ چیز جو موجود ہے۔ وجود رکھتی ہے خواہ وہ وجود اصلی ہو یا نقلی اور خارجی ہو یا ذہنی۔ پس وجود پوری کائنات پر بولا گیا ہے۔

توہمات۔ توہم کی جمع ہے جس طرح تخیلات۔ تخیل کی۔ توہم بھی منطقی اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں۔ معانی جزئیہ کا ادراک کرنا لیکن اقبال نے اس لفظ کو اس جگہ اوہام باطلہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اس شعر میں اقبال نے توہمات کا لفظ بہت موزوں استعمال کیا ہے منطق اور فلسفہ سے ناواقف شاعر، اس جگہ "تخیلات" کا لفظ استعمال کرتا لیکن اقبال بہرحال فلسفی تھے اور فلسفی ایسی غلطی نہیں کرسکتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دلِ وجود کوئی صورتِ جزئیہ نہیں ہے بلکہ ایک معنی کلی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ معنی کلی کے ادراک کو تعقل کہتے ہیں اور معانی جزئیہ کے ادراک کو توہم کہتے ہیں اس لئے یہاں لفظ تخیل بالکل غیر مناسب ہوتا کیونکہ تعقل کی ضد توہم ہے نہ کہ تخیل۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی سرشت کے لحاظ سے ایسا ناقص اور محدود ہے کہ وہ صرف اپنی عقل کی مدد سے کائنات کی حقیقت دریافت نہیں کرسکتا لیکن عشق ایسی طاقت ہے کہ اس کی مدد سے وہ حقیقت سے آگاہ ہوسکتا ہے

اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان پر دو حالتیں طاری ہوتی ہیں کبھی تو اس کی نگاہ اس قدر تیز ہوجاتی ہے کہ وہ ضمیر کائنات یعنی کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے بالفاظ دگر کبھی تو اس کی نگاہ وجود کے آر پار گزر جاتی ہے۔ اور کبھی اپنے ہی پیدا کردہ توہمات میں الجھ کر رہ جاتی ہے یعنی وہم یا شک یا تردد یا گمان میں مبتلا ہوجاتی ہے۔

یہاں اقبالؔ نے وجدان (intuition) اور استدلال (reason) کا فرق ظاہر کیا ہے یعنی جب انسان پر عشق کا فیضان ہوتا ہے اور اس کیفیت کو وجدان سے تعبیر کرتے ہیں۔ تو وہ ہمہ بیں ہوجاتا ہے اور ایک آن میں ساری کائنات کو دیکھ لیتا ہے اور جب یہ کیفیت دور ہوجاتی ہے تو اس کے پاس صرف عقل رہ جاتی ہے اور عقل کا کام استدلال ہے اور استدلال میں غلطی ہوجاتی ہے نیز عقل خود اس میں نقص نکالتی ہے اور نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ انسان شک یا تردد یا وہم میں مبتلا ہوجاتا ہے اور آخر دم تک استدلال پر جازم اور راسخ اذعان پیدا نہیں ہوتا جسے منطق میں یقین اور شریعت میں ایمان کہتے ہیں۔ اسی لئے مرشد رومیؒ نے یہ فرمایا۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا! عقل انسانی کی حقیقت اس کے

سوا اور کیا ہے کہ وہ دن رات اپنے ہی پیدا کردہ توہمات میں گرفتار رہتی ہے
پیام مشرق میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

یہ تیرے عشق ہی کا فیض ہے کہ اس مشت خاک میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ کبھی کبھی اس کی نگاہ ردل وجود، کو چیر دیتی ہے یعنی حقیقت کا جلوہ دیکھ لیتی ہے شیخ سعدیؒ نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم
گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اقبالؒ نے خود اسی مضمون کو زبور عجم میں اس طرح بیان کیا ہے۔

می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے

نوٹ:۔ میں نے اس شعر کی تشریح میں وہم اور شک دو لفظ استعمال کئے ہیں ان سے منطقی مفہوم مراد ہے بلکہ وہ مفہوم جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے ان دو لفظوں کے منطقی معنی بالکل مختلف ہیں۔ شک کہتے ہیں۔ تردد کے ساتھ نسبت خبریہ کا ادراک کرنا علیٰ وجہ الحکایت۔ وہم کہتے ہیں۔ مرجوحیت کے ساتھ نسبت خبریہ کا ادراک کرنا علیٰ وجہ الحکایت۔

یعنی شک میں تردد کی کیفیت ہوتی ہے ہم غلط یا صحیح کسی پہلو کو ترجیح نہیں دے سکتے اس کے برخلاف وہم میں ترجیح کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ ظن بالیقین کے مرتبہ تک نہیں پہونچتا۔

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبالؒ نے تحلیل کے بجائے تحقیق کا نمونہ پیش

کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ شاعری زیادہ تر تخیل کا نام ہے اور شاعر عموماً اسی صفت سے کام لیتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ حکایت اور تحقیق سے بھی اپنے کلام کو مزیّن کر دیتا ہے۔

تخیّل۔ باب تفعیل سے ہے اور فعل متعدی ہے۔

(ا) لغوی معنی ہیں کسی چیز کو خیال میں لانا یا خیال میں ڈالنا خواہ اپنے خواہ دوسرے کے یہ لفظ وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں شئے کی حقیقت کچھ ہو لیکن اظہار کچھ مقصود ہو اسی لئے اس کے لغوی معنی میں دھوکہ کا تصور مضمر ہے اور یہی تخیل اور تخیّل میں بنیادی فرق ہے۔

(ب) شاعری کی اصطلاح میں تخیل کہتے ہیں۔ خیال آرائی یا خیال بندی کو۔

(ج) علم معانی کی اصطلاح میں تخیل کی تعریف یہ ہے کہ جب نفس مدرک نسبت خبریہ کا ادراک موضوع اور محمول کے درمیان صرف رابطہ ہونے کی حیثیت سے کرے اور اس کے حکایت ہونے کی حیثیت کو ملحوظ نہ رکھے تو اس کیفیت ادراکیہ کو تخیل کہتے ہیں۔

شاعری زیادہ تر تخیل پر مبنی ہے اگرچہ کبھی کبھی شاعر کا مقصد حکایت اور تحقیق بھی ہوتا ہے اس فرق کو مثالوں سے واضح کرتا ہوں، ملاحظہ ہو اقبالؔ کا یہ شعر۔

(ا) تخیل کی مثال۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی

تخیل کی مدد سے، شاعر دو چیزوں کے درمیان رابطۂ تام پیدا کر کے اپنی اور مخاطب کی قوت خیالیہ کے لئے تفنن طبع اور تفریح ذہن کے مواقع

چھپا کرتا ہے تخیل ہی کے دم سے شاعری کا بازار گرم ہے اور شعر کی محفل اسی کے وجود سے آراستہ ہوتی ہے۔

مثلاً شعر مذکورہ بالا پر غور کیجئے۔ شاعر کہتا ہے کہ اللہ والوں کی متاع دیں و دانش لٹ گئی۔

اس جملہ میں "متاع دین و دانش" موضوع ہے۔

"لٹ گئی" محمول ہے۔

شاعر نے یہ کہہ کر کہ متاع دین و دانش لٹ گئی۔ موضوع اور محمول میں ربط تام پیدا کر دیا ہے لیکن شاعر اس واقعہ یا حادثہ کو بطور حکایت یا بطرز اطلاع بیان نہیں کر رہا ہے یعنی شاعر کسی اخبار کا رپورٹر نہیں ہے وہ پبلک کو اس واقعہ کی اطلاع نہیں دے رہا ہے بلکہ اس کا مقصد اثر آفرینی ہے یعنی موضوع اور محمول کے ارتباط سے جو اثر شاعر کے دل و دماغ پر مرتب ہوا ہے اس کا اظہار کر کے شاعر اپنے ہر مخاطب کو اس اثر سے متاثر کرنا چاہتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تاثرات قلبی کے اظہار کا مقصد حکایت یا اطلاع نہیں بلکہ اثر آفرینی ہے اور اسی کو شاعرانہ اصطلاح میں تخئیل کہتے ہیں۔

اب حکایت اور تحقیق کی مثال پیش کرتا ہوں یعنی وہی شعر جس کی شرح کر چکا ہوں، وہی حکایت اور تحقیق کی بھی ایک عمدہ مثال ہے۔

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

"میری نگاہ تیز" موضوع ہے۔

"دلِ وجود چیر گئی" محمول ہے۔

یعنی میں وجود کی حقیقت سے آگاہ ہو گیا۔

اب دوسرے مصرع کو لیجئے۔

"گاہ مری نگاہِ تیز" موضوع ہے۔

"تو ہمات میں اُلجھ کے رہ گئی" محمول ہے۔

الغرض شعر میں موضوع ایک ہے محمول دو ہیں۔

شاعر کا مقصد موضوع کے ساتھ ان دونوں محمولوں کو مرتبط کرنا ہی نہیں ہے یعنی محض ارتباط کا اظہار نہیں ہے بلکہ شاعر ایک حقیقت نفس الامری کی حکایت کرنا چاہتا ہے یا مخاطب کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ انسان کی باطنی حالت کبھی یکساں نہیں رہتی کبھی وجدان کی بدولت وہ اس قدر اونچے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وجود کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے اور کبھی یہی انسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ایک معمولی مسئلہ میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔

الغرض یہ شعر تخیل کے بجائے حکایت اور تحقیق کی ایک عمدہ مثال ہے اور چونکہ بلند پایہ شعراء کے کلام میں تخیلی اور تحقیقی دونوں قسم کے اشعار ہوتے ہیں اس لئے میں نے اس شعر کے ضمن میں ان دونوں میں فرق بیان کر دیا تاکہ بالِ جبریل کا مطالعہ کرتے وقت شائقین خود تمیز کر سکیں کہ فلاں شعر تخیلی ہے اور فلاں شعر تحقیقی ہے۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر کے اسلوب بیان میں بڑی بے ساختگی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے کلام میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے اگرچہ خدا سے تخاطب کے وقت یہ محاورہ خلافِ ادب معلوم ہوتا ہے لیکن ایک شاعر کو اس باب میں معذور سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کا مقصد مخاطب کو اپنے جذبات اور احساسات کی شدت سے مطلع کرنا ہوتا ہے اور اس لئے وہ اس

لفظ یا محاورہ کے استعمال پر مجبور ہو جاتا ہے جس سے اس کا یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ اس اصول شکنی کو مراعاتِ شاعرانہ یا Poetic Licence کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کا راز ہے چنانچہ اقبال نے ضرب کلیم میں صاف لفظوں میں آدم کو خدا کا راز قرار دیا ہے۔

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

اس میں یہ "راز" کی کیفیت کیسے پیدا ہوئی؟ اس طرح کہ وہ نہ روح ہے نہ بدن ہے۔

اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجود حضرتِ انسان نہ روح ہے نہ بدن

تو پھر ہے کیا؟ بظاہر ان دونوں کا مجموعہ لیکن بہ باطن ان دونوں سے بھی ماوراء۔ اگر انسان روح اور بدن کے مجموعہ کا نام ہوتا تو پھر گھوڑا انسان کیوں نہیں ہے؟ روح اور بدن تو اس کے پاس بھی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ انسان میں روح اور بدن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جو کسی حیوان میں نہیں وہ کیا ہے؟ کہنے کو تو وہ نفس ناطقہ ہے جس کی بدولت انسان تمام حیوانات سے جداگانہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ نفس ناطقہ کیا ہے؟ بالفاظ دگر "انا" کیا ہے؟ یہی تو وہ جوہر ہے جس کی بدولت انسان میں شعور کے علاوہ شعور ذات بھی پایا جاتا ہے اسی کو اقبال نے خدا کا راز قرار دیا ہے۔

اب میں اس شعر کا مطلب بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں بظاہر

اس شعر سے استعجاب کا رنگ ٹپکتا ہے کہ اے خدا! تو نے یہ کیا کیا کہ مجھ کو بھی شامل کر دیا لیکن دراصل شاعر اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ اے خدا مجھے پیدا کر کے تو نے اپنے آپ کو آشکارا کر دیا۔

واضح ہو کہ انسان اس کائنات میں اللہ کا مظہر تام ہے اس کے اندر روح اور بدن کے علاوہ ایک اور جوہر بھی ہے جسے اَنَا (Ego) سے تعبیر کرتے ہیں یہ انائے مقید دراصل انائے مطلق (Ultimate Ego) کا پرتو ہے۔ اسی لئے اس میں الوہیت کا رنگ نظر آتا ہے اور جو شخص اس کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے وہ خدا کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے چنانچہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ اس پر شاہد ہے یعنی جس نے اپنے نفس ناطقہ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ یا جسے اپنے نفس ناطقہ کی معرفت حاصل ہو گئی گویا اسے خدا کی معرفت حاصل ہو گئی کیونکہ انائے مقید انائے مطلق سے جدا نہیں ہے لیکن وہ اس کا عین بھی نہیں ہے۔

اس کی مثال انسانی بصارت سے مل سکتی ہے یعنی بصارتِ زید عین زید نہیں ہے بلکہ اس کی صفت ہے اور صفت اور موصوف میں مغائرت ہوتی ہے لیکن زید کی بصارت نہ عین زید ہے نہ غیر زید۔

اسی حقیقت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

خودی کا سرِّ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔

تلوار کی دھار تلوار تو نہیں ہے لیکن تلوار سے جدا بھی نہیں ہے دھار نہ ہو تو تلوار بیکار ہے اور تلوار نہ ہو تو دھار کس چیز کے ساتھ قائم ہو گی اسی حقیقت کو زبور عجم میں یوں بیان کیا ہے۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

یعنی خدا اور خودی دونوں میں ایسی آشنائی ہے کہ ایک کو پالینے سے دوسرے کو بھی پا سکتے ہیں۔ بالفاظ دگر دونوں لازم و ملزوم ہیں چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں۔

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی — کہ او پیداست او زیر نقابی
تلاش خود کنی جز او نہ بینی — تلاش او کنی جز خود نیابی

غالباً اقبال نے نظریۂ وحدۃ الوجود کی تشریح اس سے بہتر خود اقبال کے کلام میں اور کسی جگہ نہیں مل سکتی۔

عراقی نے اپنے اس مشہور شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان خدا کا راز ہے اور خدا نے انسان کو پیدا کر کے خود اپنا راز فاش کر دیا۔ خدا خود انسان کے اندر پوشیدہ ہے۔ باہر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چوں خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردند

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ جلّ جلالہٗ کے کمال تخلیق نے قدرت ظہور میں انسان کو پیدا کر کے خود اپنی انا کو فاش کر دیا یا اپنی حقیقت ظاہر کر دی حالانکہ کائنات میں سب سے بڑا راز یہی تو تھا کہ انائے مطلق، انائے مقید کی شکل میں کیسے ظاہر ہو گیا؟ فلسفہ تصوف کی اصطلاح میں اس کو تنزّل ظہور سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب انائے مطلق جسے ہندو فلسفہ کی اصطلاح میں "نرگن نرا کار" کہتے ہیں اس بات پر متوجہ ہوا کہ اپنے

آپ کو کائنات پر ظاہر کر دے تو اس نے عدمات پر اپنی تجلّی فرمائی ان عدمات میں مختلف مراتب کی استعدادیں موجود تھیں چنانچہ انسان میں خدا کا مظہر اتم ہونے کی استعداد تھی پس ساری کائنات جو بلحاظ حقیقت عدم ہے اس کی تجلّی سے جگمگا اٹھی اور ہر شے اس کی مظہر بن گئی اور انسان اس کا مظہر تام بن گیا جس طرح جب آفتاب کی تجلّی ذرات پر ہوتی ہے تو ریگستان کے تمام ذرے جگمگا اٹھتے ہیں اور ہر ذرّے میں اسی کا پرتو نظر آتا ہے اور آفتاب اگر اپنی تجلّی روک لے تو سب تاریک ہو جاتے ہیں اسی طرح انسان کی حقیقت تو عدم ہے لیکن جب اس پر اللہ نے تجلّی فرمائی تو مظہر ذات بن کر چمکنے لگا لیکن یہ چمک اس کی ذاتی صفت نہیں ہے۔ بیدؔل نے کیا خوب کہا ہے۔

عکس افتادہ بہ آئینۂ ہوشش[1]
گل تواں گفت ولے چیدن نیست

اسی لئے اقبالؔ نے انسان کو "طلسم بود و عدم" سے تعبیر کیا ہے کہ اس کی حقیقت کچھ نہیں ہے یعنی اس کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ خدا نے جو موجود حقیقی ہے اسے خلعتِ وجود سے سرفراز کر دیا یعنی اس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے بلکہ ظلّی ہے۔

اب اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے نظریہ وحدۃ الوجود

---

[1] یعنی انسان کے آئینۂ ہوش پر صفت وجود کی تجلّی ہوئی انسان موجود ہو گیا آپ اسے "پھول" کہہ سکتے ہیں لیکن شاخ سے توڑ نہیں سکتے کیونکہ اس کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے وہ تجلّی کی بدولت موجود ہے اگر تجلّی رک جائے تو وہ معدوم ہو جائے گا۔

کی تشریح کردوں تاکہ ناظرین کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

نظریۂ وحدۃ الوجود کی انتہائی شکل یہ ہے کہ "خارج میں صرف ایک "ذات" موجود ہے اور بس۔ اور وہ ذات حق تعالیٰ ہے۔ اب رہی یہ کائنات تو اس کی اصلاً کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ موہوم ہے لفظ موہوم کی تشریح یہ ہے کہ بعض اوقات اندھیری رات میں انسان کو کسی رسی پر سانپ کا یا کسی جھنڈ پر انسان کا شبہ ہو جاتا ہے لیکن جب وہ نزدیک جا کر دیکھتا ہے تو وہاں نہ سانپ کا وجود ہوتا ہے نہ انسان کا۔

اس طبقہ کے لوگ کائنات کو کبھی کبھی "ظل" سے بھی تعبیر کر دیتے ہیں لیکن ظلّی وجود سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ظل (سایہ) کا وجود صرف حس کے مرتبہ تک ہے یعنی بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کائنات (ΦΕΝΟΜΕΝΑ) موجود ہے۔ دراصل نفس الامر یا خارج میں عدم محض ہے جس طرح شعلۂ جوالہ کہ بظاہر ایک حلقۂ آتشیں نظر آتا ہے لیکن اگر گردشِ دست ختم ہو جائے تو معاً اس حلقہ کا حسّی وجود بھی ختم ہو جائے گا۔

اسی طرح یہ کائنات تجلّیِ صفات کا کرشمہ ہے تجلیات گوناگوں سے تعینات بوقلموں نظر آرہا ہے اگر تعینات کا سلسلہ رک جائے تو یہ کھیل ایک آن میں ختم ہو جائے گا بالکل اسی طرح جس طرح اگر پردۂ فلم اور لائٹ کے درمیان سے ریل (RLILS) کے تعینات کو ہٹا دیا جائے تو پردہ پر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا جس طرح پردہ فلم پر تماشائیوں کو دو گھنٹے کے لئے عورتیں اور مرد "کام" کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جب مسٹر او پنہیر سوئچ آف کر دیتے ہیں تو تماشا ختم ہو جاتا ہے بس اسی طرح سنسار پردہ فلم ہے۔ بنی آدم، ایکٹر اور ایکٹریس ہیں۔

الیشور ۔ اوپر یشر ہے :

اسی لئے ویدانت میں سنسار کو الیشور کی لیلا (کھیل) سے تعبیر کیا گیا ہے اور میری رائے میں یہ اس نظریہ کی بہترین تعبیر ہے یعنی اس نظریہ کو واضح کرنے کے لئے اس سے بہتر تشبیہ ناممکن ہے۔

القصہ تعینات نے ہم سبھوں کو فریب میں مبتلا کر دیا ہے ورنہ کچھ بھی نہیں ہے صرف وہی وہ ہے اسی مضمون کو حضرت خواجہ میر درد نے کیسے خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے۔

پردہ کو تعین کے در دل سے ہٹا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

یہ ہے وحدۃ الوجود کا وہ انتہائی نظریہ جس کو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۰ھ نے اپنی پوری دماغی قابلیت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا ہم اس نظریہ کو شنکر اچاریہ کے فلسفہ کا عربی میں ترجمہ کہہ سکتے ہیں ستر ہویں صدی میں سپنوزا اور انیسویں صدی میں ہیگل (یہی تھا) اس فلسفہ کا سب سے بڑا شارح گذرا ہے۔

اقبالؔ وحدۃ الوجود کی اس تعبیر کے مخالف ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شیخ اکبر شنکر اچاریہ ہیگل اور ان سب کے مرشد اولین افلاطون پر تنقید کی ہے۔ اقبالؔ کی نظر میں یہ کائنات موہوم نہیں ہے بلکہ موجود ہے لیکن اس کا وجود حقیقی نہیں۔ بلکہ ظلی ہے۔

اقبالؔ اس باب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مقلد اور خوشہ چیں ہیں اور حضرت موصوف کا فیصلہ اس طائفہ کے باب میں یہ ہے کہ۔

ہر چند ایں طائفہ نیز واصل و کامل اند اما قلیل را سختاں ایشاں

بضلالت والحاد رہنمونی کرد و بزندقہ رسانید !

(اقتباس از مکتوب ۴۳ بنام مولانا یار محمد بدخشی طالقانی جامع مکتوبات شریف۔

یعنی اگرچہ یہ طائفہ بھی واصل اور کامل ہے لیکن افسوس کہ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے جو الفاظ استعمال کئے انہوں نے بنی آدم کو گمراہی اور الحاد میں ڈھکیل دیا اور زندقہ میں گرفتار کر دیا۔

نظریہ وحدۃ الوجود کی اعتدالی صورت ([illegible]) یہ ہے کہ حقیقی وجود تو حق سبحانہ ہی کا ہے اور یہ کائنات اس وجود حقیقی کا (جو واحد ہے) ظل ([illegible]) ہے لیکن یہ ظل موہوم یا دھوکہ (فریب نظر) نہیں ہے بلکہ خارج میں موجود ہے یہ کائنات اگرچہ ہے ظلی لیکن اس ظل کے وجود میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ ظل اصل کے طفیل سے قائم ہے اگر خدا نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی کائنات میں جو کچھ موجود ہے اس کی تجلی کی بدولت موجود ہے ہر شئے میں اسی کا جلوہ ہے ہر موجود اسی ذات واحد کا مظہر ہے چیونٹی ہمارے زاویۂ نگاہ سے کتنی ہی حقیر سہی لیکن مظہر صفات باری ہونے کے لحاظ سے حضرت انسان سے فروتر یا کمتر نہیں ہے اس نظریہ کو وحدت شہود بھی کہتے ہیں۔

ع ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ وحدۃ الوجود کی یہ وہ تعبیر ہے جس کو حضرت مجدد الف ثانی نے پیش کیا ہے اور اقبالؔ اسی مسلک کے پیرو ہیں سہولت کی خاطر ہم دونوں بزرگوں کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کئے دیتے ہیں۔

حضرت ابن عربیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اس باب میں متفق ہیں

کہ حقیقی وجود صرف ایک ہی ہے جسے مناطقہ واجب الوجود اور صوفیہ حق کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات اس باب میں بھی متفق ہیں کہ یہ کائنات حق تعالیٰ کی صفات کا ظل ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ

حضرت ابن عربیؒ۔ اس ظل کو موہوم قرار دیتے ہیں۔

حضرت مجددؒ صاحبؒ۔ اس ظل کو موجود قرار دیتے ہیں۔

میں نے ساری بحثوں کا خلاصہ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ اگر ان دو لفظوں کا فرق ذہن نشین نہ ہو سکے تو ناظرین پھر تفصیل کی طرف رجوع کریں۔ پھر انشاء اللہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے اپنے کلام میں جہاں جہاں وحدۃ الوجود کی تردید کی ہے تو وہاں انہوں نے حضرت ابن عربیؒ کے نظریہ یا ان کی تعبیر کی تردید کی ہے ورنہ دوسری قسم (پیش کردہ حضرت مجدد) کے وحدۃ الوجود سے ان کا سارا کلام لبریز ہے اور ایسا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ خود قرآن ببانگِ دُہل اعلان کر رہا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔

(۵۷/۳) یعنی وہی خدا سب سے پہلا اور سب سے پچھلا اور باہر اور اندر ہے اور وہ خدا سب کچھ جانتا ہے۔

اس جگہ میں نے قصداً اختصار سے کام لیا ہے انشاء اللہ جب میں اقبالؔ اور تصوّف پر ایک مستقل کتاب لکھوں گا اس وقت اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کروں گا۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

⁂ ⁂ ⁂

پہلی غزل پر عمومی تبصرہ

غور سے دیکھو تو پوری غزل وحدۃ الوجود کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے پہلے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا کے عشق میں گرفتار ہے اور اس کے فراق میں "نوائے شوق" پر مجبور ہے۔

(۱) عشق میں کیوں گرفتار ہے؟ اس لئے کہ "کند ہم جنس با ہم جنس پرواز" والا معاملہ ہے انسان کا خدا سے عشق کرنا ہی دلیل ہے اس بات کی کہ انسان کی اصل "خاکی" نہیں ہے۔ اقبال نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو

(۲) نوائے شوق" دلیل ہے اس بات کی کہ عاشق کو یہ صحبتِ آب و گل پسند نہیں آتی اس لئے وہ محبوبِ حقیقی کی ملاقات کا آرزومند ہے اور یہ بالکل فطری امر ہے۔ کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ۔ ہر شئے اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ مرشد رومیؒ نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگارِ وصل خویش

ہر شخص جو اپنی اصل سے دور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی اصل سے ملاقات کا آرزومند رہتا ہے بلکہ ملاقات کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

دوسرے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص "جمالِ ذات" پر عاشق ہوتا ہے حور و فرشتہ اس کی نگاہ میں نہیں جچتے بلکہ اس کی نگاہ اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ تجلیاتِ الٰہیہ میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

تیسرے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ عشق انسان کو اس قدر بلند کر دیتا ہے کہ وہ کعبہ اور سومنات دونوں میں اسی کا جلوہ دیکھتا ہے اور اس لئے دونوں جگہ ہنگامہ برپا کر سکتا ہے۔

چوتھے شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان پر الوہیت کا غلبہ ہوتا ہے تو اپنے وجدان کی بدولت ساری کائنات کو ایک آن میں دیکھ لیتا ہے اور جب مادیت کا غلبہ ہوتا ہے تو عقل سے کام لیتا ہے اور عقل کا کام ہی سلوک پیدا کرنا ہے اس کی عقل خود ہی باری تعالیٰ پر دلیل قائم کرتی ہے اور خود ہی اس کو توڑ دیتی ہے اقبال نے اسی لئے تو ہمیں تنبیہ کی ہے۔

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل
بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است

اور اسی لئے اکبر نے یہ کہا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

پانچویں شعر کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا کا راز ہے خدا نے انسان کو فاش کر کے اپنا راز ظاہر کر دیا۔ اس پر حسب ذیل آیت قرآنی شاہد ہے۔

نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ یعنی ہم اس سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

اقبال نے اس حقیقت کو زبورِ عجم، جاوید نامہ، اور ارمغان حجاز میں

مختلف پیرایوں سے واضح کیا ہے اور ارمغان حجاز میں تو بالکل ہی وضاحت کردی ہے۔

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز	بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی	خودی را فاش تر دیدن بیاموز

یعنی اگر خدا کو دیکھنا چاہتے ہو تو خودی کو دیکھنا سیکھو وحدۃ الوجود کی تعلیم یہ ہے کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ اب اس تعلیم کو خود اقبال کی زبان سے سنئے۔ رباعی برص ۶

تو اے ناداں دل آگاہ دریاب	بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند ایں راز را فاش	ز لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ دریاب

اس رُباعی کا چوتھا مصرع حدِّ ادب سے متجاوز ہو گیا ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلی غزل کے آخری شعر کی توضیح میں بیان کیا ہے شاعروں کو اس قسم کی مراعات حاصل ہوتی ہیں کہ وہ بارگاہ احدیت میں کبھی کبھی گستاخی کرلیں جہاں تک الفاظ کے ظاہری مفہوم کا تعلق ہے بیشک تجلی کی صفت کو جناب احدیت سے منسوب کرنا شوخی ہے۔

بات یہ ہے کہ شاعری اثر آفرینی کا نام ہے شاعر دانستہ ایسا اسلوبِ بیان اختیار کرتا ہے کہ اس کا مفہوم واضح بھی ہو جائے اور پڑھنے یا سننے والے کے دل میں بھی اتر جائے چونکہ شاعر کی نیت نیک ہوتی ہے اس لئے ہم اس کے الفاظ سے تعرض نہیں کرتے بلکہ اپنی توجہ اس مقصد پر مرکوز کر دیتے ہیں جو شاعر کے پیش نظر ہوتا ہے۔ آئیے اب اس مقصد سے آگاہی حاصل کریں۔

دراصل اقبال نے اس رباعی میں ایک عظیم الشان حقیقت کو

شاعرانہ انداز میں واضح کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا کی تخلیق اس نہج پر ہوتی ہے کہ اس میں مصلحت ایزدی کی بنا پر اکثر حوصلہ مند افراد کی آرزوئیں ان کی خواہش کے مطابق پوری نہیں ہوتیں اکثر اُمنگیں ساری عمر سینہ ہی میں مدفون رہتی ہیں۔ مثلاً

ایک شخص علم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اسے مواقع حاصل نہیں ہوتے یا ایک شخص کسی فن میں مہارتِ تامّہ حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اسے مہارت میں وہ مقام حاصل نہیں ہوتا جس کا وہ آرزومند ہے۔ غالبؔ نے اس مشہور شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

یہاں ارمان سے مراد مادّی نفسانی اور سفلی خواہشات بھی ہو سکتی ہیں اور روحانی عقلی اور علوی تمنائیں بھی بہرحال جو مفہوم چاہو اختیار کر لو حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ ہر زمانہ میں ہزاروں اس حالت میں رخصت ہو جاتے ہیں کہ انہیں تکمیل آرزو کے ذرائع یا تو میسّر نہیں آتے اور اگر آتے ہیں تو بقدر آرزو نہیں آتے۔

اقبالؔ نے شاعرانہ انداز میں جذبات انسانی کی ترجمانی کی ہے یعنی خدا سے یہ پوچھا ہے کہ اے خدا! کیا تیرے شیشہ میں مے باقی نہیں رہی؟ کیا تیرا خزانہ خالی ہو گیا! کیا تو میرا ساقی (خالق اور رازق) نہیں ہے؟ تیرا شیشہ تو خالی ہو نہیں سکتا۔ یقیناً تیرا خزانہ معمور ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہو سکتی اور یقیناً تو میرا ساقی یعنی خالق اور رازق بھی ہے جب یہ دونوں باتیں مسلّم ہیں پھر یہ کیا بات ہے کہ بعض اوقات بعض افراد کے پاکیزہ ترین ارادے بھی

پورے نہیں ہوتے! ان کی بہترین تمنائیں تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں کیا سلطان ٹیپو شہید کی تمنا لائق تحسین نہ تھی؟ کیا وہ اسلام کی سربلندی کا طالب نہ تھا؟ پھر کیا بات ہے اس کا شمار سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمرہ میں نہ ہو سکا۔ کیا سلطان شہید کے سر میں اسلام کا سودا نہ تھا؟ پھر وہ کیوں کامیاب نہ ہوا۔

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انہیں تبلیغ دین کے بیش از بیش مواقع حاصل ہوں لیکن کم از کم حاصل ہوتے ہیں بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انہیں قارون کا خزانہ مل جائے تاکہ وہ اسلام کی اشاعت پر صرف کر سکیں لیکن انہیں بمشکل قوت لایموت حاصل ہوتی ہے یعنی سمندر سے پیاسے کو صرف چند بوندیں نصیب ہوتی ہیں قصور معاف ہو یہ رزاقی تو نہیں ہے اسے تو بخیلی کہتے ہیں۔

اس لفظ بخیلی کو ایک مستقل لفظ کی حیثیت سے مت دیکھو بلکہ اس مقصد کی روشنی میں دیکھو جو شاعر کے پیش نظر ہے تو یہ گستاخی نہیں ہے بلکہ ایک شاعرانہ انداز بیان ہے یا ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ وگرہیچ۔

دوسرا مطلب اس رباعی کا یہ ہے کہ اے خدا تو نے مجھے اپنی محبت عطا فرمائی یہ تیرا بڑا کرم ہے لیکن تو نے اپنی محبت کا صرف ایک جام پلایا اور میری فطرت متقاضی ہے اس امر کی کہ کسی منزل پر بس نہ کروں تو دمے جائے میں پئے جاؤں یہاں تک کہ میں ماسوا سے بیگانہ ہو جاؤں۔

لیکن تیرا طرز عمل کیا ہے؟ ایسا کہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ سمندر سے پیاسے کو صرف دو چار قطرے نصیب ہوئے اگر کوئی پیاسا سمندر کے پاس اپنی پیاس بجھانے جائے اور سمندر اسے صرف دو چار قطرے دے تو

کیا وہ شخص بیساختہ یہ نہیں کہہ اٹھے گا کہ بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے۔
خلاصہ کلام یہ ہے کہ اقبال عشق الٰہی کی انتہا چاہتے ہیں۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

لیکن صورت یہ ہوئی کہ محبوب نے صرف ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھنے کے بعد تغافل اختیار کر لیا اس لئے عاشق نے بے اختیار ہو کر اس تغافل کا شکوہ کیا اب اگر آپ اس شعر کو منطق کی ترازو میں تولنا چاہتے ہیں تو شوق سے اقبال پر گستاخی کا الزام عائد کر لیجئے۔ میں کوئی ڈیفنس پیش نہیں کروں گا۔

دوسری غزل

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا
محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

؟

اس غزل کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مسلسل ہے، ہر شعر میں خدائے تعالیٰ سے خطاب ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بظاہر اقبالؔ نے ہر شعر میں خدا سے سوال کیا ہے لیکن بباطن مشیتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلوبِ بیان بہت دلکش اور موثر ہے

اردو ادب میں اس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اقبال نے اس غزل کی جو ردیف قائم کی ہے۔ تیرا ہے یا میرا؟ وہ اقبال کے بنیادی فلسفہ کی آئینہ دار ہے یعنی خدا کی ہستی کے ساتھ ساتھ خودی کا اثبات بھی کر دیا ہے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ پانچ شعر کی غزل میں فلسفہ اور مذہب کے بعض اہم مسائل کی طرف اشارہ کر دیا ہے مثلاً!

(۱) انجم (بنی آدم) کی کجروی۔

(۲) لامکاں کا عشق سے خالی ہونا۔

(۳) انکار ابلیس اور اس کا سبب۔

(۴) حرف شیریں (جذبۂ عشق) کی کار فرمائی۔

(۵) اہمیت وجودِ آدم۔

یہ وہ مسائل ہیں جن پر حکماء اور علماء نے مبسوط کتابیں لکھی ہیں اقبال کا کمال یہ ہے کہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

غزل کا تعارف یہ اشعار، حقیقت حال یہ ہے کہ شاعرانہ انداز بیان کی بہترین مثال ہیں۔ انسان طبعاً غور و فکر پر مجبور ہے۔ چنانچہ جب وہ کائنات کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی پر غور کرتا ہے جب وہ اہل کائنات کی زندگیوں پر نظر کرتا ہے تو اپنے زاویۂ نگاہ سے اسے بعض امور میں نقائص نظر آتے ہیں اور وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس نازک مرحلے پر اقبال بنی آدم کو از سر نو دعوت غور و فکر دیتے ہیں کہ یا تو یہ کائنات ایک غیر مرتب اور غیر منظم شئے (chaos) ہے یا ایک مرتب اور منظم (cosmos) شئے ہے۔

اگر یہ غیر مرتب ہے تو تمہارا اعتراض فضول بلکہ خارج از بحث ہے کیونکہ جب کوئی علیم و حکیم ہستی اس کی بنانے والی ہی نہیں تو اس میں ترتیب اور نظم کہاں سے اور کیسے پیدا ہوتا ہے لیکن اگر اس میں نظم اور ترتیب پائی جاتی ہے اگر اس میں قوانین اور ضوابط کار فرما ہیں تو پھر اس کو ضرور کسی حکیم و علیم ہستی نے بنایا ہے چونکہ کائنات میں ہر جگہ قوانین کی حکومت ہے اس لئے یقیناً دوسری صورت صحیح ہے اگر تم کو اس میں نقائص یا خوبیاں نظر آتی ہیں تو یہ خود تمہاری ناقص اور محدود عقل کا قصور ہے یا اگر یہ کائنات تمہاری مرضی کے خلاف نہیں ہے تو یہ بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس کائنات کا بنانے والا تم سے زیادہ دانشمند ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو وہ خدائی کے لائق نہیں ہے اور اگر وہ تم سے زیادہ دانشمند ہے تو تمہیں اس کے افعال پر نکتہ چینی کا حق نہیں ہے دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ تم سے مشورہ کرتا تو دوسرے یہ اعتراض کرتے کہ ہم سے مشورہ کیوں نہیں کیا؟ اور اگر وہ سب سے مشورہ کرتا تو اختلاف آراء کی صورت میں کس کے مشورہ پر عمل کرتا! نتیجہ یہ نکلتا کہ کائنات ہی پیدا نہ ہو سکتی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ یہ کائنات خدا نے اپنی مرضی اور اپنی مصلحت کے مطابق بنائی ہے اور انسان کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے وہ اپنی حقیقت کو نہیں جانتا۔ کائنات کی حقیقت کو کیا سمجھ سکتا ہے۔

وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلاً ۔

دنیا کے تمام حکماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان اپنی عقل کی بدولت صرف مظاہر (APPLREAKCE) کو جان سکتا ہے حقائق (R<TY) کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔ علم حقائق کا ذریعہ عقل نہیں ہے بلکہ وجدان (

ULTIUNAL (۱۹) ہے اور یہ طاقت عشق[۲] کی بدولت انسان میں پیدا
ہوسکتی ہے اور عشق فقر[۳] کا ثمر ہے اور فقر مرشد کامل[۴] کی صحبت سے پیدا ہوسکتا
ہے اسی لئے اقبال نے ہر کتاب میں مرشد کامل کی صحبت اختیار کرنے کا
مشورہ دیا ہے چنانچہ ارمغان حجاز میں کہتے ہیں.

زرومی گیر اسرار فقیری | کہ آں فقر است محسود امیری
حذر زاں فقر و درویشی کہ از وے | رسیدی بر مقام سر بزیری

یہاں رومی سے دراصل مرشد کامل کی صحبت مراد ہے کیونکہ شان
فقر صرف صحبت مرشد سے پیدا ہوسکتی ہے. چراغ تو چراغ ہی سے جل سکتا
ہے دوسری کوئی صورت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ میں بزرگوں نے
اسی اصول پر عمل کیا القصہ صحبت مرشد سے وہ نگاہ پیدا ہوسکتی ہے جو
انسان کو حقائق اشیاء سے آشنا کرسکتی ہے اور اس کے بعد وہ فیصلہ
کرسکتا ہے کہ یہ دنیا اچھی ہے یا بری؟ پھر فرماتے ہیں.

خود بیگانہ ذوق یقین است | عمار علم و حکمت بد نشین است
دو صد بوحامد و رازی نیرزد | بنادانے کہ چشمش راہ بین است

یعنی جس شخص نے مرشد کی صحبت میں بیٹھ کر "چشم راہ بیں" پیدا کرلی
ہے خواہ وہ جاہل ہی کیوں نہ ہو لیکن سیکڑوں غزالی اور سیکڑوں رازی
اس ناداں (منطق اور فلسفہ سے بیخبر) کا مقابلہ نہیں کرسکتے کیونکہ منطق
انسان کو یقین کی دولت عطا نہیں کرسکتی۔

قصہ مختصر جب حقیقت یہ ہے کہ ہم عقل کے ذریعہ سے حقیقت کو نہیں
جان سکتے تو پھر ہمیں یہ اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں کہ ایسا کیوں ہے ویسا
کیوں نہیں؟ یعنی دنیا میں صحت کے ساتھ بیماری کیوں ہے؟ نیکی کے ساتھ

بدی ہے؟ وغیرہ ذالک ان اعتراضات کے ساتھ ہمیں اپنے عجز کا اعتراف کرنا مناسب ہے بلکہ اس کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہئے۔

بظاہر تو اس غزل میں "تیرا ہے یا میرا؟" کی تکرار ہے لیکن دراصل اقبال نے ہمیں اس پردہ میں تسلیم و رضا کا درس دیا ہے اور یہ درس دوسرے لفظوں میں حمد الٰہی ہی تو ہے۔ اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم اشعار کا مطلب لکھتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے اللہ! اگرچہ اس میں شک نہیں کہ انجم (ستارے) کجرو ہیں یعنی دنیا کے اکثر لوگ تیری مرضی پر نہیں چلتے یعنی صراط مستقیم پر چلنے کے بجائے شیطانی راستوں پر چل رہے ہیں لیکن مجھ کو اس بات پر اعتراض کا کوئی حق نہیں پہونچتا کہ تو نے یہ دنیا اس نہج پر کیوں بنائی ہے کہ یہاں ہر طرف فسق و فجور کی گرم بازاری ہے اور نیکوکاروں کی کہیں قدر و منزلت نہیں ہے یہ جہاں تیرا پیدا کردہ ہے میرا پیدا کردہ نہیں اور نہ اس کی تخلیق میں کسی انسان کے مشورہ کو دخل ہے اس لئے میں تیری مشیت کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔

انسان کا فرض یہ نہیں کہ وہ مشیت ایزدی پر اعتراض کرے بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ خالق کائنات کی مرضی پر چلے اور اپنی اصلاح کرے کیونکہ قیامت کے دن نہ اس سے دوسروں کے اعمال کی پرسش ہوگی اور نہ دریافت کیا جائے گا کہ یہ کائنات کس طرح پیدا ہوئی اور کس نہج پر اس کا کاروبار چلایا گیا؟ یہ سب باتیں عقل انسانی کی دسترس سے بالاتر ہیں اس نکتہ کو بلبل شیراز نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

دوسرا شعر :- اس شعر میں لفظ "لامکان" تشریح طلب ہے واضح ہو کہ لامکاں کی اصطلاح مناطقہ نے وضع کی ہے اور یہ لفظ مکاں کی نقیض ہے جیسے نابینا، بینا کی نقیض ہے۔ جیسے منطق سے ناواقف لوگ بینا کی ضد سمجھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت اس کی یہ بھی ہے کہ وہ ذات بے ہمتا مکان اور زمان میں نہیں ہے۔ چنانچہ شرح عقائد نسفی میں مرقوم ہے کہ "لَیْسَ لَہٗ مَکَانٌ وَلَا یَجْرِیْ عَلَیْہِ زَمَانٌ۔ تَعَالیٰ عَنِ الْجِھَاتِ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مکان یا مقام نہیں ہے اور نہ زمانہ اس پر جاری ہو سکتا ہے اور وہ جہات سے ماوراء ہے یعنی مکان کی قید میں نہیں ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ مکان کا تحقق جہاتِ ستّہ (چھ معروف سمتوں) سے ہوتا ہے اور جہات ستہ کا محدّد فلک تاسع (نواں آسمان) ہے اور زمان کا تحقق بھی اسی فلک تاسع کی حرکت سے ہوتا ہے کیونکہ زمانہ اسی محدّد جہات (فلک تاسع) کی حرکت کا نام ہے زمانہ کی تعریف فلسفہ میں یہ ہے۔ اَلزَّمَانُ ھُوَ کَمٌّ مُتَّصِلٌ غَیْرُ قَارٍّ مِقْدَارٌ لِلْحَرَکَۃِ۔ یعنی زمانہ، آنات کے تسلسل کا نام ہے جو متصل ہیں اور اس کے اجزاء مجتمعاً فرض نہیں کئے جا سکتے اور زمانہ مقدار حرکت فلک کی۔

اب چونکہ اللہ تعالیٰ فلک الافلاک سے بھی ماوراء بلکہ وراء الوراء ہے اس لئے نہ وہ مکان میں ہے نہ زمان میں۔

اقبالؔ شاعرانہ انداز میں اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں کہ اے خدا! اگر لامکاں میں تیرے عشاق موجود نہیں ہیں بالفاظ واضح تر اگر فرشتے تیرے عشق میں ہنگامہ ہائے شوق برپا نہیں کرتے تو یہ بات تیری مشیت کے عین مطابق ہے کیونکہ تو نے فرشتوں کے اندر عشق کا جذبہ ودیعت ہی نہیں کیا۔ دوسرے لفظوں میں اقبالؔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتے ہیں کہ اے خدا! یہ محض تیرا کرم ہے کہ تو نے انسان ضعیف البنیان کو اپنی محبت سے نوازا ہے اور وہ اس عالم میں جو مکان سے عبارت ہے تیری محبت میں ہنگامہ ہائے شوق برپا کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے یہ دنیا۔ دنیا بن گئی۔ ورنہ یہاں کسی قسم کی دلکشی نہ ہوتی اسی خیال کو اقبالؔ نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے۔

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

نہ کر تقلید اے جبریلؑ میرے عشق ومستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر وتسبیح وطواف اولیٰ

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبالؔ ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کر رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے کہ اس نے لامکان کو ہنگامہ ہائے شوق سے خالی رکھا ہے اور فرشتوں کے بجائے انسان کو اپنی محبت کی دولت عطا کی ہے اور اسی لئے انسان کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

تیسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! یہ صحیح ہے کہ ابلیس نے تیرے حکم سے سرتابی کی لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس میں انکار کی جرأت تیری ہی مشیت کی بدولت پیدا ہوئی تیری مشیت کا تقاضا یہی تھا کہ دنیا میں آدم

کے ساتھ ساتھ ابلیس کا وجود بھی کار فرما ہے اس لئے تو نے دونوں کو پیدا کیا اور ابلیس کو اختیار دیا کہ وہ جو راستہ چاہے اپنے لئے پسند کرے چنانچہ اس نے اپنی مرضی سے انکار کا راستہ اختیار کیا تو اگر چاہتا تو اسے انکار کی جرأت ہرگز نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس صورت میں اس کی آزادی سلب ہو جاتی علاوہ بریں تو اگر چاہتا۔ تو ایسی دنیا بھی پیدا کر سکتا تھا جس میں ابلیس کا وجود ہی نہ ہوتا لیکن تو نے اس صورت کو پسند نہیں کیا بہرحال میرا فرض تو تیری مشیت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اے خدا! اس میں شک نہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریلؑ اور قرآن حکیم یہ تینوں تیرے ترجمان ہیں یعنی تیری مرضی اہل دنیا پر ظاہر کرتے ہیں اور تیری مرضی وہ شریعت و دستور زندگی ہے جو تو نے قرآن حکیم کی صورت میں سرکار دو عالم کے واسطہ سے بنی آدم کیلئے نازل فرمائی ہے۔

لیکن یہ حرف شیریں یعنی یہ جذبۂ عشق و محبت جو انسان کے قلب میں موجزن ہے یہ بھی تو تیرا ہی ترجمان ہے یعنی یہ بھی تو تیرا ہی پیدا کردہ ہے اور ہم اسی جذبہ کے تحت بعض اوقات تیرے قوانین کو توڑ دیتے ہیں پس تو ہم پر نگاہ کرم فرما اور ہماری خطاؤں کو معاف کر دے۔

دوسرا مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ اے خدا! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبریلؑ اور قرآن حکیم یہ تینوں تیرے ترجمان ہیں یعنی دنیا والوں کے لئے تیری ہستی کا ثبوت ہیں لیکن یہ "حرف شیریں" یعنی یہ جذبۂ عشق میری ہستی کا ثبوت ہے۔

واضح ہو کہ انسان اسی جذبۂ عشق کی بدولت اللہ اور اس کے رسول کی جناب

کی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے ورنہ عقل کا تقاضا تو یہ ہے کہ انسان ان مقامات سے بکلی اجتناب کرے جہاں جان کا خطرہ ہو اسی حقیقت کو اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

پانچواں شعر:۔ اے خدا! تیری یہ دنیا آدم ہی کے دم سے آباد ہے اسی کی بدولت اس میں خوبصورتی اور رونق ہے اگر جذبہ عشق ختم ہو جائے تو آدم ختم ہو جائے گا اور زوال آدم خاکی میرا زیاں نہیں ہے بلکہ اس میں آپ ہی کا نقصان ہے کیونکہ جمادات نباتات اور حیوانات نہ آپ سے محبت کر سکتے ہیں اور نہ آپ کے نام پر سر کٹا سکتے ہیں یہ حوصلہ تو آدم ہی کا ہے کہ وہ آپ کے لئے سر بکف ہو کر نکلتا ہے اور اپنے خون سے آپ کی ہستی کا اثبات کر دیتا ہے چنانچہ رموز بیخودی میں اقبال نے اسی حقیقت کو یوں واضح کیا ہے۔

بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لاَ اِلٰہ گردیدہ است

یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا کے میدان میں اللہ کے قانون کو زندہ کرنے کے لئے اپنا سر کٹایا اور ایسا کر کے انہوں نے توحید الٰہی کو دنیا میں قائم کر دیا یعنی کوئی انسان اللہ کے سوا دوسرے انسانوں کی اطاعت نہیں کر سکتا۔

واضح ہو کہ اقبال نے جو یہ بات کہی ہے کہ زوال آدم خاکی میرا زیاں نہیں بلکہ تیرا زیاں ہے۔ یہ انہوں نے اپنی طرف سے نہیں کہی ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ کو شعر کے سانچہ میں ڈھال دیا ہے۔

قَالَ ابْنُ اِسْحٰقَ، ثُمَّ عَدَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

الصُّفُوفَ وَرَجَعَ إِلَى الْعَرِيْشِ فَدَخَلَهُ وَمَعَهُ فِيْهِ أَبُوْبَكْرٍ الصِّدِّيْقُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ لَيْسَ مَعَهُ فِيْهِ غَيْرُهُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَاشِدُ رَبَّهُ مَا وَعَدَهُ مِنَ النَّصْرِ وَيَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ الْيَوْمَ لَا تُعْبَدُ۔ (سیرۃ ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۶۷)

پھر سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے صفوں کو برابر کیا اس کے بعد آپؐ اپنے خیمہ کی طرف واپس ہوئے پھر اس میں داخل ہوئے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ داخل ہوئے۔ اور اس وقت اس خیمے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا اور کوئی شخص آپ کے ساتھ نہ تھا۔ آپؐ حالتِ جذب میں اپنے رب سے مناجات میں مشغول ہو گئے اور ان وعدوں کو یاد دلایا جو اللہ نے آپؐ سے فتح کے سلسلے میں فرمایا تھا پھر آپ نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا۔

اے خدا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج تباہ اور برباد ہو گئی تو (میرا تو کوئی نقصان نہیں) پھر تو قیامت تک نہ پوجا جا سکے گا۔ پھر کون اس دنیا میں یہ کہہ سکے گا کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ؟

اقبالؔ نے اس شعر میں اسی عظیم الشان صداقت کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ اے خدا! اس منوّر کی رونق محض آدم کے دم سے وابستہ ہے تیری دنیا اسی کوکب کی تابانی سے منوّر ہے۔ اگر جذبہ عشق زائل ہو جائے تو یہ کوکب تاریک ہو جائے گا اور زوالِ آدمِ خاکی سے آدم کا نقصان نہیں خود خالقِ آدم کا نقصان ہے۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

✤

تیسری غزل

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیطِ بے کراں میں ہوں ذرا سی آبِ جو
یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

اس غزل کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مطلع تغزل کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے یعنی حقیقت کی شراب، مجاز کی بوتل میں بھر کر پیش کی گئی ہے پہلی غزل کے مطلع میں "حریم ذات" کا لفظ آیا ہے جس سے پوری غزل نہیں تو مطلع میں یقیناً سنجیدگی پیدا ہو گئی ہے لیکن اس غزل کا مطلع "گیسو" کے لفظ سے شروع ہوتا ہے اور چونکہ یہ لفظ آن واحد میں محبوب کی تصویر کھینچ دیتا ہے اس لئے مطلع میں غضب کی دلکشی اور شوخی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شعروں میں ناز کے ساتھ "نیاز" کا رنگ بھی پایا جاتا ہے پہلی دو غزلوں میں عاشق (شاعر) نے اپنے محبوب سے کوئی التجا نہیں کی یعنی ان میں "ناز" کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن اس غزل کے اشعار میں آرزو، تمنا اور التجا کا انداز نمایاں ہے اگرچہ التجا کے انداز میں بھی شوخی کا رنگ پوشیدہ ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ علم معانی اور علم بیان دونوں کے اعتبار سے یہ غزل اقبال کی بہترین غزلوں میں سے ہے یعنی اس غزل کا ہر شعر مرصّع ہے چنانچہ میں اشعار کی شرح میں اس خوبی کی طرف اشارہ کروں گا۔

پہلا شعر :- اس شعر میں حقیقت اور مجاز دونوں رنگ موجود ہیں، اگر "گیسوئے تابدار" کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو اس کا مخاطب معشوق مجازی قرار پائے گا یعنی عورت لیکن سیاق سباق کلام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ شعر حمد باری میں ہے اس لئے ہم "گیسوئے تابدار" کو مجاز پر محمول کریں گے اور گیسو سے زلفیں مراد لینے کے بجائے صفات باری اور تابدار کرنے سے شدت تجلیات مراد لیں گے۔ اس تقدیر پر شعر کا مطلب یہ ہو گا کہ اے خدا! تو اپنی تجلیاتِ حسن اس شدت کے ساتھ مجھے دکھا کہ میں ان کے

جلووں میں سراپا غرق ہو کر ماسوئی سے بیگانہ ہو جاؤں

دوسرے مصرع میں "ہوش و خرد" اور "قلب و نظر" کی ترکیب غور طلب ہے ہوش سے مراد ہے شعور جو حواس خمسہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس شعور کی ترقی یافتہ صورت کو عقل سے تعبیر کرتے ہیں اور قلب سے مراد ہے قوت وجدان جو حواس خمسہ سے بے نیاز ہوتی ہے اور اس قوت کے ثمرہ کو نظر سے تعبیر کرتے ہیں۔ الغرض انسان کے اندر یہی دو خاص قوتیں ہیں عقل اور وجدان۔ اور اقبال نے ان دونوں کا ذکر اس مصرع میں کر دیا ہے مطلب یہ ہے کہ اے خدا! مجھے اپنی محبت عطا کر اور اس محبت میں اس درجہ مستغرق کر دے کہ میں عقل اور وجدان دونوں کو تیری یاد میں فنا کر دوں نہ اپنی عقل پر بھروسہ کروں نہ اپنے وجدان پر بلکہ تیری یاد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاؤں۔

ع تو ہو ترا جلوہ ہو اور گوشۂ تنہائی

اقبال نے اسی خیال کو فارسی میں یوں بیان کیا ہے۔

فرصت کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

اس جگہ اس شبہ کا ازالہ ضروری ہے کہ اگر ایک شخص خدا کی محبت میں ہوش و خرد اور قلب و نظر دونوں سے بیگانہ ہو جائے تو وہ خلافت دنیا الٰہیہ کے فرائض کیسے انجام دے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عورت کی محبت میں تو ایک انسان بلاشبہ عقل و نگاہ سے بیگانہ ہو کر انسانیت کے مقام سے گر جاتا ہے لیکن اللہ کی محبت میں دیوانہ ہو کر حقیقی معنی میں فرزانہ ہو جاتا ہے وہ عشق جس میں انسان بقول

غالب تھا۔ ہو جاتا ہے مادی اور دنیاوی ہے چنانچہ اس عشق کی حقیقت مرشد روم یوں بیان فرماتے ہیں۔

عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

لیکن عشق الٰہی تو انسان کو صحیح معنی میں انسان بنا دیتا ہے مثال کے طور پر سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء دہلوی کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ آپ کی دیوانگی سراسر فرزانگی تھی اس بات کی کون شخص تردید کر سکتا ہے کہ حضرت موصوف عشق الٰہی میں ماسوی سے بیگانہ ہو گئے تھے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ان کی یہ دیوانگی ہم سگان دنیا کی فرزانگی سے بدرجہا ارفع تھی۔ انہوں نے تقریباً ساٹھ سال تک اہل ہند کے دلوں پر حکمرانی کی اور بلا مبالغہ ہزاروں انسانوں کو مومن بنا دیا اور ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے خلفاء کی وساطت سے اسلام کا پیغام پہونچا دیا بالفاظ دگر آج ہندوستان کے سارے مسلمان مل کر جس کام کو انجام نہیں دے سکتے انہوں نے تن تنہا اس کام کو انجام دیا۔ کیا خوب کہا ہے اقبال نے۔

ع   لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف

دوسرا شعر:۔ اس شعر میں تجاہل عارفانہ کا رنگ پایا جاتا ہے (اس صنعت کی تعریف مقدمہ میں لکھ چکا ہوں وہاں دیکھ لیجیے)

اقبال خدا سے کیسے دلپذیر انداز میں اپنی آرزو کا اظہار کرتے ہیں کہ اے خدا! یہ بات تو مجھے کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی کہ عاشق بھی حجاب میں رہے اور معشوق بھی حجاب میں رہے یہ بات تو تقاضائے عشق

کے خلاف ہے کہ دونوں حجاب میں رہیں عشق تو نمود اور اظہار چاہتا ہے اس لئے یا تو، تو خود آشکار ہو جا اور اگر یہ بات تجھے پسند نہ ہو تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ مجھے آشکار کر دے ان دونوں میں سے ایک بات تو ضرور ہونی چاہئے۔

چونکہ اقبال جانتے ہیں کہ خدا مجسم نہیں ہو سکتا کہ وہ اس طرح بندوں کی آنکھوں پر عیاں ہو جائے اس لئے خود دوسری صورت پیش کردی جو ممکن الوقوع بھی ہے اور عاشق کی معراج یا اس کا مقصود بھی ہے. واضح ہو کہ اظہار اور ظہور عشق کا تقاضائے ذات ہے عشق عاشق کو بھی ظاہر کرنا چاہتا ہے (یہ اظہار ہے) اور خود بھی ظاہر ہونا چاہتا ہے (یہ ظہور ہے) یا یوں سمجھو کہ جب عاشق ظاہر ہوگا تو عشق بھی ظاہر ہو جائیگا۔

الغرض یا مجھے آشکار کر، سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ مجھے اپنے فضل وکرم سے ایسی طاقت عطا فرما کہ میں اپنی مومنانہ زندگی سے تیرے نام کی عظمت کو دنیا پر ظاہر کر سکوں یعنی میرے اعمال سے اسلام دنیا میں سربلند ہو سکے۔

تیسرا شعر:۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں "استعارہ" اور دوسرے مصرع میں استعارہ بالکنایہ کا رنگ پایا جاتا ہے چنانچہ صنائع معنوی کے لحاظ سے یہ شعر اس غزل میں بہترین قرار دیا جا سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ فن شاعری کے اعتبار سے یہ غزل اردو ادب کے لئے سرمایۂ صد افتخار ہے اگر کوئی شخص اس غزل کو بغور پڑھے تو اسے اقبال بحیثیت شاعر اپنے انتہائی نقطۂ کمال پر نظر آئے گا۔

کہتے ہیں کہ اے خدا! تو محیط بیکراں ہے میں ذرا سی آبجو ہوں یعنی تیری ذات غیر محدود ہے. میں محدود ہوں۔ یہ امتیاز اور تفریق اقتضائے

عشق کے خلاف ہے اس لئے یا تو مجھے بھی اپنی آغوش میں لے کر بیکراں کر دے اور اگر یہ صورت تجھے پسند نہ ہو تو پھر اپنے رنگ میں رنگین کر کے مجھ میں غیر محدودیت کی صفت پیدا کر دے میں تو اپنے آپ کو تیرے رنگ میں رنگنا چاہتا ہوں یہ مقصد جس صورت سے حاصل ہو تجھے منظور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معنویت کے لحاظ سے یہ شعر اس قدر بلیغ ہے کہ اس کی شرح بہت دشوار ہے صرف دو باتیں بیان کرتا ہوں۔

پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ شاعر نے خدا کو سمندر سے اور اپنے آپ کو نہر سے تشبیہ دی ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ اصل حقیقت کے لحاظ سے عاشق اور معشوق یا خدا اور خودی دونوں ایک ہیں باقی دونوں جگہ موجود ہے یہ دوسری بات ہے کہ ایک "جگہ" غیر محدود ہے دوسری جگہ محدود ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دوسرے شعر کی طرح یہاں بھی اقبالؔ نے دو متبادل صورتیں پیش کی ہیں مقصد یہ ہے کہ شاعرانہ شوخی اور حسن بیان کے ساتھ ساتھ اپنا مسلک بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

پہلی صورت "ہمکنار" ہونا اقبالؔ کے مسلک کے خلاف ہے اس لئے کہ قطرہ اگر سمندر سے ہمکنار ہو جائے تو یقیناً اپنی انفرادیت کھو بیٹھے گا اس لئے پہلی صورت "برائے بیت" پیش کی ہے۔ دراصل مقصود دوسری صورت ہے یعنی یہ کہ مجھے بیکراں کر دے میرے اندر بھی غیر محدودیت کی شان پیدا کر دے تاکہ تجھ سے "مشابہت" پیدا ہو سکے۔

واضح ہو کہ یہ تمنا شعر، فلسفہ اور تصوف تینوں کی معراج ہے یا بقول افلاطون "خیر ارفع" (Summum Bonum) ہے۔

منطقی اعتبار سے کوئی مخلوق، خالق کے ساتھ کسی قسم کی مماثلت یا مشابہت

حاصل نہیں کر سکتی اس لئے کہ نص قرآنی لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کوئی شئے اس کے مانند یا مثل نہیں ہے۔ اس پر شاہد ہے تصوّف میں جو اس بات کی آرزو سکھائی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سالک (عاشق) اللہ کی صفتِ غیر محدود کے پرتو کا آرزومند ہوتا ہے یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ اس صفت کا پرتو اس کی خودی پر بھی پڑ جائے تاکہ اس میں بھی اس صفت کا عکس نظر آنے لگے اس کی مثال یہ ہے کہ جب لوہار لوہا کے ٹکڑے کو دھونکنی کے زور سے پورے طور سے آگ میں فنا کر دیتا ہے تو وہ لوہا آگ کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے چنانچہ جب وہ لوہار اسے باہر نکالتا ہے تو وہ لوہا صورت کے لحاظ سے بھی آگ نظر آتا ہے یعنی سُرخ ہوتا ہے اور سیرت (خاصیت) کے اعتبار سے بھی آگ ہو جاتا ہے یعنی اگر کوئی شخص اسے چھوئے تو یقیناً اس کا ہاتھ جل جائے گا۔

اسی طرح جب مرشد کامل (جس کی اتباع اقبالؔ کی رائے میں خدا رسی کے لئے شرطِ اوّلین ہے) سالک کو باطنی توجہ کے زور سے عشقِ الٰہی میں فنا کر دیتا ہے تو وہ سالک اگرچہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے تو مخلوق ہی ہوتا ہے) لیکن اس میں "دھونکنی"[ل] کی بدولت خالق کی صفات کا عکس نظر آنے لگتا ہے اقبالؔ نے اس حقیقت کو اپنی ہر کتاب میں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ او مولا صفات

یعنی بندہ کی ذات میں فقر کی بدولت اللہ کی صفات کا رنگ جھلکنے

ل مرشد کی توجہ ۱۲

لگتا ہے اب پڑھیئے اس مصرع کو۔

؎ یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر

چوتھا شعر:- اس شعر میں بھی استعارہ اور کنایہ کی خوبیاں موجود ہیں علم معانی اور بیان کے اعتبار سے یہ مصرع بال جبریل میں چاند کی طرح چمک رہا ہے۔ ذرا غور کیجئے اس مصرع پر۔

؎ میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو

(ا) "میں ہوں صدف" اس میں استعارہ کا رنگ بھی ہے اور اگر حرف تشبیہ محذوف مان لیا جائے تو تشبیہ بھی ہو سکتی ہے۔

(ب) "میرے گہر کی آبرو" یہ بھی استعارہ ہے۔

(ج) "میرے گہر کی آبرو تیرے ہاتھ ہے" یہ استعارہ بالکنایہ بھی اور مجاز مرسل بھی ہو سکتا ہے۔

اگر ایک شخص ان معنوی خوبیوں پر غور کرے گا تو اسے تسلیم کرنا پڑیگا کہ اقبال تشبیہ، استعارہ مجاز اور کنایہ کا بادشاہ ہے اور محض شاعری کی حیثیت سے بھی اس کا مقام اس قدر بلند ہے کہ غالب اور بیدل، ظہوری اور عرفی۔ فیضی اور خسرو اُسے اپنی صفوں میں جگہ دینے کو خود اپنے لئے باعثِ افتخار خیال کریں گے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے خدا! اگر تیری نگاہ میں میرے اندر کوئی خوبی ہے تو تجھ سے میری التجا یہ ہے کہ اس خوبی (گوہر) کو برقرار رکھ اور اسے پایۂ تکمیل تک پہونچا دے اور اگر تیری نظر میں میری ذات ہر قسم کی خیر و خوبی سے معرّا ہے تو اپنے فضل سے میرے اندر خوبی پیدا کر دے۔

چونکہ شاعر خدا کی درگاہ میں التجا کر رہا ہے اس لئے اس نے ازراہ

ادب کسی قسم کا ادعا نہیں کیا بلکہ عاجزانہ رنگ اختیار کیا ہے کہ اگر کوئی خوبی ہو تو اسے قائم رکھ اور نہ ہو تو اپنے فضل سے مجھے یہ نعمت عطا فرما دے۔
لفظ "گہر" میں بڑی بلاغت کی شان پائی جاتی ہے یعنی اس سے بہت سے مفہوم پیدا کئے جا سکتے ہیں مثلاً روحانی پاکیزگی ایمان و یقین حُبِّ رسول۔ جذبۂ خدمتِ اسلام یا کمالاتِ علمی و عملی وغیرہ وغیرہ خزف کے لغوی معنی ٹھیکری یا سنگریزہ کے ہیں یہاں خزف کنایہ ہے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی سے۔

پانچواں شعر:۔ نغمۂ نوبہار، کنایہ ہے ملّت اسلامیہ کے عروج سے یا اسلام کی سربلندی سے۔ "دمِ نیم سوز" کنایہ ہے اپنی ذات سے۔ طائرک بہار، کنایہ ہے آغازِ طلوعِ آفتابِ اسلام یا آغازِ دورِ شوکتِ اسلام سے۔ الغرض پورا شعر مجازات اور کنایات سے معمور ہے۔

اقبالؔ التجا کرتے ہیں کہ اے خدا! میں ایک مدت سے احیائے ملّتِ اسلامیہ کے لئے کوشش کر رہا ہوں اس لئے قدرتی طور پر میری یہ آرزو ہے کہ اسلام اور مسلمان کے عروج کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں لیکن اگر تیری مشیت میں یہ مسرّت میرے لئے مقدّر نہیں ہے تو میں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں اور یہ التجا کرتا ہوں کہ تو مجھے اس سے کمتر نعمت عطا فرما دے یعنی مجھے آمد آمدِ دورِ بہارِ اسلام کا مبشّر بنا دے اگر ملّت کا عروج اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں تو کم از کم اس متوقع عروج کی آمد کی خوشخبری ہی اپنی ملّت کے افراد تک پہنچا دوں میرے لئے یہ شرف بھی کچھ کم نہیں ہے۔

چھٹا شعر:۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں صنعت تلمیح پائی جاتی ہے یعنی اقبالؔ نے حضرت آدمؑ کے جنت سے اخراج کی طرف اشارہ کیا

ہے نیز اس مصرع میں مجاز مرسل کا رنگ بھی موجود ہے دوسرے مصرع میں مجاز عقلی کی صفت پائی جاتی ہے غرضیکہ یہ شعر بھی صنائع معنوی سے لبریز ہے ان خوبیوں کے علاوہ اسلوب بیان میں شوخی کا رنگ جھلکتا ہے اور اس کی وجہ سے شعر میں بہت دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے خدا! تو نے اپنی مشیت کے مطابق حضرت آدم کو خود جنت سے نکالا پس اگر اب تو تنہائی محسوس کر رہا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے اب تو تجھے میرا انتظار کرنا ہی پڑے گا کیونکہ جب تک "کار جہاں" اختتام پذیر نہ ہو میری ملاقات تجھ سے ناممکن ہے یعنی جب تو یہ کارخانۂ عالم ختم کر دیگا اس وقت میں تجھ سے مل سکوں گا۔

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبال نے رمز وایما اور حُسنِ انداز بیان کے پردہ میں اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس طرح انسان خدا سے ملنے کا آرزومند ہے خدا بھی انسان کی ملاقات کا تمنائی ہے چنانچہ زبور عجم میں انہوں نے خود اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو ست
چوں ما نیاز مند و گرفتار آرزو ست

لیکن اس نے خود اپنی مشیت کی بنا پر انسان کو ایک معین عرصہ کے لئے دنیا میں بھیج دیا ہے انجام کار جب یہ کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا تو کُلُّ شَیٍٔ یَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ کے مطابق انسان پھر اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا اس بات کو اقبال نے شاعرانہ انداز میں اس شعر میں بیان کیا ہے اور اس مفروضہ کی بنا پر کہ محبوب خود ہمارا مشتاق ہے شاعر کے کلام میں نیاز کے بجائے ناز کا رنگ آگیا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس شعر میں

اقبالؔ کی شاعری اپنے کمال کو پہونچ گئی ہے۔

ساتواں شعر:۔ سابق شعر کی طرح اس شعر میں بھی تغزل کا رنگ جھلک رہا ہے اور انداز بیان میں بھی شوخی کارفرما ہے۔

کہتے ہیں کہ قیامت کے دن جب میں تجھ سے ملوں گا تو میرا نامۂ اعمال بھی تیرے سامنے پیش ہوگا چونکہ میرے گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے اس لئے مناسب تو یہی ہے کہ تو پردہ پوشی سے کام لے لیکن اگر تو نے یہ صورت پسند نہ کی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ میں تیرے سامنے شرمسار ہوں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ تجھے اپنے عاشق کی اس شرمساری پر خود بھی شرم محسوس ہوگی پس جب صورت حال یہ ہے تو اے خدا! میں تو عاجزی کے ساتھ یہی عرض کروں گا کہ قیامت کے دن تو مجھ سے حساب مت کیجیو۔ کیونکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا۔

ع آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبالؔ نے مسئلہ جبر و اختیار کی طرف اشارہ کیا ہے اور رمز و ایما سے کام لے کر شعر میں دلکشی اور معنویت پیدا کر دی ہے اقبال کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو بہت تھوڑا اختیار دیا گیا ہے اور چونکہ وہ بہت کمزور ہے اس لئے اس سے گناہوں کا صدور یقینی ہے پس جب قیامت کے دن بندہ اپنے گناہوں پر شرمسار ہوگا تو رحمت خداوندی اس کی شرمساری کے باعث جوش میں آجائے گی۔ اور خدا اپنی رحمت سے گنہگاروں کو مغفرت عطا فرمائے گا اس کے سوا انسان کی کامیابی کی اور کوئی صورت نہیں ہے اقبالؔ نے شاعرانہ انداز سے کام لے کر رحمتِ خداوندی کے جوش میں آنے کو "آپ بھی شرمسار ہو" سے تعبیر کیا ہے اور اسی بات نے شعر میں لطف پیدا کر دیا ہے۔

❖ ❖ ❖

رباعی

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر　　حریم کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے　　اسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

اس رباعی میں اقبال نے اللہ سے یہ دعا مانگی ہے کہ اے خدا! مسلمانوں کے دلوں میں محبت اور وفا کا رنگ پیدا کر دے اور انھیں حریم کبریا سے آشنا کر دے محبت سے مراد ہے آپس میں ایک دوسرے سے محبت اور یہ مومنوں کی وہ صفت ہے جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ (جناب رسالت مآب حضرت) محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیشک اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں (ان کی صفت یہ ہے کہ وہ کافروں پر بہت شدید ہیں۔ (لیکن) آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں۔

وفا سے مراد ہے سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم سے وفا کرنا یعنی شریعت محمدیہ کی کامل اطاعت۔

ناظرین غور کریں کہ اگر مسلمانوں میں یہ دو خوبیاں پیدا ہو جائیں تو پھر اور کیا چاہیئے تاریخ گواہ ہے کہ انہی خوبیوں کی بدولت انہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے تھے اور دنیا میں اسلام کا نام بلند کر دیا تھا۔

حریم کبریا سے آشنائی کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ساری جد و جہد کا مقصد استرضاءِ باری تعالیٰ ہو یعنی وہ محبت اور وفا کو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا ذریعہ بنائیں ان کا ہر عمل اس نیت سے ہو کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے۔

دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا! جس مسلمان کو تو نے دولت دنیا سے حصہ وافر نہیں دیا صرف "نانِ جویں" عطا کی ہے میں اس مسلمان کے لئے تجھ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ اگر تو نے اسے دنیا کی دولت نہیں دی صرف جَو کی روٹی دی ہے تو بہت خوب! سرِ تسلیم خم ہے لیکن تو اسے نان جویں کے ساتھ ساتھ زورِ حیدری بھی عطا کر دے یہ خوبی اگر ایک طرف دولت کا نعم البدل ہو جائے گی تو دوسری طرف اس مسلمان کو حیدر کرارؓ کا مثیل بھی بنا دیگی اور وہ اس بازوئے حیدری کی بدولت اسلام کی وہی بیش بہا خدمات انجام دے سکے گا۔ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انجام دی تھیں۔

واضح ہو کہ نان جویں اور بازوئے حیدر میں یہ ربط ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو شجاعت اور بسالت میں یگانۂ روزگار تھے ہمیشہ نان جویں ہی تناول فرمایا کرتے تھے لیکن اس زہد و ورع اور ترکِ لذات کے باوجود ان کے بازو میں وہ طاقت موجود تھی جس کی نظیر اس زمانے میں نایاب تھی اقبال نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سادہ خوراک سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جسمانی طاقت عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ لذاتِ دنیوی سے چنانچہ اس حقیقت کو انہوں نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوّتِ حیدری

چوتھی غزل

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد
یہ مشتِ خاک یہ صرصر یہ وسعتِ افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذّتِ ایجاد
ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گُل
یہی ہے فصلِ بہاری؟ یہی ہے بادِ مراد
قصور وار غریب الدّیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مری جفا طلبی کو دعائیں دیتا ہے
وہ دشتِ سادہ وہ تیرا جہانِ بے بنیاد
خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

!————!

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اس غزل کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نیاز کے ساتھ ساتھ ناز کا رنگ بھی موجود ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اقبالؔ نے انسان کی فضیلت فرشتوں پر ثابت کی ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقبالؔ نے رمز و ایما سے کام لیکر بلاغت اور اثر آفرینی کی شان پیدا کر دی ہے۔

ع یہ مشتِ خاک! یہ صرصر! یہ وسعتِ افلاک

یہ مصرع رمز و ایماء کی بہترین مثال ہے۔

(۱) انسان کے بجائے مشتِ خاک کہا۔

(۲) سیلِ حوادث کو صرصر سے تعبیر کیا۔

(۳) انسان کائنات کے مقابلہ میں بہت حقیر بلکہ ناچیز ہے۔

اس تقابل کو واضح کرنے کے لئے مشتِ خاک کے مقابلہ میں "وسعت افلاک" کی ترکیب اختیار کی۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقبالؔ نے یہ دکھایا ہے کہ اگرچہ انسان بہت حقیر اور ناچیز ہستی ہے لیکن کائنات کی ساری رونق اسی کے دم سے ہے۔

پہلا شعر:۔ یہ شعر اقبالؔ نے تصوف کے رنگ میں ڈوب کر لکھا ہے کہتے ہیں کہ اے خدا! میں تیرا عاجز بندہ ہوں اور تیری مشیت کے سامنے سرفگندہ ہوں غلام کی یہ مجال کہاں کہ وہ اپنے آقا کے سامنے لب کشائی کر سکے۔ لیکن غلام اگر کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو وہ آقا کے علاوہ اور کس کے پاس جا کر اپنا دردِ دل بیان کرے! میں ایک بندۂ ناچیز ہوں۔ میں یہ جسارت

نہیں کرسکتا کہ تجھ سے یہ کہوں کہ تو میری فریاد سے اثر قبول کرے یعنی میری دادرسی کر. میری التجا قبول کر۔ نہیں یہ تو تیری مرضی پر منحصر ہے کہ تو میری درخواست کو قبول فرما. یا رد کر دے لیکن اے خدا کم از کم تو میری فریاد کو سُن تو لے۔

اقبالؔ نے اس شعر میں شیوۂ تسلیم و رضا کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ لفظوں میں اس کی کیفیت کا اظہار ناممکن ہے اور یہ شیوۂ تسلیم و رضا کیا ہے ؟ یہی اسلام کی روح ہے یہی ساری شریعت کا خلاصہ ہے اور یہی تصوّف کی تعلیم ہے۔

واضح ہو کہ تصوّف اسلامی زاویۂ نگاہ سے اسی شیوۂ تسلیم و رضا کو زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل طور سے نافذ کرنے کا نام ہے اور اس کے لئے ٹریننگ یعنی عملی تعلیم کی ضرورت ہے۔ بس مرشد اسی کام کو انجام دیتا ہے وہ مرید کو سکھاتا ہے کہ اس طرح تسلیم و رضا کی خو پیدا کی جاتی ہے پھر سمجھ لیجئے اسلام (BUREMDER) کرنے یعنی سرِ تسلیم خم کرنے کا نام ہے لیکن نفس امارہ انسان کو خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے باز رکھتا ہے ابلیس کا طرزِ عمل اس شیوہ کی ضد ہے اور اسی لئے وہ راندۂ درگاہ ہوگیا۔ پس اشد ضروری ہے کہ ہم کسی معلّم سے تسلیم کا فن سیکھیں یعنی نفس امارہ کو مغلوب کرنے کا طریقہ۔ اگر دنیاوی تعلیم کے لئے آپ بی۔ اے۔ بی ٹی تلاش کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ دین کی حقیقت سیکھنے کے لئے یعنی شیوۂ تسلیم و رضا کی عملی تربیت حاصل کرنے کے لئے آپ کسی ٹرینڈ استاد یعنی مرشد کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کرتے ؟

یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنی ہر کتاب میں صحبت مرشد کی اہمیت

کو واضح کیا ہے یاد رکھئے کہ مرشد کی صحبت کے بغیر کوئی شخص محض کتابوں کی مدد سے نفس امارہ کو مغلوب نہیں کر سکتا۔

دوسرا شعر: کہتے ہیں کہ اے خدا! انسان کی حقیقت ہی کیا ہے وہ محض ایک مشت خاک ہے نہایت ضعیف اور ناتوان اس کے مقابلہ میں دنیا حوادث، آفات اور مشکلات سے معمور ہے بھلا یہ مشت خاک ہجوم آفات کا کیا مقابلہ کر سکتی ہے انسان کی قوتیں ناقص اور محدود ہیں ان کے مقابلہ میں دنیا کی آفات بہت وسیع اور کثیر الوقوع ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر میں بڑے ادب سے یہ سوال کرتا ہوں کہ

ع کرم ہے یا کہ ستم تیری لذت ایجاد!

واضح ہو کہ اس مصرع میں اقبال نے جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی کی ہے یہ سوال اقبال نے نہیں کیا بلکہ ہر غور و فکر کرنے والے انسان کے ذہن میں یہی سوال پیدا ہوتا ہے جب انسان ایک طرف اپنی بے کسی اور بے چارگی ضعف اور کم مائیگی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف وہ وسعت افلاک اور دہر کو مدنظر رکھتا ہے تو بے اختیار یہ پکار اٹھتا ہے کہ انسان دنیا کی آفات کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

"کرم ہے یا کہ ستم" اس میں شاعرانہ شوخی کا رنگ پایا جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ اے خدا! جب تک تیرا فضل و کرم شامل حال نہ ہو ہم نفس امارہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ وہ سچائی ہے جس کا اعلان خود قرآن حکیم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے فرمایا ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (سورۂ یوسف) یعنی میں اپنی نسبت پاکی کا دعویٰ نہیں کرتا کیونکہ نفس امارہ تو انسان کو ہمیشہ بدی کے لئے ابھارتا رہتا ہے مگر

یہ کہ میرا پروردگار ہی اپنا رحم کرے۔

تیسرا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے شاعرانہ انداز میں انسانی زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! بیشک بادِ مراد کلیوں کو شگفتہ کرتی ہے اور فصل بہار میں پھولوں کی بہار ہوتی ہے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ گلوں کا خیمہ اس قدر کمزور ہے کہ ہوائے چمن کے مقابلہ میں قائم نہیں رہ سکتا یعنی حیاتِ گل محض چند روزہ ہے اندریں حالات میں کس طرح شادماں ہو سکتا ہوں! فصل بہار سے مجھے کیا مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ فرشتوں پر انسان کی فضیلت ثابت کی ہے اور کہتے ہیں کہ اے خدا! بیشک انسان خطاکار ہے اور غریب الدیار ہے۔ (اشارہ ہے جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے اخراج کی طرف یعنی یہ دنیا بنی آدم کا اصلی وطن نہیں ہے بلکہ وہ پردیس میں ہیں) لیکن اس کے لئے یہ بات کچھ کم باعث فخر و ناز نہیں کہ تیری اس دنیا کی رونق اسی کے دم سے ہے۔ بیشک فرشتے تیری نظر میں بہت اچھے ہیں (کیونکہ وہ گناہ نہیں کرتے) اور آدم واقعی قصوروار ہے (اسی لئے جنت سے نکالا گیا لیکن تیری دنیا کو بیگناہ فرشتے آباد نہ کر سکے۔

پانچواں، چھٹا اور ساتواں شعر:۔ واضح ہو کہ یہ تینوں شعر باہم مربوط ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! تیری دنیا دراصل انسان کی "جفا طلبی" کی بدولت آباد ہے اگر انسان میں دکھ اور مصیبت برداشت کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی۔ اگر وہ تیری محبت کے جذبہ سے سرشار نہ ہوتا تو کبھی ہرگز یہ دنیا آباد نہ ہو سکتی۔

انسان فطرتاً "خطر پسند" واقع ہوا ہے عشق نے اسے خطرات کا مقابلہ

کرنے کی طاقت عطا کر دی ہے جو پرندہ حوصلہ مند ہوتا ہے وہ اسی باغ میں رہنا پسند کرتا ہے جہاں صیاد بھی اس کی گھات میں لگا ہوا ہو اسی طرح جو انسان حقیقی معنی میں انسان ہے وہ عیش طلب نہیں ہوتا۔ عافیت کوش نہیں ہوتا بلکہ کسی مدمقابل (ابلیس) کو چاہتا ہے تاکہ اسے مغلوب کرکے اپنی خودی کو معراج کمال پر پہونچا سکے۔

اے خدا! بیشک فرشتے بہت مقدس ہیں اور بڑے نیک ہیں لیکن "مقام شوق" یعنی تیری محبت میں سرفروشی کے لئے تیار ہو جانا یہ ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کربلا کے میدان میں بے آب ودانہ تیغ وسناں کے زخم کھانا۔ اور پھر بھی مسکرائے جانا اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ زندہ خون کا نذرانہ دونوں ہاتھوں میں لے کر تیرے سامنے پیش کرنا موت اور حیات کی کش مکش میں گرفتار ہونے کے باوجود ظہر کی نماز کو عین وقت پر پوری توجہ کے ساتھ ادا کرنا جبکہ ہر بُنِ مُو سے خون کا فوارہ ابل رہا ہو اور پھر تیرے نافذ کردہ قانونِ حریت نفس انسان کی خاطر اپنا سر کٹا دینا بلکہ پورے خاندان کو بخوشی قربان کر دینا۔ اے خدا! یہ کام تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں ہے یہ دیوانگی۔ یہ سرفروشی یا یہ قربانی وہی لوگ دکھا سکتے ہیں جو فرشتوں سے بڑھ کر حوصلہ رکھتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ حوصلہ صرف جذبۂ عشق کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے اور فرشتے اس جذبہ سے عاری ہیں۔ ان میں صرف عبادت کا مادہ ہے یہ انسان ہی ہے جس میں عبادت کے علاوہ محبت کا جذبہ بھی موجود ہے اس لئے انسان ملائکہ سے افضل ہے۔

رباعی

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اس رباعی میں اقبالؔ نے اللہ سے اپنی قوم کے نوجوانوں کے لئے یہ دعا کی ہے کہ اے خدا! میں یہ چاہتا ہوں کہ میری قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ پیدا کر دے۔ یہ نوجوان دراصل شاہین بچے ہیں لیکن بے بال و پر ہیں اس لئے اڑ نہیں سکتے۔ عشق رسولؐ سے ان کو بال و پر نصیب ہو سکتے ہیں اور ان کی بدولت وہ پھر دنیا کو فتح کر سکتے ہیں۔

اے خدا! میری آرزو یہ ہے کہ میری قوم کے نوجوان دنیا کو میری نظر سے دیکھیں پس تو میرا "نورِ بصیرت" عام کر دے یعنی حق اور باطل میں امتیاز کر سکنے کی جو قوت تو نے مجھے عطا فرمائی ہے وہی قوت نوجوانوں کو عطا کر دے

واضح ہو کہ بصیرت اور بصارت دونوں کے لغوی معنی دیکھنے کے ہیں لیکن بصارت کا تعلق مادی آنکھوں سے ہے اور یہ صفت صرف ایمان سے پیدا ہو سکتی ہے جو شخص مومن نہیں وہ روحانی اعتبار سے اندھا ہے کیا خوب کہا ہے اقبالؔ نے۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

پانچویں غزل

کیا عشق ایک زندگیٔ مستعار کا
کیا عشق پائدار سے ناپائدار کا
وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا
میری بساط کیا ہے؟ تب و تاب یک نفس
شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا
کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا
کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

اس غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقبال نے ناز اور شوخی طنز اور تعلّی سب باتوں سے قطع نظر کر کے اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا اعتراف کیا ہے اور اللہ سے دعا کی ہے کہ اے خدا! میں فانی ہوں تو باقی ہے بھلا میں کس منہ سے عشق کا دعویٰ کر سکتا ہوں پس میں التجا کرتا ہوں کہ تو

مجھے حیاتِ جاوداں عطا کر تاکہ میں حقیقی معنی میں مجھ سے محبت کرسکوں اگر عاشق کو یہ یقین ہو کہ میں تو فانی ہوں لیکن میرا معشوق غیر فانی ہے تو بھی ہرگز اس کے عشق میں شدت اور سرگرمی پیدا نہیں ہو سکتی اس لئے اقبال نے اس مسلسل غزل میں نوع انسانی کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور اسی ترجمانی نے ان کو دنیا کے نامور شعراء کی صف میں نمایاں جگہ عطا کی ہے۔

اس غزل کا رنگ گذشتہ چاروں غزلوں سے بالکل مختلف ہے اس میں بڑی سنجیدگی گہرائی غور و فکر اور تاثیر پائی جاتی ہے لیکن تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کی خوبیاں حسب معمول اس غزل میں بھی موجود ہیں اس کے باوجود ہر شعر سے سوز و گداز کا رنگ نمایاں ہو رہا ہے جو اس غزل کی دوسری خصوصیت ہے۔

پہلا شعر:۔ یہ شعر مجاز مرسل کی نہایت عمدہ مثال ہے اقبال کہتے ہیں کہ جس شخص کی زندگی دوسرے کی عطا کردہ ہو۔ وہ حقیقی معنی میں عشق نہیں کر سکتا کیونکہ، خدا معلوم، جس نے زندگی عطا کی ہے وہ کب اس زندگی کو واپس لے لے۔

اقبال نے اس مصرع میں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ انسان کا وجود ذاتی۔ اصلی یا حقیقی نہیں ہے بلکہ مستعار حالی یا مجازی ہے۔ مانگی ہوئی چیز پر نہ ہمیں کسی قسم کا اختیار حاصل ہوتا ہے اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز ہماری ملکیت ہے۔ ہماری زندگی خانہ زاد نہیں ہے بلکہ مستعار ہے یعنی ناپائیدار ہے اور اللہ تعالیٰ پائندار ہے لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ انسان اللہ سے عشق نہیں کر سکتا جب تک اسے صفت دوام حاصل نہ ہو جائے۔

دوسرا شعر:۔ اس مصرع میں تعقید لفظی پیدا ہو گئی ہے واضح

ہو کہ فنی اعتبار سے تعقید کا شمار عیوبِ شاعری میں ہے ہے لیکن اقبال کے کلام میں یہ عیب النادر کالمعدوم کا مصداق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حسن عشق کی شمع کو اجل کی پھونک بجھا سکتی ہے یعنی بجھانے کا فاعل شمع نہیں ہے بلکہ "اجل کی پھونک" ہے اس عشق میں نہ سوز کا لطف ہے نہ انتظار کا۔ کیونکہ بہت ممکن ہے عین اس وقت جبکہ تپش کا رنگ پیدا ہونے لگے پیام اجل آجائے اور عاشقی کا سارا کاروبار ختم ہو جائے۔

نوٹ :- اس شعر میں استعارہ بالکنایہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

تیسرا شعر :- اے خدا! میری بساط یا حقیقت کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں محض حیاتِ چند روزہ جیسے اندھیری رات میں شہاب ثاقب کی چمک ابدیت تو بڑی چیز ہے کائنات کی مدتِ عمر کے مقابلہ میں بھی انسان کی عمر ایک سکنڈ سے زیادہ نہیں ہے پس انسان (شرر) کا خدا (شعلہ) سے عشق کرنا کچھ موزوں یا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

نوٹ :- شعلہ اور شرار میں استعارہ کا رنگ ہے اور اسی صنعت کی بدولت اس شعر میں اس قدر تاثیر پیدا ہو گئی۔

چوتھا شعر :- اے خدا! چونکہ تو غیر فانی ہے اس لئے مجھے بھی حیاتِ جاودانی عطا کر دے تاکہ میں دلجمعی اور طمانیت کے ساتھ تجھ سے محبت کر سکوں میرے دل میں عشق کا زبردست جذبہ پنہاں ہے لیکن وہ اس لئے بروئے کار نہیں آتا کہ مجھے ہر دم اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوتا رہتا ہے اگر تو مجھے لازوال کر دے تو میرا عشق بھی لازوال ہو جائے گا اور حقیقی معنی میں عاشقی کا لطف آجائے گا۔

پانچواں شعر :- پس میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو مجھے اس عشق

کی نعمت سے سرفراز کر جو لازوال ہو اور میرے دل میں ایسا درد پیدا کر جس کی کسک غیر فانی ہو۔

اس غزل میں اقبالؔ نے در پردہ خودی کے لازوال ہو جانے کی دعا کی ہے اور جب خودی لازوال ہو جائے گی تو عشق یقیناً لازوال ہو جائے گا۔

پہلی پانچ غزلوں پر مجموعی تبصرہ

ناظرین ان غزلوں کو غور سے پڑھیں اور ان کی خصوصیات کو مدنظر رکھیں اس کے بعد فیصلہ کریں کہ کیا اقبالؔ سے پہلے کسی شاعر نے غزل کو اس قدر بلندی عطا کی ہے؟ کیا کسی شاعر نے حمد کا انوکھا اسلوب اپنے کلام میں کہیں استعمال کیا ہے؟ کیا حمد کے اشعار میں رمز و ایما، اور تشبیہ و استعارہ مجاز مرسل اور کنایہ کی یہ فراوانی اردو شاعری میں کہیں نظر آتی ہے؟

اقبالؔ نے حمد باری تعالیٰ میں پانچ غزلیں لکھی ہیں لیکن ہر غزل کا رنگ منفرد ہے اور ہر رنگ دلپذیر ہے اور اپنی جگہ اثر آفرینی میں مرتبہ کمال کو پہنچا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کو شاعری کی ہر صنف پر قدرت حاصل ہے اسی لئے ان پانچ غزلوں میں ہم کو فلسفیانہ شاعری صوفیانہ شاعری، طنزیہ شاعری، عاشقانہ شاعری اور نعتیہ شاعری ان پانچوں قسموں کا بہترین نمونہ مل سکتا ہے اور اس میں مبالغہ نہیں کہ رفعت۔ رومانیت اور پابندی فن کا یہ امتزاج ہم کو دنیا کے صرف چند شعراء کے کلام میں نظر آتا ہے مثلاً دانتے۔ گوئٹے ملٹن۔ فردوسی عرفی اور غالبؔ۔

نوٹ:۔ میں اس بات کو اپنی تصنیف ادب اردو پر اقبالؔ کے احسانات میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کروں گا۔

چھٹی غزل

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے
نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے
کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے
بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے
کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی | مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں محکوم و مجبور | مری دنیا میں تیری پادشاہی

پہلا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق میرے ریشہ ریشہ میں سمایا ہوا ہے یعنی میں مجسم عشق ہوں اس لئے مر کر بھی عشق میرے ذراتِ جسم سے جدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا میری خاک پھر دل کی صورت اختیار کرے گی اور دل چونکہ مرکزِ عشق ہے اس لئے میں پھر عشق میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ یعنی جس حیثیت میں اب گرفتار ہوں مرنے کے بعد بھی اس سے رہائی نہیں ملے گی۔

واضح ہو کہ یہ شعر شاعرانہ تخیل کی نہایت عمدہ مثال ہے شاعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ میں مرنے کے بعد بھی عشق کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ بعد وفات اگر میرا گذر جنت میں ہو گیا تو حوریں یقیناً میری طرف ملتفت ہوں گی لیکن میں عاشق صادق ہوں ان کو دیکھ کر مجھے اپنا محبوب یاد آئے گا اور میں اس کی یاد میں آہ و نالہ پر مجبور ہو جاؤں گا اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ میرے سوزِ دروں کی بدولت جنت میں بھی وہی ہنگامہ برپا ہو جائے گا جو اس دنیا میں برپا ہے۔

تیسرا شعر:۔ محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق اپنے محبوب کی تلاش میں نکلتا ہے اور جہاں اس کے محبوب نے قیام کیا تھا وہ بھی اسی منزل میں قیام کرتا ہے پھر وہ اس کی تلاش میں آگے چلتا ہے تو کبھی وہ چھوڑی ہوئی منزل اسے یاد آتی ہے اور منزل کی یاد دورانِ صحرا نوردی میں اسے بے چین کر دیتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ کھٹک (منزلِ جاناں کی یاد) کہیں بڑھتے بڑھتے غمِ منزل نہ بن جائے اور اگر ایسا ہو گیا تو بہت برا ہوگا۔ کیونکہ پھر اس منزل کے غم میں عاشق تلاشِ محبوب سے غافل ہو جائیگا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ سالک جب سیر الی اللہ شروع کرتا ہے تو

راہ میں بہت سی منازل آتی ہیں اور ہر منزل اپنے اندر ایک مخصوص دلکشی رکھتی ہے جس میں راہی کو ایک خاص نوعیت کی روحانی لذت محسوس ہوتی ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سالک (راہی) اپنی سابقہ منازل میں سے کسی منزل کو یاد کرتا ہے اور یہ یاد اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے اور یہ یاد حد سے بڑھ جائے تو پھر وہ اس منزل کی یاد میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ مطلوب حقیقی سے غافل ہو جاتا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سالک کی روحانی ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔

چوتھا شعر: عشق حقیقی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ عاشق کو معشوق کے رنگ میں رنگین کر دیتا ہے یعنی اس میں بھی غیر محدودیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے۔

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندیشۂ صحرا

لیکن اگر سالک ذاتِ معشوق میں فنا ہو جانے کے بجائے اپنی ذات کی طرف بھی ملتفت رہے تو یہ التفات (خود نگہداری) بعض اوقات اس کی شان غیر محدودیت کو زائل کر دیتا ہے اور اس زوال کو اقبال نے ساحل سے تعبیر کیا ہے یعنی عشق تو انسان کو دریائے بیکراں بنانا چاہتا ہے لیکن اگر عشق اپنی ذات کا تصوّر بھی باقی رکھے تو پھر یہ دریا بیکراں نہیں ہو سکتا اسی کا تصوّرِ ذات اس کے لئے بمنزلہ ساحل بن جاتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس شعر میں حسنِ تخیل سے ایک شاعرانہ مضمون پیدا کیا ہے اس کو ان کے مخصوص فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں ہے یعنی

یہ غزل کا شعر ہے اسے منطق کے پیمانہ سے ناپنا مناسب نہیں ہے انہوں نے اس جگہ اپنا فلسفہ بیان نہیں کیا ہے بلکہ وہ روایتی انداز بیان اختیار کیا ہے جو فارسی اور اردو شاعری میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ افسانۂ دنبالۂ محمل" تلمیح ہے جس میں مجنوں کے اس مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ ایک دفعہ مجنوں نے اپنا ایک قاصد لیلیٰ کے پاس روانہ کیا تھا لیکن خود بھی دور تک محمل کے ساتھ ساتھ قاصد سے باتیں کرتا ہوا چلا گیا تھا کہ جب تم لیلیٰ سے ملو تو یہ کہنا، یہ کہنا۔

شاعر کہتا ہے کہ جب میں بعد وفات اس عالم رنگ و بو سے منتقل ہو کر عالم بے رنگ و بو میں پہونچ جاؤں گا تو مجھے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں میری طلب (جذبۂ حصولِ مقصد) مجھے پھر کوچہ محبوب میں جانے پر مجبور نہ کر دے اس طرح کہ میں وہاں سے کسی قاصد کو محبوب کے پاس بھیجوں اور اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اس عالم بے رنگ و بو سے دوبارہ اسی عالمِ رنگ و بو میں پہونچ جاؤں۔

مطلب ان اشعار کا یہ ہے کہ میں عاشق صادق ہوں اور جذبۂ عشق میری رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

چھٹا شعر:۔ انجم" بطور مجاز مرسل مستعمل ہے یعنی ساکنانِ عالمِ بالا۔" ٹوٹا ہوا تارہ کنایہ ہے حضرت آدم سے اور اس جگہ مجازاً مستعمل ہے اولاد آدم کے لئے۔

انجم سے اگر فرشتے مراد لئے جائیں تو یہ لفظ استعارہ ہے اور اس طرح ٹوٹے ہوئے تارہ سے ذاتِ شاعر مراد لی جائے تو یہ استعارہ بالکنایہ ہے میں نے یہ صراحت اس لئے کی ہے کہ ناظرین پر یہ حقیقت واضح ہو جائے اقبال

مجاز اور استعارہ کا بادشاہ ہے اسی لئے اس کا کلام (اردو اور فارسی) بلاغت کی کان ہے اور ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق اس کان سے جواہرات معانی حاصل کر سکتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نکالے گئے تو فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہبوطِ آدم۔ زوالِ آدم ثابت ہوگا لیکن جب انہوں نے اولاد آدم یا مرد مومن کا عروج دیکھا تو اب بہت سہمے ہوئے ہیں اور انہیں یہ اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں یہ ٹوٹا ہوا تارہ۔ مہ کامل نہ بن جائے یعنی ایسا نہ ہو کہ یہ خاک کا حقیر پتلا ہم پر تفوق حاصل کرلے۔

"مہ کامل" استعارہ بالکنایہ ہے اور اس سے مراد ہے آدم کا اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچ جانا یعنی مقامِ خلافتِ الٰہیہ پر فائز ہو جانا۔

اس شعر میں معنوی خوبیوں کے علاوہ صنعتِ مراعاۃ النظیر بھی موجود ہے۔ انجم تارہ اور مہ کامل۔

یہاں انجم کا لفظ بلاغت کی جان ہے فرشتوں کا لفظ لانے سے وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی تھی جو لفظ انجم سے پیدا ہو گئی اس لفظ سے دو مطلب پیدا ہو گئے ایک یہ کہ ساکنانِ عالم بالا سہمے جاتے ہیں دوسرا یہ کہ فرشتے تو فرشتے۔ انجم تک سہمے جاتے ہیں اور ستاروں کا سہم جانا۔ وہ شاعرانہ انداز بیان ہے جس کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ نہیں مل سکتے۔

نوٹ:۔ یہ غزل مسلسل ہے اور اول سے آخر تک اقبال نے ہر شعر میں ایک خاص اندیشہ کا اظہار کیا ہے۔ یعنی پوری غزل اندیشہ ہائے گوناگوں سے لبریز ہے۔ واضح ہو کہ یہاں "اندیشہ" کا لفظ میں نے خوف کے معنی میں استعمال کیا ہے نہ کہ فکر کے معنی میں۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ "اندیشہ" امکان کے معنی میں

استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی اقبالؔ نے اپنی قوت تخئیل کے زور سے عاشقانہ زندگی کے مختلف امکانات اشعار میں نظم کئے ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ غزل اقبالؔ کی قوت تخئیل کی نہایت دلکش مثال ہے۔

ان امکان میں بلند ترین امکان آخری شعر میں پیش کیا ہے یعنی عشق وہ قوت ہے جس کی بدولت یہ بات ممکن ہے کہ انسان جو اصل کے لحاظ سے ٹوٹا ہوا تارہ ہے مہ کامل بن جائے۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ ہر شعر سے عشق کی کسی نہ کسی صفت کا اظہار ہوتا ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے دراصل یہ غزل "درثنائے عشق" لکھی ہے اور ان کا ایسا کرنا بالکل ان کے مسلک کے مطابق ہے کیونکہ وہ مرشد رومیؒ کی اتباع میں عشق کو اس کائنات میں سب سے بڑی تخلیقی قوت (creative force) یقین کرتے ہیں اور ان کو ہر جگہ ہر شئے میں عشق ہی کارفرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق

رباعی

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی — مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں ہیں محکوم و مجبور — مری دنیا میں تیری پادشاہی

اقبالؔ نے اس رباعی میں خدا اور انسان کا ایسے دلکش انداز میں موازنہ کیا ہے کہ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!

کہتے ہیں کہ اے خدا! یہ جہانِ مرغ و ماہی تیری پیدا کردہ دنیا ہے یعنی تیری ہستی کا ثبوت یہ ہے کہ تو نے یہ گوناگوں عالم پیدا کیا ہے جس میں مختلف النوع اشیاء پائی جاتی ہیں اگرچہ ان سب کی اصل ایک ہی ہے یعنی ہیولیٰ اور صورت لیکن اس وحدت کے باوجود کثرت پائی جاتی ہے. کوئی شے دوسری شئے سے نہیں ملتی پس ثابت ہوا کہ ضرور کوئی حکیم و علیم ہستی ایسی موجود ہے جس نے یکسانیتِ اصل (مادّہ) کے باوجود اشیائے کائنات کی طبائع اور اشکال میں اختلاف پیدا کر دیا۔

اب رہی میری دنیا تو وہ بہت مختصر ہے صرف فغان صبح گاہی یعنی میری ہستی کا ثبوت یہ ہے کہ میں عاشق ہوں کیونکہ اگر میں موجود نہیں ہوں تو یہ "فغان صبح گاہی" کس کی صفت ہے؟ تیری ذات تو اس فعل سے پاک اور بالاتر ہے کیونکہ فغان دلیل ہے۔ احتیاج کی اور تو احتیاج سے مبرّا اور منزّہ ہے۔

اب رہی کائنات تو یہ مرکب ہے جمادات۔ نباتات اور حیوانات سے اور ان میں سے کسی کو شعور ذاتی حاصل نہیں ہے اور عشق کے لئے عاشق میں شعور ذاتی ہونا لازم ہے کیونکہ عشق غیر سے ہوتا ہے اور جمادات نباتات اور حیوانات میں من و تو کا شعور ہی موجود نہیں تو وہ عشق کیسے کر سکتے ہیں؟

الغرض جب فغان صبح گاہی نہ تیری صفت ہو سکتی ہے نہ کائنات میں کسی ہستی کی تو پھر وہی سوال ہے کہ یہ کس کی صفت ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ انسان کی صفت ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اپنی محبوب کتاب زبور عجم میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے؟

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت
از عشق ہویدا شد ایں نکتہ کہ ہستم من

یعنی میرے ہونے اور نہ ہونے میں عقل کو بہت تردد تھا چنانچہ اس نے بہت سے احتمالات مرتب کئے تھے جن میں سے بعض میری ہستی پر دال تھے اور بعض اس کا ابطال کرتے تھے لیکن بھلا ہو عشق کا کہ اس کی بدولت یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ میں موجود ہوں۔

لیکن اے خدا! کہنے کو تو ہم دونوں موجود ہیں مگر ہمارے وجود کی کیفیت اور نوعیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے یعنی حالت یہ ہے کہ تیری دنیا میں میں محکوم اور مجبور ہوں اور میری دنیا میں تو حاکم اور مختار ہے۔

غور کیجئے کس خوبی کے ساتھ اقبالؔ نے خدا اور خودی دونوں کا اثبات بھی کر دیا اور دونوں کی حقیقت بھی واضح کر دی کہ خدا حاکم اور مختار ہے انسان محکوم اور مجبور ہے۔

نوٹ:۔ اگرچہ اس رباعی کا مطلب (جیسا میری فہم ناقص میں آسکا) میں نے بیان کر دیا ہے لیکن "تری دنیا" اور "مری دنیا" کے تقابل سے کلام میں جو دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ اسے میں لفظوں کے ذریعہ کیسے ظاہر کر سکتا ہوں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اے خدا! تو خالقِ کائنات ہے اور خود مختار ہے اور حُسنِ مطلق ہے میں مخلوق اور مجبور ہوں، اور تیرا عاشق ہوں۔

چونکہ تو معشوقِ حقیقی ہے اس لئے تو بتقاضائے ذاتِ خویش حکمراں ہے (معشوق حکمراں ہوتا ہے) میں عاشق ہوں اس لئے بتقاضائے ذاتِ خویش تیرا غلام ہوں، تیرا بندہ ہوں (عاشق محکوم ہوتا ہے) تیرا کام بادشاہی کرنا ہے میرا کام تیری اطاعت کرنا ہے۔

نوٹ :۔ اقبالؔ نے اس رباعی میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ صراحت کئے بغیر محض رمز و ایما کی مدد سے، جبر و اختیار کے مسئلہ کو دو لفظوں میں حل کر دیا۔ خدا حاکم ہے انسان محکوم ہے اور حاکم مختار ہوتا ہے محکوم مجبور ہوتا ہے۔

ساتویں غزل

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرّہ میں غوغائے رستا خیز ہے ساقی

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

وہی دیرینہ بیماری وہی نا محکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں
غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

ہر چند اقبال نے شاعری میں نئی اور دلکش راہیں نکالی ہیں لیکن انہوں نے اپنے کلام میں قدیم اسالیب بیان اور فنی اصول وضوابط کو بجنسہٖ برقرار رکھا ہے چنانچہ قدیم صوفیانہ شاعری کی اتباع میں اس غزل اور آئندہ غزل میں انہوں نے ساقی یعنی خدا سے خطاب کیا ہے واضح ہو کہ تصوف آمیز شاعری میں ساقی سے عموماً ذات باری تعالیٰ اور کبھی کبھی ذاتِ مرشد بھی مراد ہوتی ہے کیونکہ مرشد کی ذات خدا تک پہونچنے کے لئے واسطہ ہے۔

ان غزلوں میں طرز خطاب تو قدیم اسلوب کا علمبردار ہے لیکن مضامین بالکل نئے ہیں اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کے یہاں قدیم وجدید دونوں کا ایک خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے وہ جدت پسندی میں کسی سے کم ہوتا کیا بلکہ موجودہ تمام جدت پسندی کے پیشوا ہیں لیکن انہوں نے فن کے اصول وضوابط کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مضمون کتنا ہی بلند اور دلکش کیوں نہ ہو اگر "قالب" فن شاعری سے بیگانہ ہو جائے تو پھر کلام "چوں چوں کا مربہ" ہو کر رہ جائے گا۔ شعر کا اطلاق تو اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب وہ فن شاعری کے مسلمہ قواعد وضوابط کے مطابق ہو علامہ مرحوم سے بڑھ کر اس حقیقت کا عالم اور کون ہو سکتا ہے کہ فن تو نام ہی ہے قیود وحدود کے تدوین اور متعین کرنے کا۔ اگر قیود مٹادی جائیں تو فن کیسے باقی رہ سکتا ہے۔؟

واضح ہو کہ اس غزل میں اقبال نے اپنی قوم کی روداد نہایت دلکش انداز میں حضورِ باری تعالیٰ میں پیش کی ہے اور آخر میں اللہ سے نگاہ کرم کی التجا کی ہے جسے انہوں نے "نم" سے تعبیر کیا ہے۔ پوری غزل رمز وایمار کی خصوصیات

سے معمور ہے اور اسی میں اس کی دلکشی کا راز مضمر ہے۔

پہلا شعر:۔ معنوی اعتبار سے قطع نظر کر کے فنی اعتبار سے بھی یہ مطلع نہایت بلند ہے "تاروں کی گردش تیز ہے"۔ کنایہ ہے حالات و واقعات عالم کے بسرعت تمام بدلنے سے "ہر ذرہ کے دل میں غوغائے رستخیز ہے۔ استعارہ بالکنایہ ہے۔

الغرض دونوں مصرعے مرصع ہیں اور شاعر کی قدرتِ کلام اور اس کے کمالِ فن پر شاہد عادل ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اے خدا! یہ بڑا نازک دور ہے جس میں سے میں گذر رہا ہوں حالات روزگار بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں اور ہر شخص کے دل میں قیامت کا ہنگامہ بپا ہو رہا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اے خدا! جو لوگ تیرے پرستار تھے ان کا دین بھی خطرہ میں ہے اور ان کے دینی علوم بھی مٹ رہے ہیں۔

اس شعر میں اشارہ ہے انگریزوں کی اسلام دشمنی کی طرف کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کو جس قدر نقصانات اس قوم نے پہونچائے اسلامی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اور سب سے بڑا نقصان یہ پہونچایا کہ مسلمانوں کو اسلامی علوم سے بیگانہ کر دیا۔

اقبال اگر مصرع ثانی میں انگریزوں کے نام کی تصریح کر دیتے تو وہ تاثیر اور دلکشی پیدا نہ ہوتی جو استفہام سے پیدا ہو گئی ہے اسی لئے تو علمائے معانی کا متفقہ فیصلہ یہ ہے۔ الکنایۃ ابلغ من التصریح یعنی کنایہ میں تصریح سے زیادہ بلاغت پائی جاتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے خدا! میری قوم جس مرض میں اس وقت

مبتلا ہے یہ نیا نہیں ہے صدیوں سے مسلمانوں کے قلوب ایمان ویقین کی لذت سے محروم ہو چکے ہیں تیرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں عشق کا درس دیا تھا۔ لیکن مدتیں گذریں وہ اس اسبق کو بھلا چکے ہیں۔ پس میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ تو پھر اپنے کرم سے انہیں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شراب (آب نشاط انگیز) پلا دے تاکہ ان کے اندر مستی کا رنگ پیدا ہو جائے اس کے سوا ان کے مرض کا اور کوئی علاج نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ اے خدا! اس میں شک نہیں کہ تیری ہستی کا ثبوت اس کائنات کی ہر شئے سے مل سکتا ہے تیرا جلوہ ہر جگہ موجود ہے لیکن ثبوت کو سمجھنے اور جلوہ کو دیکھنے کے لئے عقل اور نگاہ کی ضرورت ہے اور میری قوم عرصہ دراز سے ان دونوں قوتوں سے محروم ہو چکی ہے اس لئے اہل حرم (مسلمانوں) کے دل میں سوز آرزو پیدا نہیں ہو سکتا پس میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو عقل اور نگاہ کی دولت سے مالامال کردے۔

پانچواں شعر:۔ اے خدا! اگرچہ اسلامی ممالک آج بھی موجود ہیں لیکن صدیاں گذر گئیں دوسرا رومی قوم میں پیدا نہیں ہوا۔ جو مسلمانوں کو عقل کے ساتھ ساتھ عشق کا درس بھی دیتا اور یہ بتاتا کہ محض عقل تجھ تک پہونچنے کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے میں دعا کرتا ہوں کہ تو اپنے فضل سے رومی کا مثیل قوم میں پیدا کردے۔

چھٹا شعر:۔ اے خدا! یہ سچ ہے کہ مسلمان اس وقت بہت گئی گذری حالت میں ہیں لیکن اس کے باوجود میں ان کی طرف سے ناامید نہیں ہوں اگر تیری نگاہ کرم ان کے حالِ زار پر مبذول ہو جائے تو وہ دوبارہ اس دنیا

میں سربلندی حاصل کر سکتے ہیں اگر کشت ویران ہو چکی ہے تو کیا ہوا مٹی تو بہت زرخیز ہے مسلمان تباہ حال ضرور ہیں لیکن ہیں تو تیرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا۔ ان کے عمل بیشک خراب ہیں لیکن کلمہ تو بہر حال تیرا اور تیرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا پڑھتے ہیں۔

ساتواں شعر:۔ یہ تیرا فضل وکرم ہے کہ تو نے مجھ پر دہ حقائق ومعارف کھول دیئے ہیں جن کی بدولت میری قوم دوبارہ دنیا میں سربلند ہو سکتی ہے۔ (اے خدا! ان نعمتوں کے لئے میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں) اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا پیغام خسرو پرویز (شاہ ایران) کے خزانوں سے بھی بڑھ کر قیمتی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ میرا کلام بلحاظ قدر وقیمت بادشاہت سے کم نہیں ہے اور میرے پیغام پر عمل کرنے سے قوم کو دولت پرویز حاصل ہو سکتی ہے۔

رباعی

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں	غلام طغرل وسنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن	کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

اس رباعی میں اقبال نے اپنے منصب اور مقام کی نہایت دلکش پیرایہ میں وضاحت کی ہے ساغر جمشید۔ تلمیح ہے جس کی تشریح یہ ہے کہ جمشید قدیم ایران کا مشہور بادشاہ گذرا ہے۔ اگرچہ اس کی شخصیت تاریخی اعتبار سے ثابت نہیں ہو سکتی لیکن فارسی ادب میں "جام جمشید" کا تذکرہ اس کثرت سے آیا ہے کہ اس کا نام محتاج تعارف نہیں رہا۔ روایت ہے کہ اس کے لئے حکماء نے ایک پیالہ بنایا تھا جس میں سارے جہاں کا حال نظر آجاتا تھا۔

اقبالؔ خدا کی جناب میں عرض کرتے ہیں کہ میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تونے مجھے وہ جوہر عطا کیا ہے کہ میں بادشاہوں تک کی غلامی سے بے نیاز ہو گیا ہوں چنانچہ اس بات کو انہوں نے اس شعر میں بھی بیان کیا ہے۔

کہاں سے تونے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

پھر کہتے ہیں کہ جہاں بینی میری فطرت ہے یعنی تونے مجھے ایسی عقل دوربین عطا فرمائی ہے کہ میں حیات اور کائنات دونوں کے حقائق و معارف پر وقوف رکھتا ہوں لیکن تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں کسی جمشید کا ساغر نہیں ہوں بالفاظ دگر میں اور جام جمشید دو جہاں بینی کی صفت میں مشترک ہیں لیکن جام جمشید ایک بادشاہ کے قبضہ میں تھا میں کسی کے قبضہ اور تصرف میں نہیں ہوں ساغر تو ہوں لیکن ساغر جمشید نہیں ہوں۔

طغرل :۔ سلجوقی خاندان کا بانی اور اپنے عہد کا نامور فرماں روا گذرا ہے ۴۵۵ھ میں وفات پائی نہایت شجاع اور صاحب عزم و ہمت تھا جملہ اوصاف جہانبانی اس کی ذات میں موجود تھے ان شاہانہ صفات کے علاوہ نہایت راسخ العقیدہ اور دیندار مسلمان تھا پنجگانہ نماز کا تو ذکر ہی کیا ہے ساری عمر تہجد کی نماز بھی ناغہ نہیں ہوئی۔

سنجر :۔ اسی سلجوقی خاندان کا نامور فرماں روا گذرا ہے جو سلطان اعظم کے لقب سے مشہور تھا ۵۵۲ھ میں وفات پائی۔

آٹھویں غزل

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی
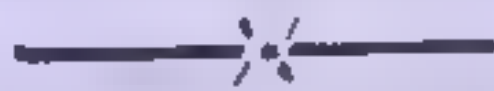
وہی اصل مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے

خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

پہلا شعر :۔ اقبالؔ جناب باری تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ اے خدا! مسلمانوں کو پھر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار کر دے تاکہ انہیں پھر سابقہ عظمت و شوکت نصیب ہو سکے اسی مضمون کو اقبالؔ نے ساقی نامہ میں یوں باندھا ہے۔

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

دوسرا شعر :۔ اے خدا! تین سو سال سے ہندوستان میں کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو بادشاہوں کے سامنے کلمہ حق کہہ سکے اور اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں میں حریت کا جذبہ بیدار کر سکے لہٰذا میں دعا کرتا ہوں کہ تو اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو اس دولت سے مالا مال کر دے۔

نوٹ :۔ تین سو سال" کے تعین کی بنا پر میرا قیاس کہتا ہے کہ علامہ مرحوم کا اشارہ حضرت امام ربانی مجدّد الف ثانی رح کی طرف ہے جن کے روحانی اور علمی کمالات کے علاوہ وہ عظیم الشان تجدیدی کارنامے جو انہوں نے عہد جہانگیری میں انجام دیئے اظہر من الشمس ہیں چنانچہ مرحوم نے اسی کتاب میں حضرت مجدّد کی خدمت میں بایں الفاظ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

تیسرا شعر :۔ ظاہر پرست ملّاؤں کی تنگی نظر کا شکوہ کرتے ہیں کہ اے خدا! عشق و محبت کی باتیں ان لوگوں کی نظر میں موجب ملامت ہیں اس لئے نثر میں وارداتِ عشق کا بیان تو مدت سے ختم ہو چکا ہے لے دے کے میری غزلوں میں یہ رنگ کہیں کہیں پایا جاتا ہے لیکن یہ لوگ اس کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔

یہ شعر رمز و ایما کی بہترین مثال ہے اقبالؔ نے شعر میں "شراب" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ "مینائے غزل" سے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ قاری کا ذہن خود بخود اس کی طرف منتقل ہو جائے۔

چوتھا شعر:۔ اے خدا! مسلمانوں میں مدتوں سے تحقیق کا ذوق ختم ہو چکا ہے خانقاہوں اور مدرسوں میں جو لوگ مسند ارشاد و درس پر بیٹھے ہوئے ہیں وہ زیادہ تر اسلاف پرستی اور تقلید کور میں مبتلا ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی ترقی بند ہو گئی ہے۔

پانچواں شعر:۔ اگلے وقتوں میں عام دستور یہ تھا کہ علماء تحصیل علوم کے بعد کسی نہ کسی شیخ کامل کی صحبت میں رہ کر تکمیل سلوک بھی کرتے تھے اور اس طرح علم کے ساتھ ساتھ عشق کی دولت بھی حاصل کرتے تھے لیکن اب یہ حالت ہے کہ عشق کی شمشیر برّاں تو غائب ہو چکی ہے۔ اہل علم کے ہاتھ میں محض خالی نیام رہ گیا ہے۔

جس طرح محض نیام اگر اس کے اندر تلوار نہ ہو قطعاً بیکار ہے اسی طرح محض ظاہری علوم عشق کے بغیر بالکل بے سود ہیں کیونکہ خدا کی معرفت کا ذریعہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا محرک علم نہیں بلکہ عشق ہے اور اگر عشق کے ساتھ علم بھی ہو تو پھر "نور علیٰ نور" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ اے خدا! تیرے فضل و کرم سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے کہ اگر شاعر کا سینہ تیری محبت کے نور سے روشن ہو تو اس کی شاعری خود اس کے اور بنی آدم کے حق میں زندگی کا پیغام بن جاتی ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو وہی شعر و سخن اس کے اور اس کی قوم کے لئے سخت تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔

اس شعر میں اقبالؔ نے ہمیں شاعری کا معیار بتایا ہے کہ سچی شاعری وہ ہے جس سے انسانوں کے اندر پاکیزہ جذبات پیدا ہوں اور پاکیزہ جذبات وہ شاعر پیش کر سکتا ہے جس کا دل محبت الٰہی سے لبریز ہو یہ جو کہا گیا ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری" تو یہ مقولہ اسی شاعری پر صادق آتا ہے جس سے خیالات اور افکار میں اصلاح ہو سکے جو شاعری یہ فرض انجام نہیں دے سکتی وہ مخرب اخلاق ہے اس لئے قوموں کے حق میں "مرگ دوام" کی مصداق ہے۔

ساتواں شعر:۔ اے خدا! تو اپنے فضل و کرم سے میرے سینہ کو اپنے الہام کی روشنی سے منور کر دے اور اوہام باطلہ کی تاریکی کو دور کر دے کیونکہ تیری ذات منبع خیر و برکت ہے اور تیرے پیمانہ (الہام) میں ماہ تمام (کامل ہدایت) جلوہ گر ہے پس جب تو مجھے اپنی الفت کا جام پلائیگا تو یقیناً میرا دل منور ہو جائے گا۔

رباعی

وہی اصل مکان ولامکاں ہے	مکاں کیا شئے ہے؟ انداز بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے	اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

اس رباعی میں اقبالؔ نے وحدۃ الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے بایں معنیٰ کہ درحقیقت ذات باری کے سوا اور کسی شئے کا مستقل وجود نہیں ہے چنانچہ زمان و مکان کی بھی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے ضرب کلیم میں انہوں نے اس صداقت کو نہایت صفائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری	نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

یعنی خدا کے سوا کسی شئے کا حقیقی وجود نہیں یا درحقیقت کوئی شئے موجود نہیں ہے اسی بات کو دوسرے پیرایہ میں اس رباعی میں بیان کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ مکان اور لامکان دونوں کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے دراصل صرف خدا ہی موجود ہے اور وہی مکان اور لامکان کی اصل ہے ورنہ بذات خود مکان کی کوئی اصل یا بنیاد نہیں ہے نہ اس کا کوئی مستقل خارجی وجود ہے تو پھر مکان ہے کیا؟ صرف انداز بیان ہے یعنی حضرت انسان نے اپنے مافی الضمیر کو سمجھانے کے لئے زمان و مکان کی دو اصطلاحیں وضع کر لی ہیں ورنہ درحقیقت۔

نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

اللہ کے سوا اور کوئی شئے حقیقی معنی میں موجود نہیں ہے۔

ہم اپنی روزمرہ گفتگو میں مجبور ہیں کہ زمان و مکان کی مدد سے اپنا مدعا واضح کریں مثلاً کوئی شخص ہم سے سوال کرے کہ کل آپ کہاں گئے تھے؟ تو ہم جواب میں کہیں گے کہ میں کل صبح شاہدرہ گیا تھا اب اس جملہ میں زمان و مکان دونوں تصورات موجود ہیں لیکن ان کا وجود حقیقی نہیں ہے اور نہ یہ دونوں خارج میں کہیں موجود ہیں بلکہ محض ذہنی اعتبارات ہیں۔

پیام مشرق میں زمانہ انسان سے کہتا ہے۔

تو رازِ درونِ من، من رازِ درونِ تو

از جانِ تو پیدائم، در جانِ تو پنہانم

یعنی میں تجھ سے پیدا ہوا ہوں مگر تجھی میں پوشیدہ ہوں تجھ سے الگ ہو کر میرا کوئی وجود نہیں ہے اسی حقیقت کو اسرار خودی میں اس طرح بیان کیا ہے۔

زندگی دہر است و دہر از زندگی است
لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فرمانِ نبی است

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کی اپنی حقیقت کیا ہے؟ اس کا اپنا بھی تو کوئی مستقل وجود نہیں ہے وہ خود اللہ کی صفت تخلیق کی تجلی کا ایک کرشمہ ہے لہٰذا انجام کار بات اسی ذات بیچگوں پر آکر منتہی ہوتی ہے کس قدر عظیم الشان صداقت ہے جس کا اظہار قرآن حکیم نے اس آیت میں کیا ہے۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (۵۳ : ۴۲) اور یہ کہ سب کو تیرے رب تک پہونچنا ہے یعنی تمام علوم و افکار اور سلسلہ وجود کی انتہا اسی کی ذات پر ہوتی ہے۔

اب ہم اس حقیقت کو کہ مکان غیر حقیقی ہے دوسرے انداز سے واضح کرتے ہیں تاکہ جو لوگ تصوّف کا مذاق نہیں رکھتے وہ بھی اقبال کے مسلک سے آگاہ ہو جائیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ مکان کا وجود غیر حقیقی ہے یا وہ خارج میں موجود نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ از روئے علم طبیعات مکان نام ہے جسم حاوی کی سطح باطن کا جو جسم محوی کی سطح ظاہر سے مماس ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو صدرا یا شمس بازغہ: بحث مکان۔ اب غور کیجئے کہ سطح خواہ باطنی ہو یا ظاہری بہرحال خط سے پیدا ہوتی ہے اور خط نقاط کے مجموعہ کا نام ہے اور نقطہ خارج میں کہیں موجود نہیں کیوں کہ خارج میں جب آپ نقطہ کو ظاہر کریں گے تو وہ جسم ہوگا نہ کہ نقطہ چنانچہ اسکول کا ہر طالب علم جس نے جیومیٹری پڑھی ہے بخوبی

---

[1] یعنی زمانہ دراصل استمرارِ وجود باری تعالیٰ ہی کا دوسرا نام ہے۔

جاتا ہے کہ نقطہ کا محل تو متعین ہو سکتا ہے لیکن اس میں جسامت نہیں پائی جاتی اس سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ نقطہ کا وجود ذہنی ہے نہ کہ خارجی اس لئے مکان کا وجود بھی ذہنی ہے نہ کہ خارجی ۔

اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ جب مکان کا خارج میں وجود نہیں ہے تو پھر ہم کہاں ہیں؟ آپ کہاں ہیں؟ یہ کائنات کہاں ہے؟ واضح ہو کہ اقبال نے اس شعر میں خود ہی سوال کیا ہے ۔

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم آپ اور یہ کائنات جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب اسی کی ذات میں ہے اس کے علاوہ اس سے علٰحدہ یا اس سے جدا ہو کر کسی شئے کا مستقل وجود ہی کہاں ہے؟ اس کے علاوہ اور کوئی شئے موجود ہی کب ہے؟

اس نکتہ کو اقبالؔ نے رباعی کے دوسرے شعر سے ثابت کیا ہے کہتے ہیں کہ اگر مچھلی خضر سے پوچھے کہ دریا کہاں ہے تو آپ ہی انصاف کیجئے کہ خضر اسے کیا بتائے؟ مچھلی تو خود دریا ہی میں ہے دریا سے باہر مچھلی کا وجود کہاں ہے؟

اسی طرح اگر انسان یہ دریافت کرے کہ خدا کہاں ہے؟ تو کوئی کیا جواب دے سکتا ہے جبکہ سائل اور مجیب دونوں خدا ہی کے وجود محیط میں ہیں بالفاظ دگر خدا کہاں نہیں ہے ۔

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہ ہو

اسی حقیقت کو انگریزی کے اس مشہور مقولہ میں واضح کیا گیا ہے

"We live and move and have being in Him"

ہم خدا ہی میں رہتے ہیں اسی میں حرکت کرتے ہیں اور اسی میں ہمارا وجود ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جب کائنات کا خارج میں مستقل وجود نہیں ہے۔ تو زمان و مکان بھی خارج میں موجود نہیں ہیں چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی اپنے مکتوب ۵۸ جلد سوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ

"بایں تحقیق معلوم گشت کہ ہیچ چیز غیر از حق جل وعلا در خارج موجود نیست چہ اعیان وچہ آثار اعیان بلکہ ثبوت اینہا در مرتبۂ حس و وہم است۔"

یعنی اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ خدائے تعالیٰ کے سوا خارج میں کوئی چیز موجود نہیں ہے نہ اعیان اور نہ ان کے آثار بلکہ ان اعیان و آثار کا ثبوت بھی حسی اور وہمی مرتبہ ہی میں ہو سکتا ہے۔ (نہ کہ خارجی اور حقیقی مرتبہ میں)

حسن خود جلوہ ہے خود عشق ہے خود ذات وصفات
یہی اک نقطۂ حقیقت ہے کل افسانوں کی (جگر)

نویں غزل

لٹا دیا مرے ساقی تے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شورِ چنگ و رباب
سکوتِ کوہ ولبِ جوئے و لالۂ خود رو

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سُبو

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا
صفائے پاکیٔ طینت سے ہے گہر کا وضو

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریان و بے تیغ و سناں عشق

پہلا شعر :۔ اس بے نظیر مطلع کے دوسرے مصرع میں لَا اِلٰہ اِلَّا ھُوْ۔ سورۂ حشر کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ یعنی اللہ وہ ذات پاک ہے جس کی صفت یہ ہے کہ اس کے سوا اس ساری کائنات میں اور کوئی اِلٰہ یعنی معبود مسجود نہیں ہے

اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ لا الٰہ الّا ھُوْ کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔؟

پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ الٰہ صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے یعنی اللہ اور الٰہ باہم مرادف (ہم معنی) ہیں اللہ ہی اِلٰہ ہے اور الٰہ ہی اللہ ہے۔

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کا وجود حقیقی ذاتی یا اصلی نہیں ہے یعنی اس کے علاوہ حقیقی معنی میں اور کوئی موجود نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ الٰہ کے ایک ہی معنی ہیں پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ الٰہ کے سوا حقیقی معنی میں اور کوئی موجود نہیں ہے دنیا میں جو کچھ نظر آتا ہے اس کا وجود ظلّی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اب شعر کا مطلب واضح ہو گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ جب مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوْ۔ واضح ہو کہ لا الٰہ الا اللہ ۔ یا لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ دونوں کا مطلب یہی ہے کہ حقیقی معنی میں اللہ کے سوا اور کوئی شئے موجود نہیں ہے اور اسی کو لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ یا لاموجود الّا ھُوْ کہتے ہیں۔ تو میں اور تو کا امتیاز خود بخود زائل ہو گیا۔

واضح ہو کہ ،، عالم من و تو ،، سے وہ امتیازات مراد ہیں جو ہم نے اپنی

جہالت یا حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر قائم کر لئے ہیں۔ میں تو اور وہ
یہ وہ ضمائر (PRONOUNS) ہیں جو ہم نے اپنی سہولت گفتگو اور اظہار
خیالات کے لئے وضع کر لئے ہیں اور انہی ضمائر کی بنا پر ہم امتیازات پیدا
کرتے ہیں۔ مثلاً۔

یہ میرا مکان ہے۔ یہ تیرا باغ ہے۔ یہ اس کا کھیت ہے۔
یہ میں ہوں یہ تو ہے یہ وہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جب سالک پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس ذات پاک کے
علاوہ اور کوئی ہستی حقیقی معنی میں موجود ہی نہیں تو یہ عالم من و تو، خود بخود
مٹ جاتا ہے کیونکہ جب حقیقی معنی میں نہ میں موجود ہوں نہ تو موجود ہے صرف
وہی وہ موجود ہے تو پھر "من و تو" کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا یہ تصورات
تو اس وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب انسان اپنے آپ کو اور دوسروں کو موجود
یقین کرتا ہے لیکن جب یہ یقین ہو جائے کہ اس کے سوا حقیقی معنی میں کوئی موجود
ہی نہیں تو یہ "من" کا وجود باقی رہا نہ "تو" کا۔ یہ وحدۃ الوجود کا وہی اعتدالی
مسلک ہے جو اقبال نے حضرت مجدد الف ثانی کی اتباع میں اختیار کیا ہے اور
اس کی تشریح گذشتہ صفحات میں ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں۔

شعر کا مطلب تو (جیسا کچھ میں سمجھ سکا) میں نے اپنی فہم ناقص کے مطابق
بیان کر دیا لیکن اقبال نے اپنے اسلوب بیان کی بدولت جو بے پناہ دلکشی اس
شعر میں پیدا کر دی ہے اس کا اظہار الفاظ کے ذریعہ سے ناممکن ہے ہاں ایک
نکتہ ہدیۂ ناظرین کئے دیتا ہوں۔

اقبال نے "مٹ گیا" نہیں کہا۔ "مٹا دیا" کہا ہے یعنی شاعر نے فعل
کی نسبت ساقی کی طرف کر کے اس شعر میں غضب کی وجد آفریں کیفیت پیدا کر دی

ہے۔ اس نکتہ سے وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو علم معانی سے واقف ہیں۔ اب میں ساری بحث کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں۔

لَا اِلٰہ اِلَّا ھُوَ۔

اللہ ہی الٰہ ہے (اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے)

(اور یہ مسلم ہے کہ) اللہ ہی موجود ہے (اس کے سوا کوئی اور موجود نہیں ہے)

اس لئے لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوَ ثابت ہے۔

یعنی لَا اِلٰہ اِلَّا ھُوَ کے معنی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ لَا اِلٰہ اِلَّا ھُوَ سے عالم من و تو، مٹ گیا۔

اسی لئے صوفیائے کرام جب کہتے ہیں کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ تو اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ لَا اِلٰہَ وَلَا مَعْبُوْدَ وَلَا مَقْصُوْدَ وَلَا مَطْلُوْبَ وَ لَا مُؤَثِّرَ فِی الْوُجُوْدِ وَ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوَ یعنی اس کے سوا اس کائنات میں نہ کوئی الٰہ ہے نہ کوئی معبود ہے، نہ کوئی مقصود ہے نہ کوئی مطلوب ہے نہ وجود میں کوئی مؤثر ہے نہ کوئی موجود ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں اقبالؔ نے اس کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے جو اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد سالک پر طاری ہوتی ہے کہ کائنات میں اللہ کے علاوہ اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔

واضح ہو کہ جب تک انسان یہ سمجھتا ہے کہ کائنات کی اشیاء کا وجود حقیقی ہے تو وہ ان کو لذت و سرور یا راحت و تسکین کا ذریعہ سمجھتا ہے اور ان کی طرف ملتفت ہوتا یا ان کے حصول کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن جب اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ،

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوَ۔

یعنی اس کے سوا، یا اس کی تجلیات کے سوا کائنات میں اور کوئی موجود ہی نہیں ہے تو لذت اور سرور کا سرچشمہ خود اس کی ذات بن جاتی ہے۔ غیر خارجی اشیاء سے لذت و سرور حاصل کرنے کا تصور اس کے دماغ سے نکل جاتا ہے کیونکہ جب خارج میں کوئی موجود ہی نہیں تو لذت و تسکین کس سے حاصل کی جائے۔

جب سالک اس مقام پر پہونچتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ یعنی ساری کائنات خود میرے اندر موجود ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ثابت ہو چکا ہے کہ نہ میں ہوں نہ تو ہے صرف وہی وہ ہے جسے میں "میں" سمجھتا ہوں یہ بھی اسی کی صفت کی تجلّی ہے اور جسے میں "تو" سمجھتا ہوں وہ بھی اسی کی صفت کا پرتو ہے۔ کیا خوب کہا ہے حضرت حاجی صاحب قبلہ نے[1]

دو عالم میں نہیں موجود و مشہود
بجز ذات و صفات افعال و آثار

یعنی کائنات میں اللہ کے سوا کسی غیر کا وجود نہیں ہے جو کچھ ہے وہ اس کی ذات ہے یا اس کی صفات ہیں یا ان کے افعال ہیں یا ان افعال کے آثار ہیں۔

---

[1] تمام اکابر دیوبند مثلاً حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی مرحوم، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم اور مولانا محمود حسن شیخ الہند مرحوم کے مرشد اور روحانی پیشوا حضرت شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد غلام آباد ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ کو وطن بنا لیا اور وہیں ۱۳۱۷ھ میں رحلت فرمائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۲

الغرض کائنات کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے جو کچھ نظر آتا ہے یہ میرا ہی علم ہے یہ کائنات میرے ہی ذہن کی بدولت موجود نظر آتی ہے اور میں کیا ہوں؟ اس کی صفت ربوبیت کا پرتو اس کے علاوہ میری کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اب ہم یہ واضح کرتے ہیں کہ کائنات کا تحقق نفس مدرک کے وجود پر منحصر ہے۔

(ا) اندھے کی نظر میں۔ اس کائنات میں روشنی اور رنگ کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے گلاب اور چمبیلی۔ بنفشہ اور لالہ۔ سب بے معنی الفاظ ہیں کیونکہ وہ گلابی رنگ کا تصور کرسکتا ہے نہ سفید کا نہ بنفشی کا نہ سرخ کا۔

(ب) بہرے کی نظر میں اس کائنات میں آواز کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے۔ بلبل کا نغمہ، اور کوئل کی کوک بھیرویں اور کھماج کا الاپ یا پیلو اور دیس کی دھن سب اس کے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔

(ج) گونگے کی نظر میں تقریر، خطاب، وعظ یا درس کا کوئی وجود نہیں ہے وہ صرف اشاروں سے اپنا مطلب واضح کرسکتا ہے۔

(د) جو شخص قوتِ شامہ سے محروم ہے اس کی نظر میں خوشبو یا بدبو کا کوئی وجود نہیں ہے عطر، سینٹ، لیونڈر، ابٹن، غازہ، کریم پوڈر اور یوڈی کلون سب بے معنی الفاظ ہیں۔ گلاب کی خوشبو، جوہی کی بھینی بھینی مہک، رات کی رانی اور مولسری کی دلکش خوشبو، یہ سب بے معنی تراکیب ہیں۔ اس کے لئے طبلۂ عطار اور عفونت مردار، دونوں یکساں ہیں۔ نہ اسے عطار سے الفت ہے نہ مردار سے نفرت ہے کیونکہ اس کی رائے میں دونوں معدوم ہیں۔

(ہ) جو شخص قوتِ ذائقہ سے محروم ہے اس کی نظر میں نہ مٹھاس کا وجود

ہے نہ کھٹّا اس کا، شیرینی اور ترشی دونوں بے معنیٰ لفظ ہیں، میٹھا، کھٹّا، کڑوا کسیلا، سیٹھا، پھیکا اور چٹ پٹا ان میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہے اس کے لئے لیموں اور انگور دونوں یکساں ہیں۔

(۵) جو شخص قوت لامسہ سے محروم ہے۔ چکنا، کھردرا، سخت، نرم ٹھوس اور ملائم یہ سب الفاظ مہمل اور بے معنیٰ ہیں کیونکہ اس کے نزدیک ان میں سے کوئی شئے موجود نہیں ہے۔

اب ایسے شخص کا تصوّر کیجیے جو اندھا بھی ہو۔ بہرا بھی۔ گونگا بھی ہو اور قوائے شامہ وذائقہ ولامسہ سے بھی محروم ہو اس کے بعد خود انصاف کیجیے کہ کیا اس کی نظر میں خارج میں کسی شئے کا وجود متحقق ہو سکتا ہے؟ پس ثابت ہوا کہ

بادہ از ما مست شد نے ما ازو

پیکر از ما ہست شد نے ما ازوؔ[1]

میرا مطلب اس طویل تقریر سے یہ ہے کہ جو بات ایک فلسفی کہتا ہے کہ نفس مدرک سے باہر کسی شئے کا وجود نہیں ہے وہی بات ایک صوفی کہتا ہے کہ فلسفی کی بات ہم غور سے سنتے ہیں اور اس پر بخوشی ایمان لے آتے ہیں مگر صوفی کی بات سن کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اسے خلاف عقل قرار دیتے ہیں حالانکہ اسی بات کو اگر فلسفیانہ انداز سے بیان کر دیا جائے تو بلا تامل تسلیم کر لیتے ہیں یہ کیوں؟ اس لئے انگریز علیہ ما علیہ نے مسلمانوں کو اسلامی علوم

---

[1] مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ شراب میں مستی ہماری وجہ سے ہے نہ یہ کہ ہم شراب سے مست ہوتے ہیں اور قالب جسمانی ہماری وجہ سے ہست ہوا ہے نہ یہ کہ ہم اس کی وجہ سے ہست ہوئے ہیں۔

سے بالکل بیگانہ کردیا ہے۔ یورپ خواہ کتنی ہی مہمل بات کیوں نہ کہے۔ ہم بلا تامل، اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ لیکن صوفی کتنی ہی معقول بات کیوں نہ پیش کرے، ہم فوراً اُسے رجعت پسندی سے تعبیر کردیتے ہیں۔ مارکس اور لینن کی خرافات پہ بلا چون وچرا ایمان لے آتے ہیں لیکن اقبال کے پیغام میں تضاد نظر آتا ہے۔ اسی حقیقت کو اکبر الٰہ آبادی نے اپنے مخصوص رنگ میں یوں بیان کیا ہے۔

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز
جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

الغرض جب سالک پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے تو کیف وسرور کے حصول کے لئے دنیا کی کسی شے کی طرف ملتفت نہیں ہوتا نہ اسے شراب کی ضرورت ہوتی ہے نہ ساقی کی نہ شعر کی حاجت ہوتی ہے۔ نہ مطرب کی۔ بلکہ وہ ان تمام کھیل تماشوں اور عارضی دلفریبیوں سے یکسر قطع تعلق کرکے خود غرضی اور دغابازی بلیک مارکیٹ اور نفع اندوزی دھوکہ اور فریب کی دنیا سے بہت دور چلا جانا چاہتا ہے۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں۔ رقص وسرور کی محفلوں اور معصیت سے لبریز سیرگاہوں سے متنفر ہوجاتا ہے کیونکہ یہ سب کھیل تماشا ہے سب دھوکہ کی پونجی ہے سب فریب نظر ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

لہ قرآن مجید نے خود اس دنیا کے لئے یہی الفاظ استعمال کئے ہیں۔ صرف دو آیتیں لکھتا ہوں (ا)، وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکہ کی پونجی۔ (ب) مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ۔ (سورہ انعام ع ۴) نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر کھیل اور تماشا۔ ۱۲ر

دنیا پرست لوگ جو اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ شراب، شعر، عورت اور طاؤس و رباب میں تسکین قلبی کا سامان تلاش کرتے ہیں لیکن وہ جس کی نگاہ دل وجود کو چیر کر حقیقت کو دیکھ چکی ہے یعنی وہ جو اس حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہے کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ وہ ان کھیل تماشوں کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ

سکوت کوہ لب جوئے دلالۂ خود رو

سے حقیقی لذت اور سرور حاصل کرتا ہے کیونکہ اسے پہاڑ کی خاموشی اور دریا کے ساحل اور لالۂ صحرائی غرضکہ ہر شئے میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

اس حقیقت کو اکبر الہ آبادی نے بڑے دلپذیر انداز سے پیش کیا ہے۔

صاف آئے گی نظر صانعِ عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھ آئینۂ فطرت کے سوا
تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں پیدا دفتر
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

یہ جو کچھ نظر آتا ہے سب اس کی قدرت کا کرشمہ ہے ورنہ کائنات کی بذات خود کوئی حقیقت نہیں ہے۔

لَو شمع حقیقت کی ہے اپنی جگہ قائم
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

تیسرا شعر:۔ جو لوگ مرشد کامل کے ہاتھ سے میخانۂ یثرب کی کھینچی ہوئی شراب طہور کا ایک جام بھی پی لیتے ہیں ان کے اندر اس درجہ بے نیازی کی شان پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اگر کسی وقت چشمۂ حیواں، آبحیات کے کنارے پہونچ جاتے ہیں تو اس کے پینے کی آرزو مطلق ان کے دل میں

پیدا نہیں ہوگی بلکہ وہ اپنی شان استغنار کا اثبات کرنے کے لئے اپنا "سبو" بھی توڑ دیتے ہیں۔

اس بے نیازی کا سبب یہ ہے کہ جسے باعثِ ایجادِ عالم یعنی ساقیٔ یثرب صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستِ حیات بخش سے اپنی محبت کا جام پلا دیں اسے ابدی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔

لہ اس جگہ ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم تو حریم قدس میں آرام فرما رہے ہیں جو عرشِ الٰہی سے بھی نازک تر ہے جہاں حضرت جنیدؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ ہوش و حواس گم کر بیٹھے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مرشد کامل کا ہاتھ قلبی طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک ہے اب اگر یہ وسوسہ لاحق ہو کہ مرشد کامل کا ہاتھ کملی والے صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح کملی والے کا ہاتھ خود اللہ کا ہاتھ ہے پڑھو آیت قرآنی تاکہ عشق کی آگ اور تیز ہو جائے اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (سورۃ فتح آیت ۱۰) یعنی اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو لوگ صلح حدیبیہ کے وقت تمہارے ہاتھ پر قتال فی سبیل اللہ کی بیعت کر رہے ہیں وہ تم سے نہیں بلکہ خدا ہی سے بیعت کر رہے ہیں تمہارا نہیں بلکہ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

دعا منجانب راقم الحروف

اے اللہ! مجھ کو اور ناظرین کتاب کو اپنے فضل و کرم سے کہ انہوں نے تیرے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطہ سے تجھ سے بیعت کی ہے اسے قبول فرما آمین۔

چوتھا شعر:۔ اقبال کہتے ہیں کہ آج کل خانقاہوں میں یا تو مجاور باقی رہ گئے ہیں جنہوں نے جاگیریں اپنے نام باقاعدہ الاٹ کرا رکھی ہیں اور تمام مقامی بدقماش لوگوں کی سرپرستی کو اپنا مشغلۂ حیات بنا رکھا ہے یا کچھ گورکن ہیں جو زندہ درگور کا مصداق بنے بیٹھے ہیں جن کی گذر اوقات کا ذریعہ کفن فروشی بلکہ کفن دزدی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اس لئے وہ قوم کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ "مرا سبو چہ غنیمت ہے اس زمانہ میں" یعنی میرا کلام ان حقائق و معارف سے لبریز ہے جو کسی زمانہ میں خانقاہوں سے حاصل ہو سکتے تھے اب چونکہ خانقاہوں میں اسلاف پرستی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے میرے کلام کو غنیمت سمجھو اور جاہل صوفیوں کی صحبت میں تضییع اوقات سے یہ بہتر ہے کہ خلوت میں میرے کلام کا مطالعہ کرو۔[1]

اگر ہو شوق تو خلوت میں پڑھ زبور عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

پانچواں شعر:۔ شاعر اپنے محبوب سے خطاب کرتا ہے کہ میں

---

[1] ابھی تک تو قوم نے اس مردِ قلندر کے مشورہ پر عمل کیا نہیں اور جب تک کراچی اور لاہور کے ہوٹل برقرار ہیں مستقبل قریب میں اس کے کوئی آثار نظر آتے ہیں ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ اس کے کلام کا کچھ حصہ قوالوں اور ارباب نشاط کے ہتھے چڑھ گیا ہے چنانچہ کبھی کبھی اقبال مرحوم کا سبوچہ قوالی کی آرائش میں کام آجاتا ہے۔ اور سامعین دو دو چار چار گھونٹ پی لیتے ہیں۔ سچ کہا ذوق مرحوم نے۔

لاشئے کو دفن کیجئے میرے کہ پھینک دیجئے
مردہ بدست زندہ جو چاہئے سو کیجئے

ابھی نیاز مندی (اطاعت) کے رنگ میں پختہ نہیں ہوا ہوں اس لئے مناسب ہے کہ تو ابھی مجھ سے پردہ کرے (بے حجابانہ) میرے سامنے نہ آیئے۔ میرا دل تو قابو سے باہر ہے ہی۔ لیکن میری نگاہ میرے دل سے بھی زیادہ بے قابو ہے میں ڈرتا ہوں مبادا مجھ سے تیری جناب میں کوئی گستاخی سرزد ہو جائے اور اس کی پاداش میں تو مجھے راندۂ درگاہ کردے۔

واضح ہو کہ یہ بالکل حافظ اور جامی کا رنگ ہے جو حضرت اقبالؒ نے بال جبریل کی اکثر غزلوں میں اختیار کیا ہے مثلاً اس شعر سے محبوب بھی مراد ہو سکتی ہے اور محبوب حقیقی بھی مراد ہو سکتا ہے۔ اس تقدیر پہ شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ اے خدا میرے اندر ابھی شیوۂ تسلیم و رضا پورے طور سے پیدا نہیں ہوا ہے کیونکہ سلوک کے کوچہ میں بالکل تازہ وارد ہوں مجھ سے حجاب ہی مناسب ہے مبادا شوق ملاقات میں حدود نیاز مندی سے متجاوز ہو جاؤں اور اس کا نتیجہ یہ لازمی طور پر یہ ہوگا کہ میری روحانی ترقی رک جائے گی۔

چھٹا شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ موتی اگرچہ سمندر کی موجوں میں رہتا ہے لیکن سمندر کے پانی کے بجائے اپنی پاکیٔ طینت کی صفائی سے وضو کرتا ہے چنانچہ اس کی فطرت پاکیزہ ہے اس لئے وہ سمندر میں رہنے کے باوجود سمندر کی کثافت اور تلخی اور عفونت اور گندگی سے اپنے آپ کو آلودہ نہیں کرتا۔

اسی طرح جو لوگ بالطبع نیک اور متقی ہیں وہ بدکاروں اور ناپاک ماحول میں رہ کر بھی اپنی نیکی اور پاکیزگی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

ہندی کے مشہور شاعر عبدالرحیم خانخاناں نے بھی اسی مضمون کو اپنے دوہے میں نظم کیا ہے۔

چندن وِش ویاپت نہیں لپٹت رہیں بھجنگ

صندل کے درخت میں زہر سرایت نہیں کرتا اگرچہ کالے ناگ رات دن اس سے لپٹے رہتے ہیں۔

ساتواں شعر:۔ اقبال نے اس شعر میں اپنا مخصوص فلسفہ بیان کیا ہے جس کی طرف میں گذشتہ اشعار کی تشریح میں اشارہ بھی کر چکا ہوں کہ اگر نفس مدرک نہ ہو تو اس کائنات کا وجود ہی ثابت نہیں ہو سکتا۔

کہتے ہیں کہ فطری شاعر کی نگاہ میں ایسا جادو پوشیدہ ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ کے فیض سے گل و لالہ زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے لگتے ہیں کس طرح اس کی تفصیل یہ ہے کہ شاعر کی آنکھ عام آدمیوں کی آنکھ سے زیادہ قوی اور تیز ہوتی ہے اس لئے اس کو گل و لالہ میں وہ خوبیاں نظر آجاتی ہیں جو عام آدمیوں کو نظر میں نہیں آسکتیں۔

واضح ہو کہ اس بات میں دو مشہور مسلک ہیں جو افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے متداول چلے آرہے ہیں۔

ایک گروہ کا (جس کا سرخیل افلاطون ہے) یہ خیال ہے کہ جو کچھ ہے وہ نفس مدرک کے اندر ہی ہے خارج میں کسی چیز کا وجود نہیں ہے نفس مدرک بظاہر خارجی کو وجود عطا کرتا ہے فلسفہ کی اصطلاح میں اس کو تصوریت (Idealism) کہتے ہیں۔

دوسرے گروہ کا (جس کا قافلہ سالار ارسطو ہے) یہ مسلک ہے کہ اشیائے کائنات اپنے تحقق وجود میں نفس مدرک کی محتاج نہیں ہیں بذات خود قائم ہیں۔ مثلاً گلاب کی خوشبو، گلاب میں قائم ہے اور موجود ہے خواہ کوئی سونگھنے والا ہو یا نہ ہو۔ اس مسلک کو خارجیت (Realism) کہتے ہیں۔

اب اس شعر کی دو طریقوں سے تشریح کر سکتے ہیں۔

(ا) شاعر اپنی حقائق بیں نظر کے فیض سے حسین چیزوں کے حسن میں اضافہ کرسکتا ہے اس کی نگاہ اشیائے کائنات میں حسن پیدا کرسکتی ہے اور حسین چیزوں کو حسین تر بنا سکتی ہے۔

(ب) دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ شاعر اشیائے کائنات میں اس حسن کو بھی دیکھ سکتا ہے جو ان میں موجود تو ہے لیکن عام آدمیوں کی نگاہ سے مخفی ہے۔

بہر حال خواہ پہلی صورت ہو یا دوسری۔ یہ بات مسلّم ہے کہ شاعر کی قوت تخیل عام آدمیوں سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوتی ہے چنانچہ اسی قوت کی بدولت وہ نئے نئے مضامین پیدا کرتا ہے اور اسی قوت کی بدولت وہ کائنات کی بے جان چیزوں کو زندہ تصور کرکے ان سے باتیں کرتا ہے۔ استعارہ اور کنایہ۔ مجاز مرسل اور مجاز عقلی وغیرہ یہ سب اسی قوت کی بدولت ظہور میں آتے ہیں اگر یہ قوت نہ ہو تو بازار شاعری کی ساری رونق ایک آن میں ختم ہوجائے۔

رباعی

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق　　کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش　　کبھی عریان و بے تیغ و سناں عشق

اس رباعی میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ عشق کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ بالفاظ دگر عاشقوں کی متعدد انواع و اقسام ہیں۔

(ا) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عشق انسان کو آوارہ اور بے خانماں کر دیتا ہے چنانچہ جب کفار مکہ نے صحابہ کرامؓ کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے جرم میں ترک وطن پر مجبور کیا تو شمع رسالتؐ کے یہ پروانے خوشی خوشی اپنا گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے یعنی بے خانماں ہو گئے۔

(۲) اسی عشق کی بدولت کبھی انسان بادشاہی کے مرتبہ پر پہونچ جاتا ہے۔ مثلاً حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آباؤ واجداد بادشاہ نہیں تھے لیکن عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بدولت ان کو یہ مرتبہ حاصل ہوگیا۔

(۳) اسی جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر کبھی مسلمان ذرہ پوش ہو کر میدان جنگ میں آتا ہے۔ مثلاً حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت یہ طاقت حاصل ہوگئی تھی کہ انہوں نے ہر میدان میں دشمنان اسلام کو شکست دی اور جنگ موتہ میں آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ میں ٹوٹ گئی تھی۔

(۴) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عاشق بغیر ساز وسامان ظاہری اور بے تیغ وسنان کے میدان جنگ میں آجاتا ہے۔ مثلاً جب حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جہانگیر بادشاہ کے دربار میں افضل الجہاد؛ یعنی کلمۂ حق کہنے کے لئے تشریف لائے تو آنجناب کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔

دسویں غزل

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

پہلا شعر: - اس شعر میں اقبال نے عشق کی اہمیت اور قدر و قیمت واضح کی ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب کے حصول کی آرزو سے انسان کے اندر درد اور سوز کی جو کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ عاشق کی نظر میں اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مقامِ بندگی (آرزومندی) کے عوض اگر مجھے شانِ خداوندی بھی ملے تو قبول نہ کروں۔

یہ محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے جسے شاعر نے رنگ نیاز کی اہمیت کو ذہن نشین کرنے کی غرض سے اختیار کیا ہے اس جگہ مقامِ بندگی سے شانِ نیاز اور شانِ خداوندی سے مرتبۂ ناز مراد ہے شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ مرتبۂ نیاز مرتبۂ ناز سے زیادہ دلکش ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ اس مصرع میں "شانِ خداوندی" سے شانِ الوہیت یا خالقیت مراد نہیں ہے۔

دوسرا شعر: - اس شعر میں اقبال نے آزاد بندوں کی صفت بیان کی ہے۔ واضح ہو کہ کلامِ اقبال میں "آزاد" ایک اصطلاح ہے جس سے مراد ہے وہ شخص جو اللہ سے خالص محبت کرتا ہو کسی صلہ یا جزا مثلاً جنت کا خواہاں نہ ہو لیکن اس شعر میں اس لفظ کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ "آزاد" وہ ہے جو کسی قسم کی پابندی گوارا نہ کرے الغرض آزاد سے وہ عاشقِ صادق مراد ہے جو کائنات میں کسی غیر کی طرف سے عائد کردہ پابندی کو قبول نہ کرے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے خدا! سچی بات تو یہ ہے کہ تیرے آزاد بندے یعنی وہ بندے جو تیری محبت کی قید میں ہیں ان کے اندر قیود و حدود سے اس درجہ بُعد پیدا ہو گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ نہ یہاں خوش رہ سکتے ہیں نہ وہاں کیونکہ یہاں مرنے کی پابندی ہے اور وہاں جینے کی پابندی ہے۔

داخلہ ہو کہ یہ شعر بھی شاعرانہ انداز بیان کی ایک عمدہ مثال ہے مقصد شاعر کا یہ ہے کہ جو شخص ذات کا طالب ہوتا ہے وہ کسی قسم کی پابندی پسند نہیں کرتا لیکن اقبال نے اس بات کے اظہار کے لئے اسلوب بیان ایسا دلکش اختیار کیا ہے کہ یہ شعر بھی مطلع کی طرح تحسین سے بالاتر ہو گیا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے خدا! جب میں غور کرتا ہوں تو تیری دیر یابی (دیر میں مانوس ہونا) عاشق کے حق میں بہت مفید ثابت ہوتی ہے کیونکہ تو جس قدر مجھ سے اجتناب کرتا ہے اسی قدر تجھ سے ملنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ شاہین چونکہ پرندوں کا درویش ہے اور آشیاں بندی کو اپنے لئے موجب ذلت سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ بڑی آسانی کے ساتھ پہاڑوں اور جنگلوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔

اسی طرح جو شخص اپنے اندر شان درویشی پیدا کر لیتا ہے وہ علائق دنیوی سے پاک ہو جاتا ہے چنانچہ حضرات اولیائے کرام کی پاکیزہ زندگیاں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ان کے حجرہ میں ایک چٹائی اور ایک مٹی کے گھڑے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہوتی تھی اس کے باوجود دنیا والے، ان کا احترام بادشاہوں سے بھی زیادہ کرتے تھے۔

پانچواں شعر:۔ کہتے ہیں کہ جذبۂ عشق جس کی بدولت انسان خوشی خوشی اپنا گلا چھری تلے رکھ دیتا ہے۔ کالج یا اسکول کی تعلیم سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ یہ نعمت مرشد کامل کی نظر سے حاصل ہوتی ہے چنانچہ دیکھو حضرت اسماعیلؑ کے اندر یہ شیوۂ تسلیم و رضا کتابوں کے مطالعہ سے یا کتب خانہ دماغ میں اتار لینے سے پیدا نہیں ہوا بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صحبت میں رہنے سے یہ مقام حاصل ہوا۔

صحبت اور نظر ایک ہی چیز ہے اور اس کے بغیر تزکیۂ نفس نہیں ہو سکتا اسی لئے تمام بزرگان دین نے صحبت مرشد کو تکمیل دین، یا حصول مرتبہ یقین کے لئے از بس ضروری اور لازمی قرار دیا ہے اسی لئے اقبالؔ نے اپنی ہر تصنیف میں صحبت مرشد کی ضرورت اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔

اگر انسان اپنا تزکیۂ نفس خود بخود کر سکتا تو اللہ کی مشیت کے مطابق بعثت انبیاء کا سلسلہ قائم نہ ہوتا محض کتاب آسمان سے نازل ہو جایا کرتی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ قرآن حکیم کی واضح آیات کی رو سے تزکیۂ نفوس انسانی انبیاءؑ کے فرائض میں داخل ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ الخ یعنی اللہ وہ ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو آیات الٰہی پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے۔

مرشدی حضرت شیخ نصیر الدین الملقب بہ چراغ دہلیؒ کو یہ مقام رفیع اس لئے حاصل ہوا کہ انہوں نے حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخؒ کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیۂ نفس کر لیا تھا اور ان کا تزکیۂ شیخ العالم حضرت فرید الدین گنج شکرؒ نے کیا تھا اور ان کا تزکیۂ قطب العالم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے فرمایا تھا اور ان کا تزکیۂ سلطان الہند غریب نواز خواجۂ خواجگان حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا اور یہ سلسلۂ عالیہ انجام کار سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم پر منتہی ہو جاتا ہے۔

اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ چراغ کسی چراغ ہی سے جل سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص نہ مرشد کی صحبت میں رہے نہ اس کی نگاہ سے فیض حاصل

کرے محض کتابوں کے مطالعہ سے اس لائق ہو جائے کہ "صالحین" کی جماعت مرتب کرکے دنیا میں کوئی پاکیزہ انقلاب پیدا کردے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اگر انسان خود بخود صالح بن جایا کرتا (صالح سے میری مراد ہے وہ شخص جس نے تزکیۂ نفس کر لیا ہو) تو دنیائے اسلام کے یہ نامور حضرات مدتوں اپنے مرشدوں کی خدمت میں نہ رہتے اور برسوں تزکیۂ نفس کے سلسلہ میں ریاضت نہ کرتے۔

ایک دفعہ حضرت خواجہ اجمیریؒ اپنے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین صاحب سے ملنے کے لئے دلی تشریف لائے اس زمانہ میں حضرت باوا فریدالدین گنج شکرؒ اپنے سلوک کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے حضرت سلطان الہندؒ نے انہیں دیکھا تو خواجہ قطب الدین صاحب سے فرمایا کہ آخر کب تک اس کا امتحان لیتا رہے گا کب تک اس کو اس طرح جلاتا رہے گا؟ مدتیں گذر گئیں اس کو آتش عشق میں جلتے ہوئے! اب مناسب ہے کہ تو اس پر نگاہ کرم کرکے اس کو مالا مال کر دے جب خواجہ قطب الدین صاحب نے اپنے مرشد کی زبان مبارک سے یہ کلمات سنے تو ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ پہلے حضور خود اس پر ایک نگاہ کرم فرمائیں اس کے بعد آپ کا یہ غلام آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا چنانچہ پہلے حضرت خواجہ اجمیریؒ نے حضرت باوا صاحب کو سینہ سے لگایا اس کے بعد حضرت قطب الدین صاحب نے جامع ملفوظات فریدی حضرت سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت باوا فریدالدین صاحب فرماتے تھے کہ حضرت خواجہ اجمیری کی نگاہ اور ان کے معانقہ کی بدولت جو دولت سرمدی مجھے حاصل ہوئی اس کا اظہار الفاظ کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔

میرا مطلب اس واقعہ کے نقل کرنے سے داستان سرائی نہیں ہے بلکہ

میں مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ صحبت مرشد کے بغیر کوئی شخص مرتبۂ کمال کو نہیں پہونچ سکتا۔ اقبالؔ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس بھولے ہوئے سبق کو از سر نو تازہ کریں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہر کتاب میں اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے اس جگہ مسافر سے دو شعر نقل کرتا ہوں۔

دل ز دیں سرچشمۂ ہر قوت است
دیں ہمہ از معجزاتِ صحبت است

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر

یعنی مسلمان کی زندگی دل پر منحصر ہے اور دل صحبت سے زندہ ہو سکتا ہے۔ دین کتابوں میں تلاش مت کرو۔ علم بیشک کتابوں سے مل سکتا ہے لیکن دین صرف مرشد کی نظر سے حاصل ہو سکتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ چونکہ میں نے مسلمانوں کو ترقی اور سربلندی کا راز بتا دیا ہے اس لئے مجھے اللہ کے فضل و کرم سے امید واثق ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری قبر زیارت گاہ بن جائے گی اہل عزم و ہمت یعنی دیندار مسلمان مجھے دعائے خیر سے یاد کیا کریں گے اور دور و نزدیک سے لوگ میری قبر پر فاتحہ پڑھنے آیا کریں گے نہ یہ کہ سجدہ میری قبر پر کریں گے اور مجھ سے نہ حاجت مانگیں گے اور جو ایسا کریں گے وہ صریح مشرک ہیں۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اقبالؔ کی یہ دعا قبول کرلی۔ بلا مبالغہ ان کا مزار آج زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں میں جس قدر مذہبی شعور پیدا ہوگا۔ اسی قدر اقبالؔ کی عزت ان کے دلوں میں پیدا ہوگی۔

رازِ الوندی کنایہ ہے سربلندی سے کیونکہ الوند ایک پہاڑ کا نام ہے جو ایران میں واقع ہوا ہے۔

ساتواں شعر:۔ حسن معنی کو میری مشاطگی کی ضرورت نہیں ہے

دیکھو گل ولالہ اپنی زیبائش کے لئے کسی انسانی ہاتھ کا محتاج نہیں ہے فطرت خود اس کی تزئین کرتی ہے اسی طرح حقائق و معارف (علمی ہوں یا مذہبی) اپنی اثرآفرینی یعنی لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کے لئے کسی انسان کی کوشش کے محتاج نہیں ہیں۔ سچی بات خود دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔

رباعی

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق ۔۔۔ کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر ۔۔۔ کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اس رباعی کا مضمون بھی وہی ہے جو پچھلی رباعی میں مذکور ہے یعنی عشق حقیقی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عشق حقیقی انسان کو عزلت پسند بنا دیتا ہے چنانچہ عاشق خلوت نشینی اور گمنامی میں اپنی ساری زندگی بسر کر دیتا ہے مثلاً حضرت مخدوم علی احمد کلیری پر تجرید و تفرید کا رنگ غالب ہو گیا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے ساری زندگی تنہائی میں بسر کی۔ اور مدۃ العمر میں صرف ایک شخص کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کیا جن کا نام حضرت شمس الدین ترک پانی پتی تھا یا مثلاً حضرت شیخ نجیب الدین متوکل دہلوی کہ مراتب روحانی کے لحاظ سے اپنے چھوٹے بھائی حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر اجودھنی سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن نہ زندگی میں شہرت حاصل ہوئی اور نہ آج ان کا نام مشہور ہے۔

(۲) کبھی یہ عشق حقیقی، سوز و سرور و انجمن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء دہلوی کی خانقاہ میں سیکڑوں درویش

رہتے تھے جو ان کی نگاہ سے سوز دروں حاصل کرتے تھے۔ نیز روزانہ مجلس وعظ وارشاد منعقد ہوتی تھی جس میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے تھے اور رجوع خلائق کا یہ عالم تھا کہ سلاطین دہلی رشک وحسد کرتے تھے۔

(۳) کبھی یہ عشق حقیقی سرمایۂ محراب ومنبر کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے مثلاً امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ مجدد دہلوی کی ذات اپنے زمانہ میں منبع علم وفضل تھی چنانچہ آنجناب کی تصانیف کو آج بھی علماء اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔

(۴) اور کبھی یہ عشق انسان کو خیبر شکن بنا دیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قلعہ خیبر کا دروازہ تن تنہا محض عشق کی طاقت سے اکھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ جو اس قدر وزنی تھا کہ بعد ازاں کئی آدمیوں نے مل کر اٹھانا چاہا تو اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔

اگیارہویں غزل

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ
وہ ادب گہِ محبت وہ نگہ کا تازیانہ

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ

نہیں اس کھلی فضا میں کوئی گوشۂ فراغت
یہ جہاں عجب جہاں ہے نہ قفس نہ آشیانہ

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مئے مغانہ

مرے ہم صفیر اسے بھی اثرِ بہار سمجھے
انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

مرے خاک و خوں سے تونے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تاب جاودانہ

تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْنْ کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

پہلا شعر:- یہ شعر تغزّل کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اس میں واردات عاشقی کا تذکرہ نہایت دلکش اور بلیغ انداز میں کیا گیا ہے۔

اقبالؔ اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہیں کہ کیا تجھے میری ابتدائے عشق میں وہ زمانہ یاد نہیں جب میں سراپا عجز و نیاز بنا ہوا تھا۔ (بات یہ ہے کہ عاشق ابتدائے عشق میں گستاخ نہیں ہوتا) تیری مجلس میں نہایت ادب کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ خاموش سر کو جھکائے ہوئے اگر میں کسی وقت فرطِ شوق سے مجبور ہو کر تیری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا تھا تو چونکہ تو اپنی نگاہ کے تازیانے سے مجھے متنبہ کر دیتا تھا۔ اور میں سہم کے رہ جاتا تھا۔

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب عاشق عشق کی ابتدائی منزل میں تھا لیکن جب اس نے اپنی محبت کا نقش محبوب کے دل پر ثبت کر دیا تو پھر نیاز ناز میں مبدل ہو گیا اور اب عاشق فخریہ انداز میں محبوب کو اپنی محبت کا ابتدائی زمانہ یاد دلا رہا ہے کہ میں وہی ہوں جو کسی زمانے میں تجھے آنکھ بھر کے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں عاشق صادق ہوں اس لئے میرے خلوص کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تو مجھ پر مہربان ہے اور میں دل بھر کے تیرے جمال سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔

نوٹ:۔ بلاغت کے علاوہ اس شعر کے دوسرے مصرع میں اقبالؔ نے شاعری کو مصوّری سے بھی ہم آغوش کر دیا ہے یعنی دو لفظوں میں عہد گذشتہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

دوسرا شعر:- کہتے ہیں کہ میری قوم کے نوجوان (طلبہ اور طالبات) جو کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں ان کی حالت پر مجھے سخت افسوس آتا ہے کہ کالج میں جا کر ان کی زندگیاں بالکل برباد ہو گئیں۔ الحاد پرور تعلیم پا کر دین اسلام سے بیگانہ ہو گئے۔ دوسری طرف کفار کی نگاہوں میں بھی کوئی وقعت حاصل

نہ کر سکے۔ دین کی نعمت سے محروم ہوئے تھے تو کفر ہی میں کوئی مقام حاصل کر لیتے لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ نہ ان میں ادائے کافرانہ پائی جاتی ہے نہ تراش آذرانہ نظر آتی ہے۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

اسی مضمون کو اکبر الٰہ آبادی نے اپنے مخصوص رنگ میں یوں بیان کیا ہے۔

دیکھ اے قوم سنتے تھے جسے　　　چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے
راہِ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے　　　واں نہ پہونچے اور یہاں سے چھٹ گئے

تیسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ یوں دیکھنے میں تو یہ دنیا بہت وسیع نظر آتی ہے لیکن جب انسان اس میں اپنی زندگی بسر کرنی شروع کرتا ہے تو اتنی بڑی دنیا میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ملتا جہاں وہ اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکے جس کو دیکھو پریشانیوں اور الجھنوں میں گرفتار ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ دنیا بھی عجب دنیا ہے نہ اسے قفس سے تعبیر کر سکتے ہیں نہ آشیانے سے قفس تو اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ یہ دنیا نہایت وسیع ہے اور ہر شخص آزاد ہے جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ آشیانہ سے اس لئے تعبیر نہیں کر سکتے کہ آشیانہ میں پرند کو گوشۂ فراغت تو نصیب ہو جاتا ہے لیکن دنیا میں حضرت انسان کو کہیں فارغ البالی نہیں مل سکتی۔

چوتھا شعر:۔ اے خدا! اسلامی ملکوں میں اب وہ ساقی نظر نہیں آتے جو تیرے طالبوں کو معرفت کی شراب پلایا کرتے تھے میکدے تو موجود ہیں لیکن ان میں شراب ناپید ہے یعنی خانقاہ تو برقرار ہیں لیکن ان میں روحانیت کا رنگ باقی نہیں ہے اس لئے قوم تیری بارش کرم کی منتظر ہے تو اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو پھر روحانیت سے مالا مال کر دے۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میرے ہم شہریوں نے میری نوائے

عاشقانہ سنی تو وہ یہ سمجھے کہ میں فصل بہار کی آمد سے متاثر ہو کر نغمہ سرائی کر رہا ہوں حالانکہ میری نوائے عاشقانہ اثرِ بہار کی محتاج نہیں ہے بلکہ وہ تو میری عاشقانہ فطرت کا تقاضہ ہے اسی خیال کو اقبال نے اس انداز سے نظم کیا ہے۔

یہ نغمہ فصلِ و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

چھٹاں شعر:- اے خدا! اس میں کیا شک ہے کہ تیری دنیا کی ساری رونق تیرے عاشقوں ہی کے دم سے ہے اگر تیرے عاشق تیرا نام زندہ رکھنے کے لئے ہر زمانہ میں خاک و خون میں نہ تڑپتے تو تیرا یہ جہان کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا جہاں تو ہوتا لیکن تیرا نام لینے والا کوئی نہ ہوتا۔ تیری خدائی نہ ہوتی بلکہ ہر جگہ ابلیس ہی کی فرمانروائی ہوتی پس میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ ان شہیدوں کو اس عظیم الشان قربانی کا صلہ عطا فرما اور وہ صلہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں تب و تاب جاودانہ یعنی حیاتِ دوام عطا فرما دے۔

واضح ہو کہ اقبال کے فلسفہ کی رو سے حیات ابدی صرف تب و تاب یعنی سوزِ عشق کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص عاشق نہیں وہ اپنی خودی کو مستحکم نہیں کر سکتا اور جس کی خودی مستحکم نہیں ہے وہ موت کے صدمہ کی تاب نہیں لا سکتا۔

ساتواں شعر:- اے خدا! اگرچہ دنیا نے مجھے اپنے حسد کا نشانہ بنایا۔ اور میری ترقی راہیں مسدود کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میری زندگی محض تیرے فضل و کرم سے عزت کے ساتھ بسر ہو رہی ہے نہ میں دوستوں کی بیوفائی کا گلہ کرتا ہوں اور نہ زمانہ کی بے مہری کی شکایت کرتا ہوں۔

نوٹ:- حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کی تہ میں دوستوں کی کج ادائی اور

زمانہ کی بے وفائی کا شکوہ یقیناً پوشیدہ ہے کیونکہ پہلے مصرع کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ شاعر کو یہ احساس ہے کہ زمانہ اور ابنائے زمانہ دونوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی یہ تو محض فضل خداوندی ہے کہ زندگی کے دن کسی نہ کسی طرح بسر ہو رہے ہیں۔

رباعی

عطا اسلاف کا جذب دروں کر | شریکِ زمرۂ لا یحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں | مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اس رباعی میں اقبال نے اللہ سے ایک دعا مانگی ہے جو دراصل ان کے فلسفہ کا خلاصہ ہے یعنی حیات کا مبنیٰ عشق ہے نہ کہ عقل زندگی بسر کرنے کے لئے عقل بھی ضروری ہے لیکن زندگی کی بنیاد اس پر نہیں رکھی جا سکتی ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ (بانگ درا)

کہتے ہیں کہ اے خدا! میں اس دور میں پیدا ہوا ہوں۔ جہاں ہر طرف مادیت اور الحاد کا چرچا ہے۔ اندریں حالات اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے اسی جذبۂ دروں کی ضرورت ہے جو میرے بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھا۔

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحر قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

لہذا اے خدا! مجھے ان پاک لوگوں کے زمرہ میں شریک کر دے جن کی شان میں قرآن مجید یہ فرماتا ہے۔ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ؕ

(۵ : ۶۹) جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور نیک کام کرے تو ایسے لوگوں پر (دنیا یا آخرت میں) نہ خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

واضح ہو کہ آئندہ مصیبت یا رنج و تکلیف کا خیال کر کے جو کیفیت قلب میں پیدا ہوتی ہے اس کو خوف کہتے ہیں۔ اور سابقہ مصیبت یا حماقت پر جو غم طاری ہوتا ہے اس کو حزن کہتے ہیں۔ قرآن مجید کی رو سے جو لوگ بدکار اور گنہ گار ہیں وہ ساری عمر انہیں دو عذابوں میں مبتلا رہتے ہیں سابقہ بداعمالیوں پر حزن اور آئندہ عقوبت کا خوف۔ اس لئے جو لوگ متقی پرہیزگار اور نکوکار ہیں وہ قدرتی طور پر ان دو عذابوں سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ الغرض خوف اور حزن سے پاک ہونا از روئے قرآن متقی حضرات کی شناخت ہے اور تقویٰ اللہ اطاعت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اطاعت جذب و دروں پر منحصر ہے جب تک اللہ سے محبت نہ ہو اس کی اطاعت محال عقلی ہے۔

دوسرے شعر میں اپنی دعا کی وضاحت کرتے ہیں کہ اے خدا میں بہت دنوں عقل کی غلامی کر چکا۔ عقلی زندگی بسر کر چکا۔ عقل میرے سامنے روزانہ نئے مسائل پیش کرتی تھی اور میں روزانہ انہیں حل کرتا تھا۔ اور دوسرے دن میری عقل اپنے ہی حل پر شبہات وارد کر دیتی تھی۔ الغرض میں اپنی عمر کا بڑا حصہ عقل کی گتھیوں کے سلجھانے میں ضائع کر چکا ہوں اس لئے اب میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو مجھ کو دیوانہ بنا دے تاکہ عقل کی غلامی سے نجات پا جاؤں اور صاحب جنوں ہو کر حقیقی معنی میں عقلمند بن جاؤں۔

واضح ہو کہ اسلام کی بنیاد عشق و محبت پر ہے اور عشق و محبت کا لازمی نتیجہ "جنوں" ہوتا ہے اور جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو اس وقت تک عاشق میں خامی باقی رہتی ہے پختگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مصلحت اندیشی مکمل طور پر اس کی زندگی سے خارج ہو جاتی ہے چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اس سے معلوم ہوا کہ عقل اور عشق کی نوعیت بالکل مختلف ہے اسی لئے دنیا کے تمام مشہور عاشقوں نے عقل سے کوئی سروکار نہیں رکھا اس کی تفصیل یہ ہے کہ

عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی جان کو ہلاکت سے بچاؤ۔
عشق کا اقتضاء یہ ہے کہ اپنی جان کو بلا تامل ہلاکت میں ڈال دو۔
عقل کی پیروی کرنے والا جب مرتا ہے تو ہمیشہ کے لئے مرجاتا ہے لیکن عشق کا اتباع کرنے والا جب مرتا ہے تو ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے چنانچہ لسان الغیب حافظ شیرازؒ فرماتے ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد عشق و محبت پر ہے اور اسی حقیقت کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

بس اتنی سی حقیقت ہے ہمارے دین و ایماں کی
کہ اس جانِ جہاں کا آدمی دیوانہ ہو جائے

بارہویں غزل

ضمیرِ لالہ مئے لعل سے ہوا لب ریز
اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

کسے خبر ہے کہ ہنگامۂ نشور ہے کیا
تری نگاہ کی گردش ہے میری رستاخیز

نہ چھین لذّتِ آہِ سحرگہی مجھ سے
نہ کر نگہ سے تغافل کو التفات آمیز

دلِ غمیں کے موافق نہیں ہے موسمِ گل
صدائے مرغِ چمن ہے بہت نشاط انگیز

حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے — کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی — اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

پہلا شعر:۔ جب موسم بہار آیا تو ساقی فطرت نے گلِ لالہ میں (جس کی شکل جام شراب سے مشابہ ہوتی ہے) سرخ رنگ کی شراب بھر دی جب زاہد نے یہ منظر دیکھا تو اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ ساقی مے نوشی کی دعوت دے رہا ہے اس لئے اس نے احتیاط بالائے طاق رکھ دی اور مے نوشی شروع کر دی۔

ضمیر لالہ سے باطنِ گل لالہ یا محض لالہ مراد ہے اور مۓ لعل سے سرخ رنگ کی شراب مراد ہے۔ یہ شعر اقبال کی قوت تخیل کا کرشمہ ہے گل لالہ کی قدرتی بناوٹ اور رنگ نے شاعر کا ذہن اس طرف منتقل کر دیا کہ اس میں شراب بھری ہوئی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب موسم بہار آیا تو صوفی صافی سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔

اقبال نے پرہیز کو مؤنث باندھا ہے اور اس جگہ مونث باندھنا صحیح ہے کیونکہ جب اس لفظ کو کسی طبیب کی ہدایات پر عمل کرنے کے معنیٰ میں استعمال کیا جائے تو مؤنث ہے اور اگر کسی بات یا کام سے حذر و اجتناب کے معنیٰ میں استعمال کیا جائے تو مذکر ہے۔

تصوّف کی اصطلاح میں پرہیز کا معنیٰ "اجتناب از ماسوی اللہ" ہے یعنی اللہ کے سوا سب سے قطع تعلق کر لینا۔

اس لفظ کی مثال طوطی کی سی ہے کہ جب طوطی کو بمعنی پرند باندھیں تو مؤنث ہے لیکن جب یہ لفظ محاورہ میں بولا جائے تو مذکر ہے مثلاً آج کل اس کا طوطی بول رہا ہے۔

دوسرا شعر:۔ عشق میں وہ قوت ہے کہ وہ بوریا نشینوں کو شوکت پرویز عطا کر دیتا ہے۔ بلکہ بادشاہ ان کے سامنے لرزہ بر اندام رہتے ہیں اور ان کے دربار میں اگر صف نعال میں بھی جگہ مل جائے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ اس بات کی مثالوں سے معمور ہے صرف ایک مثال لکھتا ہوں۔ شاہ جہاں کو اپنے فرزند اکبر دارا شکوہ کی سفارش سے زندگی میں صرف دو مرتبہ حضرت میاں میرؒ لاہوری کے دربار میں حاضری کی اجازت مل سکی تھی اور ہمارے حضرت سلطان المشائخؒ نے تو سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا لیکن کسی کو اپنے دربار میں آنے کی اجازت نہیں دی اور اسی عشق کی بدولت پانی پت کے ایک قلندر میں یہ جرأت پیدا ہوگئی تھی کہ اس نے بادشاہ دہلی کو یہ عتاب نامہ لکھ کر روانہ کیا تھا کہ اگر تو نے اس شہر کے بدتمیز حاکم کو فوراً تبدیل نہ کیا تو میں دہلی کا تخت کسی اور شخص کے حوالہ کر دوں گا۔ اقبالؒ نے اس واقعہ کو اس طرح نظم کیا ہے۔

باز گیر ایں عاملِ بدگوہرے
ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے

سچ لکھا ہے اقبالؒ نے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ!
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

واقعی فقر شاہوں کا شاہ ہے اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے خدا! یہ دنیا تو پرانی ہوگئی ہے اس میں اب کچھ دلچسپی اور دلکشی باقی نہیں رہی ہے اس لئے اگر تجھے واقعی میرا امتحان مقصود ہے تو مجھے ایسا جہان میں بھیج دے جو ابھی "تو خیز" ہو۔ تاکہ اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ مجھے اپنی طرف مائل کر سکے یعنی اس میں مجھے صراطِ مستقیم سے منحرف کر دینے کی طاقت ہو پھر میں اپنے عشق کا روشن ثبوت تیری بارگاہ میں پیش کر سکوں گا یہ فرسودہ جہان میرے امتحان کے لائق نہیں ہے میرا مدمقابل بھی نہیں ہے۔

اس شعر میں لفظ "نوخیزہ" سارے شعر کی جان ہے اور شعر کا سارا لطف اسی ایک لفظ میں پوشیدہ ہے اس کی وجہ سے شعر میں غضب کا رنگ تغزل پیدا ہو گیا ہے اگر اس کو خارج کر دیا جائے تو یہ شعر بال جبریل کے بجائے، پند نامہ کا شعر بن جائے گا۔

چوتھا شعر:۔ لوگ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن بڑا زبردست ہنگامہ بپا ہوگا لیکن اس کی نوعیت اور کیفیت کا مجھے کوئی علم نہیں ہے میں تو یہ جانتا ہوں کہ میرے لئے تیری نگاہ کی گردش ہی قیامت کا حکم رکھتی ہے یعنی جب تو میری طرف سے نگاہ پھیر کر دوسری طرف دیکھتا ہے تو میرے دل پر قیامت گذرتی ہے دوسرا مطلب یہ ہے کہ تیری گردش نگاہ سے میرے دل میں جذبات عشق کا طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ اور یہ طوفان میرے لئے ہنگامہ قیامت سے کم نہیں ہے۔

پانچواں شعر:۔ اے محبوب! مدتوں کی ریاضت کے بعد کہیں جا کر آہ سحر گاہی سے لذّت اندوز ہونے کی استعداد پیدا ہوئی ہے اگر تو اپنے تغافل میں التفات کا رنگ بھی شامل کر دے گا تو آہ و فریاد کی لذت جاتی رہے گی اور یہ لذت چونکہ مدارِ زندگی بن گئی ہے اس لئے میں نگاہِ التفات نہیں چاہتا۔

قصہ یہ ہے کہ عاشق نے ابتدائیہ کوشش کی کہ محبوب میری طرف ملتفت ہو لیکن اس نے تغافل اختیار کر لیا۔ اس کے تغافل سے دورِ فراق شروع ہوا اس حالت میں فراق عاشق نے آہ فریاد شروع کی۔ کیونکہ فرقتِ محبوب کا اقتضا یہی ہے اس آہ سحر گہی سے دل میں سوز و گداز پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوئی تو اس میں تو عجیب و غریب لذّت پنہاں ہے اس لئے عاشق نے اس لذت کو مقصودِ حیات بنا لیا۔

اتفاقاً ایک عرصہ کے بعد محبوب سے ملاقات ہو گئی تو اس نے عاشق پر نگاہ

التفات مبذول کی۔ اس پر عاشق نے وہ بات کہی۔ جسے اقبال نے اپنے شعر میں نظم کیا ہے۔

چھٹا شعر:۔ عاشق چونکہ خوگر الم ہو گیا ہے اس لئے کہتا ہے کہ موسم گل میرے مزاج کے موافق نہیں ہے کیونکہ بلبل کی آواز میں نشاط کا رنگ پایا جاتا ہے اور میں کسی کے فراق میں مسرت سے محروم ہو چکا ہوں اس لئے مجھے اس کی آواز اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

ساتواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو زمانہ کے ساتھ موافقت کرنی چاہئے یعنی ماحول اور حالات زمانہ کا جیسا اقتضا ہو اس کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہئے وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر زمانہ تمہاری مرضی کے مطابق نہ چلے تو تم اس سے جنگ کرو اور اسے اپنی اطاعت پر مجبور کر دو۔

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانہ نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

رباعی

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے — کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی — اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

اس رباعی میں بھی اقبال نے وحدۃ الوجود کا نظریہ پیش کیا ہے کہ انسان خدا تو نہیں ہے مگر خدا سے جدا بھی نہیں ہے جس طرح بصارتِ زید۔ زید تو نہیں ہے لیکن زید سے جدا بھی نہیں ہے۔

ابوالحسن سے اقبال کی مراد۔ میری رائے میں مشہور متکلم ابوالحسن اشعری

سے ہے جو ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے معتزلی علماء سے فلسفہ، منطق، الٰہیات کا علم حاصل کیا۔ اور ابتدا میں اسی مسلکِ اعتزال پر عامل بھی رہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اس کی مخالفت پر کمر باندھی اور علم کلام میں ایک مستقل مدرسۂ فکر کی بنیاد ڈالی جو انہیں کے نام سے موسوم ہے یعنی مسلکِ اشاعرہ۔ غالباً ۳۳۰ھ میں وفات پائی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ ابوالحسن سے میں نے یہ نکتہ سیکھا ہے کہ جان یعنی روح فانی نہیں ہے انسان کی موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے اس حقیقت کو وہ آفتاب اور اس کی شعاعوں کی مثال سے واضح کرتے ہیں یعنی ذات آفتاب روشنی یا نور سے عبارت ہے اور اس کی شعاعیں اس نور سے وارد ہوتی ہیں اگر آفتاب اپنی ضیا پاشی بند کر دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نور یعنی اپنی ذاتیات سے مبرّا ہو گیا ہے اور منطق کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ "ذاتِ شئے اور ذاتیات شئے میں تحلّل جاعل عقلاً ممتنع ہے یعنی ذات اپنی ذاتیات سے جدا نہیں ہو سکتی اگر جدا ہو جائے گی تو ذات یعنی وہ شئے فنا یا معدوم ہو جائے گی۔

اسی طرح روح خدا کی صفتِ خالقیت کی تجلّی ہے اور اس کی صفتِ قیّومیت کی بدولت قائم ہے۔ اگر روح فنا ہو جائے گی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی صفات فنا ہو گئیں اور صفات باری تعالیٰ ذات سے جدا نہیں ہے (جس طرح نورِ آفتاب، آفتاب سے جدا نہیں ہے) اس لئے صفات کے فنا ہو جانے سے ذات بھی فنا ہو جائے گی لیکن ذات باری تعالیٰ فنا نہیں ہو سکتی اس لئے روح بھی فنا نہیں ہو سکتی۔

اگر سورج اپنی کرنوں سے بیزار ہو جائے تو سورج میں چمک باقی نہیں رہ سکتی اور چمک کا زوال، ذاتِ آفتاب کا زوال ہے کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سورج تو ہو لیکن نہ اس میں روشنی ہو نہ چمک نہ شعاعیں تاریک آفتاب تو اجتماعِ ضدین کا مصداق ہے جیسے ٹھنڈی آگ۔

اسی طرح اگر خدا۔ روح سے بیزار ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تجلیات ختم ہو گئیں اور تجلیات کا خاتمہ اس کی صفات کے خاتمہ کی دلیل ہے اور صفات کے خاتمہ سے خود ذات باری ختم ہو جائے گی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ذات تو ہو۔ لیکن صفات اور ان کی تجلیات نہ ہوں۔؟ تجلّی تو تقاضائے ذات وصفات ہے۔ خدا ہے۔ تو تجلّی بھی ہے اور تجلی ہے تو روح بھی ہے اور چونکہ تجلّی کو دوام ہے اس لئے روح کو بھی ظلّی طور پر صفت دوام حاصل ہے۔

تیرہویں غزل

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی
میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں
کوئی دل کشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے میں خرد سے

مضامین کی عظمت وشان، خیالات کی بلندی، اور حقائق نگاری کے لحاظ سے یہ غزل بالِ جبریل کی بہترین غزلوں میں سے ہے ہر شعر اپنی جگہ ایک تراشیدہ الماس اور حقائق ومعارف کا مرقع معلوم ہوتا ہے اقبالؔ نے اپنے افکارِ خصوصی کو شاعرانہ آرٹ میں اس طرح سمو دیا ہے کہ اردو شاعری میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

پہلا شعر:- اس میں سوز وگداز کا رنگ نمایاں ہے۔ پہلے مصرع کا اسلوبِ بیان اس قدر بلیغ ہے کہ پڑھنے والا کسی اور ہی عالم میں پہونچ جاتا ہے دوسرے مصرع میں "کمال نے نوازی" کنایہ ہے فن شاعری میں بلند مقام ہے۔

شاعر نہایت دردآمیز اور یاس انگیز لہجہ میں خدا سے اپنا حال زار بیان کرتا ہے بلکہ اسے اپنی دردبھری کہانی سناتا ہے کہ میری کم نصیبی اور تیری بے نیازی کی وجہ سے میرا کمال نے نوازی کچھ بھی میرے کام نہ آسکا یعنی میرا مقصد دلی حاصل نہ ہوسکا۔

وہ مقصد کیا تھا؟ صرف یہ کہ قوم بیدار ہوجائے لیکن افسوس کہ قوم نے مجھے محض ایک شاعر سمجھا۔ واضح ہو کہ ارمغان حجاز میں یہ لے بہت تیز ہوگئی ہے چنانچہ اقبالؔ نے استعارہ اور کنایہ کے پردوں کو ہٹا کر صاف لفظوں میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے قوم کی ناقدری کی شکایت کی ہے۔

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند — زشاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ اممؐ داد از تو خواہم — مرا یاراں غزل خوانے شمردند

یعنی اے میرے آقا! اے اقوام عالم کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ سے اپنی قوم کی ناحق شناسی کی شکایت کرتا ہوں کہ میں نے اس دنیا میں سربلندی کا طریقہ بتایا۔ لیکن اس نے میرے پیغام پر کوئی توجہ نہیں کی بلکہ مجھے

محض ایک شاعر سمجھا۔[۱]

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ جب تک اللہ کا فضل و کرم شامل حال نہ ہو۔ (اور اس فضل و کرم یا توفیق ایزدی ہی کو عرف عام میں خوش نصیبی کہتے ہیں کسی انسان کا ذاتی کمال اس کو کامیابی سے ہم آغوش نہیں کر سکتا اگر اس مفہوم کو مدنظر رکھا جائے تو شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ اقبال ہمیں اس بات کی تلقین کر رہے ہیں کہ اپنے کمال پر مغرور نہ ہونا چاہیے جب تک تائید ایزدی شامل حال نہ ہو۔ انسان مقصد حیات میں کامیاب نہیں ہو سکتا

دوسرا شعر:۔ اس شعر میں وحدۃ الوجود کا رنگ ہے شاعر خدا سے کہتا ہے کہ فکر انسانی روز آفرینش سے ورطۂ حیرانی میں غوطے کھا رہی ہے کہ زمان و مکان کی حقیقت کیا ہے؟ اور جسے ہم مکان سمجھتے ہیں۔ یہ واقعی مکان ہے یا محض وہم و خیال ہے نیز یہ جہان یہ ہنگامۂ رنگ و بو۔ یہ عالم شش جہت

---

[۱] مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ علامہ مرحوم کی وفات کو ۳۰ سال گذر گئے۔ لیکن "کم نصیبی" کا دور ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ اقبال اکیڈیمی بھی ہے اقبال سوسائٹی بھی ہے۔ مجلس اقبال بھی ہے اور یوم اقبال بھی ہے لیکن پیام اقبال، جس طرح حیات اقبال میں سربمہر لفافہ میں بند تھا آج بھی اسی طرح "سرّ مکنون" بنا ہوا ہے میں جب اس المیہ پر غور کرتا ہوں تو بے اختیار یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

دور فلک کامیاب دیکھئے کب تک رہے
قوم میری مست خواب دیکھئے کب تک رہے

(حسرت موہانی بادنیٰ تغیر لفظی)

دراصل کوئی خارجی وجود رکھتا ہے یا محض اس کی کرشمہ سازی ہے جس کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے؟ جیسے وہ دائرہ جو شعلۂ جوالہ کی گردش سے نظر تو آتا ہے، لیکن اس کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے۔

یہ وہ سوالات ہیں جو ہر غور و فکر کرنے والے کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اقبالؔ نے ان سوالات کو پیش کر کے فکر انسانی کی ترجمانی کا فرض انجام دیا ہے اب ہم شعر میں جو سوالات مرتب کئے گئے ہیں ان پر غور کرتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اے خدایا میں کہاں ہوں اور تو کہاں ہے؟ اس کا جواب اقبالؔ کے فلسفہ کے مطابق یہ ہے کہ مکان کے لحاظ سے خدا مکان میں نہیں ہے کیونکہ وہ غیر محدود اور لامتناہی ہے۔

الغرض خدا کسی مخصوص مقام میں نہیں ہے بلکہ یہ سوال ہی خارج از بحث ہے کیونکہ زمان و مکان کی قید اس پر وارد ہو سکتی ہے جو جسم ہو اور خدا جسم سے پاک ہے۔

لیکن اس کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں خدا کا علم نہ ہو اس کی مثال جسم انسانی سے مل سکتی ہے روح انسانی جسم میں کسی مخصوص مقام میں نہیں ہے اس کے باوجود ہر جگہ موجود ہے۔

بات یہ ہے کہ زمان و مکان یہ وہ اعتبارات ہیں جو ذہن انسانی نے وضع کئے ہیں اور رفتہ رفتہ ہمارا ذہن خود ہی اپنے پیدا کردہ تصورات کا غلام ہو گیا۔ عنقائے معانی کو گرفتار کرنے کے لئے جو دام بچھایا تھا خود ہی اس میں اسیر ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ زماں ہے نہ مکاں۔ بس وہی وہ ہے اور روح انسانی اس کی صفت کی تجلّی کا پرتو ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ نہ خدا مکان میں ہے نہ اس کی تجلی کسی مکان میں ہے۔ سارا عالم مع جمیع مظاہر گوناگوں

اس کی تجلیات بوقلموں کا پرتو ہے یا عکس ہے اس کے علاوہ اور کسی شئے کا وجود ہی کہاں ہے۔ عارف جامی فرماتے ہیں۔

مؤثر در وجود الّا یکے نیست
دریں حرف شگرف اصلاً شکے نیست

الغرض نہ زماں ہے نہ مکاں ہے عالم اسی کے وجود منبسط کا دوسرا نام ہے اور ہم سب اسی وجود میں ہیں جس طرح لہروں کا وجود سمندر سے باہر نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے لہریں سمندر میں ہیں۔ انسان خدا میں ہے۔

جس طرح مکان اس کے وجود منبسط کا دوسرا نام ہے اسی طرح زمان بھی اس کے استمرار ذاتی کا دوسرا نام ہے زمانہ کیا ہے؟ ایک تمادی یا طول موہوم ہی تو ہے جسے ہمارے ذہن نے پیدا کیا ہے وہ شعوری طور پر ہمارے ذہن میں موجود ہے لیکن خارج میں اس کی تلاش بے سود ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ مکان ہے یا لامکان ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر مکان کا وجود محسوس ہوتا ہے لیکن درحقیقت خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

وہی اصل مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شئے ہے؟ انداز بیاں ہے

تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ جہان میرا جہان ہے کہ تیری کرشمہ سازی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جسے ہم اپنا جہان کہتے ہیں یہ ہمارا جہان نہیں ہے کیونکہ خارج میں موجود ہی نہیں اور جو موجود نہ ہو اس پر ملک (possession) کا اطلاق کیسے درست ہو سکتا ہے؟ تو پھر ہے کیا؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ اس کی کرشمہ سازی ہے یعنی یہ جہان (کائنات) اس کی صفت خالقیت کا

پرتو ہے اور چونکہ تجلّی ہر دم، ہر لحظ اور ہر آن ہو رہی ہے لہٰذا کائنات بھی برقرار یا قائم نظر آتی ہے اس کی تجلی اگر ایک سکنڈ کے لاکھویں حصہ کے لئے بھی رک جائے تو یہ ساری کائنات یکسر فنا یعنی معدوم ہو جائے گی کیونکہ اس کا کوئی ذاتی یا مستقل یا خارجی وجود تو ہے ہی نہیں یہ بیچاری تو کسی کی چشم سرمگیں کا ایک کرشمہ ہے ایک شان دلبری ہے۔ غالبؔ نے اس حقیقت کو کیسے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

تیسرا شعر:۔ اس شعر میں انسان کی دو بنیادی قوتوں یعنی ذکر اور فکر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مرشد رومیؒ ارباب ذکر کے قافلہ سالار ہیں اور امام رازی اصحاب فکر کے سردار ہیں۔ اول الذکر کشف اور وجدان کے علم بردار ہیں۔ آخر الذکر برہان اور استدلال کے دوست دار ہیں۔ انداز رومی سے دل میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہوتا ہے اور طرز رازی سے ذہن پیچ و تاب میں مبتلا رہتا ہے (وجدان کا تعلق قلب سے ہے۔ استدلال کا رابطہ ذہن سے ہے)

شاعر کہتا ہے کہ اکثر انسانوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک باطنی کشمکش میں زندگی بسر کر دیتے ہیں یعنی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کون سا طریق زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے؟ رومی یا رازی! مصرع کی معنوی خوبی یہ ہے کہ اقبالؔ نے دو لفظوں میں دونوں طریقوں کے نتائج بیان کر دیئے ہیں اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔

رازیؔ کے طریقہ سے ذہن کو تسلی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ عقل کا کام ہی

یہ ہے کہ اپنے استدلال پر خود ہی شبہات وارد کرتی رہے یعنی اپنی عمارت خود ہی منہدم کرتی رہے چنانچہ امام ابوالحسن اشعری نے عقل کی اس خصوصیت کو بہت اچھی طرح واضح کیا ہے اور امام موصوف ہی کی تقلید میں کانٹ (KANT) نے یہ لکھا ہے کہ محض عقل کی بدولت خدا کو ثابت نہیں کیا جا سکتا اور اس باب میں کانٹ نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے امام صاحب موصوف سات سو سال پہلے اس حقیقت کا انکشاف کر چکے تھے فرق اتنا ہے کہ کانٹ اور ہیگل داخل نصاب ہیں اس لئے ہم ان سے مرعوب و متاثر ہیں اور اشعری اور ماتریدی کی تصانیف چونکہ "خداوندان مکتب" کی فہم سے بالاتر ہیں اس لئے یہ جواہرات گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں۔ والئے بر حال ما۔ کہ جو خود ہمارے دست نگر یعنی ابن رشد اور ابن سینا کے شاگرد تھے وہ آج ہمارے استاد بنے ہوئے ہیں اور ہم بڑے فخر کے ساتھ اپنے غلاموں کی غلامی کر رہے ہیں۔

الغرض رازی کے طریقہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی ایک ذہنی پیچ و تاب میں مبتلا ہو جاتا ہے کیونکہ کسی ایک مسئلہ میں بھی اسے تسلی حاصل نہیں ہو سکتی مثال کے طور پر ڈھائی ہزار سال ہو گئے لیکن ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ "علم" کی ماہیت کیا ہے؟ آیا وہ حاضر عند المدرک کا نام ہے یا "مایہ الانکشاف کا"؟ یا ان کے علاوہ کسی اور چیز کا؟ (واضح ہو کہ اس مسئلہ میں چودہ مذاہب ہیں جن کی تفصیل اس شرح میں ممکن نہیں ہے۔)

علم، کو جانے دیجئے کہ وہ نظری ہے "وجود" تو بدیہی ہے لیکن آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ وجود کی ماہیت کیا ہے اور اس کا مبدأ و منشأ انتزاع کیا ہے؟ اس بات میں علماء متکلمین اور صوفیہ میں شدید اختلافات ہیں۔ مثلاً وجود جزئی حقیقی ہے یا کلی مشکک ہے؟

اس کے مقابلہ میں رومیؒ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ استدلال کے بجائے وجدان کو حقیقت تک پہونچنے کا ذریعہ بناتے ہیں اور صاف لفظوں میں کہتے ہیں ۔ کہ استدلال سے خدا نہیں مل سکتا ۔

گر باستدلال کارِ دیں بدے
فخر رازی رازدار دیں بدے

اگر دین کی فہم استدلال پر موقوف و منحصر ہوتی تو (امام فخر الدین رازی) دین کے سب سے بڑے " رازدار " ہوتے ۔

رومیؒ عقل کے بجائے وجدان کو رہنما بناتے ہیں اور اس کی بدولت دل میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اقبالؔ نے اپنے مصرع میں ان دونوں میں کسی کو ترجیح نہیں دی ہے لیکن ذوق سلیم کے لئے یہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں کہ اقبال کس مسلک کو ترجیح دیتے ہیں ۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اقبالؔ کا اعجاز شاعرانہ قابل داد ہے کہ ایک شعر میں فلسفہ کے تین مشکل سوالات بھی پیش کر دیئے اور جوابات بھی دیدیئے اور انداز بیان ایسا دلکش اختیار کیا کہ فلسفہ کی خشکی کے باوجود شعریت میں کمی واقع نہیں ہوئی ۔

چوتھا شعر:- فریب خوردہ شاہین کنایہ ہے " مسلمان نوجوانوں سے " کہ پلا ہو کر گسوں میں " کنایہ ہے کفار کی صحبت اور غیر اسلامی ماحول سے کہتے ہیں کہ میری قوم کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سراسر کافرانہ ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ملحدانہ نظام تعلیم ان پر مسلّط ہے جس نے ان کے دل و دماغ کو اسلام سے بیگانہ بنا دیا ہے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا جذبہ عشق سرد پڑ گیا ۔ ترقی کے ولولے ختم ہو گئے ۔ مذہبی غیرت فنا ہو گئی خودی مردہ ہو گئی ۔

اگر کسی شاہین کی پرورش گدھوں میں ہوں گی تو قدرتی طور پر وہ "مردار" کھانے کا عادی ہو جائے گا وہ کیا جانے کہ زندہ طائر کو شکار کرنے میں کیا لذت ہوتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ کہتے ہیں کہ غزل یعنی جذبات کے اظہار کے لئے کسی خاص زبان کی پابندی لازمی نہیں ہے جو چیز غزل کو دلکش بناتی ہے ۔ وہ "دل کشاصد" یعنی پاکیزہ اور بلند خیالات ہیں، نہ کہ زبان۔

چھٹا شعر:۔ اس شعر کا اسلوب بیان بہت دلکش ہے کہتے ہیں کہ فقر اور سلطنت میں نام کا فرق تو ضرور نظر آتا ہے لیکن بباطن دونوں ایک ہی ہیں بالفاظ دگر صرف طریق کار کا فرق ہے۔ مقصد دونوں کا یکساں ہے یعنی سلطان بھی حکمرانی کرتا ہے اور فقیر بھی۔ فرق یہ ہے کہ سلطان سپاہ کی مدد سے دوسروں پر حکومت کرتا ہے لیکن فقیر یہی کام نگاہ کی مدد سے انجام دیتا ہے خلاصہ کلام یہ کہ سلطان حکمرانی کے لئے غیروں کا محتاج ہے فقیر کسی کا محتاج نہیں کیونکہ اس کی سپاہ اس کے اندر موجود ہے۔

ساتواں شعر:۔ کارواں کنایہ ہے ملت اسلامیہ سے۔ اور حرم کنایہ ہے دین اسلام سے۔ کہتے ہیں کہ آج کل مسلمانوں کے دینی پیشواؤں میں (علما ہوں یا مشائخ) دلنوازی کی عادت نہیں پائی جاتی حسن اخلاق کی بہت کمی ہے اس لئے حالت یہ ہے کہ بعض افراد نے تو ملت اسلامیہ سے رشتہ منقطع کر لیا اور بعض اشخاص ان کی سرد مہری کی بنا پر مذہب اسلام ہی سے بدظن ہو گئے

رباعی

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے — بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے — خرد بیزار دل سے میں خرد سے

اس رباعی میں اقبالؔ نے دل کے مقابلہ میں خرد کی حیثیت کو متعین کیا ہے یعنی عقل کا مرتبہ عشق سے فروتر ہے اس مضمون کو انہوں نے اپنی تمام کتابوں میں مختلف انداز سے واضح کیا ہے۔ چنانچہ ضرب کلیم میں لکھتے ہیں۔

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

یعنی عقل بہت اچھی چیز ہے اللہ کی بڑی نعمت ہے جو بندوں کو عطا ہوئی ہے لیکن وہ بنی آدم کی رہنمائی نہیں کر سکتی اس کا کام جزئیات سے کلیات مرتب کرنا اور کلیات سے جزئیات مستنبط کرنا ہے اس کی مدد سے ہم علمی مسائل میں داد تحقیق دے سکتے ہیں ایجادات و اختراعات کر سکتے ہیں لیکن وہ ہمیں یہ نہیں بتا سکتی کہ نیکی کیا ہے۔ بدی کیا ہے؟ یعنی عقل کی مدد سے انسان متقی نہیں بن سکتا۔ خدا تک نہیں پہونچ سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر عقل کو عشق کے احکام کا پابند نہ بنایا جائے تو وہ بنی آدم کی گمراہی کا موجب بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ذہن میں شکوک پیدا کرتی رہتی ہے اسی لئے اقبالؔ نے ہمیں متنبہ کیا ہے

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رسائل کہ ادب خوردۂ دل است

یعنی وہ عقل حاصل کر جس نے دل (عشق) سے ادب سیکھا ہو۔

الغرض عقل شبہات پیدا کرتی ہے اس کے مقابلہ میں دل یقین پیدا کرتا ہے لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنی زندگی کی بنیاد یقینات پر رکھے تاکہ اس کے اندر عمل کا جذبہ پیدا ہو اسی لئے علامہ اقبالؔ رحمۃ اللہ علیہ ہمیں نصیحت کرتے ہیں۔

حیاتِ جاوداں اندر یقین است
رہِ تخمین و ظن گیری بمیری
یعنی یقین زندگی ہے اور ظن و تخمین موت ہے۔

عقل کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ ہمیشہ اپنی حدود سے تجاوز کرنے پر آمادہ رہتی ہے یعنی جو امور اس کی دسترس سے باہر ہیں ان میں بھی ژاژ خائی کرتی رہتی ہے۔ اگرچہ اس کی رائے ان معاملات میں نہ صحیح ہوتی ہے نہ تسلی بخش اس کے باوجود وہ دل کے فرامین اور ارشادات پر معترض ہوتی رہتی ہے یعنی خرد دل سے بیزار رہتی ہے اور اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بنی آدم دل کے بجائے اس کے کہنے پر چلیں۔

لیکن مردِ مومن خرد کی حدود سے واقف ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ طاقت مادیات میں تو بہت کارآمد ہے لیکن عالمِ روحانیات اس کی گرفت سے باہر ہے اس لئے وہ دینی معاملات میں اور نیک و بد کی تمیز میں عقل کے بجائے دل کو اپنا رہنما بناتا ہے یعنی ان معاملات میں دل خرد سے بیزار رہتا ہے۔

چودھویں غزل

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ دارِیہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے

ولیکن بندگی! استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

اس غزل میں بنیادی تصور یہ ہے کہ عشق انسان کو زمان و مکان کی قیود و حدود سے آزاد کر دیتا ہے اور یہ وہ نکتہ ہے جو اقبال کے نظامِ فکر میں اساسی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کو اپنی تصانیف میں اور علی الخصوص فارسی تصانیف میں بار بار پیش کیا ہے۔ مثلاً مسافر میں لکھتے ہیں۔

ہستی او بے جہات اندر جہات
او حریم و در طوافش کائنات

یعنی مومن (اقبال کی رائے میں مومن اور عاشق مترادف ہیں) اگرچہ بظاہر جہات ہی میں رہتا ہے لیکن درحقیقت اس کی ہستی بے جہات یعنی مکان کی قید سے بالاتر ہوتی ہے اور اس کی ذات اس قدر عظیم بالشان ہوتی ہے کہ ساری کائنات اس کا طواف کرتی ہے۔

اس نکتہ کو سمجھنے میں ہم لوگوں کو جو دشواری لاحق ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف ریاضی یا منطق نہیں ہے بلکہ سراسر عمل ہے اور یہاں "علم بعد از عمل می آید" والا معاملہ ہوتا ہے یعنی اگر کوئی یہ سوال کرے کہ عشق انسان کو زمان و مکان کی قید سے کیونکر آزاد کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عشق اختیار کر کے یا عاشق بن کر دیکھ لو۔ یہ سمجھنے کی چیز نہیں بلکہ دیکھنے کی چیز ہے۔

چنانچہ اقبال نے اس نکتہ کو مسافر میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے صرف ایک شعر لکھتا ہوں۔

چیست دیں؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

یعنی دین اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی اصلیت سے آگاہ ہو جائے

جس نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے۔

الغرض تصوّف۔ شنید پر نہیں بلکہ دید پر موقوف ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ پوچھے کہ ثمر بہشت کی لذّت کیسی ہوتی ہے تو نہ آپ زبان سے اس آم کی لذت کا بیان کر سکتے ہیں اور نہ سائل آپ کے بیان سے اس کی لذت کا تصور کر سکتا ہے بس اس کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ خود اس آم کو کھائے پھر اسے کسی سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی کہ ثمر بہشت کیسا ہوتا ہے۔

پہلا شعر:۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان جب تک عشق اختیار نہیں کرتا اس وقت تک وہ صرف اس محدود دنیا کو جو زیر آسمان واقع ہے اور عناصر اربعہ سے مرکب ہے اپنی جولان گاہ سمجھتا رہتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ لیکن جب عشق کی بدولت اس کے دل کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ حسن مطلق کا مشاہدہ کرتا ہے تو کائنات کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آسمان جسے وہ محدّد جہات سمجھتا تھا ایک میلی چادر سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے یعنی آسمان اس کے لئے حدّ نظر نہیں رہتا بلکہ وہ بالائے آسمان بھی دیکھ سکتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ جب تک انسان۔ کوچۂ عشق سے واقف نہیں ہوتا۔ وہ سورج۔ چاند اور مشتری کو اپنا ہمسایہ سمجھتا ہے لیکن جب وہ عشق اختیار کرتا ہے تو اس میں اس قدر طاقت پرواز پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ اجرام فلکی بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکتے اس کی نگاہ ان سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے بات بالکل واضح کر دی ہے کہتے ہیں کہ میں اس کائنات کو غیر محدود (بیکراں) سمجھتا تھا لیکن عشق نے مجھ میں

اس قدر طاقت پیدا کردی کہ میں نے زمین سے آسمان کا فاصلہ ایک ہی جست میں طے کر لیا اسی مضمون کو اقبال نے زبور عجم میں یوں بیان کیا ہے۔

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

یعنی وادیٔ عشق بہت دور ہے لیکن عشق حقیقی کی راہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ۔ اور فضل ایزدی پر تکیہ کر اور مایوسی کو پاس نہ آنے دے کبھی کبھی اسی عشق کی بدولت ایسا بھی ہوتا ہے کہ سو سال کا راستہ صرف چشم زدن میں طے ہو جاتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اگرچہ میں نے اپنی محبت کو ضبط کے پردے میں بہت چھپایا لیکن میرے اخفائے محبت کا انداز کچھ ایسا تھا کہ راز محبت فاش ہو گیا یعنی جسے میں ضبط فغاں سمجھتا تھا وہ بھی فغاں ہی کی ایک صورت بن گئی۔

چھٹا شعر:۔ عام دستور ہے کہ جب قافلہ روانہ ہوتا ہے تو روانگی سے پیشتر ایک شخص بآواز بلند اعلان کرتا ہے کہ قافلہ روانہ ہونے والا ہے تاکہ سب مسافر روانگی کے لئے تیار ہو جائیں اور کوئی پیچھے نہ رہ جائے اقبال نے اس شعر میں اپنی قوت تخیل سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ میں جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا وہ دراصل اس بدبخت مسافر کی صدائے دردناک تھی جس نے اپنا وقت غفلت میں ضائع کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قافلہ سے بچھڑ گیا اور جب قافلہ روانہ ہو گیا تو اس نے دردناک آواز سے قافلہ کو پکار کر کہا توقف کرو تاکہ میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جاؤں۔

دراصل اقبال نے رحیل کارواں کے پردہ میں انسان کی غفلت کا نقشہ

کھینچا ہے جب تک وہ دنیا میں زندہ رہتا ہے سفر آخرت کی تیاری سے بالکل غافل رہتا ہے لیکن جب ملک الموت قبض روح کے لئے سر پر آن موجود ہوتا ہے۔ تو ہر دنیا پرست اور عقبیٰ سے غافل انسان زبان حال سے یہ کہتا ہے کہ مجھے چند روز کی مہلت دو تاکہ میں اعمال حسنہ بجالا کر اپنے لئے زاد راہ مہیا کر لوں۔

بظاہر تو الرحیل الرحیل (کوچ کرو کوچ کرو) دوسرے شخص کی آواز ہوتی ہے لیکن دراصل یہ اس غافل انسان کی آواز ہوتی ہے جو اس وقت کارکنان قضا و قدر کو پکارتا ہے کہ ذرا توقف کرو تاکہ سامان سفر تیار کر لوں۔

رباعی

خدائی اہتمام خشک و تر ہے　　خداوندا خدائی درد سر ہے
ولیکن بندگی استغفراللہ　　یہ درد سر نہیں درد جگر ہے

اس رباعی میں اقبال نے جو بات کہی ہے وہ بہت واضح ہے یعنی خدائی اور بزرگی کا موازنہ کیا ہے لیکن اس معمولی سی بات کے اظہار کے لئے جس میں کوئی فلسفیانہ پیچیدگی نہیں ہے اسلوب بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ رباعی میں عجیب کی دلکشی پیدا ہو گئی ہے شاعر کا کمال یہی تو ہے کہ وہ پیش پا افتادہ باتوں کو ایسے طریق سے ادا کرتا ہے کہ روح وجد کرنے لگتی ہے چونکہ لفظ "بندگی" میں ابہام ہے اس لئے اس شعر کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں جو ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ خدائی کوئی آسان کام نہیں ہے چونکہ خدا کو ساری دنیا کا انتظام کرنا پڑتا ہے، اس لئے اسے ہر وقت مصروف کار رہنا پڑتا ہے اور یہ بڑی ذمہ داری ہے جو خدا نے اپنی مرضی سے قبول کر لی ہے۔ اقبال نے ذمہ داری کو "درد سر" سے تعبیر کیا ہے اور یہ محض شاعرانہ انداز بیان ہے۔

لیکن بندگی (اگر اس کے معنی غلامی کے لئے جائیں) میں خدائی سے بھی زیادہ

ذمہ داریاں ہیں اور اس پر مستزاد یہ ہے کہ غلام کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی وہ تو دوسرے کا غلام ہوتا ہے یہ مانا کہ خدا کو ساری کائنات کا انتظام کرنا پڑتا ہے مگر اس پر کوئی حاکم نہیں ہے۔ وہ خود مختار ہے لیکن غلام تو دوسرے کا محکوم ہوتا ہے اس لئے وہ ہر وقت خونِ جگر پیتا رہتا ہے۔

اگر بندگی سے اللہ کی بندگی مراد لی جائے تو شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ خدائی اگر دردِ سر ہے، تو بندگی، دردِ جگر ہے یعنی اے خدا! تجھے ساری کائنات کا انتظام کرنے میں وہ زحمت اٹھانی نہیں پڑتی جو عاشق کو تیری خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اٹھانی پڑتی ہے جب تک انسان اپنی تمام خواہشات اور دنیاوی لذت کو قربان نہ کردے خدا راضی نہیں ہوسکتا پس ایک خدا کا راضی کرنا ساری کائنات کا انتظام کرنے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔

نوٹ:۔ یہ شاعری ہے۔ اس لئے اسے منطق کی ترازو میں تولنا مناسب نہیں ہے کیونکہ منطق کی رو سے تو اس رباعی کا دوسرا مصرع بالکل غلط ہے کسی خدا پرست میں یہ جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ خدائی کو درد سے تعبیر کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ محض شاعرانہ اندازِ بیان ہے اور اس سے شاعر کا مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ بندگی خواہ کسی انسان کی ہو جسے ہم غلامی کہتے ہیں یا خدا کی ہو جسے ہم عاشقی کہتے ہیں، بہرحال نہایت مشکل ہے آقا ہو یا محبوب دونوں اسی وقت راضی ہوسکتے ہیں جب بندہ (غلام یا عاشق) اپنے آپ کو ان کی مرضی میں فنا کردے۔

پندرہویں غزل

اک دانشِ نورانی اک دانشِ بُرہانی
ہے دانشِ بُرہانی حیرت کی فراوانی
اس پیکرِ خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری
میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی
اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک
تونے ہی سکھائی ہے مجھ کو یہ غزل خوانی
ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی
مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلّا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی
تقدیر شکن قوّت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی
تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے
دونوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی

یہی آدم ہے سُلطان بحر و بر کا — کہوں. کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں — یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا

پہلا شعر:۔ دانش کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عقل وہ ہے جو دل کو منوّر کردیتی ہے اور اس کی بدولت انسان ضمیر کائنات سے آگاہ ہوجاتا ہے۔ دوسری عقل وہ ہے جو دماغ کو روشن کرتی ہے اور اس کی مدد سے انسان اپنے دعاوی پر براہین و ادلّہ قائم کرسکتا ہے۔

دانش نورانی سے انسان کے دل کو اطمینان حاصل ہوجاتا ہے کیونکہ اس عقل کے نور سے انسان اپنے محبوب کو دیکھ لیتا ہے اور "دید" کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

دانش برہانی سے اس کے برعکس انسان کے دماغ میں شکوک او شبہات کی فراوانی ہوجاتی ہے کیونکہ یہ عقل انسان کو صرف "حریم ذات" تک پہونچا سکتی ہے۔ پردہ اٹھا کر محبوب کا جمال جہان آرا نہیں دکھا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ عقل تجلی کی تاب نہیں لاسکتی۔ یہ عشق ہی ہے کہ عاشق میں مشاہدہ کی طاقت پیدا کردیتا ہے چنانچہ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ "دیدار یار" سے لطف واندوز ہوتا ہے نہ اس کی نگاہ میں کمی پیدا ہوتی ہے۔ اور نہ وہ اپنے مقصد سے منحرف ہوتی ہے یعنی عاشق سراپا دید بن جاتا ہے[۱]۔

الغرض استدلالی عقل سے شکوک اور شبہات پیدا ہوتے ہیں اور اس کا منطقی نتیجہ حیرت بمعنی اضطراب یا پریشانی یا تذبذب ہے (یہاں حیرت تصوّف کی اصطلاح نہیں ہے۔

واضح ہو کہ تمام دنیا کے حکمار کا اس پر اتفاق ہے کہ دانش برہانی کا نتیجہ

---

[۱] مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ (۵۳: ۱۷) نہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کسی طرف کو بہکی نہ کسی جگہ سے اُچٹی۔

حیرانی اور پریشانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ چنانچہ افلاطون نے اپنے شہرۂ آفاق مکالمات میں لکھا ہے کہ

"فلسفہ کی ابتدا بھی حیرانی سے ہوتی ہے اور انتہا بھی حیرانی پر ہوتی ہے"

اسی نکتہ کو اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص رنگ میں بیان کیا ہے۔

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

دوسرا شعر: اے خدا! میرا یہ جسم مٹی سے بنا ہے اس لئے اس کی کوئی قیمت نہیں ہے لیکن اس میں ایک تحفہ ہے یعنی قلب اور وہ تیری محبت کے لئے مخصوص ہے اس میں غیر کا خیال نہیں آنا چاہئے لیکن اے خدا! تو نے میرا ماحول ایسا بنایا ہے کہ میرے لئے اپنے حریم دل کو تیرے لئے مخصوص اور محفوظ رکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ دنیا میں زن۔ زر اور زمین۔ یہ تین چیزیں ایسی ہیں جو اس دل کے لئے باعث کشش ہیں اس لئے میں تجھ سے توفیق خیر طلب کرتا ہوں جب تک تیری تائید شامل حال نہ ہو میں ان تینوں کو نہیں توڑ سکتا۔

تیسرا شعر: اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ اگر میری فغان نے ساکنان ملاء اعلیٰ کو مضطرب کر دیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ نہ تو مجھے اپنے فراق میں مبتلا کرتا نہ میں غزل خوانی (آہ و فغاں) پر مجبور ہوتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر میرے عشق کا چرچہ حدود کائنات سے نکل کر لامکاں تک پہونچ گیا ہے اور تجھے افشائے راز کا اندیشہ ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ جذبۂ عشق میرا پیدا کردہ تو نہیں ہے نہ تو مجھے

اپنے عشق میں مبتلا کرتا نہ میں تیرا راز فاش کرتا۔

واضح ہو کہ اس شعر میں اقبال نے ان صوفی شعراء کا تتبع کیا ہے جو
اللہ کو اپنا معشوق قرار دے کر اس سے عام عاشقوں کی طرح خطاب کرتے
ہیں۔ اس شعر میں بنیادی تصور یہ ہے کہ معشوق اپنی رسوائی پسند نہیں کرتا
اقبال خدا کو مجازی معشوق تصور کر کے کہتے ہیں کہ "اب تو اس بات سے کیوں
مضطرب ہوتا ہے کہ میری فغاں ستاروں تک پہونچ گئی ہے اگر تجھے اپنی
رسوائی کا اندیشہ تھا۔ تو کیوں تو نے مجھے اپنے فراق میں مبتلا کیا! اسی مضمون کو
ایک گمنام شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

اپنی رسوائی کا عشاق پہ مت رکھ الزام
تجھ سے کس نے یہ کہا تھا کہ تماشائی ہو
حسن مستور عیاں کر دیا کل عالم پر
تیری تو خود یہ تمنا تھی کہ رسوائی ہو

چوتھا شعر: اے خدا! اگر پہلا آدم باطل یعنی مٹ جانے والا
ہے (جیسے پانی کا بلبلہ) کہ اِدھر ابھرا اُدھر فنا ہو گیا۔ تو پھر اس مہمل۔ بے مقصد
اور باطل آدم کی طرح لاکھوں کروڑوں۔ بلکہ ان گنت آدم تخلیق کرنے
سے کیا فائدہ؟ اگر آدم بھی حشرات الارض کی طرح ہے۔ یعنی فانی ہے تو کیا
تجھے اس نوع کی ارزانی پسند آتی ہے؟ کیا یہ مقصد کیڑے مکوڑوں کی پیدائش
سے حاصل نہیں ہو سکتا۔؟

شاعر کا مقصد اس استفہام سے یہ ہے کہ چونکہ یہ بات خدا کی عظمتِ
شان اور حکمتِ بالغہ سے بعید ہے کہ وہ کائنات میں کسی کو بھی اپنی نیابت
کا منصب عطا نہ فرمائے کسی نوع پر بھی اپنی صفتِ ابدیت کا پرتو نہ ڈالے

اس لئے مجھے یقین ہے کہ آدم باطل نہیں ہے اللہ نے انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ دنیا میں آئے کھائے پیئے اور دوسرے حیوانات کی طرح ہمیشہ کے لئے فنا ہوجائے بلکہ اس کی تخلیق میں ایک مقصد پوشیدہ ہے وہ یہ کہ وہ اللہ کا نائب ہے۔ اس لئے مرنے کے بعد بھی اس کی روح زندہ رہے گی کیونکہ اسے اللہ کے سامنے حاضر ہوکر اپنی نیابت کا حساب دینا ہے کہ اس فرض کو کس حد تک انجام دیا۔

نوٹ:۔ یہ شعر قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ یعنی اے لوگو کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

پانچواں شعر:۔ زندیق کے لغوی معنی ہیں۔ کتاب زندکا پیرو۔ یعنی مجوسی یا آتش پرست اور مجازی معنی ہیں۔ ملحد۔ بیدین یا کافر کے۔ (غیاث اللغات)

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا انگریزی داں طبقہ تو مغربی تعلیم کی بدولت دین سے برگشتہ ہوگیا۔ کیونکہ یہ نظام تعلیم الحاد پرمبنی ہے لیکن اس زمانہ کے علماء نے تو کسی کالج میں تعلیم نہیں پائی پھر وہ کیوں دین اسلام کے لئے موجب ننگ و عار ہیں؟

اس شعر میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دین اسلام صرف عقائد کا نام نہیں ہے بلکہ وہ عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور اگر ان دونوں کی حقیقت معلوم کرنی ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام عقیدہ کے لحاظ سے توحید خالص اور عمل کے اعتبار سے جہاد پیہم کا نام ہے۔

افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے علماء نے عمل کی اہمیت اور قیمت کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا حتیٰ کہ ان کے نزدیک اسلام صرف عقائد صحیحہ کا نام رہ گیا چنانچہ اس خود ساختہ اصول کی روشنی میں انہوں نے ان لوگوں کو بلا تامل دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جن کے عقائد اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے لیکن جن لوگوں کے اعمال اللہ اور اس کے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے خلاف تھے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل کا امتیاز بالکل نہیں تو بڑی حد تک اٹھ چکا ہے مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تقلید شخصی ضروری نہیں تو علماء بلا تامل اسے گمراہ یا فاسق قرار دیں گے لیکن اگر کوئی شخص دن رات رشوت لے۔ بلیک مارکٹ اور ذخیرہ اندوزی کو مشغلۂ حیات بنالے۔ دھوکا اور فریب سے اپنی تجارت چمکالے۔ ہمسائے کو ایذا پہونچائے۔ پرائی زمین پر اپنا مکان تعمیر کرے۔ مدۃ العمر زکوٰۃ نہ دے۔ یتیموں کا مال ہضم کر جائے۔ غرضکہ ایسے اعمال بد میں مشغول رہے جن کے ارتکاب سے کفار کو بھی شرم آجائے۔ تاہم ان تمام بداعمالیوں کے باوجود وہ شخص مسلمان رہتا ہے۔ اور کوئی عالم دین اسے گروہ فاسقین میں داخل نہیں کرتا حالانکہ جرم کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ اگر ایک اسلام کے پہلے جز کا منکر ہے تو دوسرا اسی اسلام کے دوسرے جز کا منکر ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کے خلاف جہاد فرمایا تھا۔

اقبالؔ نے بڑی جرأت سے کام لے کر ان علماء سوء کا پردہ چاک کیا ہے جو اپنے اعمال کے لحاظ سے "ننگ مسلمانی" ہیں اگر یہ طبقہ عمل صالح کی اہمیت

کا معترف ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس کے افراد کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا نہ ہوتا حالانکہ یہ لوگ ساری عمر قرآن اور حدیث کا درس دیتے ہیں اور یہ دونوں کتابیں جہاد ہی کی تعلیم دیتی ہیں لیکن اس طبقہ کے اندر سبھی کچھ ہے مگر جہاد کا ولولہ نہیں ہے۔

چھٹا شعر:۔ جو لوگ اسلامی تعلیمات کی روح سے آگاہ نہیں ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان میں اپنی تقدیر بدلنے کی طاقت نہیں ہے حالانکہ اگر کوئی شخص اسلامی تعلیمات پر عمل کرے تو اس کے اندر یہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے۔

اقبال نے اپنی تصانیف میں تقدیر (جبر و اختیار) کے مسئلہ پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے اور بڑے عجیب نکات پیدا کئے ہیں (خصوصاً جاوید نامہ) تو اس قسم کے مباحث سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن بخوف طوالت میں ان تمام مباحث کو اس جگہ بیان نہیں کر سکتا صرف ایک بات لکھنے پر اکتفا کروں گا۔

ہر شخص جو اس کو پڑھے گا اس کے دل میں یہ سوال قدرتی طور پر پیدا ہوگا (اور وہ سوال نہایت معقول ہے) کہ آخر انسان اپنی تقدیر کو کیسے بدل سکتا ہے؟ اقبال نے اسرار خودی میں اس سوال کا جواب دیا ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار

می شود از جبر پیدا اختیار

یعنی اے غافل مسلمان! اللہ کے احکام کی نہایت تندہی کے ساتھ اطاعت کر۔ اس اطاعت کامل کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اگرچہ تو بلحاظ اصل خویش مجبور ہے لیکن تیرے اندر اختیار کا رنگ پیدا ہو جائے گا یہاں اطاعت

سے اقبال کی مراد ایسی اطاعت ہے کہ مسلمان مجسم تسلیم و رضا بن جائے یعنی اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دے۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

جب عاشق (انسان مومن ہو نہیں سکتا جب تک پہلے عاشق نہ ہو) اپنی مرضی کو یعنی اپنے آپ کو رضائے حق میں فنا کر دیتا ہے تو اللہ (معشوق حقیقی) اس کی اطاعت سے اس درجہ خوش ہوتا ہے کہ اسے اپنے مقربین بارگاہ میں داخل کر لیتا ہے اسی "قرب سلطانی" کو اقبال نے "قضائے حق" سے تعبیر کیا ہے یعنی بندۂ مومن خود "ارادۂ الٰہی" بن جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن جو زبان سے کہہ دیتا ہے وہی ہو جاتا ہے۔

اس کی مثال تو بہت ہیں۔ تاریخ فرشتہ سے صرف ایک مثال اس جگہ درج کئے دیتا ہوں۔

سلطان فیروز بہمنی ایک روز سلطان دکن حضرت بندۂ نواز سید محمد گیسو دراز کی خدمت میں حاضر ہوا (جن کو سلطان دہلی حضرت اقدس مرشدی و سیدی شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے اپنا نائب السلطنت بنا کر گلبرگہ (دکن) بھیجا تھا) اور عرض کی دعا فرمائیے کہ میرے بعد میرا بیٹا تخت نشین ہو۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تیری درخواست قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ فیصلہ تو یہ ہو چکا ہے کہ تیرے بعد تیرا چھوٹا بھائی احمد خان تخت نشین ہوگا۔ سلطان فیروز چونکہ بہت صاحب سطوت و شوکت تھا۔ اس لئے عالم نخوت میں اس کی زبان سے یہ فقرہ سرزد ہوا کہ "اگر میں ابھی جا کر احمد کو قتل کر دوں تو؟"

حضرت نے ارشاد فرمایا "تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ نہ مانے تو کوشش

کر کے دیکھ لے چنانچہ سلطان فیروز اپنے ارادہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے سیدھا حضرت کی خدمت سے اٹھ کر محل میں آیا۔ لیکن اس کا بھائی اس کے پہونچنے سے پہلے خانقاہ عالیہ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ ادھر فیروز محل پہونچا ادھر اس کا بھائی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا حضرت نے اپنا عمامہ مبارک اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر باندھا اور بادشاہی کی بشارت دی چنانچہ بحکم خدا ایسا ہی ظہور میں آیا کہ سلطان فیروز کی وفات کے بعد اس کا بھائی احمد خان ۱۴۲۲ء میں سلطان احمد شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

ساتواں شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ عام مسلمانوں کی طرح ان کے مذہبی رہنما بھی زر۔ زن۔ اور زمین کی محبت میں گرفتار ہیں۔ حالانکہ عوام اور خواص دونوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دنیا اور اس کی دلفریبیاں سب فانی ہیں۔

لفظ "تیرے" سے واعظین اور "میرے" سے عوام مراد ہیں۔

رباعی

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا	کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں	یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

اس رباعی میں اقبال نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے جو بالکل جامد قدامت پرست تنگ نظر متعصب اور مقلد کور ہیں چونکہ ایسے لوگ کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتے اس لئے اقبال نے ان کو "بے بصر" سے تعبیر کیا ہے۔ واضح ہو کہ تعصب قدامت پرستی اور کورانہ تقلید انسان کی ذہنی صلاحیتوں کے حق میں سُمِّ قاتل کا حکم رکھتی ہیں اور جو لوگ ان امراض میں مبتلا ہیں وہ نہ

خودبیں ہوسکتے ہیں۔ نہ خدابیں اور نہ جہاں بیں اور جو شخص ان تینوں صفات سے محروم ہو اس میں اور دیگر حیوانات میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔

خودبیں کا لفظ اقبال کی اصطلاح ہے اس کے معنی متکبر کے نہیں بلکہ وہ شخص جسے اپنی خودی کی معرفت حاصل ہو۔

واضح ہو کہ اقبال نے تیسرے مصرع میں بلا مبالغہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے کیونکہ سائنس۔ فلسفہ، مذہب اور تصوّف حقیقت تک رسی کے یہی چار مشہور طریقے ہیں اور کم و بیش انہی تین مسائل سے بحث کرتے ہیں کہ (۱۔ انسان کیا ہے؟ (۲۔ خدا کیا ہے؟ (۳۔ اور یہ کائنات کیا ہے؟

چوتھے مصرع میں طنز کا رنگ پایا جاتا ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جو شخص نہ خودبیں ہو۔ نہ خدابیں ہو۔ اور نہ جہاں بیں وہ بلاشبہ نوع انسانی کا بدترین (بہ کار کی ضد) فرد ہے اور اس لئے سلطانی بحر و بر یا خلافت الٰہیہ کے لائق نہیں ہے۔

یہ ہے صاف لفظوں میں مطلب اس رباعی کا لیکن اقبال نے اس باب کو استفہام۔ طنز اور استعارہ کے پردوں میں چھپا کر نظم کیا ہے تاکہ اسلوب بیان میں دلکشی اور تاثیر پیدا ہو جائے جو شاعری کی اصلی غرض ہے۔

⟶ ⁘ ⟵

سولہویں نظم

یارب! یہ جہانِ گذراں خوب ہے لیکن
کیوں خوار ہیں مردانِ صفاکیش و ہنرمند

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند

تو برگِ گیاہے ندہی اہلِ خرد را
او کشت گل و لالہ بہ بخشد بہ خرے چند

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظۃ و پند

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کے مانند

مدّت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر
کر دے اسے اب چاند کے غاروں میں نظر بند

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلّی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسۂ و خورسند

ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرّم
کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند
چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

یہ نظم، اقبال کی ان نفسیاتی کیفیات اور قلبی جذبات کا مرقع ہے جو دنیا کے حالات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کے بعد ان کے دماغ اور دل پر طاری ہوئے انہوں نے بظاہر خدا سے شکوہ کیا ہے لیکن دراصل اس طبقہ کی ترجمانی کی ہے جو علوم و فنون میں کمال رکھتا ہے لیکن اہل دنیا ان کی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں ہیں چونکہ ان کا شمار بھی اسی طبقہ میں ہے اس لئے جابجا شخصی رنگ جھلکتا ہے۔ شدتِ احساس طنز کے لباس میں جلوہ گر ہے۔ اور میری رائے ناقص میں یہ نظم اقبال کی طنزیہ شاعری کی بہترین مثالوں میں سے ہے۔

اس نظم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اقبال نے بڑی ایمان داری کے ساتھ اپنی زندگی کی تصویر بھی کھینچ دی ہے۔ اور اگر ہم ان اشعار کو غور کے ساتھ پڑھیں تو ہم اس ذہنی کشمکش سے بھی بڑی حد تک آگاہ ہو سکتے ہیں جس میں ملت مرحومہ کا یہ نامور فرزند اپنی عمر کے آخری حصہ میں مبتلا رہا۔

جس ذہنی کشمکش کی طرف اقبال نے اس نظم میں اشارہ کیا ہے وہ اس دنیا میں ہر اس بڑے آدمی کے حصہ میں آئی ہے جس نے بگڑی ہوئی انسانیت کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش کا نتیجہ اکثر اوقات یہی نکلتا ہے کہ "اپنے" اور "بیگانے" دونوں اس سے خفا ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس دنیا کے لوگوں کی روش ہی کچھ ایسی ہے کہ سچی بات انہیں کڑوی اور ناگوار معلوم ہوتی ہے اس لئے صحیح بولنے والا دنیا والوں کی نگاہ میں کسی عزت یا توقیر کا مستحق نہیں سمجھا جاتا اس کے خلاف شیطانی راستہ کی طرف بلانے والے کو لوگ عموماً سر آنکھوں

پر بٹھاتے ہیں۔ اور اس کے قدموں پر اپنی عقیدت کے بہترین پھول نچھاور کرتے ہیں۔ دنیا والوں کی اسی ذہنیت سے متاثر و مغلوب ہو کر جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ (Kant) نے یہ فقرہ کہا تھا کہ "سچ بہت اچھی چیز ہے" مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات کا اظہار اور اعلان بھی کیا جائے" بیشک یہ فقرہ اس کی اخلاقی کمزوری پر دال ہے لیکن اس کا باعث یہی ہے کہ وہ دنیا والوں کی روش سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا کہ سچ بولنا بھی بعض اوقات فتنہ کا موجب ہو جاتا ہے اور میرا خیال ہے کہ خاقانی نے بھی اہل دنیا کی اسی باطل پرستار ذہنیت کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ شعر کہا تھا۔

خود بوئے چنیں جہاں تواں بُرد
کابلیس بماند وابوالبشر مُرد

یعنی اس دنیا کے لوگوں کی پرورش اس طرح کی ہے کہ یہاں عموماً نیکی کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی۔ ہاں شیطانی باتوں کو بہت آسانی کے ساتھ فروغ ہو جاتا ہے۔ شاعر بارگاہِ ایزدی میں عرض کرتا ہے کہ

پہلا شعر:۔ اے خدا! تیری یہ دنیا جو ہر لحظہ بدلتی رہتی ہے بظاہر بہت خوبصورت اور بہت دلکش ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اس دنیا میں دیانتدار، راستی پسند، اور صاحبان فضل و کمال اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ اے میرے خدا! یہ کیا ماجرا ہے کہ جو لوگ علوم و فنون میں اپنا جواب نہیں رکھتے وہ گمنامی اور مفلسی، کس مپرسی اور بے توقیری کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور جو لوگ اوّل درجہ کے مکّار، عیّار اور دغا باز ہیں انہیں شہرت اور دولت، عزت اور وجاہت۔ غرضکہ دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہیں۔

دوسرا شعر:- کہنے کو تو اس دنیا کا خالق اور مالک تو ہی ہے لیکن یہاں کے لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ فرنگی کو اپنا خدا سمجھتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ اس کی خدائی میں سرمایہ دار بھی شریک ہیں۔

تیسرا شعر:- اور اس کا مجازی خدا (فرنگی) کا طریقِ کار یہ ہے کہ تو عقلمندوں اور عالموں کو قوت لایموت بھی مشکل سے دیتا ہے لیکن وہ بیوقوفوں اور نااہلوں پر بھی سیم وزر کی بارش کرتا ہے اور انہیں بڑی بڑی جاگیریں اور بلند آہنگ خطابات عطا کرتا ہے۔

چوتھا شعر:- جب میں کلیساؤں پر نظر کرتا ہوں تو وہاں بڑی دلکشی اور شان وشوکت دکھائی دیتی ہے لیکن تیرے گھر میں سوائے وعظ ونصیحت کے اور کچھ بھی نہیں ہے اور وعظ ونصیحت کا فرض بھی وہ لوگ انجام دیتے ہیں جن کو دنیا میں کوئی عہدہ نصیب نہیں ہو سکتا۔

پانچواں شعر:- اب رہے قوم کے علماء تو ان کا حال یہ ہے کہ تیرے احکام جو قرآن میں مذکور ہیں۔ اگرچہ برحق ہیں۔ لیکن یہ لوگ خداوندانِ مجازی کو خوش کرنے کے لئے تاویل سے کام لے کر تیرے قرآن کو پازند بنا سکتے ہیں۔

نوٹ:- پازند۔ فارسی لغت میں اس چمٹے کو کہتے ہیں جس سے آتش کدہ میں مقدس آگ درست کی جاتی ہے لیکن اصطلاح میں پارسیوں کی مقدس کتاب ژند کی تفسیر کو کہتے ہیں۔

چھٹا شعر:- جس بہشت کا تو نے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے وہ ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے اس لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ درحقیقت کیسی ہے؟ لیکن یورپ کا ہر قصبہ خوبصورتی اور دلکشی میں رشکِ فردوس بنا ہوا ہے اس لئے ایک دنیا اس کی طرف کھینچی چلی جاتی ہے۔

ساتواں شعر:۔ میں نے برسوں فلسفہ اور الٰہیات کے مسائل میں غور کیا لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا قوم بدستور فرنگیوں کا کلمہ پڑھ رہی ہے جیسے دیکھو لندن اور پیرس جانے کی آرزو میں مبتلا ہے اس لئے میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو میرے افکار کو کسی دوسری دنیا میں مثلاً چاند کے تاریک غاروں میں نظر بند کر دے تاکہ اس دنیا میں ان کی بے قدری اور بے وقعتی نہ ہو۔

اب یہاں سے گریز شروع ہوتا ہے یعنی شاعر دنیا والوں کے سامنے اپنی شخصیت کے خاص خاص پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔

آٹھواں شعر:۔ اللہ نے مجھے دل و دماغ کی بہترین خوبیاں عطا فرمائی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں دنیا میں رہتا ہوں لیکن دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا مادی ضرور ہوں لیکن مادیات کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

نواں شعر:۔ میں ایک درویش ہوں۔ خدا کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا میری نگاہ میں نہ یورپین ہونا باعثِ فخر ہے نہ ایشیائی ہونا باعثِ عزت ہے نہ میں ہندی ہوں نہ ایرانی ہوں نہ ترک ہوں نہ خراسانی بلکہ مسلم ہوں۔ میرا زاویۂ نگاہ وطنی نہیں۔ بلکہ آفاقی ہے۔

ع مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

دسواں شعر:۔ دنیا والے چاہے مجھ سے خوش ہوں یا ناخوش! مجھے اس کی پرواہ نہیں میں تو وہی بات کہتا ہوں جسے حق سمجھتا ہوں نہ طبقۂ علماء سے تعلق رکھتا ہوں اور نہ زمرۂ دانشورانِ مغرب سے کوئی علاقہ ہے۔

اگیارہواں شعر:۔ چونکہ میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ نہیں کہہ سکتا اس لئے میری قوم بھی مجھ سے ناراض ہے اور غیر اقوام بھی ناخوش ہیں۔

بارہواں شعر:۔ بات یہ ہے کہ ایک حق پرست اور راست باز انسان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ دن کو رات یا مٹی کے ڈھیر کو پہاڑ کہہ دے۔

نوٹ:۔ الوند اور دماوند علاقہ ہمدان واقع ایران میں مشہور پہاڑ ہیں جن کا ذکر فارسی ادب میں اکثر آتا ہے اور اقبال نے بھی فارسی شعراء کے تتبع میں ان کا تذکرہ اپنی تصانیف میں کیا ہے۔

تیرہواں شعر:۔ میں غیر اسلامی ماحول میں اور غیر مسلموں کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس زمانہ کے فراعنہ اور نمارد مجھے ہر قسم کی اذیتیں پہونچا رہے ہیں۔ لیکن میں ان سب تکلیفوں کو صبر وسکون کے ساتھ برداشت کر رہا ہوں۔ کیونکہ میں مسلمان ہوں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معنوی فرزند اور ان کی سنت پر عمل پیرا ہوں۔ دانۂ اسپند نہیں ہوں کہ آگ میں پڑ کر شور برپا کروں۔

نوٹ:۔ اسپند کے دانہ کی یہ خاصیت ہے کہ جب اسے آگ میں ڈالا جائے تو چٹخ جاتا ہے اور چٹخنے سے آواز پیدا ہوتی ہے اقبال نے اپنی قوت تخئیل کی بدولت اس کی آواز کو فقدان ضبط وتحمل کا مرادف بنا دیا اور اس طرح پہلے مصرع میں "خاموش" کا جو لفظ مستعمل ہے اس کے ساتھ تقابل کا رنگ پیدا ہو گیا جس سے شعر کی خوبی کو چار چاند لگ گئے۔

آتش نمرود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے یعنی بابل کے بادشاہ نمرود نے ان کو توحید پرستی کی وجہ سے آگ میں ڈال دیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس موقع پر کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔

چودہواں شعر:۔ اس ایک شعر میں اقبالؔ نے اپنی شخصیت کی تصویر کھینچ دی ہے چنانچہ اس کا ہر لفظ ان کی زندگی پر صادق آسکتا ہے چونکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اس لئے گواہی دے سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے شعر بالکل واضح ہے اس کا مطلب لکھنا چنداں ضروری نہیں۔

پندرہواں شعر:۔ میں ہر حال میں خوش رہتا ہوں جس طرح شگفتگی غنچہ کی فطرت ہے اور کوئی اسے بدل نہیں سکتا اسی طرح خوش وخرم رہنا میری فطرت میں داخل ہے میرے بدخواہ لاکھ کوشش کریں اس نعمت سے مجھ کو محروم نہیں کر سکتے۔

سولہواں شعر:۔ اس منزل پر پہونچ کر شاعر کو یہ احساس ہوتا ہے کہ بارگاہ ایزدی میں یہ طرز گفتگو اور یہ طویل کلام دونوں حد ادب سے خارج ہیں اس لئے وہ اپنی گستاخی پر نادم ہو کر خود ہی اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اقبالؔ خاموش! تجھے احساس نہیں کہ تو کس کی بارگاہ میں حاضر ہے؟ بس زبان بند کر۔

اس آخری شعر میں شاعرانہ شوخی اسلوب بیان۔ رمز وایما، اور زورِ آفرینی ان چاروں خوبیوں کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا شوخی ہو سکتی ہے کہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد شاعر اپنے آپ کو خاموش رہنے کی تلقین کر رہا ہے۔

نظم ع ۱

اعلیٰ حضرت شہید امیر المؤمنین نادر شاہ غازیؒ کے لطف و کرم سے نومبر ۱۹۳۳ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنویؒ کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ چند اذکار پریشان جن میں حکیم ہی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی کی گئی ہے اور اس روز سعید کی یادگار میں سپرد قلم کئے گئے۔

"ما از پئے سنائی و عطار آمدیم"

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا
خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا
رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاّج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا
نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

•

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا

نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

حضورِ حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا[1]

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا

---

[1] یہ مصرع حکیم سنائی کا ہے۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا
فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہوگئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیٔ خارا
رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا
وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا
محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا
عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را[1]
وہ دانائے سُبل ختم الرُسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰہٰ
سنائی کے ادب سے میں نے غوّاصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

---

[1] یہ مصرع مرزا صائب کا ہے جس میں صرف ایک لفظی تغیر کیا گیا ہے۔

یہ نظم بلیغ ان جذبات کی آئینہ دار ہے جو اقبالؔ کے دل میں حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کے موقع پر طاری ہوئے۔ علامہ مرحوم کو حکیم موصوف سے بہت عقیدت تھی چنانچہ جب وہ مزار پر حاضر ہوئے تو بقول علامہ سیّد سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ ان پر شدید رقت طاری ہوگئی اور ایک گوشہ میں کھڑے ہو کر بڑی دیر تک زور زور سے روتے رہے۔

اقبالؔ نے مرشدی رومی کے اس مشہور شعر کے دوسرے مصرع کو عنوان نظم بنایا ہے۔

عطارؒ روح بود و سنائیؒ دو چشم او
ما از پئے سنائیؒ و عطار آمدیم

یعنی اگر تصوف کو ایک انسان فرض کیا جائے تو خواجہ عطارؒ اس کی روح ہیں اور حکیم سنائی اس کی آنکھیں ہیں اور ہم (اشارہ بجانب خویش) تو سنائی اور عطار کے بعد آئے ہیں (یعنی ان کے متبع ہیں)

اس مصرع کو از راہ عقیدت اقبالؔ نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے یعنی میں بھی اپنے مرشد مولانا رومؒ کی طرح ان بزرگوں کا مقلد اور متبع ہوں ناظرین غور کریں کہ اقبالؔ نے اپنی کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ میں فلاں فلسفی کا متبع ہوں یا فلاں حکیم کا پیرو ہوں۔ ہاں مولوی رومیؒ اور دوسرے روحانی بزرگوں کی غلامی پر ضرور فخر کیا ہے۔

اس تصریح سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اقبالؔ اپنے مزاج یا سوبھاؤ (NATURAL [illegible]) کے اعتبار سے تصوّف کے دلدادہ ہیں اور اس باب میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے

انداز فکر یعنی وحدت شہود[1] یا ہمہ از وست کے قائل ہیں۔

خواجہ عطار کا پورا نام فریدالدین ابوحامد محمد بن ابوبکر ابراہیم بن اسحٰق نیشاپوری ہے ان کے والد عطار تھے اسی لئے یہ لفظ ان کے نام کا جزبن گیا بلکہ اصلی نام سے زیادہ مشہور ہوگیا۔ ولادت غالباً ۵۱۶ھ میں اور وفات غالباً ۶۲۷ھ میں ہوئی ان کی تصانیف میں ہند نامہ۔ دیوان۔ مثنوی۔ اور تذکرۃ الاولیاء یہ چار کتابیں ہیں آج بھی مل سکتی ہیں۔

حکیم سنائی کا پورا نام ابوالمجد مجدود سنائی غزنوی ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں غزنی میں پیدا ہوئے۔ سلطان بہرام شاہ غزنوی کے درباری شاعر تھے اور غلامی کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن بعد چندے ان کے نصیب نے یاوری کی یعنی دربار سے قطع تعلق کرکے شیخ ابو یوسف ہمدانیؒ کے ہاتھ پر بیعت کرکے یہ مقام حاصل کیا کہ اسی بہرام شاہ نے جس کے سامنے یہ دست بستہ کھڑے رہتے تھے ان سے یہ درخواست کی کہ اگر حضرت والا میری حقیقی ہمشیرہ کو اپنے حبالۂ عقد میں لانا پسند فرمائیں تو یہ بات میرے لئے موجب صد فخر ومباہات ہوگی۔ لیکن حکیم موصوف نے بہت خوبصورتی کے ساتھ انکار کردیا۔

---

[1] وحدتِ شہود کا مطلب یہ ہے کہ جب سالک اللہ کی صفات کے تصور میں مستغرق ہوجاتا ہے۔ تو اسے ہر شئے میں اور ہر طرف اسی کا جلوہ نظر آتا ہے اور جس طرح آفتاب کی روشنی کے ساتھ چراغوں کی روشنی موجود ہونے کے باوجود معدوم ہوجاتی ہے اسی طرح سالک کو خدا کی ہستی کے ساتھ مخلوقات کی ہستی نظر نہیں آتی اگرچہ مخلوقات بھی ظلّی طور پر موجود ہوتی ہیں لیکن سالک کی نظر میں ان کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔

حکیم سنائی کے مفصل حالات اور کلام پر تبصرہ تو انشاء اللہ تعالیٰ فرہنگ اقبالؔ میں درج کروں گا۔ اس جگہ صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ حکیم موصوف صوفیانہ شاعری کی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے شاعری کو تصوف کی دولت سے مالا مال کیا یعنی اپنی کتاب حدیقۃ الحقیقۃ میں جس کا پہلا شعر بطور تبرک درج ذیل ہے۔

اے درون پرور بیرون آرائے
وے خرد بخش بے خرد بخشائے

تصوّف کے بنیادی اصولوں کو نظم کے دلکش پیکر میں پیش کیا ہے۔ اقبالؔ نے سنائیؒ، عطارؒ، رومیؒ اور جامیؒ چاروں بزرگوں سے اکتساب فیض کیا ہے جیسا کہ بال جبریل کی غزلوں میں عیاں ہوتا ہے۔

اس نظم میں پانچ بند ہیں اور ہر بند میں ایک مرکزی خیال پایا جاتا ہے جس کی تشریح اقبالؔ نے اپنے انداز میں کی ہے پہلے بند میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ عشق وہ قوت ہے جس کی بدولت عاشق زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہو جاتا ہے یعنی اس میں بھی معشوق کے صفات کا عکس یا پرتو نظر آنے لگتا ہے چنانچہ اقبالؔ نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

فقر مؤمن چیست؟ تسخیر جہات
بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

دوسرے بند میں اقبالؔ نے مسلمانوں کے اخلاقی اور روحانی زوال کا بڑے مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے۔

تیسرے بند میں اس تلخ حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا مادّیت اور الحاد میں مبتلا ہے لیکن آج کل مسلمانوں کے اندر یہ صلاحیت موجود نہیں کہ

وہ اقوام عالم کو توحید کا پیغام دے سکیں۔

چوتھے بند میں ان کے زوال کا نتیجہ بیان کیا ہے یعنی جب انہوں نے اسلام کو ترک کر دیا تو ان پر غلامی کی لعنت مسلط ہو گئی اس کے ضمن میں غلامی کی حقیقت بھی واضح کر دی ہے۔

پانچویں بند میں۔ اقبالؔ نے غلامی سے نجات پانے کا نسخہ تجویز کیا ہے یعنی عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس نظم کے آخری شعر میں اقبالؔ نے اس تہذیب کی ایک جھلک دکھائی ہے جو اس "ترقی اور آزادی" کے دور میں چند روز کی مہمان نظر آتی ہے یعنی بزرگوں کا ادب۔

واضح ہو کہ بزرگوں کا ادب کرنا۔ دین اسلام کی ابتدا ہے اور عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں فنا ہو جانا یہ اس کی دین کی انتہا ہے[1] لیکن ہماری قوم کی لڑکیوں اور لڑکوں کا تو حال یہ ہے کہ،

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہی یہ بات کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم

پہلا شعر:۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق حقیقی عاشق کو زمان و مکان کی قیود سے آزاد کر دیتا ہے اس کی نگاہ میں اس قدر وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات اسے چھوٹی نظر آنے لگتی ہے اور یہ اس لئے کہ عشق کی تاثیر سے اس کا مادی جسم کثافت سے پاک ہو جاتا ہے اور وہ ایک آن میں زمین

---

[1] دین سراپا سوختن اندر طلب
انتہائش عشق و آغازش ادب

سے آسمان تک جا سکتا ہے۔

اس جگہ اگر یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ عقل کی مدد سے زمان و مکان پر قدرت حاصل کر سکتے ہیں یعنی جو فاصلہ جہانگیر کے زمانہ میں تین سال میں طے ہوتا تھا وہ آج کے دور میں تین دن میں طے ہو سکتا ہے تو صوفی عشق کی مدد سے اگر یہی قدرت حاصل کر سکتا ہے تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔؟

واضح ہو کہ عشق میں یہ خاصیت ہے کہ وہ عاشق میں معشوق کا رنگ پیدا کر دیتا ہے اور یہ رنگ ذکر سے پیدا ہوتا ہے چنانچہ ذکر کہتے ہی ہیں کسی کی یاد میں فنا ہو جانے کو چونکہ اللہ جو صوفی کا محبوب ہے زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے اس لئے عاشق میں بھی بلاشک یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

رنگِ او بر کن مثالِ او شوی
در جہاں عکسِ جمالِ او شوی (رموز بیخودی)

دوسرا شعر: کہتے ہیں کہ توحید خالص پر عامل ہونے سے موحد کی خودی میں اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس طلسم رنگ و بو کو پاش پاش کر سکتا ہے یعنی وہ کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

اقبال نے اس کائنات کو متعدد مقامات میں طلسم رنگ و بو سے تعبیر کیا ہے یہ لفظ طلسم بہت غور طلب ہے کیونکہ اس لفظ کے مفہوم پر غور کرنے سے ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال اس کائنات کو کیا سمجھتے ہیں یا ان کی نظر میں اس کی حقیقت کیا ہے۔

طلسم کے لغوی معنی۔ یہ یونانی لفظ تالسما یا تیلسما کا معرّب ہے اور اس کے کئی معنی ہیں مثلاً جادو کی ایک خاص قسم سرّ مکتوم۔ نہایت پوشیدہ راز کسی امر

کی تکمیل کسی مبتدی کو کسی مخفی مذہب میں داخل کرنا۔ تعویذ یا نقش مرتب کرنا منتر پڑھنا یا جادو کرنا رفتہ رفتہ یہ لفظ "سحر" کا مرادف بن گیا اور یہیں سے اس کے اصطلاحی معنی پیدا ہوئے۔

اصطلاحی معنی :- اقبالؔ نے اس لفظ کو "نمود" کے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی ایسی چیز جس کی کوئی اصل یا حقیقت یا جس کا کوئی مستقل وجود نہ ہو۔ اور یہ مفہوم اس لئے پیدا ہوا کہ جادو یا سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی مثلاً جادوگر ہتھیلی پر سرسوں جما کر دکھا دیتا ہے یا رسّی کو سانپ بنا دیتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ درحقیقت نہ سرسوں کا وجود ہوتا ہے نہ سانپ کا۔

الغرض طلسم سے اقبال کی مراد ہے وہ شئے جس کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہ ہو۔ جس کا کوئی مستقل وجود نہ ہو۔ چونکہ اقبالؔ کی رائے میں اس "جہان رنگ و بو" کا وجود مستقل بالذات یا حقیقی نہیں ہے اس لئے وہ اس کو طلسم رنگ و بو سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اقبالؔ اس دنیا کو کیا سمجھتے ہیں؟ یعنی دنیا موجود ہے یا موہوم ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا موجود ہے موہوم نہیں ہے۔ واضح ہو کہ اگر اقبالؔ یہ تسلیم کرلیں کہ یہ دنیا موہوم ہے تو پھر وہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے ہمنوا ہو جائیں گے اور اس بات کے لئے وہ تیار نہیں ہیں کیونکہ اس باب میں وہ مجدد الف ثانی کے تبع ہیں۔

اب دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کی رائے میں دنیا موجود ہے تو اس کے وجود کی نوعیت کیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کا وجود ظلی ہے حقیقی نہیں ہے لیکن یہ ظل موجود ہے۔ موہوم نہیں ہے۔

تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظل کا مفہوم کیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے

کہ ظلی وجود اپنے موجود ہونے میں اصل کا تابع ہوتا ہے یعنی حقیقی وجود کا محتاج ہوتا ہے جس طرح زید اگر دھوپ میں کھڑا ہو تو اس کا ظل یعنی سایہ اگرچہ موجود ہے لیکن اس کا وجود حقیقی یا مستقل بالذات نہیں ہے مثلاً اگر زید وہاں سے ہٹ کر سایہ میں آجائے تو وہ ظل معدوم ہو جائے گا یعنی ظل کی ماہیت وجود نہیں بلکہ عدم ہے۔

اسی طرح یہ کائنات اسماء وصفات الٰہیہ کا ظل ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ نظر آتی ہے بذات خود موجود نہیں ہے اسی لئے اقبالؔ اس طلسم "رنگ و بو" کو نمود سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود اس کی تصریح کرتے ہیں۔

مردِ مومن از کمالاتِ وجود
او وجود و غیر او ہر شے نمود

اقبالؔ اور ابن عربی کے فلسفہ میں یہ فرق ہے کہ اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ عالم کا وجود ظلی ہے۔ حقیقی نہیں لیکن یہ ظل خارج میں موجود ہے۔
ابن عربی کا مسلک یہ ہے کہ عالم کا وجود ظلی ہے لیکن یہ ظل خارج میں موجود نہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:

بقول اقبالؔ:۔ عالم ظل ہے لیکن یہ ظل موجود فی الخارج ہے۔
بقول ابن عربی: عالم ظل ہے۔ لیکن یہ ظل موہوم فی الذہن ہے۔

اقبالؔ کے مسلک پر شرعی دلیل یہ ہے کہ قرآن حکیم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کائنات اگرچہ ظلی ہے۔ لیکن خارج میں موجود ہے مثلاً فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ یعنی جب تم نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین پر پھیل جاؤ اور اپنی معاش کا انتظام کرو۔

اس آیت میں لفظ فِیْ آیا ہے یہ ثیئت مستلزم ظرفیت ہے اور

ظرفیت مستلزم مکان ہے اور یہ مکان موجود فی الذہن نہیں ہو سکتا کیونکہ پھر انتشار کا حکم مہمل اور لغو ہو جائے گا۔ پس ثابت ہوا کہ مکان خارج میں موجود ہے ظاہر ہے کہ اگر مکان خارج میں موجود نہ ہو تو لوگ پھیلیں گے کس میں؟ اس جگہ اگر یہ شبہ ہو کہ اقبالؔ تو یہ کہتے ہیں کہ:-

نہ ہے زماں نہ مکاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں جہاں جہاں زمان ومکاں یا کائنات کی نفی کی ہے۔ وہاں ان کی مراد یہ ہے کہ کائنات یا زمان و مکاں کا وجود حقیقی یا مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ خالق کائنات کے وجود کا ظل ہے یعنی اگر خدا نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی اگر اقبالؔ ابن عربی کے ہمنوا ہو جائیں یعنی اگر وہ یہ تسلیم کر لیں کہ یہ کائنات خارج میں موجود نہیں بلکہ محض وہم وخیال ہے تو پھر ان کا پیغام عمل بلکہ ان کا فلسفہ خودی بالکل لغو اور مہمل ہو جائے گا کیونکہ اگر خودی محض وہم وخیال ہے یعنی باطل ہے تو پھر ایک امر موہوم کے استحکام کا کیا مطلب ہے؟ آپ مستحکم تو اسی شئے کو کر سکتے ہیں جس کا خارج میں وجود ہو لیکن اگر کوئی شئے خارج میں موجود ہی نہیں تو آپ اسے مستحکم کیسے کریں گے؟ اسی لئے انہوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے۔

خودی را حق بداں باطل مپندار

خودی را کشت بے حاصل مپندار

میں نے اس مسئلہ کی وضاحت اس لئے کر دی کہ اگر یہی بنیادی مسئلہ ناظرین پر مشتبہ ہو گیا تو پھر سارا کلام اقبالؔ مہمل ہو جائے گا اب مکرر اس ساری بحث کا خلاصہ درج کرتا ہوں۔

ایک مسلک یہ ہے کہ اس کائنات کا وجود حقیقی ہے مستقل بالذات ہے

یعنی یہ کائنات اپنے وجود میں کسی دوسرے کی محتاج نہیں ہے۔ اقبال اس مسلک کی تردید کرتے ہیں۔

دوسرا مسلک یہ ہے کہ اس کائنات کا وجود ظلی ہے لیکن یہ ظل خارج میں موجود نہیں ہے محض فریب نظر ہے کہ اقبال اس مسلک سے بھی متفق نہیں ہیں۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ اس کائنات کا وجود حقیقی نہیں بلکہ ظلی ہے لیکن یہ ظل خارج میں موجود ہے۔ فریب نظر نہیں ہے۔ اقبال اس مسلک کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

طلسم رنگ و بو۔ کی تشریح کے بعد اب ہم اس شعر کا مطلب بیان کرتے ہیں یعنی یہ بتاتے ہیں کہ موحد اپنی خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو کیسے توڑ سکتا ہے واضح ہو کہ اس طلسم رنگ و بو کو توڑنے کا مطلب قوائے فطرت کو مسخر کرنا ہے اور اقبال کے فلسفہ خودی کی غرض و غایت یہی ہے کہ انسان اس کائنات کو مسخر کر سکے یعنی عناصر فطرت پر حکمراں ہو سکے زمان و مکان پر غالب آسکے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے مثلاً مثنوی۔ پس چہ باید کرد۔ میں کہتے ہیں۔

مردِ حق! افسونِ ایں دیرِ کہن
از دو حرفِ رَبِّیَ الْاَعْلیٰ شکن

یعنی اے مسلمان! اللہ نے یہ کائنات اس لئے نہیں پیدا کی کہ تو اس کی پرستش کرے (جیسا کہ بعض اقوام عالم کا وطیرہ ہے، بلکہ اس لئے کہ تو اس پر حکومت کرے پس تو اپنے اندر وہ طاقت پیدا کر کہ یہ کائنات تیری غلام بن جائے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے اپنے اس پیغام میں قرآن حکیم کے ارشاد صریح کی ترجمانی کی ہے یہ کتاب مقدس بار بار انسان کو خوشخبری سناتی ہے کہ یہ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے سب تیری خدمت کے لئے ہے یہ اس لئے بنائی گئی ہے کہ تو اس پر حکومت کرے اس لئے تیرا فرض ہے کہ تو اس کو مسخر کر ذیل میں چند آیات درج کرتا ہوں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ (۲۲: ۶۵)

یعنی کیا تو نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے جو کچھ زمین میں ہے۔

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

(۳۱: ۲۰) یعنی کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ اللہ نے یہ کائنات اس لئے بنائی ہے کہ انسان اسے مسخر کر کے اس پر حکومت کرے۔ اقبالؔ نے اس شعر میں قرآن مجید کی انہی آیات کی تفسیر کی ہے۔

ماسوئ از بہر تسخیر است و بس
سینۂ او عرضۂ تیر است و بس

یعنی اس کائنات کی تخلیق کی غایت یہ ہے کہ "موحد" اسے مسخر کرے۔

اب آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کائنات کی تسخیر کیسے کی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ۔

(۱) سب سے پہلے انسان کو خدائے واحد پر ایمان لانا چاہئے۔

(۲) اسے اپنا مقصود اور مطلوب بنانا چاہئے یعنی اس سوال پر غور کرنا

چاہیئے کہ یہ کائنات تو میرے لئے ہے لیکن میں کس کے لئے ہوں؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی ہے کہ میں اللہ کے لئے ہوں پس مجھے اس سے محبت کرنی چاہیئے۔

(۳)۔ اس زاویۂ نگاہ سے موحد میں عشق حقیقی کا رنگ پیدا ہو جائے گا اللہ سے عشق کی صورت یہ ہے کہ انسان عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں فنا ہو جائے۔

(۴)۔ اس عشق سے خودی مستحکم ہو جائے گی۔

(۵)۔ اس استحکام سے مومن میں شان فقر پیدا ہو جائے گی۔

(۶)۔ اور فقر کی بدولت انسان عناصر کائنات کو مسخر کر سکتا ہے یعنی ان پر حکمران ہو سکتا ہے چنانچہ حضرت علیؓ کی زندگی اس پر شاہد ہے۔

ہر کہ در آفاق گردد بو تراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

الغرض توحید کا عقیدہ قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے جس کی بدولت موحد میں یہی قوت پیدا ہو جاتی ہے لیکن افسوس کہ اس نکتہ کو (کہ توحید سرچشمۂ قوت ہے) مسلمانوں نے فراموش کر دیا (نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا) اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ توحید اللہ کی وحدت کے محض زبانی اعتراف کا نام ہے اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چین سے لے کر مراقش تک سارے موحدین، غلامی میں مبتلا ہو گئے یعنی تسخیر کرنے والے خود مسخر ہو گئے اور یہ صورت حال بالکل فطرت اللہ کے مطابق ہے چنانچہ اقبالؔ کہتے ہیں۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر از دیگراں

اقبالؔ نے اس شعر میں مسلمانوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کی

ہے کہ توحید الٰہی ایک قوت ہے نہ کہ علمی مسئلہ۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام
(ضربِ کلیم)

اقبالؔ کی تعلیم یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محض زبان سے ادا کرنا کافی نہیں۔ زبان کے ساتھ ساتھ دل سے بھی ہونا چاہیئے تاکہ قائل کے اندر قوت پیدا ہو سکے۔

لا الٰہ گوئی؟ بگو از روئے جاں
تا ز اندام تو آید بوئے جاں
(جاوید نامہ)

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! تجلیاتِ انوارِ الٰہیہ ہر لحظہ اور ہر جگہ کارفرما ہیں اگر تو ان سے مستفید ہو سکتا تو یہ ان تجلیات کا قصور نہیں بلکہ تیری بے بصری کا فتور ہے کہ تو نے ان کے دیکھنے کے لئے نگاہ پیدا نہیں کی۔

واضح ہو کہ تجلیات کا نزول تو عین سنت اللہ کے مطابق ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ اپنی مخلوقات سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل ہو جائے کیونکہ اگر ایک سکنڈ کے لاکھویں حصہ کے لئے بھی اسماء و صفات الٰہیہ کی تجلیات کا سلسلہ بند ہو جائے تو یہ ساری کائنات اسی طرح معدوم ہو جائے گی جس طرح ہاتھ کی حرکت رک جائے تو وہ دائرہ فوراً معدوم ہو جائے گا جو شعلۂ جوالہ کی گردش سے پیدا ہوا ہے۔

اقبالؔ اس بات کو کہ "تجلّی عین فطرت ہے" دریا اور موج کی مثال سے واضح کرتے ہیں یہ مثال اقبالؔ نے اس لئے درج کی ہے کہ صوفیائے کرام اسی مثال کو پسند کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اگر دریا اپنی امواج سے بیگانہ ہو جائے تو ان کا وجود ہی ختم ہو جائے

کیونکہ موج کا وجود دریا کے وجود پر موقوف ہے اسی طرح اگر خدا کائنات سے بیگانہ ہو جائے تو کائنات کا وجود ختم ہو جائے گا یعنی، انسان کا وجود ختم ہو جائے گا کیونکہ ہم پچھلے شعر کی شرح میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ کائنات کا وجود ظلی ہے یعنی وہ محض اللہ تعالیٰ کی تجلّی اسماء و صفات کی بدولت موجود ہے بذاتِ خود اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کائنات یا انسان ختم ہو جائے تو کیا نقصان ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر خدا کا فلسفیانہ تصوّر مدِ نظر رکھا جائے تو چونکہ وہ بذاتِ خود کامل اور منبع کمالات ہے اس لئے عقل مقتضی ہے کہ کوئی ہستی ایسی ہو جو اس کے کمال کا اعتراف کرے ورنہ کمال کا تحقق کیسے ہوگا؟ فرض کرو خدا کامل تو ہے لیکن وہ کچھ پیدا نہیں کرتا تو اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پیدا نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ تخلیق سے عاجز ہے اور عجز کمال کی ضد ہے۔

اس کو شاعر کی مثال سے واضح کر سکتے ہیں۔ شاعری ایک فطری ملکہ ہے اور یہ جس شخص میں ہوتا ہے وہ جب شعر کہتا ہے تو اپنی ذات کے اقتضا پر عمل کیا۔

اب اگر یہ کائنات ختم ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کی صفات ربوبیت ختم ہو گئیں اور یہ محال ہے اس سے اقبالؔ کا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ خدا اپنی مخلوقات سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ پس تجلیات کا ظہور ہر لحظہ ہو رہا ہے ہاں ان سے استفادہ کے لئے نگاہ پیدا کرنا ضروری ہے۔

چوتھا شعر: کہتے ہیں کہ علم اور عرفان یا فلسفہ اور عشق یا شریعت اور طریقت یا مذہب اور تصوف کو عام طور سے ایک دوسرے کی ضد سمجھا جاتا ہے اس کا باعث منبر (علمائے ظاہر) کی غلط بینی (غلط فہمی) ہے درحقیقت شریعت اور طریقت میں کوئی مخالفت نہیں ہے دنیا میں ہر شے کا ایک ظاہر ہوتا ہے

جسے جسم سے تشبیہ دے سکتے ہیں دوسرا باطن ہوتا ہے جسے روح سے تعبیر کر سکتے ہیں شریعت ظاہر کو مدنظر رکھتی ہے طریقت اسی شئے کے باطن پر اپنی توجہ مبذول کرتی ہے مثلاً شریعت حکم دیتی ہے کہ نماز پڑھو۔ روزہ رکھو۔ وغیرہ وغیرہ اب اگر ایک شخص نماز پڑھتا ہے تو حامی شرع اور عالم دین مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے شریعت کا تقاضا پورا کر دیا لیکن حامی طریقت اس منزل پر آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر بوقت نماز حضوری قلب جو اس کا باطن ہے حاصل نہ ہو تو نماز تو ہو گئی لیکن کامل نہیں ہوئی یعنی ایسی نماز سے شارع علیہ السلام کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ بیشک قیام۔ رکوع۔ سجدہ اور جلسہ یہ ارکان نماز بھی ضروری ہیں لیکن یہ سب ظاہری امور ہیں۔ نماز کا باطن نہیں ہیں اس لئے ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کی طرف بھی توجہ ضروری ہے اقبالؔ نے مثنوی پس چہ باید کرد میں اس شعر میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے۔

پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن باعماقِ حیات

یعنی طریقت، شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کے مشاہدہ کا نام ہے کہ شریعت اعماق حیات سے پیدا ہوتی ہے یعنی شریعت کی اصل کو دریافت کرنے ہی کا دوسرا نام طریقت ہے چنانچہ ارباب طریقت شریعت سے کسی حالت میں بھی مستغنی نہیں ہو سکے۔

پانچواں شعر:۔ ایک متقی مسلمان خواہ وہ برسر اقتدار ہو یا محکومی کی حالت میں ہو اگر اس میں استغنا یعنی اہل دنیا سے بے نیازی کی شان موجود ہے تو وہ دونوں حالتوں میں اپنے ایمان کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔

استغنا سے مراد ہے اللہ کے سوا کسی اور سے حاجت روائی کی آرزو

نہ کرنا پس جو مسلمان خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم ہر حال میں صرف اللہ کو اپنا حاجت روا سمجھتا ہے اور دوسرے کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا وہ شرک سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ اگرچہ بظاہر جبرئیل سے خطاب کیا ہے لیکن دراصل شاعر کا مطلب یہ ہے کہ فرشتوں میں اللہ سے عشق کرنے کی صلاحیت نہیں ہے کیونکہ ان کو یہ نعمت عطا نہیں کی گئی ان کو اللہ نے محض تسبیح و ذکر و طواف کے لئے پیدا کیا ہے۔

نظم مذکور کے پہلے بند پر تبصرہ

چونکہ اقبالؔ نے یہ نظم حکیم موصوف کے مزار کی زیارت سے متاثر ہو کر لکھی تھی اس لئے انہوں نے پہلے بند میں تصوف کی شؤن مختلفہ کا بیان کیا ہے۔ مثلاً

پہلے شعر میں یہ بتایا ہے کہ عشق انسان کو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر کر دیتا ہے عاشق اس کائنات میں نہیں سما سکتا۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

دوسرے شعر میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ عشق کی بدولت انسان قوائے فطرت کو مسخر کر سکتا ہے۔

تیسرے شعر میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ عشق خالق اور مخلوق میں ربط پیدا کر دیتا ہے اور اس کی بدولت عاشق کو تجلیاتِ الٰہیہ کا جلوہ نظر آسکتا ہے

چوتھے شعر میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ علم اور عشق میں کوئی رقابت یا مخالفت نہیں ہے۔ بلکہ عشق علم کی اعلیٰ صورت ہے۔

پانچویں شعر میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ عشق انسان میں شان استغنا پیدا کر دیتا ہے اور دنیا میں بے نیازی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے یہ وہ دولت بے بہا ہے کہ اکثر سلاطین عالم اس کی حسرت اپنے ساتھ لے گئے

چھٹے شعر میں اس بات کو مشرح کیا ہے کہ کائنات میں صرف انسان وہ ہستی ہے جسے اللہ نے دولت عشق سے سرفراز کیا ہے۔

القصہ اقبالؔ نے اس بند کے ہر شعر میں عشق ہی کی مختلف خصوصیات کو بیان کیا ہے اور چونکہ حکیم سنائی عشق کے علمبردار ہیں اس لئے در پردہ اقبالؔ نے یہ بند حکیم موصوف ہی کی شان میں لکھا ہے۔

دوسرا بند

پہلا شعر: کہتے ہیں کہ میں نے مشرق اور مغرب کے تمام میخانوں کی سیر کی ہے لیکن حالت یہ ہے کہ مشرق کے میخانوں میں شراب معرفت تو موجود ہے۔ قرآن اور حدیث تو موجود ہے لیکن با عمل علماء اور صوفیاء جو مسلمانوں میں ذوق ایمان پیدا کر سکیں نظر نہیں آتے مغرب میں حکماء اور علماء موجود ہیں لیکن ان کے علوم ناقص اور ایمان سے بیگانہ بنانے والے ہیں یعنی ان کی بدولت دنیا مل سکتی ہے خدا نہیں مل سکتا۔

خلاصہ
مشرق میں شراب موجود ہے لیکن ساقی موجود نہیں۔
مغرب میں ساقی موجود ہے لیکن ان کی شراب میں کیف نہیں۔

دوسرا شعر: اس شعر سے لے کر آخر بند تک اقبالؔ نے مشرق

کی حالت بیان کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان جنہوں نے کسی زمانہ میں قیصر اور کسریٰ کے تخت الٹ دیئے تھے اب نہ ایران میں نظر آتے ہیں۔ نہ توران میں مطلب یہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام کی حالت یہی ہے۔

تیسرا شعر:۔ علماء اور شیوخ کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں بزرگان دین کے نام پر اپنی اپنی دکانیں چمکا رہے ہیں خود ان کے اندر نہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے زہد۔ ورع کا کوئی رنگ ہے نہ حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کے عشق ومحبت کی کوئی جھلک ہے اور نہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی عفت و پاکیزگی کا کوئی شائبہ ہے۔ صرف ان بزرگوں کا نام بیچ رہے ہیں اور خلق خدا کو فرقہ بندی میں مبتلا کر رہے ہیں۔

واضح ہو کہ اقبالؔ نے نہایت خوبی کے ساتھ ایک مصرع میں ملت اسلامیہ کی تین مشہور اور قابل احترام شخصیتوں کو جمع کر دیا ہے یہ قرن اوّل کی وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کی عظمت کے سامنے ہر مسلمان کا سر فرط عقیدت سے جھک جاتا ہے اور قدر مشترک ان تینوں میں یہ ہے کہ ان میں اسلام کی روح یعنی دنیا اور دنیا والوں سے بے نیازی کی شان جلوہ گر تھی جیسا کہ گلیم (کمبل)، دلق (گدڑی) اور چادر سے مترشح ہے۔ اس مصرع کو پڑھ کر اقبالؔ کے کمالِ فن کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ہر موصوف کے لئے کیسی موزوں اور حقیقت افروز صفت استعمال کی ہے۔ گلیم۔ دلق اور چادر۔ ان تین لفظوں سے شان استغنا کی تصویر نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ اسرافیل نے حضور حق میں یہ بات عرض کی کہ اے خدا! اقبالؔ کی شاعری بڑی ہنگامہ خیز ہے اور اگر اس کا یہی مقام رہا تو مجھے

اندیشہ ہے کہ وہ وقت سے پہلے ہی قیامت برپا کردے گا۔

پانچواں شعر:۔ بارگاہ ایزدی سے یہ ندا آئی کہ تونے غور نہیں کیا قیامت تو برپا ہو چکی ہے کیا یہ حادثہ آشوب قیامت سے کچھ کم ہے کہ چین جیسے دور و دراز ملک کے مسلمان تو زیارت حرمین (مکہ اور مدینہ) کی تیاری کریں لیکن وادی بطحا (مکہ مکرمہ) کے رہنے والے ارکانِ اسلام کی طرف سے ایسی غفلت اختیار کریں۔

بطحا کے لغوی معنی وہ نشیبی زمین جس میں سنگریزوں کی کثرت ہو اور سیلاب کا پانی وہاں سے گذرتا ہو عرف عام میں وادیٔ مکہ کو کہتے ہیں۔

قیامت۔ عرفی معنی میں تو محتاج تصریح نہیں ہیں لیکن۔

قیامت۔ برپا کر دینا محاورہ ہے اس کا مطلب ہے ہنگامہ برپا کر دینا۔
قیامت۔ ہوگئی یعنی غیر متوقع طور پر کوئی زبردست سانحہ رونما ہو گیا۔
قیامت۔ ہے یعنی (۱)۔ انتہائی ناگوار اور ناقابل برداشت بات ہے مثلاً

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے ہم سے

(۲)۔ بہت دشوار ہے۔ مثلاً

طرز بے دل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

تیسرا بند

اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی حالت پر تبصرہ کے بعد اس بند میں اقبالؔ نے مغرب کی مذہبی اور سیاسی کیفیت بیان کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب

(CIVILISATION) سراسر مادہ پرستی اور انکار خدا پر مبنی ہے (لا) سے مراد ہے (لا الٰہ) لیکن افسوس ہے کہ مغرب کے علماء، حکماء اور سائنسدان اس زہر کا تریاق مہیا کرنے سے قاصر ہیں (اِلّا) سے مراد ہے۔ اِلّا اللہ۔

دوسرا شعر:۔ یورپ اپنی الحاد پرور اور اخلاق سوز تہذیب کی بدولت عنقریب تباہی کے گڑھے میں گرنے والا ہے۔

زخمہ ۔بمعنی مضراب۔ زخمہ ور ۔بمعنی ساز بجانے والا۔ لیکن یہاں زخمہ ور سے مراد ہے یورپ کے ارباب سیاست۔

نوٹ:۔ یہ شعر اقبال نے ۱۹۳۴ء کے شروع میں لکھا تھا جبکہ یورپ میں جنگ کے آثار بظاہر نظر نہیں آرہے تھے لیکن انہوں نے اپنی فراست سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ اس مادہ پرست یورپ میں عنقریب ایسی قیامت برپا ہونے والی ہے جس سے تہتگوں کے نشیمن بھی تہ و بالا ہو جائیں گے یعنی بڑی حکومتیں تباہ ہو جائیں گی چنانچہ پانچ سال بعد ان کی یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہو گئی۔

چوتھا بند

اس بند میں اقبال نے غلامی کی حقیقت اور فضیلت بیان کی ہے۔

پہلا شعر:۔ جب کوئی قوم مادہ پرستی میں مبتلا ہو جاتی ہے تو وہ نفس امارہ یا خواہشات نفسانی کی غلام ہو جاتی ہے اور یہ غلامی کی بدترین صورت ہے کیونکہ وہ قوم نیکی اور پاکیزگی مروّت اور شرافت کے جذبات سے بیگانہ ہو جاتی ہے ایسی قوم دنیا میں کسی کو نکوکاری اور شرافت (زیبائش) کا درس نہیں دے سکتی کیونکہ نیکی وہ ہے جسے آزاد بندے نیکی قرار دیں نہ کہ غلام۔

آزاد بندوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کے قانون پر چلتے ہیں۔

دوسرا شعر:- مادہ پرست قوموں کی تعلیمات لائق اعتماد نہیں ہیں کیونکہ دنیا میں صرف خدا پرست لوگ نیکی اور بدی میں امتیاز کر سکتے ہیں جو لوگ اپنی محدود اور ناقص عقل کی غلامی (پیروی) کرتے ہیں کوئی عقلمند آدمی ان کی سمجھ (بصیرت) پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔

تیسرا شعر:- امروز او رفردا۔ ان دو لفظوں کو اقبالؔ نے اصطلاحی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ امروز سے مراد ہے اقتضائے عصر حاضر۔ اور فردا سے مراد ہے مآل اندیشی یا عاقبت بینی یا دور بینی۔

مطلب یہ ہے کہ جو قوم مآل اندیش اور عاقبت بیں نہیں ہے وہ دنیا میں سربلندی حاصل نہیں کر سکتی بالفاظ دگر جو قوم دنیا میں آج سربلند اور برسر اقتدار نظر آتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے آئندہ زمانہ کے اقتضاء کو سامنے رکھ کر بہت عرصہ پہلے مناسب حال تیاری کر لی تھی جس کے نتیجہ میں وہ آج سربلند ہے۔ اس کی آسان مثال یہ ہے کہ جو طالب علم ۱۹۵۱ء میں کامیاب ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۱ء میں منعقد ہونے والے امتحان کے لئے تیاری کر لی تھی۔

پانچواں بند

اس بند میں اقبالؔ نے مسلمانوں کو یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ اگر وہ افسون فرنگ کو پاش پاش کر دینا چاہتے ہیں تو عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وظیفۂ حیات بنا لیں۔

پہلا شعر:- یہ شعر سراسر کنایات سے معمور ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اقوام یورپ نے دنیا کی بہت سی طاقتور قوموں کو زیر کر لیا ہے لیکن میرے پاس ایک

ایسا نسخہ ہے جس کی بدولت کمزور قوم طاقتور ہو سکتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ ملت اسلامیہ کے دشمن مدتوں سے اس کوشش میں ہیں کہ میرا قصہ پاک کر دیں کیونکہ وہ مجھے اپنے مقاصد کی تکمیل میں ایک زبردست رکاوٹ سمجھتے ہیں لیکن مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں حکمت کلیمی کا وارث ہوں میرے پاس بھی وہی معجزہ ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰ کو عطا کیا تھا یعنی ید بیضا جس کی مدد سے انہوں نے فرعون کو شکست دی تھی۔

تیسرا شعر:۔ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے ظاہر فرمایا ہے کہ وہ دنیا میں اسلام باطل مذاہب پر غالب آجائے لہٰذا اسلام کی چنگاری خس و خاشاک سے فنا نہیں ہو سکتی بلکہ وہ تو خود سارے جنگل کو پھونک کر رکھ دے گی۔

چوتھا شعر:۔ وہ اکسیر۔ وہ ید بیضا اور وہ چنگاری کیا ہے؟ وہ عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جو مسلمان کے اندر خویشتن بینی اور خویشتن داری کی صفات پیدا کر سکتا ہے۔ اور اپنے بادشاہوں سے بے نیاز بنا سکتا ہے۔

خویشتن بینی سے مراد ہے۔ اپنی معرفت حاصل کرنا یا اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جانا۔ خویشتن داری کا مطلب ہے اپنی خودی کی حفاظت کرنا اور اس میں استغنا کا رنگ پیدا کرنا جو مومن کی بنیادی صفات میں سے ہے۔

پانچواں شعر:۔ اگر مسلمان سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا اپنا شعار زندگی بنا لیں تو اقوام مغرب کی تو حقیقت ہی کیا ہے وہ عناصر کائنات کو اپنا محکوم بنا سکتے ہیں۔

فتراک بمعنی شکار بند۔ مراد ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کرنا اب اقبال اس صاحب دولت کے نام کی صراحت کرتے ہیں۔

چھٹا شعر:۔ اے مسلمان تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار

کرو۔ کیونکہ آپؐ ہی اس صراطِ مستقیم سے واقف ہیں جو اللہ تک پہونچا سکتی ہے اور آپؐ ہی تمام رسولوں کے ختم کرنے والے ہیں یعنی آپؐ کے بعد کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوگا اور آپؐ ساری کائنات کے آقا اور سردار ہیں۔ اور آپؐ کی غلامی کی بدولت "غبارِ راہ" یعنی ایک ادنیٰ انسان اللہ کا مقرب بن سکتا ہے۔

ساتواں شعر:۔ کون صاحبِ دولت؟ وہ برگزیدہ ہستی جس کو اگر عشق و مستی کی نگاہ سے دیکھا جائے تو وہی اول ہے اور وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے۔ یعنی عاشقانِ رسولؐ کو ذاتِ محمدیؐ میں ذاتِ ایزدی کی صفات کا پرتو نظر آتا ہے۔ بظاہر تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم انسان ہی ہیں لیکن بباطن مظہرِ صفاتِ الٰہی ہیں۔ خدا تو نہیں ہیں لیکن خدا نما ضرور ہیں۔

واضح ہو کہ اوّل اور آخر۔ ظاہر اور باطن اللہ کی صفات ہیں لیکن ان کا عکس ذاتِ محمدیؐ میں بھی جلوہ گر ہے۔

نیز چونکہ آپؐ کا قلبِ مطہر۔ مہبطِ وحی ہے اس لئے آپؐ قرآنِ ناطق بھی ہیں۔ آپؐ کی سیرتِ مبارک قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "کانَ خُلُقُہُ القُراٰن" یعنی آپؐ کو اگر سیرت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو آپ مجسم قرآن ہیں۔

نیز آپؐ کی ذات ستودہ صفات چونکہ معیارِ حق و باطل ہے اس لئے آپؐ کو فرقان بھی کہہ سکتے ہیں یعنی حق اور باطل کے درمیان امتیاز کرنے والا اور قرآن مجید میں اللہ نے آپؐ کو یٰسین اور طٰہٰ کے مقدس القاب سے بھی نوازا ہے۔

آخری شعر میں اقبال نے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ میں اس بات کو سوءِ ادب خیال کرتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء میں حکیم سنائی سے بڑھ جاؤں اس لئے اپنے قلم کو یہیں روکتا ہوں ورنہ الخ

بحر میں لاکھوں موتی موجود ہیں یعنی ذات محمدیؐ کی مدح و ثنا میں بہت کچھ لکھا ہے لاکھوں کا لفظ استعمال کرکے اقبالؔ نے نہایت بلیغ انداز میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا کما حقہٗ طاقت بشری سے خارج ہے۔
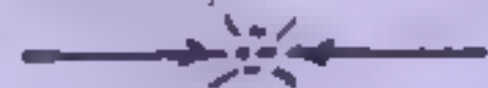
غزل ۲

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنتِ پرویز

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز

جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

یوں دادِ سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خونریز

پہلا شعر:- اس میں اقبالؔ نے اپنی شاعری کی حقیقت بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سوز و گداز اور کیف و مستی سے لبریز ہے جس کے پڑھنے سے روحانی سرور حاصل ہوتا ہے اور اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عقل کے ساتھ ساتھ انسان میں عشق کا رنگ بھی پیدا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ کی شاعری پر اس سے بہتر تبصرہ ناممکن ہے اس شعر میں خود انہوں نے ہماری واقفیت کے لئے اپنی شاعری کی تین خصوصیات بیان کر دی ہیں۔

۱- پرسوز ہے۔ یعنی واردات عاشقی کی سچی تصویر ہے۔
۲- نشاط انگیز ہے۔ یعنی عشق و مستی کے جذبات کو بیدار کرتی ہے۔
۳- اندیشہ (عقل) میں جنون (عشق) کا رنگ پیدا کر دیتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبالؔ مرشد رومی کی اتباع میں اس مسلک کے مبلغ ہیں کہ محض عقل انسان کو کامیاب نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ انسان کے اندر عشق کا جذبہ بھی کارفرما ہے تو حقیقی معنی میں انسانیت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

دوسرا شعر:- فقر اور ملوکیت دونوں میں بڑی مشابہت ہے یعنی فقر اور بادشاہ دونوں انسانوں پر حکومت کرتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ پرویزی شوکت ظاہری اور لوازم مادی (فوج اور خزانہ) پر موقوف ہے لیکن فقیری ان تمام باتوں سے بے نیاز ہے بادشاہ۔ خزانہ۔ فوج اور تخت اور تاج کے بغیر حکومت نہیں کر سکتا ہے لیکن فقر ان میں سے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔

تیسرا شعر:- اس زمانہ میں خانقاہیں تو بدستور آباد ہیں لیکن ان کے حجروں میں وہ فقیر نظر نہیں آتے جن کی ہیبت سے شیروں کے پتے پانی ہو جاتے ہیں

یعنی بادشاہ لرزہ براندام ہو جائیں۔

چوتھا شعر: میں آج کل کے صوفیوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ
حقیقی معنی میں فقیر وہ ہے جس کے سینہ میں انقلاب برپا کرنے کی اس قدر زبردست
آرزو موجزن ہو کہ پاس بیٹھنے والوں کو قیامت کا نقشہ نظر آجائے۔ انقلاب سے
مراد ہے تبلیغ اور اشاعت اسلام کی تڑپ جو حضرات صوفیائے کرام کی زندگیوں
کا طرۂ امتیاز تھی[1]۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کا آج ہر طرف فقدان ہے۔

پانچواں شعر: حقیقی فقیر کی دوسری شناخت یہ ہے کہ اس میں
ذکر اور فکر دونوں طاقتیں پہلو بہ پہلو کارفرما ہوتی ہیں۔

ذکر سے مراد ہے عشق رسولؐ! جس کی بدولت قلب منور ہو جاتا ہے۔ فکر
سے مراد ہے ذہن میں چند مسلمات کو اس طرح ترتیب دینا کہ ان کی مدد سے
نئے معارف حاصل ہو سکیں[2]۔

یعنی حقیقی معنی میں "مرد خدا" یہ فقیر وہ ہے جس کا دل ذکر الٰہی (محبت الٰہی)
سے منور ہو اور جس کی فکر (قوت ادراک) حقیقت رسی میں بجلی سے بھی زیادہ تیز ہو

---

[1] سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے نامور بزرگ سیدی و مولائی حضرت شیخ نصیر الدین
چراغ دہلیؒ نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام ہی کے لئے اپنے نامور خلیفہ حضرت سید
محمد گیسو درازؒ کو (جن کا لقب خواجہ بندہ نواز ہے) دکن بھیجا تھا اور وہ اس شان
سے روانہ ہوئے تھے کہ سات سو درویش ان کے ہمرکاب تھے۔

[2] مثلاً یہ کائنات ہر دم متغیر ہے۔ (صغریٰ)
اور ہر متغیر شے حادث ہوتی ہے۔ (کبریٰ)
اس لئے یہ کائنات حادث ہے۔ (نتیجہ)

نوٹ:۔ ذہانت نام ہی ہے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ معلومات سے مجہولات تک پہونچنے کا۔

چھٹا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ ملوکیت ایک لعنت ہے جو انسان کے دماغ میں "فرعونیت" پیدا کر دیتی ہے اور جس طرح مرض جنوں میں دماغ خراب ہو جاتا ہے جس کی بنا پر مریض سے عقل کے خلاف افعال سرزد ہوتے ہیں اسی طرح ملوکیت بھی دماغ میں فتور پیدا کر دیتی ہے اور انسان اپنی حد سے متجاوز ہو جاتا ہے اور بعض اوقات ایسی باتیں کر بیٹھتا ہے جو سراسر عقل سلیم کے خلاف ہوتی ہے۔

اطبا، جنوں کے معالجہ میں فاسد خون نشتر کے ذریعہ سے خارج کر دیتے ہیں اس طریق علاج سے اقبال کی قوت تخیل نے بڑا عمدہ مضمون پیدا کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ چنگیز یا تیمور دراصل وہ نشتر ہیں جن کے ذریعہ سے اللہ متکبر بادشاہوں کا دماغ فاسد خون خارج کر کے درست کر دیتا ہے۔

نوٹ:۔ تاریخ عالم میں اس کی مثالیں بکثرت مل سکتی ہیں میں صرف دو مثالیں درج کرتا ہوں تاکہ اقبال کے نظریہ کی تائید ہو سکے۔

۱۵۳۶ء میں ہمایوں نے چاپانیر (واقع گجرات) کا مشہور قلعہ فتح کیا اور اس کی خوشی میں اس نے اپنے درباریوں اور فوجی افسروں کو داد عیش دینے کی اجازت دی چنانچہ ان لوگوں نے رات کے وقت خوب شراب پی اور نشہ کی حالت میں، انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب تو دکن فتح کرنا چاہئے چنانچہ یہ لوگ اسی عالم مدہوشی میں اپنی مجوزہ مہم پر روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن جب بادشاہ کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے ان کے تعاقب میں فوج بھیجی جو انہیں گرفتار کر کے واپس لائی۔ تو بادشاہ نے حالت غضب میں حکم دیا ان لوگوں کو

مست ہاتھیوں کے پاؤں سے روند دیا جائے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ سب کا خاتمہ ہوگیا۔

اسی شام کو جب ہمایوں نے جماعت کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی تو امام نے سوءِ اتفاق سے پہلی رکعت میں سورۃ الفیل کی تلاوت کی بادشاہ نے یہ سمجھا کہ امام نے میری توہین کے لئے قصداً ایسا کیا ہے۔ اس لئے نماز کے بعد اس نے حکم دیا کہ اس امام کو بھی ایک مست ہاتھی کے پاؤں میں ڈال دیا جائے اس واقعہ سے یہ حقیقت ناظرین پر بآسانی منکشف ہو سکتی ہے کہ ملوکیت یقیناً ایک طرح جنون پیدا کر دیتی ہے جس کے زیر اثر بعض اوقات مطلق العنان بادشاہوں سے ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں جو عقل اور انسانیت دونوں کے خلاف ہوتے ہیں۔

اب دوسری مثال درج کرتا ہوں۔

۱۴۰۲ء میں تیمور نے انگورہ کے میدان میں سلطان بایزید ایلدرم کو شکست دی لیکن جب سلطان ایک قیدی کی حیثیت سے اس کے سامنے آیا تو اس نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور بعزت تمام اپنے برابر بٹھایا پھر اس سے کہا کہ "تم پر جو یہ مصیبت آئی ہے وہ خود تمہاری لائی ہوئی ہے۔ تم نے بارہا اپنی حدود سے تجاوز کیا جس کی وجہ سے میں تم سے انتقام لینے پر مجبور ہو گیا۔"

تیمور کے یہ تاریخی الفاظ کسی تبصرہ کے محتاج نہیں ہیں جب کوئی بادشاہ تکبّر اور نخوت کی بنا پر اپنی حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے تو اللہ کسی دوسرے بادشاہ کے ذریعہ سے اس کی شان و شوکت کو فنا کر دیتا ہے ناظرین اگر ان حقائق کو مدّنظر رکھ کر اقبال کے اس شعر کو پڑھیں گے تو وہ یقیناً اس بات کا

اعتراف کریں گے کہ چنگیز اور تیمور واقعی اللہ کے نشتر تھے۔

ساتواں شعر:۔ عراق و پارس سے اسلامی ممالک مراد ہیں اور کافر ہندی سے اقبالؔ نے اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا ہے لفظ "کافر" اس جگہ "غلام" کا مرادف ہے اور یہ تلخ حقیقت اقبالؔ نے اس لئے واشگاف بیان کی کہ مسلمانوں کے اندر حرّیت کا جذبہ پیدا ہو۔

کہتے ہیں کہ مسلمان ملکوں میں جو لوگ سمجھدار ہیں اور میری شاعری کے مقصد سے واقف ہیں وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کافر ہندی سے تیغ و سنان خونریزی میں مشغول ہے۔ اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ میں اس زمانہ میں کفر والحاد کے خلاف جہاد بالقلم کر رہا ہوں۔

نوٹ:۔ لیکن بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہند و پاک کے مسلمان علی العموم اقبالؔ کو ایک "عظیم الشان" شاعر ہی سمجھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے کلام کو خلوت میں پڑھنے اور سمجھنے کے بجائے قوّالوں کی زبان سے سن کر واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے بلند کرتے ہیں کاش انہیں اس حقیقت کا احساس ہو سکے کہ اقبالؔ نے اپنے کلام میں اسلام کے حقائق و معارف بیان کئے ہیں جن پر عمل کرنے سے قوم دنیا میں سربلند ہو سکتی ہے۔

غزل ۳

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبریلؑ دے تو کہوں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

ضمیر پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قارون نہ فکرِ افلاطون

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

پہلا شعر: کہتے ہیں کہ عشق نے تمام اسرار کائنات (مثلاً انسان کیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟) مجھ پر واضح کر دیئے ہیں لیکن الفاظ کے ذریعہ سے ان کا اظہار بہت دشوار ہے اس لئے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے نفس جبرئیل عطا فرما دے تاکہ میں وہ اسرار و رموز واضح طور پر دلنشیں انداز میں دنیا کے سامنے بیان کر سکوں۔

نفس جبرئیل کی تخصیص اس لئے کی ہے کہ ملائکہ مقربین میں حضرت جبرئیل ہی اللہ کا پیغام (کلام) رسولوں اور نبیوں تک پہونچاتے ہیں اس وجہ سے اللہ نے ان کو فوق العادۃ قوتِ گویائی اور طاقت بیان بھی عطا فرمائی ہے تاکہ وہ اعلیٰ قسم کے حقائق و معارف انبیاء کو سکھا سکیں۔

اقبال بھی اپنی قوم کو حقائقِ حیات (عشق اور حیاتِ باہم مربوط ہیں اگر عشق نہ ہو تو حیات بے معنی ہے) سکھانا چاہتے ہیں۔ اس لئے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مجھے بھی حضرتِ جبرئیل کی سی روحانی طاقت اور شرح حقائق کی لیاقت عطا فرما۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب تک انسان کی روح میں فرشتوں کی سی پاکیزگی پیدا نہ ہو جائے وہ روحانی حقائق بیان نہیں کر سکتا اس لئے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اقبال اللہ سے اس پاکیزگی کے حصول کی دعا کرتے ہیں۔

دوسرا شعر: مسلمان عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی زندگی ستاروں کے نیک و بد اثرات کے تابع ہے یہ عقیدہ عمل کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اگر زید مثلاً اس وقت کسی منحوس ستارہ کے زیر اثر ہے تو وہ لاکھ کوشش کرے لیکن اس مصیبت کو دفع نہیں کر سکتا اس لئے کوشش بے سود ہے جد و جہد بیکار ہے جب ستارہ بدل جائے گا۔ حالات خود بخود بدل جائیں گے۔ ظاہر ہے یہ

عقیدہ اقبال کے فلسفہ کی ضد ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا؟ وہ تو خود وسعت کائنات میں سرگشتہ و حیران ہے وہ خود کسی زبردست ہستی کا تابع فرمان ہے پس وہ بیچارہ نہ کسی کو نفع پہونچا سکتا ہے نہ نقصان۔

تیسرا شعر:۔ اسلامی زاویۂ نگاہ سے زندگی عناصر میں ظہور ترکیب کا نام نہیں ہے بلکہ خیال اور نگاہ دونوں میں جذب و مستی (عشق) کی کیفیت پیدا ہو جانے کو کہتے ہیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کیفیت صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسان کسی کی یاد میں محو ہو جائے۔

اس نکتہ کو اقبال نے دوسرے مصرع میں واضح کر دیا ہے کہ اگر انسان کسی محبوب واحد کے تصور میں فنا ہو جانے کے بجائے ہر روز یا ہر ہفتہ ایک نیا معشوق تلاش کرتا رہے گا تو محبوبوں (تصورات) کی یہ کثرت جسے اقبال نے اندیشہ ہائے گوناگوں سے تعبیر کیا ہے اس کی خودی میں پختگی کا رنگ کبھی نہیں پیدا ہونے دے گی۔ استحکام خودی تو وحدت خیال پر منحصر ہے اور وحدت خیال وحدت مطلوب پر موقوف ہے۔

میں اس نکتہ کو موسیقی کی مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں فرض کیجئے زید۔ دھرپد گانے میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے پس اس نے آج بلادل کی دھرپد شروع کی لیکن دو ہی دن کے بعد اس نے جونپوری کا خیال سیکھنا شروع کیا اور چار دن کے بعد اس نے بھیرویں کی ٹھمری گانا شروع کر دی اور ایک ہفتہ کے بعد اس نے کھماج کے ٹپّہ کی مشق شروع کر دی اور دوسرے ہفتے اس نے تلنگ کا دادرا شروع کر دیا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ساری عمر کسی ایک چیز کو بھی صحیح طور پر نہیں گا سکے گا یعنی اسے موسیقی نہیں آسکتی اسی لئے اس فن کے ماہروں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے۔

"ایک کو سادھے سب سدھیں سب سادھے سب جائیں۔"
اگر کوئی شخص ایک راگ کو سدھ کرے تو سارے راگ اس کے قبضہ میں آجائیں گے اور اگر وہ بیک وقت سب راگوں کو سادھنا شروع کر دیگا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خالی ہاتھ رہ جائے گا۔

الغرض کامیابی (استحکام خودی) کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان کسی ایک کا ہو جائے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اسی طرح ایک دل میں دو محبوب نہیں رہ سکتے۔

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جس فرد یا قوم نے ترقی یا کامیابی حاصل کی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے کسی ایک معین شے کو اپنا محبوب بنا کر اس سے عشق شروع کیا اور شدتِ انہماک کی بدولت اپنے خیال و نظر میں جذب کی کیفیت پیدا کر لی جسے عرف عام میں دیوانگی کا عالم کہتے ہیں اور اسی نقطہ سے لطف عاشقی شروع ہوتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ وہ شئے عورت ہی ہو۔ بت بھی ہو سکتا ہے۔ لیلیٰ بھی ہو سکتی ہے۔ وطن بھی ہو سکتا ہے۔ قوم بھی ہو سکتی ہے۔ خدا بھی ہو سکتا ہے۔ دولت بھی ہو سکتی ہے۔ مدینہ بھی ہو سکتا ہے دیوی بھی ہو سکتی ہے اور ماسکو بھی ہو سکتا ہے، محبوب خواہ کوئی ہو صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ وہ ایک سے زیادہ نہ ہو۔ ورنہ خودی فنا ہو جائے گی خوب یاد رکھئے۔ دوسرے کا خیال آیا اور بنا بنایا کھیل بگڑا۔

اب یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جب خیال و نظر کی مجذوبی سے خودی زندہ یا مستحکم ہو جاتی ہے تو انسان میں یہ صفت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کے لئے اپنی سب سے بیش قیمت چیز یعنی جان بآسانی قربان کر سکتا ہے تاریخ سے ایک مثال لکھتا ہوں۔

۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب انقلاب پسندوں نے دلّی پر قبضہ کیا تو لفٹنٹ ولوبی (Lieutenant Willoughby) نے جو کشمیری دروازہ متصل دلّی کے میگزین کا انچارج تھا اس خیال سے کہ گولہ بارود کا یہ عظیم الشان ذخیرہ اگر دشمنوں کے ہاتھ آ گیا تو خدا معلوم اس کی مدد سے وہ میری قوم کے کس قدر افراد کو ہلاک کر دیں۔ یہ فیصلہ کیا کہ مجھے اس میں آگ لگا دینی چاہئے بس اس نے بلا تامل اس ذخیرہ کو نذرِ آتش کر دیا اور خود اپنے بارہ ماتحت افراد کے ساتھ خوشی خوشی لقمۂ اجل بن گیا۔

چونکہ اس نے کسی کے عشق میں جان دی اس لئے زندہ ہو گیا۔ اور اگر وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا تو مر جاتا۔

اگر وہ زندہ رہتا تو شاید آج اس کی قبر کا نشان بھی مٹ گیا ہوتا لیکن اس نے مر جانے کو ترجیح دی اس لئے آج بھی اس کا نام زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا وہ کیا خوب کہا ہے جناب مسیح علیہ السلام نے کہ "جو زندہ رہنے کی آرزو کرے گا وہ مر جائے گا اور مرنے کی تمنا کرے گا وہ زندگی حاصل کرے گا۔

اب میں اس امر کی وضاحت کرتا ہوں کہ اسلام استحکام خودی کا درس اسی لئے تو دیتا ہے کہ اس کی بدولت مقصد حیات حاصل ہو سکتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

(ا) مقصدِ حیاتِ مسلم حصول خوشنودیٔ باری تعالیٰ ہے۔

(ب) اللہ صرف اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ اس کی راہ میں جہاد کیا جائے۔

(ج) جہاد فی سبیل اللہ کے معنیٰ ہیں سر ہتھیلی پر رکھ لینا یعنی جان دینے کے لئے تیار ہو جانا۔

(د) جان صرف عاشق دے سکتا ہے یعنی وہ شخص جس کے خیال و نظر میں خودی

کا زنگ پیدا ہو چکا ہو۔

(ہ) عاشقی استحکام خودی پر موقوف ہے اگر خودی مستحکم نہیں ہے تو عاشقی بھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔

(و) اس لئے قرآن حکیم نے مسلمات کو حکم دیا کہ عَلَیۡکُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ یعنی تم پر اپنی خودی کی حفاظت (استحکام) فرض ہے جو مسلمان اپنی خودی کو مستحکم نہیں کرتا وہ قرآن حکیم کی روح اور اپنی پیدائش کی غرض ان دونوں باتوں سے ناواقف ہے اور کبھی ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آخر میں ایک بات اور واضح کرنی ہے کہ مدینہ اور ماسکو میں کیا فرق ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہی فرق ہے جو مدینہ اور ماسکو میں ہے۔۔۔ وہی فرق ہے جو نوری اور ناری میں ہے جو خیر اور شر میں ہے جو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور چنگیز میں ہے۔ مدینہ کا عاشق دنیا کے حق میں پیام رحمت ہوتا ہے۔ ماسکو کا عاشق اللہ کے بندوں کی بربادی اور ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر کا مطلب تو بہت واضح ہے اور چند سطروں میں بیان ہو سکتا ہے کہ خودی کی لذّت اور دوسری چیزوں کی لذت میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا کی لذتوں کا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کو آپے سے باہر یعنی بیخود کر دیتی ہیں لیکن خودی کی لذت کا نتیجہ بالکل برعکس ہے یعنی انسان بیخود نہیں ہوتا بلکہ اگر کسی کو یہ لذت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ شعور اور ہوش کے لحاظ سے مرتبۂ کمال کو پہونچ جاتا ہے۔

اس حقیقت کو اقبالؔ نے ایسے دلکش شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے کہ روح وجد کرنے لگتی ہے یہ شعر بلاشبہ حسن تخیل اور حسن بیان دونوں کے امتزاج کی بہترین مثال ہے۔

عجب مزہ ہے اس محاورہ کو اقبالؔ نے حیرت اور استعجاب کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب حقیقی نے مجھے از راہ کرم خودی کی لذت عطا فرمائی اور اب وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اس لذت سے از خود رفتہ یا بیخود ہو جاؤں حالانکہ یہ ناممکن ہے کیونکہ خودی کی لذت کا تقاضا اس کے برعکس ہے اس لذت کا نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی ہوش میں آجاتا ہے یا صاحب ہوش ہو جاتا ہے پس میں حیران ہوں کہ محبوب کے ارشاد کی تکمیل کیسے کروں۔

پانچواں شعر:۔ جس شخص کو خودی کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے وہ بیخود نہیں ہو سکتا بلکہ اس میں حسب ذیل صفات پیدا ہو جاتی ہیں اس کا قلب منور اور مطہر ہو جاتا ہے اس کی نگاہ میں بلندی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ عشق الٰہی سے سرشار ہو جاتا ہے نہ اس کی نظر میں قارون کے خزانوں کی کوئی وقعت باقی رہتی ہے اور نہ وہ حقیقت پژوہی کے لئے فلاسفر اور حکماء کے افکار کا محتاج ہوتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج سے اقبالؔ نے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ "بشر" قوائے فطرت اور عناصر کائنات کو مسخر کر سکتا ہے اور زمان و مکان پر غالب آسکتا ہے۔

اسی مضمون کو اقبالؔ نے ضرب کلیم میں بانداز دگر باندھا ہے۔

تو معنیٔ وَالنَّجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

یعنی جب تک کوئی شخص زمان و مکان کی قید میں ہے وہ معراج کی حقیقت نہیں سمجھ سکتا وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ ایک انسان اس جسد عنصری کے ساتھ بالائے آسمان کیسے جا سکتا ہے یا زمان و مکان کی قیود سے کس طرح آزاد ہو سکتا ہے جاوید نامہ میں بھی ایک شعر میں معراج کی حقیقت واضح کی ہے۔

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور

یعنی انسان جو یہ کہتا ہے کہ فلاں شئے نزدیک ہے اور فلاں شئے دور ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا شعور زمان ومکان میں مقید ہے اگر اس کے شعور میں انقلاب پیدا ہو جائے یعنی اگر وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو جائے تو پھر نزدیک اور دور، یہ دونوں لفظ اس کے لئے یکساں ہو جائیں گے جس مقام کو وہ موجودہ شعور کی بنا پر "دور" کہتا ہے وہ نزدیک ہو جائے گا یعنی انقلاب کے بعد اس کی نظر میں فاصلہ یا بعد مکانی کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد انسان معراج کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے معراج کیا ہے ؟ اس شعور میں جو زمان ومکان کی قید میں ہے انقلاب ہی کا دوسرا نام ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شعور کو زمان ومکان کی قید سے آزاد کر لیا تھا اس لئے آپؐ آن واحد میں ساتوں آسمان کی سیر کر کے اپنے حجرہ میں واپس تشریف لے آئے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ انقلاب کیسے پیدا ہوا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اقبالؔ کے پیغام کا خلاصہ یہی تو ہے کہ اے مسلمان ! سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دے تاکہ تیرے اندر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات روحانی منعکس ہو جائیں اور تو بھی زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو سکے۔

واضح ہو کہ میں نے یہاں فنا کا لفظ اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے یعنی "فنافی الرسول" کا مطلب ہے اپنے اندر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا رنگ پیدا کرنا نہ یہ کہ اپنی انفرادیت کو فنا کر دینا اس کی مثال یہ ہے کہ جب لوہا بھٹی میں پڑ کر فنافی النار ہو جاتا ہے تو اس میں نار کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً

حرارت. سرخی اور چمک جب اسے بھٹی سے باہر نکالتے ہیں تو وہ بظاہر آگ ہی نظر آتا ہے اسی طرح جب سالک فنا فی الرسولؐ ہوجاتا ہے تو وہ فنا نہیں ہوجاتا بلکہ اُس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات منعکس ہوجاتی ہیں۔

اقبالؔ نے اس فنا فی الرسولؐ کے طریقہ کو فقر سے تعبیر کیا ہے اور اپنی ہر تصنیف میں مسلمانوں کو یہی پیغام دیا ہے کہ اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرلو یہ کائنات تمہاری غلام ہوجائے گی۔

چونکہ شانِ فقر کا پیدا کرنا صحبت مرشد پر موقوف ہے اس لئے اقبالؔ نے اس چیز کی اہمیت بھی جا بجا اپنے کلام میں واضح کردی ہے قصہ مختصر اس پروگرام کے دو اجزا ہیں پہلی منزل۔ صحبتِ مرشد جس کو اصطلاح میں مرتبۂ فنا فی الشیخ کہتے ہیں یعنی پہلے سالک اپنے اندر اپنے شیخ کے کمالات پیدا کرتا ہے اس کے بعد اس میں صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ دوسری منزل میں قدم رکھے یعنی پھر وہ بواسطہ شیخ فنا فی الرسولؐ کا مرتبہ حاصل کرتا ہے اور جب اسے یہ مرتبہ حاصل ہوجاتا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے وہ فنا فی اللہ کا درجہ حاصل کرتا ہے یعنی اس میں اسماء وصفات الٰہیہ کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے اور یہی مقصود بالذات ہے چنانچہ اقبالؔ نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

یعنی اگر انسان شانِ فقر پیدا کرلے تو اس میں اللہ کی صفات منعکس ہوجاتی ہیں اور جب یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوجاتا ہے۔

افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ عقیدت مندانِ اقبالؔ مرحوم کے فلسفہ

اور علمی کمالات پر تو آئے دن تقریریں کرتے رہتے ہیں لیکن ان کے پیغام پر عمل کرنے کا جذبہ کسی میں نظر نہیں آتا کیا خوب لکھا ہے جناب اسد ملتانی نے

یوم اقبال تو ہر سال منا لیتے ہیں
لیکن اقبال کے پیغام سے کچھ کام نہیں

ساتواں شعر۔ کُن فَیَکُونَ۔ قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ (۳-۴۶) جب اللہ کسی امر کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اسے کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے اردو زبان میں "کُنْ فَیَکُوْنَ" کے معنی تخلیق یا پیدائش کے آتے ہیں۔

اس شعر میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلامی زاویہ نگاہ سے اللہ کائنات کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہو گیا بلکہ فعل تخلیق برابر جاری ہے اس کی تائید اس آیت سے ہو سکتی ہے۔ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵-۲۹) اللہ ہر لحظہ نئی جلوہ گری میں مصروف رہتا ہے۔

اس شعر میں اقبال نے یونان کے فلسفہ مشائین کی بھی تردید کی ہے جس کی رو سے اللہ عقل اول کو صادر کر کے کائنات سے بے تعلق ہو گیا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ نہ فارغ ہوا ہے اور نہ فعل تخلیق ختم ہوا ہے۔ ہر لحظہ تخلیق ہو رہی ہے۔ اللہ ہر وقت نئی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف ہے پرانی اشیاء فنا ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کی جگہ نئی اشیاء پیدا ہوتی رہتی ہیں الغرض تخلیق کا سلسلہ ہر وقت جاری ہے۔

آٹھواں شعر۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان مغربی تعلیم نے تجھ کو روحانیت اور تقویٰ سے معرّا کر دیا ہے اور مغربی تہذیب نے تیرا زاویہ نگاہ بالکل مادہ پرستانہ بنا دیا ہے اس لئے تو اس عالم کا جو نظر سے نہاں ہے منکر ہو گیا

ہے یعنی خدا۔ ملائکہ۔ روح۔ وحی۔ عشق۔ اور قلب۔ ان تمام حقائق میں تجھ کو شک و شبہ لاحق ہے اس لئے میں تجھ کو مشورہ دیتا ہوں کہ مرشد روم کی مثنوی کا مطالعہ کر۔

"آتش رومی" سے مراد ہے تصوف اسلام جس کا مقصد یہ ہے کہ قلب میں عشقِ رسول کی آگ سے سوز و گداز کا رنگ پیدا ہو جائے تا کہ مسلمان زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو سکے۔

مغربی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان عقل کے علاوہ اور کسی طاقت کا وجود تسلیم نہیں کرتا حالانکہ انسان میں عقل کے علاوہ عشق کی قوت بھی ہے جو صحبت مرشد کی بدولت پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتی ہے اور اس کی بدولت انسان زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو سکتا ہے مولانا رومؒ کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل کے ساتھ ساتھ عشق کی تربیت بھی لازمی ہے اور ان دونوں کی مدد سے انسان منزل مقصود تک پہونچ سکتا ہے۔

مشرق میں روحانیت کا رنگ ہنوز باقی ہے لیکن عقل کا فقدان ہے مغرب میں عقل برسرِ عروج ہے لیکن عشق کس مپرسی کے عالم میں ہے اسی لئے اقبال نے مغرب کو یہ پیغام دیا کہ عشق کی طاقت کا اعتراف کرو اور اس سے استفادہ کرو۔ اور مشرق کو یہ مشورہ دیا کہ عقل کی اہمیت پہچانو اور اس دولت سے فائدہ اٹھاؤ۔

چونکہ مسلمان بھی انگریزی تعلیم کی بدولت تصوّفِ اسلام کے روحانی پہلو سے بیگانہ ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے صحبتِ مرشد کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے اس لئے اقبال نے انہیں صاف لفظوں میں اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ۔

"علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا"

واضح ہو کہ کوئی جسمانی مریض اپنا علاج خود نہیں کر سکتا اگرچہ طب کی کتابیں بھی موجود ہیں اور مفردات بھی بازار سے دستیاب ہو سکتی ہیں اس کے باوجود ہر مریض کسی طبیب ہی سے رجوع کرتا ہے یہی حال روحانی مریضوں کا ہے وہ بھی اپنا علاج خود نہیں کر سکتے اس کے لئے صحبت مرشد اشد ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں صحبت مرشد کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

نواں شعر:۔ چنانچہ اقبال نے صحبت مرشد کی اہمیت کو اپنی ذاتی مثال سے واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تم اپنی کم علمی اور کوتاہ نظری کی بنا پر صحبت شیخ کی اہمیت سے واقف نہیں ہو تو میری طرف دیکھو میری نگاہ میں جو کچھ بھی روشنی پیدا ہوتی ہے یہ کانٹ اور ہیگل نیٹشے اور برگساں کے مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مرشد رومیؒ کا فیض نظر ہے اور میری شاعری (سبو) میں تم کو حقائق و معارف کا جو دریا (جیحون) موجزن نظر آتا ہے یہ سب اسی مرد خود آگاہ کی باطنی توجہ کا اثر ہے۔

نوٹ:۔ مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اقبال کے مداح ہر سال اقبال نمبر تو شائع کر دیتے ہیں لیکن اقبال کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق کسی کو حاصل نہیں ہوتی بس اقبال کو اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنا رکھا ہے جیسے دیکھو آلات جراحی لئے مرحوم کے کلام کا "پوسٹ مارٹم" کر رہا ہے لیکن اس نے جو مشورہ دیا کہ کسی مرشد کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے دل میں سوز و گداز کا رنگ پیدا کرو۔ اس پر عمل کرنے کی خواہش کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوتی مسلمانوں نے اقبال کے کلام کو ذہنی تفریح اور دماغی ورزش کا ذریعہ بنا لیا ہے اس کے پیغام

پر نہ عوام اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں نہ خواص اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اقبال جب
قوم سے مخاطب ہیں وہ عیش پسند اور آرام طلب ہے اور قلب میں سوز و گداز
کا رنگ بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مرشد کی صحبت میں بیٹھ کر
عہدوں اور ٹھیکوں، جلسوں اور جلوسوں، نعروں اور ہنگاموں غرضکہ
ساری دنیا سے دست کش ہونا پڑتا ہے اور قوم اس کام کے لئے تیار نہیں ہے

غزل ۷

عالمِ آب و خاک و باد! سرِّ عیاں ہے تو کہ میں
وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں
وہ شبِ درد و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے
اس کی سحر ہے تو کہ میں؟ اس کی اذاں ہے تو کہ میں
کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر
شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں
تو کفِ خاک و بے بصر! میں کفِ خاک و خود نگر
کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں

رفعت تخیل ندرت تخیل حسن ادا۔ زور کلام اور تاثیر بیان کے لحاظ سے یہ غزل اقبالؔ کی بہترین غزلوں میں سے ہے اس میں انہوں نے عالم اور انسان کا موازنہ کیا ہے اور اس سے متعلق اپنے خیالات کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

پہلا شعر:۔ (۱) عالم آب وخاک وباد" کی ترکیب غور طلب ہے اقبالؔ صرف " عالم " بھی لکھ سکتے ہیں لیکن انہوں نے اس کے عناصر ترکیبی کی صراحت کرکے اپنا مدعا ثابت کیا ہے کہ عالم یا کائنات عیاں نہیں ہے کیونکہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ عناصر اربعہ سے مرکب ہے۔

(۲) سرِّ عیاں کی ترکیب بھی غور طلب ہے اس سے مراد ہے وہ چیز جس کی ماہیت معلوم نہیں لیکن وہ آنکھوں کے سامنے موجود ہو ایسی چیز اقبالؔ کی رائے میں صرف ایک ہے اور وہ حضرت انسان ہے کہ اس کی ماہیت معلوم نہیں ہو سکتی لیکن وہ موجود ہے۔

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

(۳) وہ جو نظر سے ہے پنہاں " کنایہ ہے ذات خداوندی سے اور اقبالؔ نے یہ اسلوب بیان بلاغت کا رنگ پیدا کرنے کے لئے اختیار کیا ہے۔

(۴) اس کا جہاں ہے تو کہ میں " اس ترکیب میں جہان سے مراد یہ پیدا کردہ دنیا نہیں ہے کیونکہ مخلوق ہونے کے لحاظ سے تو جہان بھی اسی کا ہے اور انسان بھی اسی کا دونوں کی حیثیت یکساں ہے لہٰذا اقبالؔ نے جو یہ بات کہی ہے کہ اس کا جہان تو نہیں ہے بلکہ میں ہوں اس تخصیص کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اپنی مخلوق میں سے اگر کسی مخلوق کے ساتھ قربت یا مناسبت ہے تو وہ انسان کی

ذات ہے اب شعر کا مطلب لکھتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ سر عیاں کائنات نہیں ہے بلکہ انسان ہے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ کائنات راز نہیں ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ کائنات عناصر سے مرکب اور عناصر ذرات مادی سے مرکب ہیں اور ذرات مادی کی تحلیل کی جائے تو ان کی اصلی برقی تموجات معلوم ہوتی ہے لہذا اصل کے امتیاز سے کائنات کوئی راز سربستہ نہیں ہے اسی نکتہ کو اقبال نے زبور عجم میں اس طرح واضح کیا ہے۔

جہان رنگ و بو پیدا. تو می گوئی کہ راز است ایں
یکے خود را بتارش زن کہ تو مضراب و ساز است ایں

یعنی یہ کائنات کوئی راز سربستہ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں تو اگر تحقیق سے کام لے تو اس کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے۔

دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ انسان راز ہے یعنی خدا کا راز ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگرچہ بظاہر وہ مادہ اور روح کے مجموعہ کا نام ہے لیکن ان دو چیزوں کے علاوہ اس میں ایک شئے اور بھی پائی جاتی ہے جس کی بدولت وہ اپنے آپ کو جانتا ہے یعنی اسے شعور ذات حاصل ہے یہ چیز کائنات میں کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتی ہے اس کی بدولت وہ ایک غیر مرئی ہستی سے عشق کر سکتا ہے۔ اس کی بدولت اس میں اللہ سے ملنے کی آرزو پیدا ہوتی ہے اس کی بدولت وہ لاحدود کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہے یعنی اس کا رنگ اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے دوسری مخلوقات کی طرح وہ بھی ایک مشت خاک ہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ مائل پرواز ہے اور خاکی ہونے کے باوجود خاکیوں پر حکمراں ہے یہ جوہر کیا ہے؟ نہ کوئی آج تک بتا سکا اور نہ کوئی بتا سکتا ہے اسی کو اقبال نے راز سے تعبیر کیا ہے چنانچہ ضرب کلیم میں لکھتے ہیں۔

خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

الغرض کائنات میں صرف انسان ہی وہ ہستی ہے جسے خالق کائنات سے ایک خاص نسبت اور قربت کا شعور حاصل ہے قرآن مجید نے اسی قربت کو بایں الفاظ واضح کیا ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

غرض خدا کا مظہر تام کائنات نہیں بلکہ انسان ہے اور اسی لئے وہ مسجود ملائکہ اور خلیفۃ اللہ ہے اور اس شعر سے اقبالؔ کا مطلب اس تفوق کا اظہار کرنا ہے جو انسان کو کائنات کی جمیع مخلوقات پر حاصل ہے۔

دوسرا شعر۔ اس شعر میں اقبالؔ نے حیات کی شان ارتقائی کو واضح کیا ہے کہ زندگی ایک ارتقا پذیر حقیقت ہے اور اس کی انتہائی ترقی یافتہ شکل انسان ہے جمادات میں بھی حیات ہے لیکن ادنیٰ درجہ کی یہی حیات شکل انسانی میں آکر مرتبۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے جسے اقبالؔ نے "سحر" صبح سے تعبیر کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ زندگی کو ایک ایسی رات سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو رنج و غم اور کرب و الم سے معمور ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حیات اپنی ابتدائی منزلوں میں یعنی جب وہ جمادات اور نباتات اور حیوانات کی انواع میں ہوتی ہے عقل و خرد اور نور وجدان دونوں سے محروم ہوتی ہے اس محرومی کو اقبال رات کی تاریکی سے تعبیر کرتے ہیں۔ رات ہمیشہ تاریکی ظلمت اور فقدان نور پر دلالت کرتی ہے۔

لیکن جب یہی حیات خاک آدم میں صورت پذیر ہوتی ہے تو گویا اندھیرے سے اجالے میں آجاتی ہے اس میں شعور ذات خویش پیدا ہو جاتا ہے یہ اس دنیا میں خودی کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اقبالؔ نے خود لکھا ہے۔

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

غرض جب حیات انسان میں پہونچی ہے تو عقل وخرد اور وجدان سے منور ہو جاتی ہے اور تاریکی سے نکل کر روشنی میں آجاتی ہے پس انسانی شعور حیات کے لئے بمنزلہ سحر ہے ۔

اقبال نے سحر کے بعد ایک اور لفظ کا بھی اضافہ کیا ہے جو بلاغت رمز وایما اور اثر آفرینی کے لحاظ سے اس شعر کی بلکہ ساری غزل کی جان ہے اور حقائق ومعارف کی کان ہے اور وہ لفظ " اذان " ہے یعنی جب زندگی انسان میں جلوہ گر ہوتی ہے تو شعور ذات کے علاوہ نکتۂ توحید یعنی اذان سے بھی آشنا ہو جاتی ہے اور یہ اس کی معراج کمال ہے ۔ واضح ہو کہ کائنات میں صرف انسان ایسی مخلوق ہے جسے ایک فوق الفطرت اور وراء الکائنات ہستی کے وجود کا احساس ہوتا ہے اور یہ احساس اسے وجدان کی بدولت حاصل ہوتا ہے جو عقل کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے یعنی زندگی جب آدم کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے تو عشق سے آشنا ہو جاتی ہے اور یہ وہ جذبہ ہے جو انسان کے علاوہ اور کسی حیوان میں نہیں پایا جاتا ۔

تیسرا شعر :۔ شام وسحر سے مراد ہے زمانہ گرم سیر یعنی تیز چلنے والا واضح ہو کہ اقبال زمانہ کی گردش کے قائل نہیں ہیں بلکہ اسے سیلانی (بہنے والا) تصور کرتے ہیں جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہو سکتا ہے ۔

تیرے شب وروز کی حقیقت ہے کیا
ایک زمانہ کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اقبال کہتے ہیں کہ یہ ساری کائنات خصوصاً زمانہ انسان ہی کی نمود کے لئے حرکت کر رہا ہے زمانہ کی حرکت کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ انسان اپنی مخفی صلاحیتوں کو ظاہر کر سکے یعنی نمود آدم سے اقبال کا مطلب ہے آدم کی مخفی استعدادوں کا قوت سے فعل میں آنا اسی حقیقت کو اقبال نے

یوں بیان کیا ہے۔

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

شانہ روزگار پہ انسان کے بار گراں "ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شئے زمانہ پہ حکمراں نہیں ہو سکتی۔ صرف انسان میں یہ قوت پوشیدہ ہے کہ وہ ابلقِ زماں پہ سوار ہو سکتا ہے عقل اور عشق۔ زمانہ پر اقتدار حاصل کرنے کی یہی دو صورتوں کا نام ہے۔ فرق یہ ہے کہ عقل کی مدد سے جزوی غلبہ حاصل ہوتا ہے لیکن عشق کی بدولت اقتدار کامل نصیب ہو سکتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے کائنات اور انسان میں جو شئے مابہ الامتیاز ہے یعنی جس وجہ سے انسان کو ساری کائنات پر تفوق حاصل ہے اس کو واضح کر دیا ہے یعنی ۔ کفِ خاک تو مابہ الاشتراک ہے (دونوں خاکی ہیں) اور خودنگری مابہ الامتیاز ہے (کائنات خودنگر نہیں) یعنی کائنات میں جمادات نباتات اور حیواتات میں قوتِ وجدان اور شعورِ ذات نہیں پایا جاتا۔

پس اس کارخانہ ہست و بود (کشتِ وجود) کی رونق یا اس کی شادابی کا انحصار حضرت انسان پر ہے نہ کہ کائنات پر کیونکہ وہ تو شعورِ ذات سے محروم ہے۔

آبِ رواں کے معنی ہیں۔ بہتا پانی۔ یہاں اقبال کی مراد پاکیزگی سے ہے کیونکہ بہتا پانی پاک ہے یعنی اگر انسان اپنی فطرت سلیمہ پر قائم رہے تو اس کی ذات سے کائنات کے ہر شعبہ میں پاکیزگی کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔

دنیا کی ترقی کشتِ وجود کی سیرابی۔ تہذیب کی ترقی۔ ایجادات واکتشافات حکیمہ اختراعات فائقہ یہ سب عقل و شعور ہی کے کرشمے ہیں، دریہ جوہر صرف انسان

میں پایا جاتا ہے۔

نوٹ:۔ اس شعر میں اقبال نے ضمنی طور پر مادہ پرستی کا ابطال کر دیا ہے کیونکہ انسان میں جو یہ خودنگری کی صفت پائی جاتی ہے یہ اسے دوسرے حیوانات سے متمیز کر دیتی ہے یہ امتیاز دلیل ہے اس بات کی کہ کوئی ایسی حکیم و علیم ہستی موجود ہے۔ جس نے ذرات مادی کی یکسانیت کے باوجود اشیاء میں اختلاف پیدا کر دیا مثلاً کوئلہ اور الماس کے کیمیاوی اجزاء بالکل یکساں ہیں اس کے باوجود ایک کا رنگ سیاہ ہوتا ہے دوسرے کا سفید اس اختلاف کا باعث ذرات مادی خود نہیں ہو سکتے کیونکہ ان میں شعور نہیں پایا جاتا موجودہ سائنس نے ذرات یا سالمات مادی کا بحدِّ امکان تجزیہ کر کے دیکھ لیا ان میں شعور، احساس یا عقل کا مطلق کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ سالمات تو الیکٹران اور پروٹان سے مرکب ہیں اور ان کی برقی موجوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تو سوال یہ ہے کہ اگر انسان (بقول کارل مارکس) صرف سالمات مادی کے امتزاج کا نام ہے تو اس میں شعور ذات کہاں سے آگیا؟ اکبر الہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

منکر ہیں روح کے جو یہ اہل غرور
اک امر ہے پوچھتا ہمیں ان سے ضرور
ہے فہم و خرد کا تم کو دعویٰ یہ کہو
پیدا ہوا مادہ میں کیونکر یہ شعور

غزل ۵

(لندن میں لکھے گئے)

تو ابھی رہ گذر میں ہے قید مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر
جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گذر بادہ و جام سے گذر
گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ و دام سے گذر
کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گذر
تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

اس غزل میں اقبالؔ نے مسلمان سے خطاب کیا ہے اور ہر شعر ایک پیغام کا حامل نظر آتا ہے لیکن اس میں ایک مرکزی خیال بھی ہے جو ہر شعر کے اندر پوشیدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اے مسلمان! اپنا زاویۂ نگاہ آفاقی بنا اور مادیات سے بلند تر ہو جا۔

پہلا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اپنے محبوب پیغام کی تبلیغ کی ہے جسے انہوں نے ہر کتاب میں مختلف انداز سے پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ دین اسلام ہے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نہ میں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان! تو نہ مصری ہے نہ حجازی نہ ایرانی ہے نہ شامی ہے تو صرف مسلمان ہے اور ساری دنیا تیرا وطن ہے۔

تیرا خدا۔ ربُّ العالمین ہے یعنی ساری دنیا کا رب ہے۔
تیرا رسولؐ۔ رحمۃٌ للعالمین ہے یعنی ساری دنیا کے لئے رحمت ہے۔
تیرا قرآن۔ ذکر العالمین ہے یعنی ساری دنیا کے لئے ہدایت ہے۔
اندریں صورت تو کس طرح آپ کو کسی خاص خطّہ میں محدود کر سکتا ہے؟ تیرا خدا آفاقی ہے۔ تیرا رسول آفاقی ہے۔ تیرا دستور آفاقی ہے تو کس طرح مقامی ہو سکتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو جنت اور اس کی نعمتوں کے حصول کی غرض سے اعمال حسنہ بجا لائے گا تو تجھے بیشک یہ دونوں چیزیں مل

جائیں گی لیکن اگر تو اپنے زاویۂ نگاہ کو بلند کرے اور اپنے عمل کو اللہ کے لئے خالص کرے تو اس کی جزا جنت سے برتر کچھ اور ہی ہے یعنی تو اللہ کو راضی کرے گا اور اس کی رضا جنت کی نعمتوں سے بدرجہا بہتر ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! فرنگی تہذیب۔ تمدن۔ معاشرت۔ سوسائٹی اور طرز زندگی بہت دلکش ہے لیکن غور سے دیکھو تو یہ ساری دلکشی ایک جال ہے جس میں پھنس کر انسان بلند روحانی مقاصد حیات سے غافل ہو جاتا ہے اور مادی آسائش اور دنیاوی عیش و عشرت ہی کو مقصود زندگی سمجھ لیتا ہے اس لئے تو اس جال میں مت پھنس جانا۔

اقبال نے مسلمان کو "طائرک بلند خیال" سے تشبیہ دی ہے اور اس ترکیب میں مسلمان کا آئیڈیل پوشیدہ ہے۔

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تیری ضرب خارا شگاف ہے یعنی تو ساری دنیا کو فتح کر سکتا ہے اور تیرے پاس ایسا دستور حیات ہے کہ تو ساری دنیا کے لئے رحمت بن سکتا ہے پس گوشۂ عافیت سے نکل۔ حجروں اور کمروں سے نکل۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں سے نکل۔ سیرگاہوں اور خانقاہوں سے نکل۔ اور ہلال کی طرح کامیابی کے آسمان پر چمک۔

پانچواں شعر:۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ تیرے دینی پیشوا اور سیاسی رہنما دونوں بے حضور ہیں یعنی ضعیف الاعتقاد ہیں اگر ان کے اندر ایمان کا رنگ ہوتا تو تجھے بھی اسلامی زندگی بسر کرنے میں لذت محسوس ہوتی پس تو غافل مت بیٹھ۔ بلکہ اس بات کی کوشش کر کہ تجھے نماز میں لذت حاصل ہو سکے اور یہ بات موقوف ہے اس بات پر کہ تیرا امام خدا رسیدہ ہو۔

واضح ہو کہ جب تک انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ درست نہ ہو (اور اس کو تصوّف میں تعلق باللہ یا صحبت الی اللہ کہتے ہیں) نہ اسے نماز میں لذت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ وہ اسلامی زندگی بسر کر سکتا ہے نماز میں لذت تعلق باللہ کی درستی پر منحصر ہے اور ایک شخص دوسرے کا تعلق باللہ اس وقت درست کر سکتا ہے جب اس نے پہلے اپنا تعلق باللہ درست کر لیا ہو یہ بات دیکھا ہے۔ جسے اقبالؔ نے ہر کتاب میں مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے کہ چراغ سے چراغ جل سکتا ہے صحبت مرشد کے بغیر نہ نماز میں لطف آ سکتا ہے نہ ایمان کی تکمیل ہو سکتی ہے نہ جہاد کا ولولہ دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی۔ مولانا سید احمد صاحب رائے بریلوی کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے تو شہادت کا مرتبہ حاصل نہ ہوتا۔ ساری عمر جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر وعظ ہی کہتے رہتے۔

غزل ع۶

امین راز ہے مردان حر کی درویشی
کہ جبرئیل سے ہے اس کو نسبت خویشی

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

نگاہِ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اڑ جائیں
نہ آہ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ رنگ و نم یہ لہو آب و ناں کی ہے بیشی

●

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ جس میں شان فقر پیدا ہو جاتی ہے وہ کائنات کے اسرار اور رموز سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فقر انسان کو عالم ملکوت سے وابستہ و مربوط کر دیتا ہے اور اس کی بدولت انسان کے اندر فرشتوں کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں یعنی فقیر کو جبرئیل کی ہمنشینی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس شعر میں فقیہ سے وہ فقیہ مراد ہے جو سلاطین

کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے احکام شریعت کی غلط تاویل کرسکتا ہے۔ اکبر آبادی نے اس شعر میں اسی قسم کے فقہا کی ذہنیت کی تصویر کھینچی ہے۔

مری قرآن خوانی سے نہ ہوں یوں بدگماں حضرت
مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہئے

صوفی سے مراد ہے وہ صوفی جو اپنے مریدوں کو ترک عمل کی تلقین کرتا ہے شاعر سے مراد ہے وہ شاعر جو اپنے کلام سے قوم کے اخلاق خراب کرتا ہے اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوسکتی ہے کہ فقہا صوفیا اور شعراء نے اپنی غلط روش غیر اسلامی تعلیم اور کوتاہ بینی کی بدولت بارہا قومی ترقی کے راستے مسدود کردیئے۔

مسلمانوں کے دیگر ممالک سے قطع نظر کرکے ہم اگر صرف ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اقبال کے اس شعر کی صداقت واضح ہوسکتی ہے۔

ا۔ اکبر کو اسلام سے بدظن اور برگشتہ کرنے میں اس زمانہ کے فقہا بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔

ب۔ مسلمانوں میں غیر اسلامی تصورات کی اشاعت کے ذمہ دار زیادہ تر وہ صوفیا ہیں جو دینی علوم سے بیگانہ تھے لیکن محض اس لئے مسند ارشاد پر جاتے ہوگئے کہ وہ ان بزرگوں کی نسل سے تھے جو اپنے ذاتی فضل و کمال کی بدولت مرجع خلائق بن گئے تھے بالفاظِ دگر عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آگئے۔

ج۔ قوم کے اخلاق تباہ کرنے کا سہرا ان شعراء کے سر ہے جنہوں نے اپنے افکار اور خیالات کو عریانی اور فحاشی کی ترویج کے لئے وقف کردیا۔

تیسرا شعر:۔ اگر مسلمان ترقی کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے اندر ایسی جلالی شان پیدا کرنی چاہیئے جس کی بدولت دشمنوں کے دلوں پر ہیبت

طاری ہو جائے۔ گذشتہ ناکامیوں پر افسوس کرتے رہنے یا اپنے اندر مایوسی کا رنگ پیدا کرنے سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔

چوتھا شعر: کہتے ہیں کہ میں نے قوم کے مرض کی تشخیص کر لی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے افراد کے دلوں میں اسلام کو دنیا میں سربلند کرنے کی آرزو چٹکیاں نہیں لیتی۔

اقبالؔ کا فلسفہ یہ ہے کہ قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب ہر فرد کے دل میں تبلیغ و اشاعت اسلام کی تڑپ پیدا ہو جائے اور ہر فرد اشاعت اسلام کے لئے ایسا بےچین ہو جائے جیسے وہ شخص بےچین ہوتا ہے جس کے بدن میں کسی زہریلے جانور نے ڈنک مار دیا ہو۔

واضح ہو کہ یہ تڑپ اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب قوم کے افراد ان لوگوں کی صحبت اختیار کریں جن کے اندر یہ تڑپ موجود ہے لیکن قوم کا رُخ تو کالجوں اور اسکولوں کی طرف ہے اور وہاں تڑپ پیدا نہیں کی جاتی خواب آور گولیاں کھلائی جاتی ہیں۔ بلکہ اقبالؔ کی رائے میں تو گلا گھونٹا جاتا ہے اور اکبرؔ کی رائے میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ بہر حال موت دونوں صورتوں میں واقع ہو جاتی ہے اب ان دونوں بزرگوں کا ایک ایک شعر سن لیجئے تاکہ میرے قول کی تصدیق ہو سکے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الاّ اللہ (اقبالؔ)

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی (اکبرؔ)

پانچواں شعر: کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو جسمانی آرائش نو یا خون کی زیادتی کو زندگی سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ تو اچھی غذا کا نتیجہ ہے۔ جان پاک یعنی روحانی پاکیزگی ہوٹلوں میں ڈنر کھاتے اور اعلیٰ لباس زیب تن کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے تو پاک لوگوں کی صحبت شرط ہے۔ اگر تو اپنے آپ کو صرف ذراتِ مادی کی ترکیب کا نتیجہ سمجھتا ہے تو یہ تیری غلطی ہے۔ آب و نان سے جسم کی پرورش ہو سکتی ہے۔ روح کی بالیدگی کے لئے روحانی غذا یعنی ان لوگوں کی صحبت شرط ہے جو تیرے اندر عشق رسول صلے اللہ علیہ وسلم پیدا کر سکیں کیونکہ جسم کی غذا روٹی ہے اور روح کی غذا عشق ہے۔

غزل ۷

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہر دل سے بَن پیارے تو شہر اچھے کہ بَن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن۔ اپنا تو بَن

من کی دنیا؟ تن کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

یہ بظاہر غزل ہے لیکن دراصل ایک نظم ہے جس میں اقبالؔ نے من کی دنیا اور تن کی دنیا کا موازنہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے پہلے تین شعروں میں شاعر نے ہماری توجہ بظاہر فطرت کی طرف مبذول کی ہے تاکہ ہمارے دل میں خالق فطرت کی ہستی کا یقین پیدا ہو سکے چوتھے شعر میں "گریز" کا رنگ ہے شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ اللہ کی ہستی کا ثبوت شہروں سے زیادہ جنگلوں میں ملتا ہے شہروں میں انسان کی کاریگری نمایاں ہے اور صحراؤں میں اللہ کا جلوہ نظر آتا ہے اس لئے جو لوگ اللہ کے شیدائی ہیں انہیں شہروں کے بجائے صحرا زیادہ مرغوب ہوتا ہے۔

اس کے بعد شاعر اپنے مقصود کی وضاحت شروع کرتا ہے اور پانچ شعروں میں جو پورے دیوان پر بھاری ہیں من اور تن کی دنیا میں موازنہ کرتا ہے۔ زورِ بیان وسلاستِ زبان اور تاثیر کے لحاظ سے ان پانچ شعروں کا جواب ساقی نامہ کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ شاعری کی سرحد الہام سے مل گئی ہے۔

پہلے تین شعر بالکل آسان ہیں اس لئے ان کی تشریح نہیں کی گئی۔

چوتھا شعر: حسن بے پروا۔ سے اللہ کی ذات مراد ہے کہتے ہیں کہ اگر اللہ نے اپنی ہستی کا ثبوت دینے کے لئے شہروں کے بجائے صحرا کو پسند فرمایا ہے کہ تو ایک طالب حق کی نگاہ میں صحرا شہر سے زیادہ محترم اور مرغوب ہونا چاہئے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اللہ کی معرفت درکار ہو تو صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرے اور اس کے لئے صحرا بہترین درس گاہ ہے۔

پانچواں شعر: اللہ کی تلاش ہو تو فطرت کا مطالعہ کرو اور اگر اپنی معرفت حاصل کرنا چاہتے تو کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے اپنے

من میں ڈوب جاؤ ساری حقیقت آشکار ہوجائے گی۔ سراغ زندگی سے مراد ہے۔ زندگی کی حقیقت، ماہیت اور کیفیت فلسفہ اور سائنس دونوں میں سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ زندگی کیوں اور کیسے وجود میں آئی؟ اس کا منبع کہاں ہے اور کیا ہے؟ آیا یہ ذرّات مادّہ کی ترکیب کا نتیجہ ہے یا مادّہ سے بالاتر کوئی غیر مادی (روحانی) حقیقت ہے۔

کہاں ہیں فلسفۂ اقبال کے طلبگار! مرحوم نے اس نظم میں اپنا سارا فلسفہ نہایت دلکش انداز میں بیان کر دیا ہے۔

گل لالہ۔ نغمۂ مرغ چمن۔ بلندئ کوہ۔ وسعت دمن۔ الوان گوناگوں انواع بوقلموں۔ باد صبح، شبنم کا موتی۔ برگِ گل۔ سورج کی کرن یہ تمام مظاہر فطرت ایک علیم، حکیم، قدیر، سمیع اور بصیر ہستی کے وجود پر شہادت دیتے ہیں یعنی اللہ موجود ہے۔

(ب) دوسری حقیقت یہ ہے کہ انسان بھی موجود ہے۔

(ج) اگر اپنی حقیقت کی معرفت درکار ہے تو اس کا طریقہ استدلالی نہیں ہے بلکہ کشفی ہے یعنی انسان کو اپنی حقیقت معلوم تو نہیں ہو سکتی ہاں منکشف ہو سکتی ہے یعنی اقبالؔ عقل کے بجائے عشق کے متبع ہیں۔ سراغ زندگی منطقی بحثوں سے نہیں بلکہ مجاہدہ، مراقبہ اور مکاشفہ سے حل سکتا ہے جسے اقبالؔ اپنی مخصوص اصطلاح میں اپنے من میں ڈوب جانے سے تعبیر کرتے ہیں۔

(د) فلسفۂ اقبالؔ کا آخری جزو اس سوال کے جواب میں مضمر ہے کہ من میں ڈوبنے کا طریقہ کیا ہے؟ یا اقبالؔ نے اس کا کیا طریقہ بتایا ہے؟

دنیا میں اس کے صرف دو طریقے اب تک دریافت ہو سکے ہیں ایک طریقہ انسانی ہے۔ دوسرا رحمانی ہے۔ انسانی طریقہ کا نام ہندوستان میں لوگ

اور یونان میں اشراق ہے۔ اقبالؔ انسانی طریقہ پر رحمانی طریقہ کو ترجیح دیتے ہیں جسے عرف عام میں شریعت محمدیؐ کہتے ہیں۔ رحمانی طریقہ کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کی جسمانی ضروریات کا انتظام کیا ہے تو اس کی روحانی تسکین کا سامان بھی مہیا کیا ہوگا اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

واضح ہو کہ من میں ڈوبنا بھی ایک مستقل فن ہے اور جس طرح دیگر فنون میں استاد کی ہدایت اور ذاتی مہارت کی ضرورت ہے اسی طرح من میں ڈوبنے کے لئے بھی مرشد کی رہنمائی اور ذاتی ریاضت درکار ہے طالب کے لئے مرشد کا وجود بہت قیمتی ہوتا ہے کیونکہ استاذ کے بغیر آدمی ڈوب تو سکتا ہے لیکن ابھر نہیں سکتا اور جو شخص ابھر نہیں سکتا وہ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے ڈوب جاتا ہے۔

خودی میں ڈوبنے سے اقبالؔ کی مراد صرف ڈوب جانا نہیں بلکہ ڈوب کر ابھر آنا ہے۔ ڈوب جانا تو بہت آسان ہے ہر شخص ڈوب سکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے ڈوب سکتا ہے ڈوبنے کے لئے کسی استاد رہنما یا مرشد کی ضرورت نہیں ہے (صرف ایک ماہوار رسالہ ایک مکتبہ اور وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈہ بالکل کافی ہے) اصل چیز ہے تو ابھرنا ہے اور "اولوالالباب" ابھرنے ہی کے لئے تو ڈوبتے ہیں۔ اور اسی کے لئے تو مجاہدہ کرتے ہیں ورنہ صرف ڈوب جانے کے لئے تو کسی مجاہدہ کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ مصرع میں غور کیجئے ابھرنے کا تصور اس کے اندر موجود ہے اقبالؔ کہتے ہیں کہ انسان اپنے من میں ڈوب کر زندگی کی حقیقت پا سکتا ہے لیکن پائے گا تو وہی جو ڈوب کر ابھر بھی سکے جو ڈوب گیا وہ کیا پائے گا اور اس کے کیا ہاتھ آئے گا ہاتھ تو کچھ اسی کے آتا ہے اور تہ کا موتی تو وہی

لاتا ہے جو ڈوب کر ابھر بھی آتا ہے۔

غرض: اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی، میں ابھرنے کا مفہوم بھی مضمر ہے۔ پس ڈوبنے کا مطلب ہوا: ڈوب کر ابھر آنا۔

سب جانتے ہیں کہ پانی کے سمندر میں سیپ کا موتی نکالنا بہت مشکل کام ہے اور اس کے لئے بڑی مہارت درکار ہے تو "من" کے سمندر سے حقیقت کا موتی نکالنا کیسے آسان ہو سکتا ہے یقیناً اس کے لئے بڑے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ ڈوب کر ابھرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے جبھی تو اقبال کو یہ کہنا پڑا۔

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

شیر کو قابو میں لانا آسان ہے لیکن "من پہ" فتح پانا مشکل ہے بات یہ ہے کہ من بڑا چنچل ہے اور ہر چنچل شئے بڑی مشکل سے قابو میں آتی ہے من کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کا کہنا نہیں مانتا چنانچہ مشہور یوگی تلسی داس جی نے کیا خوب لکھا ہے۔

تلسی من مانے نہیں جب تک خطا نہ پائے
جیسے ودھوا استری گرببھ رہے پچھتائے

اے تلسی! یہ من (نفس امارہ) ایسا چنچل ہے کہ انسان کا کہنا نہیں مانتا نیکی کی طرف لاؤ تو اس کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ خود انسان کو بدی کے ارتکاب پر مجبور کرتا ہے اور ارتکاب کے بعد انسان کفِ افسوس ملتا رہتا ہے جیسے بیوہ عورت جب حاملہ ہو جاتی ہے تو دن رات گوشۂ تنہائی میں پڑی پچھتاتی رہتی ہے۔

باز آمدم بر سرِ مطلب۔ چونکہ ڈوب کر ابھرنا بہت مشکل کام ہے اس لئے

اللہ نے اس کا طریقہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو سکھایا انہوں نے مولائے کُل فخر رُسُل دانائے سُبُل سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا۔ حضورؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھایا اور ان سے تابعین اور تبع تابعین نے یہ فن سیکھا اور ان سے صلحائے امت نے اس طریقہ کو اخذ کیا اور ساری دنیا میں پھیلایا عرف عام میں خودی میں ڈوب کر ابھرنے کو "طریقت" کہتے ہیں یعنی ابھرنے کا طریقہ۔ چونکہ یہ طریقہ مرشد کے بغیر نہیں آسکتا۔ اس لئے صحابہ کرامؓ کے زمانہ سے اس زمانہ تک ہر صدی میں، ہر ملک میں ہر غواص نے (جسے حقیقت کے موتی کے حصول کی آرزو تھی اپنے زمانہ کے استاد سے اس فن کو سیکھا یعنی۔

۱۔ صحبت شیخ اختیار کی، تاکہ حوصلہ اور طاقت پیدا ہو۔

۲۔ ڈوب کر ابھرنے کی پریکٹس کی (اسی کو مجاہدہ کہتے ہیں)

یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے اپنی ہر تصنیف میں صحبت مرشد اور مجاہدہ کو تکمیل خودی کے لئے شرط قرار دیا ہے۔

بس یہی اقبالؔ کی ساری کائنات ہے یہی ان کا فلسفہ ہے یہی ان کا پیغام ہے اور اسی پر انہیں ناز ہے ساقی نامہ میں جس چیز کو وہ اپنے قافلہ میں ہر شخص کو مفت دینا چاہتے ہیں وہ "متاع" یہی تو ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اقبالؔ کے فلسفہ یا پیغام کے عناصر ترکیبی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ موجود ہے جو اس کائنات کا خالق ہے۔

۲۔ انسان موجود ہے جو اس کا نائب ہے۔

۳۔ انسان کا فرض منصبی یا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو کیونکہ اقبالؔ کی رائے میں دین اسلام پوجا پاٹ کا نام نہیں اپنی خودی سے

واقف ہونے کا طریقہ ہے تاکہ انسان نیابت الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہوسکے۔

۴۔ حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے من میں ڈوب کر ابھرنا لازمی ہے۔

۵۔ اور اس کے لئے ایک رہنما یا مرشد کی ضرورت ہے جو ڈوبنے سے محفوظ رکھے اقبالؔ کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ تیس سال تک ان پانچ باتوں کو اس قوم کے سامنے پیش کرتے رہے جو ان کی وفات کے بعد بھی سوتی رہی اور جب صورِ فرنگ کی بدولت بیدار ہوئی تو اس وقت سے اپنی پوری طاقت کے ساتھ رشوت ستانی۔ ذخیرہ اندوزی۔ بلیک مارکٹ۔ ضمیر فروشی۔ اقربا نوازی خویش پروری۔ الحاد دوستی اور کفر پسندی یعنی نارِ جحیم کی طرف دوڑی چلی جارہی ہے۔ غالبؔ نے اس شعر میں شاید ہماری ہی سرعت رفتار کی تصویر کھینچی تھی۔

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

واضح ہو کہ اقبالؔ نے من میں ڈوبنے کو دل میں غوطہ لگانے سے بھی تعبیر کیا ہے ان دونوں باتوں کا ایک ہی مطلب ہے وہ یہ کہ حقیقت تک پہونچنے یا رازِ ہستی سے آگاہ ہونے کا طریقہ صرف ایک ہے یعنی غوطہ لگانا فلسفہ کی بدولت انسان اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔ اسی صداقت کو اکبرؔ الٰہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے۔

انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

نوٹ: میں نے اس شعر کا مطلب عمداً بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے وجہ یہ ہے کہ اس میں اقبالؔ کے تمام پیغام کی روح موجود ہے اور اس کو واضح کرنا خود اقبالؔ اور اس کے کلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

آئندہ تین شعروں میں اقبال نے من کی دنیا کا تن کی دنیا سے موازنہ کیا ہے تاکہ مسلمانوں کو ان دونوں میں سے ایک دنیا کے انتخاب میں سہولت ہو سکے من کی دنیا سے وہی شانِ فقر مراد ہے جو اقبال کا محبوب ترین موضوعِ سخن ہے اور تن کی دنیا سے وہ دنیا مراد ہے جس میں ہم سب (الا ماشاء اللہ) گرفتار ہیں یعنی زن. زر اور زمین یا بقول مرشد رومی خدا سے غفلت۔ جو شخص من کی دنیا میں رہتا ہے وہ محبت الٰہی میں سرشار ہوتا ہے اس لئے وہ اللہ کی تمام مخلوقات پر مہربان ہوتا ہے اور اپنی زندگی خدمت خلق میں بسر کرتا ہے یعنی دوسروں کے لئے جیتا ہے اور جو شخص تن کی دنیا میں رہتا ہے وہ ہر وقت دولت جمع کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور اس لئے اپنی زندگی مکاری اور عیاری میں بسر کرتا ہے یعنی صرف اپنے لئے جیتا ہے۔

لیکن من کی دولت باقی ہے اس میں صفتِ دوام پائی جاتی ہے اور تن کی دولت کو قرار نہیں آج زید کے پاس ہے کل بکر کے پاس. لہذا انتہائی بدنصیب ہے وہ شخص جو باقی کو چھوڑ کر فانی کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔

من کی دنیا کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محبت کی حکومت ہوتی ہے. فرنگی اس پر اقتدار حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس دنیا میں شیخ و برہمن کا امتیاز پایا جاتا ہے کیونکہ جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے وہ تمام مخلوقات کا خیر خواہ ہوتا ہے اس کی نظر میں ہندو اور مسلمان دونوں حضرت آدم کی اولاد ہیں اس لئے وہ دونوں پر مہربانی کرتا ہے۔

آخری شعر میں اقبال نے توحید کا فلسفہ شاعری کے لباس میں پیش کر دیا ہے یعنی توحید کے معنی یہ ہیں کہ یہ انسان اللہ کے علاوہ اور کسی ہستی کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرے جو شخص غیر اللہ کی اطاعت کرتا ہے وہ روحانی اور جسمانی دونوں پہلوؤں سے اس کا غلام ہو جاتا ہے اور سب جانتے ہیں کہ غلام کو نہ اپنے ضمیر پر

اختیار ہوتا ہے نہ جسم پر۔ بالفاظ دگر آسمان کے نیچے شرک سے بڑھ کر کوئی لعنت نہیں ہے۔ مشرک دراصل مرتبۂ انسانیت ہی سے خارج ہو جاتا ہے اس لئے اس کی روحانی ترقی کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

غزل ۸

(کابل میں لکھے گئے)

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا
شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
بہت مدّت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا
کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا
قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا
کہاں سے تو نے اے اقبالؔ سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا پادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

پہلا شعر:۔ اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام۔ انسان کے اندر دوسروں کے ساتھ مہربانی اور حسن سلوک کا مادہ پیدا کر دیتا ہے چنانچہ سچے مسلمان (مرد غازی) کی پہچان یہ ہے کہ اس میں مروّت کی شان پیدا ہو جاتی ہے مروّت انسان کی بہت اعلیٰ صفات کے لئے ایک جامع لفظ ہے جو شرافت نفس جود وسخا ہمدردی۔ ایثار اور مہمان نوازی وغیرہ پر شامل ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے موجودہ نظام تعلیم پر تنقید کی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان نوجوانوں کے اندر خاکبازی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور بلند پروازی کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے یعنی مسلمان مادیات کو اپنا مقصود حیات سمجھنے لگتا ہے اور یہ بات اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف ہے۔

شاہین ایک مشہور شکاری پرندہ ہے جو بلند پرواز ہوتا ہے اپنا رزق خود اپنی قوت بازو سے مہیا کرتا ہے تیز نظر ہوتا ہے اور علائق دنیوی سے آزاد زندگی بسر کرتا ہے چونکہ یہ سب مومنانہ صفات ہیں اس لئے اقبالؔ نے لفظ شاہین کو اصطلاح بنا لیا ہے اور وہ مسلمان کو شاہین سے تعبیر کیا کرتے ہیں چنانچہ اس مصرع میں شاہین بچوں "سے مسلمان نوجوان ہی مراد ہیں۔

"خاکباز" بھی اقبالؔ کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد ہے وہ شخص جو پست ہمّت ہو۔ اور مادیات میں گرفتار ہو خاکبازی "شاہین" یا مسلمان کی فطرت کے خلاف ہے خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کالج کی تعلیم سے مسلمان کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور اسی لئے اقبال اس نظام تعلیم کے سراسر خلاف ہیں۔

تیسرا شعر:۔ مسلمان مدتوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن میں نے انہیں دنیا میں سربلندی اور کامرانی کا طریقہ سکھا دیا ہے اس لئے

ان کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہو گئی ہے نخچیر کے لغوی معنی اس جانور کے ہیں جسے صیاد شکار کرتا ہے یہاں مراد ہے مسلمان قوم جو انگریزوں کی غلامی میں ہے طریق شاہبازی سے مراد ہے غلبۂ قدرت یا حکومت حاصل کرنے کا طریقہ۔

چوتھا شعر:۔ قلندر بھی شاہباز کی طرح اقبال کی اصطلاح ہے اس سے مراد ہے مرد مومن جو اپنے اندر شان فقر رکھتا ہے فقیہ سے مراد ہے وہ عالم دین جو تزکیۂ نفس کے بجائے اپنا وقت منطقی موشگافیوں میں بسر کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دینی مسائل میں تو ماہر ہو جاتا ہے لیکن جہاد کا جذبہ اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔

فقیہ پر طعن کرنے سے فقہ یا فقیہ کی تحقیر مقصود نہیں ہے بلکہ فقیہ سے یہاں وہ ذہنیت مراد ہے جس کی وجہ سے انسان فقہی مسائل میں اس قدر منہمک ہو جائے کہ حقیقت یا مقصد حیات اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اگر ایک شخص ساری عمر فقہی مسائل میں الجھا رہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ نہ لے تو مقصد حیات یقیناً فوت ہو جائے گا صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ بھی مسائل کی تحقیق کرتے تھے لیکن جہاد فی سبیل اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے ہمارا حال یہ ہے کہ ساری عمر توحید کا درس دیتے گذر جاتی ہے لیکن ہمارے دل میں ایک دن کے لئے بھی جہاد کا ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔

اقبال کہتے ہیں کہ جہاد کے لئے لغت ہائے حجازی کے ذخیرہ کی ضرورت نہیں ہے اگر مسلمان صرف لا الٰہ الا اللہ کا مطلب سمجھ لے تو اس کے اندر جہاد کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے خلاصۂ کلام یہ کہ قلندر اور فقیہ مختلف رجحانِ فکر کے نمائندے ہیں۔

قلندر وہ ہے جو باتیں بہت کم کرے اور اپنی ساری توجہ جہاد کی تیاری پر مبذول کرے۔

فقیہ سے اس مصرع میں وہ شخص مراد ہے جو باتیں بہت زیادہ کرے اور جہاد سے کوسوں دور رہے۔

پانچواں شعر:۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ میں اپنی قوم کو جہاد فی سبیل اللہ کا درس دے رہا ہوں اس لئے میری شاعری میں "مینا و جام" کا تذکرہ نہیں ملے گا میں قوم کو جفاکشی اور خارا شگافی کی تعلیم دے رہا ہوں شیشہ سازی کا فن نہیں سکھا سکتا۔

خارا شگافی اور شیشہ سازی بھی زندگی کی دو مختلف قسمیں ہیں اقبال نے ان کے لغوی معنی مراد نہیں لئے ہیں۔ خارا شگافی سے مراد ہے مجاہدانہ زندگی۔ جو مسلمان کا طغرائے امتیاز ہے اور شیشہ سازی سے مراد ہے راحت اور آرام کی زندگی جو سراسر غیر اسلامی ہے قرآن مجید کی تعلیمات کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے۔ تزکیۂ نفس اور جہاد فی سبیل اللہ چونکہ تزکیۂ نفس کے بغیر جہاد فی سبیل اللہ ممکن نہیں اس لئے پہلے تزکیۂ نفس پھر جہاد۔ خود لفظ مجاہد فی سبیل اللہ میں یہ دونوں باتیں جمع ہیں جب تک دولت کی محبت دل سے بالکل نہ نکل جائے۔ انسان جہاد فی سبیل اللہ نہیں کرسکتا اور زن۔ زر۔ زمین کی محبت دل سے نہیں نکل سکتی جب تک تزکیۂ نفس نہ ہوجائے اس لئے مسلمان کی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے صحبت مرشد میں رہ کر تزکیۂ نفس کرے پھر جہاد فی سبیل اللہ کرے زندہ رہا تو غازی۔ مارا گیا تو شہید۔ کامیابی دونوں صورتوں میں یقینی ہے فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ پس وہ قتل کرتے ہیں اور قتل ہوجاتے ہیں۔

نوٹ:۔ افسوس یہ ہے کہ مسلمان غازی اور شہید ان دونوں لفظوں کی حقیقت سے بیگانہ ہوگئے جبھی تو "خان بہادری" اور "سول سروس" کے عشق میں مبتلا ہوگئے ورنہ ایک سچے مسلمان کی نظر میں غازی اور شہید سے معزز تر کوئی لفظ نہیں ہے لیکن غلامی سے ان کا "اندازِ نگہ" بدل گیا اور جو نا خوب تھا وہ "خوب" ہوگیا۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اقبال کی شاعری کا مقصد اسی غلامانہ انداز نگاہ میں انقلاب پیدا کرنا ہے جیسا کہ انہوں نے اس سے پہلے شعر میں خود واضح کیا ہے اور اسی لئے انہوں نے شاہبازی کا طریقہ (قرآنی پروگرام) قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔

چھٹا شعر: مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرے تو وہ بادشاہوں کی ملاقات سے بے نیاز ہو جائے گا بلکہ شاہانِ وقت اس کی بے نیازی پر رشک کریں گے حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیا کی زندگی اس شعر کی صداقت پر شاہد ہے حضرت موصوف نے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا لیکن ان کے دربار میں جانا تو بڑی بات ہے کبھی ان کو اپنے دربار میں حاضری کی اجازت نہیں دی سلطان علاء الدین خلجی المتوفی ۱۳۱۶ء اس شان و شوکت کا حکمراں گذرا ہے کہ سارا ہندوستان اس کے زیر نگیں تھا لیکن جب اس نے حضرت موصوف کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا تو آپ نے کہلا بھیجا کہ میری ملاقات سے بادشاہ کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے دعا کی درخواست کرے چونکہ میں اس کی درخواست کے بغیر خود اس کے لئے دعائے خیر کرتا ہوں اس لئے ملاقات کی کوئی ضرورت نہیں ہے اس پر علاء الدین نے دوبارہ کہلا کر بھیجا کہ اگر آپ مجھے حاضری کی اجازت نہیں دیں گے تو میں بلا اجازت حاضر ہو جاؤں گا اس پر حضرت موصوف نے یہ کہلا کر بھیجا کہ فقیر کے مکان میں دو دروازے ہیں اگر بادشاہ ایک دروازہ سے داخل ہوگا تو میں دوسرے دروازے سے باہر نکل جاؤں گا مناسب یہی ہے کہ بادشاہ مجھ سے ملنے نہ آئے یہ جواب سن کر علاء الدین اپنے ارادہ سے باز رہا۔ اب ناظرین خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا اس کے دربار میں حضرت موصوف کی بے نیازی کا چرچا نہیں ہوا ہوگا۔

غزل ۹

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ ملّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

یہ غزل اقبال نے اپنے مسلک یعنی عشق کی مدح و ستائش میں لکھی ہے اور ہر شعر میں مدح کا نیا اسلوب اختیار کیا ہے تاکہ اس کی گوناگوں خصوصیات واضح ہو سکیں۔

پہلا شعر:۔ زیر و بم۔ موسیقی کی مشہور اصطلاح ہے زیر۔ باریک آواز کو۔ اور بم موٹی آواز کو کہتے ہیں۔ مراد ہے راگنی کے سروں کا اتار چڑھاؤ جس پر اس کی ساری دلکشی موقوف ہے۔ اگر کسی راگنی سے سروں کے اتار چڑھاؤ کو

خارج کر دیا جائے تو اس کے معنی در اصل یہ ہیں کہ اس کا وجود ہی ختم ہو گیا اس حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر شعر پڑھئے۔ اقبال نے زندگی کو راگنی سے تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح زیر و بم پر راگنی کا وجود منحصر ہے اسی طرح زندگی کی دلکشی بلکہ اس کا وجود عشق پر موقوف ہے زندگی سے عشق کو خارج کر دیا جائے تو زندگی ختم ہو جائیگی پھر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہے گا انسان میں سوز و گداز کی جو کیفیت پائی جاتی ہے یہ سب عشق ہی کی بدولت ہے۔

دوسرا شعر:۔ عشق انسان کی شخصیت میں اس طرح سما جاتا ہے جس طرح شاخ گل میں بادِ سحر گاہی نم۔ مراد یہ ہے کہ عاشق کی پوری زندگی عشق کے زیر فرمان ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت کا کوئی گوشہ یا پہلو عشق کے اثر سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ نیز جس طرح بادِ سحر گاہی گلوں کو تازگی اور زندگی بخشتی ہے اسی طرح عشق انسان کو حقیقی زندگی عطا کرتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ جو شخص اپنے رازقِ حقیقی کو نہیں پہچانتا وہ لاعلمی کے سبب سے بادشاہوں کے سامنے سر نیاز خم کرتا ہے اور ان کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے لیکن جو شخص اپنے رازقِ حقیقی کو پہچان لیتا ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ بادشاہ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہونے کو اپنے لئے باعثِ عزّت تصور کرتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ رازق کی شناخت کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق کی بدولت انسان اپنے رازق کو پہچان سکتا ہے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ اگر کوئی شخص اپنے دل کو حرص و ہوس سے پاک کرے یعنی دنیاوی خواہشات سے آزاد کرے تو وہ دنیا اور دنیا والوں پر حکمراں ہو جائے گا لیکن اگر وہ دنیاوی یا نفسانی خواہشات کے حصول میں منہمک ہو جائیگا

تو اس پر روحانی اعتبار سے موت طاری ہو جائے گی اب انسان خود فیصلہ کرے کہ دل کی آزادی بہتر ہے یا شکم کی غلامی؟ ہر شخص یہی جواب دے گا کہ دل کی آزادی چاہتا ہوں اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ اس کی کیا صورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق کی بدولت دل کی آزادی نصیب ہو سکتی ہے۔

واضح ہو کہ انسان کے حقیقی دشمن پانچ ہیں۔

کام (شہوت) کرودھ (غصہ) موہ (فریفتگی) لوبھ (حرص) اور ہنکار (تکبر) چونکہ یہ پانچوں دشمن۔ دوستوں کی شکل میں آتے ہیں اس لئے انسان ان سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ دنیا میں عشق ہی وہ طاقت ہے جس کی بدولت انسان اپنے ان پانچوں دشمنوں کو زیر کر سکتا ہے چونکہ انسان کی روحانی ترقی انہی دشمنوں کو مغلوب کرنے پر موقوف ہے اس لئے عشق ہر طالب حقیقت کے لئے لازمی ہے اور تصوف انہی دشمنوں کے زیر کرنے کا دوسرا نام ہے۔

پانچواں شعر:- اے مسلمان! اللہ سے دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو اپنے دل سے پوچھ کہ "حرم" کیوں ویران ہو گیا؟ بات بالکل واضح ہے حرم کی آبادی اور رونق تو عشق الٰہی پر منحصر ہے لیکن جب مسلمان نے اللہ سے تعلق ترک کر دیا تو اس کا گھر کیسے آباد رہ سکتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ "مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" جب اللہ کی محبت دل سے نکل گئی تو ہوٹل آباد ہو گئے اور مسجدیں سنسان ہو گئیں۔

غزل ۱۰

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نِرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

کب تک رہے محکومیِ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

بجلی ہوں نظر کوہ بیاباں پہ ہے میری
میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

●

اس غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فلسفہ شاعری اور موسیقی تینوں کا ایک خوش آئند امتزاج پایا جاتا ہے اس خوبی کے علاوہ سلاستِ زبان اور اندازِ بیان کی دلکشی بھی موجود ہے۔

پہلا شعر:- اے مسلمان! اگر تجھ میں کلمہ حق برملا کہنے کی جرأت نہیں ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ تیرے دل میں اللہ کی محبت کے بجائے دنیا کی محبت جاگزیں ہے اسی لئے تو دنیا دی نعمتوں اور راحتوں کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اندریں حالات تو غیر اللہ سے بے خوف کیسے ہو سکتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال کے دینی افکار میں "پاکیزگی نگاہ" کو بہت بلند مرتبہ حاصل ہے اور انہوں نے مومن کی اس صفت کو اپنی ہر کتاب میں خصوصیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور چونکہ اس دور الحاد و فرنگیت مآبی میں قوم کی نوجوان لڑکیوں اور عورتوں کی نظر میں "پاکی نگاہ" ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ گیا ہے اور عفت نگاہ کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے بلکہ وہ اس نیکی کو خواتین کی ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ یقین کرتی ہیں اور اسی لئے کراچی اور لاہور کی مسلمان لڑکیاں پوری قوت کے ساتھ اس جوہر نسوانیت کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں جس کا ثبوت مینا بازاروں۔ زنانہ مشاعروں۔ رقص و سرود کی محفلوں کلب اور ہوٹلوں کی رنگین راتوں۔ مخلوط اجتماعوں سے بخوبی مل سکتا ہے۔ اس لئے میں اس بات کو اقبال کے مصلحانہ کارناموں میں شمار کرتا ہوں کہ انہوں نے اعورتوں کے عام رجحان کے خلاف اپنی تصانیف میں "عفتِ نگاہ" کی اسلامی حیثیت اور مدنیت اسلام میں اس کی قدر و منزلت اور عورت کی زندگی میں اس کی اہمیت ان سب باتوں کو اپنی کامل شاعرانہ قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اس وقت ہند و پاک کی مسلم خواتین کے سر پر "ترقی" کا بھوت سوار ہے اور وہ دن دور نہیں جب صنعتی نمائش کے ساتھ ساتھ نسوانی حسن کی نمائش بھی باضابطہ ہوا کرے گی اندریں حالات مجھے توقع نہیں کہ مسلمان

خواتین اقبال کی اسلامی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں بقول اکبر الہ آبادی۔

غریب اکبر نے بحث پردا کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب الٹ دی یہ کہہ کے اس نے کہ کرہی لیگا مرا کیا

لیکن مصلح قوم ناسازگار حالات سے متاثر نہیں ہوا کرتا وہ اپنا فرض بہر حال انجام دیتا ہے اور قوم کو صراط مستقیم کی طرف بلاتا ہے خواہ کوئی آئے یا نہ آئے اگر کسی بستی کے سارے لوگ ملیریا میں مبتلا ہو جائیں تو کیا اس عمومیت کی بنا پر اطبا تیمار داروں سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ملیریا" کوئی مرض نہیں ہے اس لئے کسی معالجہ کی بھی ضرورت نہیں ہے اسی طرح اگر تمام مسلمان عورتیں بے پردگی اختیار کریں تو کیا ان کے اس اجتماعی فعل سے عریانی جائز ہو جائے گی؟ بلکہ ہر مصلح قوم اس گمراہی کے خلاف جہاد کرے گا خواہ کوئی اس کی بات سنے یا نہ سنے۔

اقبال راقم الحروف سے بہتر سمجھتے تھے کہ مغربی تعلیم کا زہر عورتوں میں پوری طرح سرایت کر چکا ہے اور جب تک اس نظام تعلیم کو یکسر نہ بدلا جائے مریض کے صحتیاب ہونے کی کوئی امید نہیں ہے اسی لئے انہوں نے مدۃ العمر مسلمان عورتوں کو عریانی اور بے حیائی سے اجتناب کی تلقین کی یعنی اپنے کلام میں اس زہر کا تریاق مہیا کیا۔ اسرار خودی سے لے کر جو ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔ ارمغان حجاز تک جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ہر کتاب میں انہوں نے عورتوں کو سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کی چنانچہ ارمغان حجاز میں لکھتے ہیں۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

یعنی اے مسلمان عورت (حضرت فاطمہ) بتول رضی اللہ عنہا کی طرح

زندگی بسر کر اور دور الحاد کی کافر نگاہوں سے پوشیدہ ہو جا ایسا نہ ہو کہ اس عصر کا کوئی شاطر ہ تجھے دیکھ لے اگر تو اپنے آپ کو یعنی اپنی عفت کو اس ناپاک عصر کی دست برد سے محفوظ رکھ سکے گی تب کہیں تو اس لائق ہو گی کہ اپنی اولاد کے اندر حضرت شبیر رضی اللہ عنہ کی صفات کا عکس پیدا کر سکے ورنہ جو بچے تیری گود میں پرورش پا کر جوان ہوں گے وہ بھی تیری ہی طرح غیرت دین سے بیگانہ ہوں گے مثل مشہور ہے "جیسی مائی ویسی جائی"

واضح ہو کہ "پاکی نگاہ" کو اقبال نے "عفت نگاہ" سے بھی تعبیر کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

اس شعر سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ عفت نگاہ کیسے پیدا ہو سکتی ہے یہ عفت نگاہ اقبال کی خاص اصطلاح ہے اور معانی کثیرہ پر مشتمل ہے لیکن اس کا بنیادی مفہوم اقبال کے فلسفۂ فقر میں یہ ہے کہ مومن ہر اس چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جسے شارع علیہ السلام نے مذموم قرار دیا ہے خواہ وہ شئے بظاہر کتنی ہی دلفریب خوش آئندہ اور فائدہ مند کیوں نہ ہو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ فقر مومن کی نگاہ کو پاک کر دیتا ہے یعنی مومن کسی ناپاک شئے کی طرف نہیں دیکھتا پس جو عورت ایسا لباس پہن کر باہر نکلتی ہے جس سے اس کے اعضائے جسمانی غیروں کے سامنے نمایاں ہو جائیں اقبال کی رائے میں اس کی نگاہ ناپاک ہو چکی ہے خواہ وہ زبان سے اپنی پاکی کے کتنے ہی بلند بانگ دعوی کیوں نہ پیش کرے

اسی طرح وہ مرد بھی پاکی نگاہ سے محروم ہو چکا ہے جو عورتوں کی اس بے غیرتی اور بے حیائی کو گوارا کرتا ہے یا اچھا سمجھتا ہے ضابطہ اسلام کی پہلی خصوصیت یہ

ہے کہ وہ انسان کی نگاہ کو پاک بنا دیتا ہے یعنی مسلمان ہر غیر شرعی قول فعل کو ناپاک سمجھتا ہے اور اس سے اسی طرح نفرت کرتا ہے جس طرح دنیا کے لوگ ناپاک اشیاء مثلاً بول و براز سے نفرت کرتے ہیں۔ مسلمان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر اس فعل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جسے شارع علیہ السلام نے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کا حکم دیا ہے۔ اقبالؔ چونکہ شریعت اسلامیہ کے علمبردار ہیں اس لئے انہوں نے عفت نگاہ کی اہمیت واضح کرنے میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی اس نکتہ کی وضاحت میں تفصیل سے کام لیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اے مسلمان! تجھے اللہ نے زیورِ عقل ہی سے آراستہ نہیں کیا ہے بلکہ اس نے تیرے اندر اپنے دیدار کی آرزو بھی ودیعت فرما دی ہے تو ذرا غور سے دیکھ۔ تجھ میں اس سے ملنے کی تڑپ بھی تو موجود ہے یعنی تیرے اندر جذبۂ عشق بھی پنہاں ہے اور جس طرح کتابوں کے مطالعہ اور علماء کی صحبت سے عقل بڑھتی ہے اسی طرح پابندئ شریعت اور عاشقوں کی صحبت سے عشق کی آگ بھڑک سکتی ہے پس تو اللہ والوں کی صحبت اختیار کر تاکہ مقصدِ حیات حاصل ہو سکے۔

تیسرا شعر:۔ مغربی تعلیم سے آدمی کے اندر عیّاری چالاکی اور فریب کاری تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن دل میں سوز و گداز کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات صرف قرآن اور حدیث کے مطالعہ اور نیک بندوں کی صحبت سے پیدا ہو سکتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ صوفی اور ملّا دونوں میرے جذبات کی گہرائی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

ا۔ کیونکہ وہ دونوں دنیا طلبی میں منہمک ہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بیگانہ ہیں۔ وہ کیا جانیں محبت کسے کہتے ہیں۔

۲۔ کیونکہ وہ دونوں حالات حاضرہ سے بے خبر ہیں انہیں مطلق علم نہیں کہ اسلام پر کس کس طرف سے کس کس رنگ میں حملے ہو رہے ہیں۔

۳۔ کیونکہ وہ دونوں اپنے اپنے حجروں میں بیٹھے ایک ہزار پہلے کے علوم پڑھ رہے ہیں انہیں کیا علم کہ دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے اور آج دنیا میں اسلام کو کس طریقہ سے پیش کرنا چاہیئے یا آج دنیا والے کن مصائب میں مبتلا ہیں اور کن مسائل سے دوچار ہیں اور اسلام ان کا کیا حل پیش کرتا ہے۔

نوٹ: یہ سب مختلف المعانی لفظ جنوں کی مختلف تعبیرات سے پیدا ہوئے ہیں

پانچواں شعر:۔ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک عرصہ سے جوتش نجوم اور ستارہ پرستی اور اس کے پیدا کردہ توہمات میں مبتلا ہیں وہ ایک عرصہ سے ستاروں کی غلامی کر رہے ہیں یک عرصہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جو ہماری تقدیر میں لکھا ہے وہی ہو گا پھر ہمیں جدوجہد کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ یا یہ کہ انسان مختلف ستاروں کے زیر اثر اپنی زندگی بسر کرتا ہے مثلاً اگر وہ اس وقت زحل یا مریخ (سنیچر یا منگل) کے زیر اثر ہے تو یقیناً آفات ارضی وسماوی میں مبتلا ہو گا اور چونکہ انسان ستاروں کی تاثیر بدل نہیں سکتا۔ اس لئے ہر قسم کی جدوجہد بیکار اور بے سود ہے جس وقت اس کا طالع زہرہ یا مشتری کے زیر اثر آئے گا سب کام خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی پوری زندگی اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے لہذا اسے کسی قسم کی کوشش کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی جدوجہد سے حالات نہیں بدل سکتے۔

اقبالؔ کہتے ہیں یہ سب خیالات بالکل غیر اسلامی ہیں اور اسی لئے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جب تک زندہ ہوں ان غیر اسلامی عقائد کے خلاف جہاد کرتا

رہوں گا تا اینکہ یا ان عقائد باطلہ (گردش افلاک) کا قلع قمع کردوں گا یا خود اس کوشش میں فنا ہو جاؤں گا۔

دست از طلب ندارم تا کار من برآید
یا دل رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

چھٹا شعر:۔ کہتے ہیں کہ مسلمان کا وجود باطل کے پیغام فنا ہے جس طرح بجلی جس چیز پر گرتی ہے اسے جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے اسی طرح مسلمان خرمن باطل یعنی ہر غیر اسلامی نظام اور غیر اسلامی تعلیم کو پھونک دینے کے لئے پیدا ہوا ہے اس کا کام ہی یہ ہے کہ باطل کو مٹا دے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

اے ہمارے نبی (صلے اللہ علیہ وسلم) آپ اعلان فرما دیجئے کہ قرآن آگیا (چونکہ قرآن باطل کے لئے پیام موت ہے) اس لئے باطل مٹ گیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ باطل کی ذات میں فنا پذیری داخل ہے وہ حق کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا باطل مٹ جانے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ پس مسلمان کو خس وخاشاک (ادنیٰ دشمن) کے بجائے کوہ وبیاباں (بڑے بڑے دشمنوں) سے مقابلہ کرنے کی تیاری کرنی چاہیئے۔

نوٹ:۔ موجودہ حالات میں یہ شعر کچھ عجیب معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اقبال مسلمان سے یہ کہہ رہے ہیں کہ کوہ وبیاباں یعنی روس اور امریکہ سے ٹکرانے کی کوشش کرو حالانکہ مسلمان خس وخاشاک یعنی سرمایہ دار اور نوابوں کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ چیونٹی کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس پست ہمتی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ بجلی ہی سرے سے موجود نہیں ہے جو کسی چیز پر گر کر اسے ہلاک کر سکتی ہے جب بجلی ہی موجود نہیں تو گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چنانچہ اقبالؔ نے خود اس تلخ حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

شبے پیشِ خدا بگریستم زار
مسلماناں چرا زاراند و خوارند
ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم
دلے دارند و محبوبے ندارند

کہتے ہیں کہ میں نے ایک رات اللہ کے سامنے بہت رو کر عرض کی
کہ اے خدا! مسلمان کیوں دنیا میں اس قدر ذلیل و خوار ہیں (مثلاً منجملہ
سکھوں نے ۱۸۲۵ء پشاور مسلمانوں سے چھین لیا تھا) تو اللہ نے فرمایا کہ اے
اقبالؔ کیا تو اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ تیری قوم کے افراد اپنے سینوں میں
دل تو رکھتے ہیں لیکن وہ ہمارے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت سے خالی
ہیں پھر انہیں سربلندی کیسے نصیب ہو سکتی ہے؟

ساتواں شعر: اس شعر میں اقبالؔ نے براہِ راست قرآن
حکیم کا فلسفۂ حیات انسانی شاعری کی دلفریبی سے دامن بچا کر صاف لفظوں
میں پیش کر دیا ہے۔

"صاحبِ لولاک" بہت بلیغ ترکیب ہے اور اقبالؔ کے اسلوبِ فکر
کی بہترین مثال ہے "لولاک" سے ذاتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) مراد ہے
لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ یعنی اللہ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ
وسلم سے ارشاد فرمایا کہ "اگر تو نہ ہوتا تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا۔" بالفاظ دگر
اللہ تعالیٰ نے اس کارخانہ عالم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تصدق
میں پیدا کیا ہے پس صاحبِ لولاک سے مراد ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
کا غلام یعنی فنا فی الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

پہلا مصرع اس آیت سے ماخوذ ہے۔ اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۔ (۲۱-۵-۱) زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ یہ عالم فقط مومن جانباز کی میراث ہے اور مومن وہ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع کامل یا غلام ہو۔

قرآن حکیم کی رو سے انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کرے تاکہ اللہ کی زمین کا وارث بن سکے یعنی خلافت و نیابتِ الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہو سکے۔ وراثتِ ارض اللہ کے صالح بندوں کے لئے مخصوص ہے اور صالحیت کا رنگ صرف سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی یعنی کامل اتباع کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے اور اتباعِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بغیر ناممکن ہے۔ ع

مسلم اند عاشق نباشد کافر است

———(-:-)———

غزل ۱۱

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق
علاجِ ضعفِ یقیں اُن سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق
مریدِ سادہ تو رو رو کے ہو گیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق
اسی طلسمِ کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اس کی ہیں اب تک بتانِ عہدِ عتیق
مرے لئے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر کہ مُلّا ہیں صاحبِ تصدیق
اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

●

پہلا شعر:۔ ہر زمانہ میں مومنوں کا طریقہ ایک ہی رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے جان بچانے کے لئے کبھی جھوٹ نہیں بولا بلکہ ہمیشہ وہی بات زبان سے کہی جس کو دل سے سچی سمجھتے تھے مثلاً امام احمد حنبلؒ نے

ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کیں لیکن مامون الرشید کو خوش کرنے کے لئے یہ نہیں کہا کہ قرآن مجید مخلوق ہے کیونکہ ان کا دل یہ کہتا تھا کہ کتاب اللہ مخلوق نہیں ہے

دوسرا شعر:۔ یہ شعر تو بالکل آسان ہے لیکن اقبال نے اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جس طرح پیر مغاں کا خلق شراب نوشوں کے لئے باعث کشش ہوتا ہے اسی طرح عالم دین واعظ یا دینی پیشوا کے لئے صاحب خلق ہونا ضروری ہے تاکہ لوگ کثیر تعداد میں اس کی طرف رجوع کریں جو شخص قوم کی اصلاح کا آرزومند ہے اگر اس کے مزاج میں درشتی ہے تو لوگ اس سے یقیناً متنفر ہو جائیں گے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شخص اپنے مقصد میں ناکام ہو جائے گا۔ اس شعر کا مضمون قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (۳-۱۵۱) سو یہ بھی اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان (صحابہ) پر مہربان ہیں اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں اور اگر آپ درشت کلام اور سنگدل ہوتے تو وہ لوگ آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے یعنی آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔

اس شعر کے پردہ میں اقبال اپنی قوم کے علماء اور واعظین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آپ لوگ چونکہ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں اس لئے آپ حضرات کو بھی عوام الناس کے ساتھ محبت اور نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔

تیسرا شعر:۔ رازی سے امام فخر الدین رازی مراد ہیں جو ۵۴۳ھ میں بمقام رے پیدا ہوئے تھے امام صاحب علم و فضل شہرت عزت دولت اور کثرت تصانیف کے اعتبار سے دنیائے اسلام کی معدودے

چند خوش نصیب ہستیوں میں سے ہیں۔ اگرچہ علوم نقلی وعقلی دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے لیکن سب سے زیادہ شہرت ایک متکلم کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ اس کے بعد پھر دنیا ان کو ایک فلسفی اور مفسر کی حیثیت سے جانتی ہے ۲۰۶ھ میں وفات پائی۔

ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ تفسیر "مفاتیح الغیب" ہے جو تفسیر کبیر کے نام سے مشہور ہے اور بارہ جلدوں میں ہے اس کے بعد اساس التقدیس علم کلام میں اور مباحث مشرقیہ، الٰہیات اور طبعیات میں اور شرح اشارات منطق وحکمت میں۔ یہ تین کتابیں بہت مشہور ہیں۔

چونکہ امام صاحب پر علم کلام کا رنگ غالب تھا اس لئے انھوں نے اپنی تفسیر میں مباحث کلامیہ اور مسائل عقلیہ اس کثرت کے ساتھ درج کئے ہیں کہ بعض محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان کی تفسیر میں تفسیر کے علاوہ باقی سب کچھ ہے میں اس جگہ ان مباحث کی مثالیں تو بخوفِ طوالت کلام درج نہیں کرسکتا لیکن بڑے ادب کے ساتھ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تفسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد دل میں اس قدر یقین پیدا نہیں ہوتا جس قدر شکوک اور شبہات پیدا ہوجاتے ہیں مثلاً جب وہ وجود باری تعالیٰ یا ذات وصفات باری

لہ علامہ اور مفکر کی طرح اس زمانہ میں متکلم کا لفظ بھی اپنے حقیقی مفہوم سے معرّا ہوچکا ہے چنانچہ جو لوگ علم کلام سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے وہ بھی آج متکلم کے لقب سے مشہور ہیں حالانکہ متکلم وہ شخص ہوتا ہے جو منطق فلسفہ اور الٰہیات تین علوم میں مہارت تامہ رکھتا ہو اور ان کے مسائل پر مجتہدانہ انداز میں گفتگو کرسکتا ہو۔

تعالیٰ میں گفتگو کرتے ہیں تو پہلے مخالفین کی طرف سے جس قدر اعتراضات کئے گئے ہیں سب کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں پھر ان کے جوابات دیتے ہیں لیکن چونکہ ان کا موضوع علم کلام نہیں بلکہ تفسیر ہے اس لئے وہ بعض اوقات بعض اعتراضات کے جوابات بہت معمولی طور پر دیتے ہیں اور بعض اعتراضات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے اس لئے اکثر لوگوں کے لئے وہی اعتراضات باعث تشکیک بن جاتے ہیں۔[1]

میری رائے میں اقبالؔ نے اس شعر میں جو یہ بات کہی ہے کہ اگرچہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بعض بڑے عجیب و غریب فلسفیانہ نکتے بیان کئے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی ذہانت و فطانت اور دقتِ نظر بلکہ تبحر علمی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن ان سے ضعف یقین کا علاج نہیں ہو سکتا ایمان و عرفان کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات بالکل صحیح ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جگہ رازی پر رومی کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ خود فلسفی ہونے کے باوجود آخر الذکر کے تبع ہیں۔ رازی کے مطالعہ سے پیچ وتاب کی کیفیت تو پیدا ہو سکتی ہے سوز و گداز کا رنگ نہیں پیدا ہو سکتا اور اسلام چونکہ عشق رسول صلی اللہ علیہ

---

[1] میری کیا مجال کہ امام صاحب پر تنقید کر سکوں ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں نے ۱۹۲۲ء میں ان کی تفسیر کی پہلی جلد کا مطالعہ کیا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی بدولت میں ایک شدید قسم کی ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو گیا تھا اور اگر ۱۹۲۶ء میں مثنوی میری تشفی کا سامان مہیا نہ کرتی تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آج کس حال میں ہوتا واقعی سچ کہا ہے مرشد رومی نے۔ ع سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

وسلم کا نام ہے اس لئے اقبالؔ کی رائے میں فتح کا سہرا رومیؔ کے سر ہے۔

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومیؔ ہارا ہے رازیؔ

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے موجودہ زمانہ کے بعض شیوخ (گدی نشینوں) کی غیر اسلامی زندگی کو بے نقاب کیا ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو توبہ تلقین کرتے ہیں کہ گناہوں سے سچی توبہ کرو۔ لیکن خود توبہ نہیں کرتے۔

پانچواں شعر:۔ اگرچہ قرآن مجید نے رنگ، نسل، قوم قبیلہ اور ذاتوں کے امتیاز کو مٹا دیا ہے۔ اگرچہ اس کتاب نے پیشوائیت ملائیت۔ احبار یت۔ رہبانیت۔ ملوکیت اور سرمایہ داری کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا ہے لیکن اولاد آدم (اس میں مسلمان بھی شامل ہیں) ابھی تک ان بتوں کی پرستش کر رہی ہے۔

چھٹا شعر:۔ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب یہ دونوں علم عقائد کی اصطلاحیں ہیں ان سے مراد ہے اسلامی عقائد کی صداقت کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے اس اقرار کی تصدیق کرنا یعنی زبان کے ساتھ ساتھ دل بھی اسلام کی حقانیت پر گواہی دیتا جائے۔ اور اعضائے جوارح سے عمل بھی کرتا جائے۔

اس شعر میں اقبالؔ نے ان علما، اور فقہا پر طنز کیا ہے جو صرف اپنے آپ کو سچا مسلمان سمجھتے ہیں اور دوسروں کے ایمان کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ساتواں شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اپنا مخصوص نلقہ

بیان کیا ہے یعنی اقبالؔ کی رائے میں اسلام کا معیار فقہی احکام نہیں بلکہ عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقبال اقول الذکر کے منکر ہیں یا اس کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے ان کا مطلب یہ ہے کہ:۔

اگر ایک شخص عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سرشار ہے تو اگر اس سے ارکان اسلام کی تعمیل میں کوتاہی ہو جائے تو بھی وہ مسلمان رہتا ہے۔

لیکن اگر ایک شخص ارکانِ اسلام تو بجا لاتا ہے لیکن اس کا دل عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خالی ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔

واضح ہو کہ پہلے مصرع میں "کفر" سے اصطلاحی کفر مراد نہیں ہے کیونکہ اقبالؔ یا کسی مسلمان میں یہ طاقت نہیں کہ کفر کو اسلام قرار دیدے بلکہ اس کا مطلب ہے نافرمانی۔

اقبالؔ نے اسی مضمون کو فارسی میں بھی ادا کیا ہے۔

طبع مسلم از محبت قاہر است

مسلم ار عاشق نباشد کافر است

اس مصرع میں بھی کافر سے مراد فقہی اعتبار سے کافر نہیں ہے بلکہ ان کی مراد اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ایسے مسلمان کے اسلام کا کیا اعتبار جو مسلمان ہو لیکن عاشق رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) نہ ہو۔

غزل ۱۲

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا!
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی
میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک
دیرینہ ہے تیرا مرضِ کور نگاہی

●

اس دلکش غزل میں جو مضامین کی ندرت کے علاوہ زورِ بیان اور سلاست زبان کی بہترین مثال ہے۔ اقبال نے مسلمان کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ کافر مسلمان اور مومن مسلمان۔

پہلا شعر: کہتے ہیں کہ اگر تجھے یہ معلوم کرنا ہو کہ تو کس قسم کا مسلمان ہے تو فطرت یعنی اپنے ضمیر سے دریافت کر اس کی گواہی کبھی غلط نہیں ہوتی۔ تیرا ضمیر تجھے بتا سکتا ہے کہ تو راہ راست پر ہے یا گمراہ ہے یعنی کافر

مسلمان ہے یا مومن مسلمان۔

دوسرا شعر:۔ مسلمان۔ اگر کافر یعنی نافرمان ہے تو نہ اس میں شانِ فقر پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اسے حکومت حاصل ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ مومن یعنی فرماں بردار ہے تو وہ یا بادشاہی کرے گا۔ یا فقیری۔ اگر بادشاہی کرے گا تو اس میں فقیری کا رنگ پایا جائے گا مثلاً حضرت عالمگیرؒ جن کی سلطنت کا رقبہ بیس لاکھ مربع میل سے بھی زیادہ تھا وہ اپنے ذاتی خرچ کے لئے خزانہ سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے تھے بلکہ ٹوپیاں اور رومال بنا کر اپنی گذر اوقات کرتے تھے۔ اقبالؒ نے اس شعر میں انھی کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

اور اگر وہ فقیری کرے گا تو اس میں بادشاہی کا جلوہ نظر آئے گا صرف ایک مثال درج کرتا ہوں۔ سیدی و مولائی قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ "ایک شب وہ (سلطان شمس الدین التمش) میرے پاس آیا اور میرا پاؤں پکڑ لیا میں نے کہا تو کب تک مجھے اس طرح تکلیف پہونچاتا رہے گا؟ جو ضرورت ہو بیان کر۔ غور کیجئے ہندوستان کا بادشاہ ایک فقیر بے نوا کے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔ اس نے کہا ربّ العزت نے مجھے مملکت تو عطا فرمائی ہے لیکن موت کے دن جب مجھ سے اس کی بازپرس ہو گی اور اس کا حساب دینا ہو گا تو آپ وعدہ کریں کہ اس وقت آپ میرا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ قصہ کوتاہ وہ اس وقت تک واپس نہ گیا جب تک میں

نے اس کی بات قبول نہ کرلی۔ (بزم صوفیہ ص۲۷۲)

تیسرا شعر:۔ جو مسلمان کا فریعنی ضعیف الاعتقاد ہے اور ابھی مومن کے مرتبہ پر نہیں پہونچا وہ تو شمشیر پہ بھروسہ کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ مومن ہے تو تلوار کے بغیر یعنی نہتا بھی لڑ سکتا ہے۔ صرف ایک مثال درج کرتا ہوں۔

غزوۂ موتہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے (جن کا لقب طیار ہے) علم اپنے ہاتھ میں لیا اور گھوڑے سے اتر کر نہایت بے جگری کے ساتھ رومیوں پہ حملہ آور ہوئے۔ جب زخموں سے چور ہو گئے تو دشمنوں نے ان پر وار کیا جس سے ان کا دایاں ہاتھ قلم ہو گیا انہوں نے علم اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ اور جب بایاں ہاتھ کٹ کر گر پڑا تو دونوں کٹے ہوئے بازوؤں سے علم کو اپنے سینے سے لگا لیا اس حالت میں ایک تلوار ان کے سر پر پڑی جس نے کھوپڑی کے دو ٹکڑے کر دیئے اس وقت علم ان کے ہاتھ سے جدا ہو کر زمین پر گر پڑا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے لاش دیکھی تھی۔ تلواروں اور برچھوں کے نوّے زخم تھے لیکن سب سامنے کی جانب تھے ان کی پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا۔

اب پڑھئے اس مصرعہ کو ؎ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

چوتھا شعر:۔ مسلمان اگر نافرمان ہے ایمان کی لذت سے محروم ہے تو تابع تقدیر الٰہی ہوتا ہے لیکن اگر وہ مومن ہے تو پھر وہ خود تقدیر الٰہی بن جاتا ہے یعنی یہ کائنات اس کی مرضی پر چلتی ہے۔ صرف ایک مثال درج کرتا ہوں۔

مصر کے باشندوں کا دستور تھا کہ ہر سال ایک کنواری لڑکی کو دلہن بنا کر دریائے نیل میں ڈال دیتے تھے تاکہ کاشتکاری کے لئے دریا میں پانی

کی قرادانی ہوجائے جب مسلمانوں نے اس ملک کو فتح کیا تو حسب معمول قدیم قبطیوں کا ایک وفد عامل مصر کے پاس آیا۔ اور اس رسم پر عمل کرنے کی اجازت طلب کی لیکن عامل نے اس لایعنی رسم کی اجازت نہیں دی۔ اور ان سے کہہ دیا کہ اسلام نے ان خرافات کو باطل قرار دیا ہے سوء اتفاق دیکھیئے کہ اس سال دریا میں پانی بہت کم ہوگیا۔ اس لئے ان قبیلوں کے جن کا دارومدار زراعت پر تھا ترک وطن کا ارادہ کر لیا عامل مذکور نے مصلحتاً ان واقعات سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ تم نے قبطیوں سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے میں تمہیں ایک خط بھیجتا ہوں کہ اسے دریائے نیل میں ڈال دینا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا۔

" اللہ کے عاجز بندہ اور مسلمانوں کے امیر عمر بن خطابؓ کی طرف سے دریائے نیل (مصر) کے نام! امابعد، اے نیل! اگر تو اپنے اختیار سے بہتا ہے تو نہ بہہ، لیکن اگر تو خدائے قہار کے حکم سے بہتا ہے تو ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ تجھے جاری کردے۔

جب یہ خط دریائے نیل میں ڈالا گیا تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس سال دریا میں اس قدر پانی آیا کہ جل تھل بھر گئے۔ (تاریخ ملت جلد دوم ص۱۹۶)

پانچواں شعر:۔ اے مسلمان! میں نے تیری آگاہی کے لئے اسلام کے حقائق واضح طور پر بیان کردئے ہیں۔ مگر مجھے امید نہیں کہ تو ان سے استفادہ کرے گا۔ کیونکہ تو صدیوں سے محروم یقین ہو چکا ہے لیکن اگر تو اپنے اندر شان فقر پیدا کرے تو یہ سب باتیں جو تجھ کو ناممکن نظر آتی ہیں۔ ممکن ہوسکتی ہیں ۔۔۔؟

غزل ۱۳

(قرطبہ میں لکھے گئے)

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا برکاب

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

جہانِ صوت و صدا میں سما نہیں سکتی
لطیفۂ ازلی ہے فغانِ چنگ و رُباب

سکھا دیئے ہیں اسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

●

یہ غزل اقبالؔ نے قرطبہ (اندلس) کے دوران قیام میں لکھی تھی چونکہ
اس شہر میں عربوں کی عظمت رفتہ کے نقوش ابھی تک ہیں اس لئے قدرتی

بات ہے کہ مرحوم ان سے بہت متاثر ہوئے یہ اشعار ان تاثرات آئینہ دار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان میں تغزل کے بجائے تفکر اور تفلسف کا رنگ غالب ہے۔ ہر شعر ان کے عمیق تفکر اور زبردست قوت مشاہدہ کا حامل ہے۔

پہلا شعر: - چونکہ ہسپانیہ کی عورتوں میں عربی خون کی آمیزش کے سبب سے غیر معمولی دلآویزی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے اس لئے اس شعر میں ان کے حسن وجمال ظاہری کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اس حقیقت کو اقبال نے دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے۔

جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اُندلسی
خوش دل وگرم اختلاط سادہ و روشن جبین
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

کہتے ہیں کہ اس ملک کی عورتوں کا حسن ظاہری اپنے اندر اس درجہ کشش رکھتا ہے کہ اگر انسان عقل سے کام نہ لے تو زندگی کے اعلیٰ روحانی مقاصد سے غافل ہوجائے گا۔ بالفاظ دگر یہ حسن اس کے دل ونظر کے لئے حجاب بن جائے گا۔

اس بات کا اعتراف کرنے کے بعد اقبال ہمیں بتاتے ہیں کہ جو انسان اپنی عقل سلیم سے کام لے گا۔ اس پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی حسن وجمال لاکھ دلفریب سہی لیکن جلوہ پا بر کاب کا مصداق ہے یعنی اس کو ثبات نہیں ہے پس عقلمند آدمی اس فانی لذت کے لئے راحتِ عقبیٰ کو قربان نہیں کرسکتا جلوہ تو بہت دلکش ہے لیکن پا بہ رکاب ہے۔

دوسرا شعر: - اس لئے مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ ان عارضی دلچسپیوں میں منہمک نہ ہو یہ حسن ظاہری زندگی کے سمندر میں بمنزلہ گرداب (بقیہ)

اور ہر عقلمند کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دل و نظر (دین و ایمان) سفینہ کو اس بھنور سے بچائے۔

تیسرا شعر:- لطیفہ لطف سے مشتق ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں کسی کام کو ایسی مخفی تدابیر یا طریقوں سے انجام دینا جو ادراک میں نہ آسکیں یہیں سے اس کے اصطلاحی معنی پیدا ہوئے یعنی لطیف مادی یا کثیف کی ضد ہو گیا۔ لطیف اسے کہتے ہیں جو ادراک سے بالاتر ہو چنانچہ لطیف اللہ کی ایک صفت ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں لطیفہ اس باطنی قوت کو کہتے ہیں جو نظر نہ آسکے اور اس مصرع میں یہی معنی مراد ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ قتان چنگ و رباب یعنی موسیقی میں جو دلکشی اور روحانی لذت پائی جاتی ہے یہ اس مخفی قوت کی بنا پر ہے جس کو مذکر آواز کر سکتی ہے اور نہ بذریعہ الفاظ اس کی وضاحت ہو سکتی ہے یعنی شاعری کی طرح موسیقی بھی ایک عطیۂ الٰہی ہے جس کی حقیقت یعنی دلکشی کا راز فہم انسانی سے بالاتر ہے بظاہر موسیقی میں آوازوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن جب ایک ماہر فن (جسے اللہ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے) انہی آوازوں کو ایک خاص ترتیب اور موزونیت کے ساتھ گلے یا ساز سے ادا کرتا ہے تو اس میں ناقابل بیان جاذبیت اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ موسیقی کا ظاہری رُخ تو بیشک مادی ہے یعنی وہ آوازوں کے مجموعہ کا نام ہے لیکن اس میں روحانی لذت ہے۔ اس کی اصل مادی نہیں ہے بلکہ وہ لطیفہ ازلی ہے یعنی اللہ کی قدرت کا کرشمہ ہے۔

واضح ہو کہ ہسپانیہ کے باشندے عورت اور مرد دونوں موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں بنگال کی طرح وہاں بھی کوئی گھر ایسا نہیں جس میں گانے بجانے

کا چرچا نہ ہو۔

چوتھا شعر:۔ کہتے ہیں کہ صدر اوّل کے فقہا اور علماء کے اندر کتابی علم کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کا ولولہ بھی موجود تھا چنانچہ امام ابن تیمیہ نے درس و افتاء کے علاوہ میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر بھی دکھلائے لیکن رفتہ رفتہ صوفیوں کی صحبت کی بدولت ہمارے ان دینی پیشواؤں پر بھی گوشہ نشینی اور ترکِ جہاد کا رنگ پیدا ہو گیا۔

شیوہ ہائے خانقاہی اقبال کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد ہے ترکِ عمل یا وہ طریقِ زندگی جس کی بدولت انسان میں رہبانیت کا رنگ پیدا ہو جائے۔

یہ شعر اقبال کی ان نفسیاتی کیفیات کا آئینہ دار ہے جنہوں نے ان کو اس کے موزوں کرنے پر مائل کیا جب انہوں نے اس تلخ حقیقت پر غور کیا کہ ہسپانیہ میں مسلمانوں نے سات سو سال تک حکومت کی اس کے باوجود آج سارے ملک میں کسی مسلمان کا وجود نہیں ہے تو انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر غور کیا اس سلسلہ میں یہ حقیقت ان کے سامنے آئی کہ سب سے پہلے۔

(۱) مسلمان صوفیا پر ویدانت کا غیر اسلامی رنگ غالب ہوا جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ عمل۔ کوشش اور جہاد ہر سہ صفات سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ جب خودی اور کائنات دونوں موہوم ہیں تو پھر کوشش کون کرے کیوں کرے اور کس کے لئے کرے؟

اس قسم کے صوفیوں نے علما اور فقہاء کو بھی متاثر کر دیا اور وہ بھی ان صوفیوں کی طرح توحید کے مفہوم اور اس کے عقلی تضمنات سے بے خبر ہو گئے یعنی ان کے نزدیک توحید الٰہی محض ایک عقیدہ بن گئی۔ حالانکہ وہ کائنات میں طاقت (Force) اور توانائی (Energy) کا سب سے

بڑا قبیح ہے۔[1]

ان علماء اور صوفیاء نے عوام الناس کو اپنی طرح جہاد کی روح سے محروم کر دیا کیونکہ جب یہ لوگ خود جہاد سے نفور بلکہ کوسوں دور تھے تو اپنی قوم کو جہاد کا درس کیسے دے سکتے تھے۔

خانقاہوں اور مدرسوں میں قَالَ اللّٰهُ اور قَالَ الرَّسُولُ کی آوازیں تو ضرور بلند ہوتی تھیں لیکن صوفیاء اور علماء نے ان آیات و ران احادیث کو بالکل نظر انداز کر دیا جن میں جہاد کی فرضیت۔ اہمیت۔ ضرورت اور فضیلت کا ذکر ہے۔

جب پوری قوم میں رہبانیت پسند ہوگئی تو جہاد کا جذبہ رفتہ رفتہ بالکل ختم ہو گیا۔ اور چونکہ فطرت کا ازل سے فتویٰ ہے کہ جو قوم جہاد سے بیگانہ ہو جاتی ہے وہ یا مٹ جاتی ہے یا غلام ہو جاتی ہے اس لئے ۱۴۹۲ء میں سلطنت غرناطہ کے زوال کے ساتھ مسلمان بھی ہسپانیہ سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئے۔

جب اقبالؔ نے قرطبہ کی وہ عظیم الشان مسجد دیکھی جس کا طول ۴۴۸ فٹ ہے اور جس کی نظیر چشم فلک نے ابھی تک نہیں دیکھی اور جس میں چھ سو سال سے کسی نے اللہ کا نام نہیں لیا ہے تو یقیناً یہ سب خیالات جو میں نے اختصار کے ساتھ درج کئے ہیں ان کے دماغ میں پیدا ہوئے ہوں گے جنہوں نے کچھ دیر

---

[1] کتنا بڑا ملّی سانحہ ہے کہ آج ہند و پاک سے لے کر مراقش تک کسی مسلمان حکومت کو یہ توفیق حاصل نہیں ہوتی کسی ہز مجسٹی کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ تبلیغ واشاعت اسلام کے لئے کوئی ادارہ قائم کیا جائے تاکہ مسلمان توحید الٰہی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ ہو کر اپنے اندر طاقت پیدا کر سکیں۔

بعد اس مصرع کی صورت اختیار کر لی۔

فقیہ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

پانچواں شعر: شعر تو بالکل واضح ہے صرف اتنا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ منبر و محراب سے اگرچہ ہر مسجد مراد ہو سکتی ہے لیکن شعر کہتے وقت خاص جامع قرطبہ ان کے پیش نظر تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ آج لاہور سے لے کر فیض (مراقش) تک ساری مسجدیں ان کے سجدوں کو ترس رہی ہیں جن سے کائنات میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سجدہ کرنے والے خواہ وہ کراچی میں ہوں یا کابل میں طہران میں ہوں یا قاہرہ میں۔ خود دوسروں سے کانپ رہے ہیں۔ کوئی انگریزوں کی غلامی میں ہے۔ اور کوئی روسیوں سے پیمان وفا باندھ رہا ہے اور کوئی ڈالر کے سامنے سر تسلیم خم کر رہا ہے۔

سچ کہا ہے اقبالؔ نے۔

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن

اے مسلماں مردن است ایں زیستن

چھٹا شعر: شعر تو بالکل واضح ہے صرف اس قدر صراحت کافی ہے کہ وہ اذان دینے والے ہی صدیوں سے ختم ہو چکے ہیں چنانچہ اقبال نے خود اس حقیقت کو اس شعر میں واضح کر دیا ہے۔

در عجم گردیدم و ہم در عرب

مصطفےٰ نایاب و ارزاں بولہب

جب سرکار دو عالم محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے غلام ہی نایاب ہو گئے ہیں تو بولہب کے پیروؤں کی اذان پہاڑوں کو رعشہ سیماب کیسے

دے سکتی ہے۔

ساتواں شعر:- آخری میں اقبال نے خود اپنی نفسیاتی کیفیات سے ہمیں مطلع کر دیا ہے۔ قرطبہ اور اس کی فقید المثال جامع مسجد دیکھ کر ان کی شاعری میں مسلمانوں کی سطوت اور شوکت کے زمانہ کا سوز اور سرور پیدا ہو گیا ہے۔ روح زمین میں لرزش پیدا کرتے والے سجدے اور پہاڑوں کو رعشہ سیماب دینے والی ادائیں۔ یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب انگلستان کی شریف مائیں یہ کہہ کر اپنے بچوں کو سلادیا کرتی تھیں۔

"HUSH IBABYHUSHITHETBIRKSARE COming"

سوجا منے سوجا! ترک آرہے ہیں۔

لیکن آج وہی ترک اپنی مادری زبان بھی لاطینی حروف میں پڑھ رہے ہیں۔ اس کے باوجود دل یورپ کی نگاہوں میں ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے اسی لئے اقبال نے ان مقلدین یورپ کو یہ مشورہ دیا ہے۔

لاطینی ولا دینی! کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کی لَاغَالِبَ اِلَّاھُوْ

غزل ۱۴

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

اس اندیشے سے ضبطِ آہ میں کرتا رہوں کب تک
کہ مُغ زادے نہ لے جائیں تری قسمت کی چنگاری

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زُنّاری

●

پہلا شعر:۔ دلِ بیدار اقبال کی اصطلاح ہے اور اس سے ان کی مراد ہے۔ وہی شانِ عشق جو ان کے پیغام کی روح ہے جس پر ان کا سارا فلسفۂ اسلام مبنی ہے جسے وہ ہر مسلمان میں دیکھنا چاہتے، اور جس کو انھوں نے اسرارِ خودی

سے لے کر ارمغان حجاز تک ہر کتاب میں پیش کیا ہے وہ کہیں اسے دلِ بیدار سے تعبیر کرتے ہیں کہیں دل زندہ سے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

کہیں دل کی آزادی سے، اور کہیں خودی کی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر (ضربِ کلیم)

کہیں خودی کی عریانی سے۔ اور کہیں شکوہِ بوریا سے تعبیر کرتے ہیں۔

با سلاطیں در فتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر (پس چہ باید کرد)

کہیں نشۂ درویشی سے اور کہیں قلندری سے۔ کہیں من میں ڈوبنے سے اور کہیں رنگِ عاشقی سے تعبیر کرتے ہیں۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن (زبورِ عجم)

شعر کا مطلب بالکل واضح ہے کہ اگر دل بیدار ہو جائے تو انسان کے اندر شانِ فاروقی اور شانِ کراری پیدا ہو جائے گی۔ انسان کو اگر تانبا فرض کیا جائے تو دل کی بیداری اس کے حق میں بمنزلۂ کیمیا ہے جو تانبا کو سونا بنا دیتی ہے۔

اب صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ دل بیدار کس طرح ہو سکتا ہے اس کا جواب میں کئی جگہ لکھ چکا ہوں۔ مختصراً پھر لکھتا ہوں کہ اقبال کے فلسفہ کی رو سے۔ دل کی بیداری یا زندگی عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر موقوف ہے اور یہ عاشقی کا فن کسی عاشقِ صادق (مرشدِ کامل) کی صحبت سے حاصل ہو سکتا

ہے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ مثلاً کتابوں کے مطالعہ سے یا تقریروں سے یا رسائل کی اڈیٹری سے یا لیڈری سے یا تصنیف و تالیف سے یا امارت سے یا اشتہار بازی سے کوئی شخص اپنے دل کو بیدار نہیں کرسکتا۔ سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک سے ہمارے زمانہ تک دل کی بیداری کا صرف ایک ہی طریقہ چلا آرہا ہے اور وہ ہے۔

عشق کیا شے ہے؟ کسی کامل سے پوچھا چاہئے
کس طرح جاتا ہے دل بیدل سے پوچھا چاہئے

اپنے دل کو بیدار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس کا دل بیدار ہوچکا ہو۔ اس شخص سے رابطہ پیدا کرلو۔ تصوّف کی اصطلاح میں اسے صحبت شیخ کہتے ہیں یا اپنے دل کو روحانی تار کے ذریعہ سے اس کے دل سے جوڑ دو تاکہ پاور ہاؤس (قلب محمدیؐ) سے ایک "کرنٹ" تمہارے اندر بھی دوڑنے لگے۔ بس اس کرنٹ سے دل بیدار ہوجاتا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کنکشن کے بغیر گھر میں یا کمرہ میں بلب روشن نہیں ہوسکتا تو روحانی رابطہ کے بغیر سینہ میں دل کبھی روشن نہیں ہوسکتا اگر پاور ہاؤس سے کنکشن منقطع ہوجائے تو ساری بستی کے لوگ اندھیرے میں ٹانک ٹوئیاں مارنے لگیں گے بستی کی رونق کا دارومدار ہی کنکشن پر ہے مسلمان قوم کی رونق (زندگی) کا انحصار بھی عشق (کنکشن) پر ہے۔

ما قریں اقبالؔ نے اپنے سارے فلسفہ کا خلاصہ ایک شعر میں بیان کردیا ہے یا یوں سمجھو کہ دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

مصطفےٰ بحر است و موج او بلند
خیز و ایں دریا بجوئے خویشتن بند

یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سمندر ہیں اور اس سمندر کی موجیں بہت بلند ہیں اے مسلمان دیکھتا کیا ہے! انتظار کس بات کا ہے اٹھ اور اس سمندر کو اپنی نہر میں بند کر لے یعنی کوشش کر کہ یہ سمندر تیرے دل میں سما جائے اس شعر کا مطلب تو اس وقت بیان کروں گا جب مسافر کی شرح لکھوں گا اس وقت تو صرف دو باتیں لکھنی چاہتا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے سمندر دل میں کیسے سما سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق کی مدد سے یہ ناممکن بات ممکن ہو سکتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پھر کیا ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب وہ کملی والا وہ بادشاہوں کا بادشاہ وہ ساری کائنات کا آقا صلے اللہ علیہ وسلم دل میں سما جائیں گے تو انقلاب عظیم پیدا ہو جائے گا جس کی تفصیل اس جگہ موجب تطویل ہوگی۔ صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ دل بیدار ہو جائے گا یعنی بیڑا پار ہو جائے گا۔ اب پڑھو یہ مصرع۔

دل بیدار فاروقی دل بیدار کراری

کیا مسلمان اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ میں فاروقی کی شان پیدا ہی اس وقت ہوئی جب انہوں نے اپنے آپ کو کسی کی محبت میں فنا کر دیا۔

نوٹ:۔ جب عاشق اپنے آپ کو معشوق کی محبت میں فنا کر دیتا ہے تو معشوق اس کے دل میں سما جاتا ہے یعنی عاشق کا دل زندہ ہو جاتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اے مسلمان! منطق فلسفہ چھوڑ اور اپنے دل کو بیدار کر کیونکہ جب تک دل بیدار نہ ہو تو جہاد نہیں کر سکتا اور جو مسلمان جہاد نہیں کر سکتا۔ اور جو مسلمان مقصد حیات حاصل نہیں کر سکتا۔ اور وہ شخص

جو مقصد حیات حاصل نہیں کر سکتا اس کا عدم اور وجود اقبال کی نظر میں دونوں یکساں ہیں۔

تیسرا شعر:۔ مشام تیز کنایہ ہے یقین سے۔ اور آہوئے تاتاری کنایہ ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے۔ یعنی عشق خواہ مجازی ہو یا حقیقی اس کی بنیاد یقین پر ہے جسے شرعی یا فقہی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں جب تک عاشق کو یہ یقین نہ ہو کہ میرا محبوب حسن وجمال ظاہری کے اعتبار سے سارے عالم میں یکتا ہے وہ اس سے محبت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب تک ایک مسلمان کو اس بات کا یقین کامل نہ ہو کہ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم حسن وجمال باطنی (نبوت ورسالت) میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں سب حسینوں (انبیاء علیہم السلام) کے سرتاج ہیں اور آپ کی ذات منبع کمالات ہے وہ آپ سے محبت نہیں کر سکتا۔ پس اگر مسلمان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی دولت (آہوئے تاتاری) کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے دل میں اس بات کا یقین پیدا کرنا چاہیئے کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ہیں اور آپؐ کی اتباع سے مجھ کو بلاشبہ اللہ کی خوشنودی (جو مومن کا نصب العین یا مقصود حیات ہے) حاصل ہو جائے گی ان دونوں باتوں میں کسی قسم کا شک وشبہ (ظن وتخمین) دل میں نہ آنے پائے کیونکہ شک یقین کی ضد ہے۔

اگر دل میں شک ہے تو یقین کبھی ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔
یقین کے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہیں ہو سکتی۔
اور اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بغیر اللہ کی رضا حاصل نہیں ہو سکتی۔
اور جب اللہ راضی نہ ہوا تو زندگی اکارت چلی جائے گی۔

چوتھا شعر:۔ مُغ زادوں۔ مُغ بمعنی آتش پرست ایران میں

دستور تھا کہ شراب خانوں میں خوش رو مغ زادوں یا مغ بچوں کو لطور ساقی رکھتے تھے چنانچہ آج کل ہوٹلوں میں "بوائے" انہی مغ بچوں کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اقبالؔ نے یہ لفظ تو فارسی شاعری سے مستعار لیا ہے لیکن مفہوم بدل دیا ہے یہاں مغ زادوں سے غیر مسلم مراد ہے اور چونکہ اس مصرع میں چنگاری کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس لئے آگ کی نسبت سے لفظ میں معنوی خوبی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

قسمت کی چنگاری کنایہ ہے حصول مقصد کی تڑپ یا آرزو سے اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! میں جب تیری طرز زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ تو اگر اسی طرح غفلت میں زندگی بسر کرتا رہا تو غیر قومیں تجھ سے آگے بڑھ جائیں گی پس تیرے انجام پر غور کرنے کے بعد میرے دل سے آہ نکلنا چاہتی ہے جسے میں نے اب تک ضبط کیا ہے لیکن اب میں ضبط نہیں کر سکتا۔ نیں میں تجھے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا رہا تو یقیناً قانون قدرت کے مطابق تیرا حصّہ دوسروں کو مل جائیگا۔ یعنی اللہ غیروں پر اپنا فضل نازل کرے گا اور تو محروم رہ جائے گا کیونکہ قانون یہی ہے کہ جو قوم ترقی کی کوشش نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ بھی اس قوم کی مدد نہیں کرتا۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اللہ سے فریاد کی ہے کہ اے خدا! یہ تیرے سادہ لوح بندے بڑی مصیبت میں گرفتار ہیں کیونکہ آج کل درویشی بھی عیّاری ہے اور سلطانی بھی عیاری ہے اور مسلمان چونکہ جاہل ہے اس لئے موجودہ صورت کا مقابلہ نہیں کر سکتے عیاری اور مکاری کا جواب وہی شخص دے سکتا ہے جو نہایت ہوشیار اور چالاک اور حالات سے

باخبر ہو لیکن مسلمان ان تمام صفات سے محروم ہیں۔ اس لئے میں ان کے مستقبل کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔

نوٹ:۔ سلطانی سے مراد ہے برطانوی سیاست مسلمانوں پر اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ اس نے قوم میں ایک شخص ایسا پیدا کر دیا جس نے ان عیّاروں کا مقابلہ بڑی کامیابی کے ساتھ کیا۔

چھٹا شعر:۔ تہذیب حاضر یا دانش حاضر یا تہذیب مغرب یا تہذیب فرنگ سے مراد ہے یورپ کی تہذیب جس کی بنیاد مادیت اور انکار خدا پر رکھی گئی ہے اور چونکہ یہ تہذیب اسلام کی روح کے خلاف ہے اس لئے اقبالؔ اس کے اشد مخالف ہیں اور اسی لئے انہوں نے اس کی تردید میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اس ناپاک اور نام نہاد تہذیب کے مقاصد کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح کر دیا ہے چنانچہ انہیں خود بھی اس مقصد میں اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا تھا جیسا کہ ارمغان حجاز کی اس رباعی سے ثابت ہوتا ہے۔

طلسم عصر حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم
بنارِ او چہ بے پروا نشستم

کہتے ہیں کہ تہذیب مغرب نے جو آزادی مسلمانوں کو عطا کی ہے وہ ظاہر میں تو آزادی ہے لیکن باطن میں گرفتاری ہے یعنی اس تہذیب نے انہیں ہر برے کام کی آزادی عطا کر دی ہے۔ شریعتِ اسلامیہ جن باتوں سے روکتی ہے۔ یہ تہذیب ان باتوں کو جائز ہی نہیں بلکہ معیارِ ترقی قرار

دیتی ہے مثلاً شریعت نے عورتوں کو یہ حکم دیا ہے کہ جب گھر سے باہر نکلو تو ایسا لباس پہن کر نکلو کہ جسم کے وہ اعضاء جو مرد کے لئے باعث کشش ہو سکتے ہیں پوشیدہ رہیں۔ دوسرے لفظوں میں برقعہ پہن کر باہر نکلو تاکہ زینت کے مقام نمایاں نہ ہو سکیں۔ آنکھیں۔ چہرہ۔ گردن۔ سینہ۔ شکم۔ غرض کہ جسم کا کوئی حصّہ عریاں نہ ہو لیکن تہذیب مغرب کا تقاضا یا حکم یہ ہے کہ عورت جب گھر سے باہر نکلے تو زینت کے مقامات کو عریاں اور نمایاں کرے تاکہ اغیار اس کی خدمت میں خراج تحسین پیش کر سکیں۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ۔

اسلام حجاب کا حکم دیتا ہے۔
تہذیب مغرب بے حجابی کا حکم دیتی ہے۔

پس لبظاہر تہذیب مغرب آزادی عطا کرتی ہے لیکن دراصل وہ مسلمان عورتوں کو بے حیائی اور بے دینی کی لعنت میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اس تہذیب سے انسان آزاد نہیں ہوتا۔ بلکہ نفسیاتی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے۔

ساتواں شعر:۔ چونکہ اقبالؔ اپنی قوم کی کمزوریوں سے واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ قوم تنزل کے اس درجہ میں پہونچ چکی ہے۔ جہاں اصلاح حال کا امکان باقی نہیں رہتا (جیسا کہ نظر آ رہا ہے) اس لئے وہ بے اختیار سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کرتے ہیں کہ حضور آپ کی قوم کی حالت یہ ہے کہ دانش تو افرنگی ہو چکی ہے اور زنّاری ہو چکا ہے مسلمانوں کا معیارِ حسن و قبح ہی بدل چکا ہے وہ اب اس بات کو اچھا سمجھتے ہیں۔ جسے تہذیب مغرب اچھا قرار دیتی ہے (حالانکہ اچھا وہ ہے

جیسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اچھا قرار دیں)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نہ ان میں اسلام باقی ہے نہ ایمان ہی۔ اندریں حالات ان کی اصلاح کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ آپؐ خود اپنی قوم کی دستگیری اور چارہ سازی فرمائیں۔ مولانا حالیؔ مرحوم نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

نوٹ:۔ ایمان کے زناری ہو جانے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان اگرچہ زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اعمال بالکل کافرانہ یا غیر اسلامی ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اقبالؔ نے ساقی نامہ میں اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

غزل ۱۵

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی تو بے لذّتِ نیاز نہیں
نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگِ صورِ اسرافیل دل نواز نہیں
سوالِ مے نہ کروں ساقیٔ فرنگ سے میں
کہ یہ طریقۂ رندانِ پاک باز نہیں
ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں
اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضور
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں
اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

•

پہلا شعر: مطلب اس کا یہ ہے کہ جو لوگ مقرب بارگاہ سلطانی ہوتے ہیں وہ اس احساس کی بدولت کہ بادشاہ ہمیں عزیز رکھتا ہے۔ گستاخ اور تیز مزاج ہو جاتے ہیں اور ان کی گستاخی میں تکبّر کا رنگ جھلکتا

ہے لیکن اللہ کے محبوب بندے جو شان فقر کی بدولت اس مقام پر فائز ہوتے ہیں اگر کبھی بمقتضائے بشریت ان سے شوخی اور گستاخی یا تند مزاجی کا اظہار ہوتا ہے تو اس میں تکبر اور ناز کا رنگ نہیں پایا جاتا اور اگر کبھی یہ رنگ پایا بھی جاتا ہے تو اس طرح کہ اس میں نیاز و عاجزی کا رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ مقربین بارگاہ ایزدی خواہ کتنے ہی بلند مقام پر کیوں نہ پہنچ جائیں ان کے اندر غرور پیدا نہیں ہوتا وہ ہمیشہ اللہ کے سامنے سر نیاز خم کئے رہتے ہیں اور ہر وقت توبہ و استغفار کرتے رہتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ جس طرح شہباز اور شاہین کسی مردہ پرندے کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہمیشہ زندہ پرندوں کا شکار کرتے ہیں اسی طرح عشق بھی اس دل کو اپنا مسکن بناتا ہے جو زندہ ہو یعنی اللہ کے عشق میں وہی شخص سرشار ہو سکتا ہے جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی بدولت اپنے دل کو زندہ کر لیا ہو۔ (زندہ بمعنی پاکیزہ)

تیسرا شعر:۔ میری شاعری میں ادائے محبوبی نہیں ہے اس لئے کہ میں تو مردوں کو زندہ کرنا چاہتا ہوں اور سب جانتے ہیں کہ صور اسرافیل سے جو آواز نکلے گی وہ دلکش اور خواب آور تو نہیں ہو گی یعنی میں شاعری نہیں کرتا بلکہ قوم کو بیدار کرنا چاہتا ہوں۔

چوتھا شعر:۔ میں مغربی تہذیب سے ہمیشہ اجتناب کروں گا کیونکہ یہ تہذیب (شراب) غیر اسلامی (ناپاک) ہے اور مسلمان (زندان پاکباز) کبھی کسی ناپاک چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

پانچواں شعر:۔ دنیا میں ایسے عاشق ہمیشہ تھوڑے ہوتے ہیں کسی زمانہ میں بھی ان کی کثرت نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ عاشق زمانہ ساز یعنی ضمیر فروش

نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے مقررہ اصولوں پر چلتا ہے دنیا والوں کے ساتھ موافقت نہیں کر سکتا اور ایسے لوگ ہمیشہ بہت کم ہوتے ہیں جو اصول کے لئے دنیا کی عزت اور مال و دولت سب کو ترک کر سکیں اس لئے حکومت عشق عام نہیں ہو سکتی ہے۔

چھٹا شعر:۔ ممکن ہے دوسرے لوگ میری داستان بیان کریں تو بہت طول پیدا کر دیں لیکن میں خود ایک لفظ میں اپنی عاشقی کی داستان بیان کر سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب مجھے اس کی حضوری نصیب ہوتی ہے اس وقت بھی اضطراب ہوتا ہے اور جب میں اس کے سامنے نہیں آتا اس وقت بھی یہی کیفیت ہوتی ہے یعنی میری عاشقی بس ایک مسلسل اضطراب سے عبارت ہے۔

واضح ہو کہ عاشقی نام ہی اضطراب اور بے چینی کا ہے وجہ یہ ہے کہ عاشق معشوق کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ معشوق میرے اندر سما جائے اور چونکہ یہ ناممکن ہے اس لئے وہ ہمیشہ مضطرب رہتا ہے، ناممکن میں نے اس لئے کہا کہ غیر محدود (خدا) محدود (انسان) میں کیسے سما سکتا ہے پس عشق حقیقی مسلسل اضطراب کا دوسرا نام ہے اسی کو اقبال نے "سوختن ناتمام" سے تعبیر کیا ہے۔

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل   چیست حیات دوام سوختن ناتمام

ساتواں شعر:۔ اے مخاطب! اگر تو زندگی کے حقائق سے آگاہ ہونا چاہتا ہے اگر تیرے اندر معرفت کا ذوق ہے تو خلوت میں زبور عجم کا مطالعہ کر کیونکہ میں نے اپنی اس تصنیف میں فلسفہ اور تصوف علم اور حکمت کے بہت سے اسرار اور رموز بیان کئے ہیں۔

نوٹ:۔ جس کتاب کے مطالعہ کی اقبال سفارش کریں ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کس قدر بلند پایہ کتاب ہوگی انشاء اللہ آئندہ سال کے آخر تک اس کی شرح شائع ہو جائے گی اور اس کے مطالعہ سے ناظرین کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ زبور عجم میں کیا بات ہے جو اقبال نے مطالعہ کی سفارش کی ہے۔

غزل ۱۶۱

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف

کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف مرگِ حیاتِ بے شرف

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی!
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

●

پہلا شعر۔ مسلمانوں کے رہنما چونکہ نااہل ہیں اس لئے قوم کا شیرازہ مدتوں سے پراگندہ ہے اور یہ سب خرابیاں اس لئے رونما ہوئیں کہ قوم کے ساتھ کوئی نصب العین نہیں ہے۔

اقبالؔ نے اس شعر میں فوج کا تلازمہ باندھا ہے۔ میر سپاہ سے مراد ہے امام یا رہنما لشکریاں سے مراد ہے مسلمانوں کی جماعت۔ شکستہ صف سے مراد ہے انتشار اور بے ربطی تیر نیم کش سے مراد ہے کوشش اور ہدف سے مراد ہے مقصد یا نصب العین۔

اگر تیر انداز کے سامنے کوئی مقصد نہ ہو تو تیر بھی ضائع ہو جائے گا اور کمان کھینچنے میں جو محنت کی گئی ہے وہ بھی اکارت ہو جائے گی اسی طرح اگر قوم کے سامنے کوئی نصب العین نہ ہو تو افراد کی کوشش کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

اقبالؔ نے یہ شعر ۱۹۳۷ء میں لکھا تھا لیکن آج بھی قوم کی حالت پر بعینہٖ صادق آسکتا ہے قوم کے سامنے نہ اس وقت کوئی نصب العین تھا نہ آج ہے ہر طرف خود غرضی کا بازار گرم ہے ہر شخص اپنی ذاتی ترقی کی کوشش میں منہمک ہے قوم کی بہبود کا خیال نہ کسی کو پہلے تھا نہ آج ہے۔

مسلمانوں کا نصب العین جیسا کہ قرآن مجید سے واضح ہے صرف ایک ہے یعنی تبلیغ و اشاعت اسلام یا اعلائے کلمۃ اللہ اور اس کے حصول کے لئے نہ ۱۹۳۷ء میں کوئی کوشش کسی طرف نظر آتی تھی۔ نہ آج نظر آتی ہے چنانچہ دیکھ لیجئے تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے نہ اس وقت سارے ملک میں کوئی نظام قائم تھا نہ آج قائم ہے اور نہ اس کے قیام کے کہیں آثار نظر آتے ہیں۔

دوسرا شعر۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! میں نے اچھی طرح تلاش کر کے دیکھ لیا۔ تیری شخصیت کے سمندر میں زندگی کا موتی کہیں نظر نہیں آیا۔ زندگی کے موتی سے مراد ہے جذبۂ تبلیغ و اشاعت اسلام جیسا کہ پہلے شعر کی شرح میں واضح کیا ہے مسلمان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے یعنی وہ پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس دنیا میں اسلام کی تبلیغ کرے چنانچہ اقبالؔ خود لکھتے ہیں

زانکہ در تکبیر رازِ بود تست | حفظ و نشر لا الٰہ مقصود تست
تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے | گر مسلمانی نیا سائی دمے

یعنی اے مسلمان! تیری ہستی کا راز تکبیر میں منحصر ہے اس لئے کلمۂ توحید کی حفاظت اور اشاعت تیری زندگی کا واحد مقصد ہے اور جب تک ساری دنیا میں اسلام کا نام بلند نہ ہو جائے تو فارغ ہو کر نہیں بیٹھ سکتا۔

مسلمان سب کام کر رہے ہیں۔

تعلیمی کانفرنس۔ سیاسی کانفرنس۔ اقتصادی کانفرنس۔ بلکہ مؤتمر اسلامی کے شاندار اجلاس بھی منعقد کر رہے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے ہنگاموں میں بھی زر کثیر صرف کر رہے ہیں لیکن تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لئے کوئی ادارہ قائم نہیں کرتے حالانکہ قرآن مجید کی رو سے ان کی زندگی کا واحد مقصد یہی ہے اور یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ وہ اپنے مقصد حیات سے بالکل غافل ہیں لیکن اس کے باوجود رحمتِ الٰہی کے امیدوار ہیں۔

تیسرا شعر:۔ ان افسوسناک حالات کو مدّنظر رکھ کر اقبالؔ مسلمان سے یہ کہتے ہیں کہ اے غافل! خدا کے لئے بت پرستی سے باز آ۔ اور اپنے مقصد حیات کی طرف توجہ کر اور اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی خودی میں ڈوب جا دنیا کی فانی اور لایعنی دلچسپیوں میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو برباد مت کر خودی میں ڈوبنے کا مطلب قبل ازیں تفصیل کے ساتھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ اقبالؔ کی رائے میں جب تک ایک مسلمان اپنے من میں ڈوب کر اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل نہیں کرے گا وہ اپنے مقصد حیات کو حاصل نہیں کر سکتا۔

اگر مسلمان کا مقصد حیات مادّی یا دنیاوی ہوتا تو اسے اپنی خودی کی

معرفت کی ضرورت نہیں تھی وہ غیر قوموں کی طرح اس کے بغیر بھی اپنا مقصد حیات حاصل کر سکتا تھا لیکن اسلام نے مسلمان کے سامنے جو نصب العین رکھا ہے اس کے حصول کی پہلی شرط معرفتِ خویش ہے اور معرفت ذات عشق رسول کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی مسلمان صرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی سے منزل مقصود کو پہنچ سکتا ہے۔ کارل مارکس کی پیروی سے دنیا تو مل سکتی ہے عقبیٰ نہیں مل سکتی اور اگر اس نے صرف دنیا کو اپنا مقصود بنا لیا تو وہ کافر کی حیثیت سے شاید ترقی کر سکے مسلمان کی حیثیت سے ترقی نہیں کر سکتا اور مسلمان جب مسلمان نہ رہا تو پھر اس کا عدم اور وجود اقبالؔ کی نظر میں یکساں ہے۔

چوتھا شعر:۔ چوتھے شعر میں اقبالؔ اپنا مافی الضمیر صاف لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ اے مسلمان! تیرا مقصد حیات تو عشق ہے پس تو مرنے سے مت ڈر۔ عشق اختیار کر موت بہر حال ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی، اگر تو اس حالت میں مرا کہ عشق رسولؐ تیرے دل میں سمایا ہوا ہو تو یہ عزت کی موت ہوگی یعنی عشق مرگ باشرف کا دوسرا نام ہے۔

اور اگر تو نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے بغیر زندگی بسر کر دی تو جب تجھے موت آئے گی تو اللہ کی نگاہ میں تیری ساری زندگی بے قیمت اور بے کار ہو گی یعنی موت حیات بے شرف کا دوسرا نام ہے۔

اب تو خود فیصلہ کر لے کہ عزت کی موت اچھی ہے یا ذلت کی زندگی اچھی ہے؟ یہ سچ ہے کہ عاشق کو اپنا سر ہتھیلی پر رکھنا پڑتا ہے لیکن اس سرفروشی کا صلہ بھی تو یہ ملتا ہے کہ اس کی زندگی اللہ کی نظر میں قیمتی ہو جاتی ہے اور جو شخص میدان جنگ سے گریز کرتا ہے ممکن ہے وہ دس بیس سال اور زندہ رہ لے

لیکن اس کی زندگی بے شرف اور بے قیمت ہوتی ہے خدا کے یہاں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہو سکتی۔

پانچواں شعر:۔ کہتے ہیں کہ مرشد رومیؒ کی تصانیف کا مطالعہ کرنے اور ان سے روحانی رابطہ پیدا کرنے کی بدولت مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ فلسفہ سے اللہ کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے فلسفی ہمیشہ حیرانی اور شک و شبہ میں گرفتار رہتا ہے لیکن عشق کی بدولت انسان کو اللہ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے اس لیے مؤمن ہمیشہ سرکیف رہتا ہے لیعنی مسلمان کو لازم ہے کہ عشق رسولؐ اختیار کرے تاکہ اللہ کی راہ میں جہاد کرکے اس کی خوشنودی حاصل کرسکے اور یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ:۔

مسلمان کا مقصد حیات۔ حصول رضائے باری تعالیٰ ہے۔

اور اللہ کو راضی کرنے کا طریقہ، جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

اور اس کی راہ میں جہاد اس وقت ممکن ہے جب مسلمان اللہ سے محبت کرے۔

اور محبت الٰہی کا طریقہ، اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

یعنی عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پس مسلمان کو لازم ہے کہ بتوں سے عشق کرنے کے بجائے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں فنا ہو جائے۔

نوٹ:۔ عشق بتاں سے مراد ہے زن۔ زر۔ زمین کی محبت یہ تین بت سب سے بڑے ہیں۔ ان کے علاوہ جس قدر بت ہیں وہ سب انہی بتوں کی اولاد ہیں۔ مثلاً اقتدار۔ عہدہ۔ منصب۔ جاگیر۔ خطاب۔ جاہ و منزلت باغات۔ تجارت۔ کاروبار۔ سوداگری۔ عالی شان محلات اور حویلیاں، سیرو

شکار۔ رقص و سرود۔ خدم وحشم۔ موٹر کار اور ٹیلیفون وغیرذالک۔

چھٹا شعر:۔ گذشتہ شعر میں اقبال نے یہ کہا ہے کہ ایک لاکھ فلسفی جمع ہوجائیں تو بھی سر سے کفن باندھ کر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے نہیں نکل سکتے لیکن اگر ایک مسلمان بھی ایسا ہو جس میں شانِ کلیمی پائی جاتی ہے تو وہ تن تنہا کفر کا مقابلہ کرنے کے لئے سر بکف میدان جہاد میں آسکتا ہے۔

اس بات سے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو خود اللہ تعالیٰ نے تسلی عطا فرمائی تھی اور ان سے نصرت کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ اس لئے وہ تن تنہا فرعون کا مقابلہ کر سکے لیکن ہر شخص تو موسیٰ علیہ السلام نہیں ہو سکتا۔

اس شبہ کا اقبال یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے آج بھی اگر کوئی مسلمان مثل موسیٰ کلیم علیہ السلام معرکہ آرائی کے لئے تیار ہو یعنی اپنے اندر اللہ کی ہستی اور اس کی نصرت پر ایمان پیدا کرلے (اور یہ ایمان عشق رسولؐ سے پیدا ہو سکتا ہے) تو آج بھی درخت طور سے "لَا تَخَفْ" کی آواز آسکتی ہے اللہ آج بھی اس کی نصرت کا وعدہ فرما سکتا ہے۔

لَا تَخَفْ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ۔

پس جب وہ اس آگ کے پاس پہونچے تو ان کو اس میدان کے داہنی جانب سے اس مبارک مقام میں ایک (درخت طور) میں سے یہ آواز آئی کہ اے

موسیٰ! میں اللہ رب العالمین ہوں اور یہ کہ تم اپنا عصا ڈال دو سو جب انہوں نے اس کو لہراتا ہوا دیکھا گویا کہ وہ سانپ ہے تو لپشت پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا (اس پر دوبارہ درخت میں سے آواز آئی کہ) اے موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت۔ (۵-۲۸-۳۲)

ساتواں شعر:- کہتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھوں میں، مدینہ طیبہ اور نجف کی خاک کا سرمہ لگالیا ہے اس لئے فرنگیوں کے فلسفہ اور سائنس کے جلوہ سے میری نظر میں چکا چوند (خیرگی) پیدا نہیں ہو سکتی یعنی میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے شاگرد رشید حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تعلیمات کا پیرو ہوں اس لئے مغربی علوم مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اقبال نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر اس لئے کیا کہ یہ حدیث موضوع ان کے پیش نظر تھی۔ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس شہر کا دروازہ ہیں پس جس شخص کو علوم نبوی (صلے اللہ علیہ وسلم) کے حصول کی آرزو ہو۔ اُسے سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شاگردی کرنی چاہئے کیونکہ دروازہ کے بغیر شہر میں داخل نہیں ہو سکتے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کے دل میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت جاگزیں ہو وہ کبھی ہرگز "دانش فرنگ سے متاثر ہو کر گمراہ نہیں ہو سکتا اس کی نگاہ میں فلسفہ مغرب کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی کیونکہ فلسفہ بہر حال ظنی ہے اور ارشادات نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) حقیقت پر مبنی ہیں۔

غزل ۱۷

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

کہیں سرمایۂ محفل تھی میری گرم گفتاری
کہیں سب کو پریشاں کر گئی میری کم آمیزی

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عبرت وہی عظمت وہی شانِ دلآویزی

•

پہلا اور دوسرا شعر:۔ ان میں کوئی خاص بات وضاحت طلب نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ آج مزدور طبقہ کے افراد کہتے ہیں کہ اگر حکومت ہمارے ہاتھ میں آجائے تو ہم مزدوروں کے حقیقی ہمدرد ثابت ہوں گے اور سرمایہ داروں نے ان پر جس قدر مظالم کئے ہیں ہمیشہ کے لئے ان سب کا سدِّباب کر دیں گے لیکن حکومت خواہ مزدوروں کے ہاتھ میں ہو خواہ سرمایہ داروں کے اس کا نقشہ دونوں کو یکساں طور پر بدہوش کر دیتا

یعنی کوہکن (مزدور) کے طرزِ حکومت میں بھی پرویزی (سرمایہ دار) کے سے حیلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

نوٹ:۔ تقسیم سے پندرہ بیس سال پہلے جب کبھی انگریزی حکومت مزدوروں پر لاٹھی چارج یا فائرنگ کا حکم دیتی تھی تو ان سے کانگریسی اصحاب کہا کرتے تھے کہ جب ملک میں کانگریسی حکومت قائم ہو گی تو تمہاری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

چوتھا شعر:۔ یہ شعر پہلے شعر کے مطلب کو واضح کرتا ہے یعنی طریقِ کوہکن میں بھی پرویزی حیلے کیوں پیدا ہو جاتے ہیں؟ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر دین کو سیاست سے جدا کر دیا جائے تو حکومت خواہ مزدوروں کے ہاتھ میں ہو یا سرمایہ داروں کے اور طرزِ حکومت خواہ شخصی ہو یا جمہوری ہر حال میں نتیجہ یکساں ہی برآمد ہو گا کہ برسرِ اقتدار پارٹی ــــ دوسروں پر ظلم و ستم روا رکھے گی اور حریت۔ ضمیر۔ حریتِ فکر اور حریتِ ذات۔ ہر قسم کی آزادی کا گلا گھونٹ دے گی۔

واضح ہو کہ نظریہ وطنیت (نیشنلزم) کی تعلیم یہ ہے کہ:۔

۱۔ انسان کی وفاداری کا آخری مرجع وطن ہے نہ کہ مذہب۔

۲۔ قوم، مذہب سے نہیں بنتی۔ وطن سے بنتی ہے۔

۳۔ مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں ہیں۔

۴۔ معیارِ خیر و شر۔ مذہب نہیں۔ بلکہ وطن ہے۔

نظریۂ وطنیت کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں ہیں اس لئے مذہب کو سیاست میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے مملکت مذہب کے زیرِ اقتدار رہ سکتی ہے اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج یورپین سیاست

ہو بہو چنگیزی کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے۔

چونکہ یہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اس لئے دنیا والوں کے حق میں ہر قسم کی مصیبتوں کا سرچشمہ بن گیا ہے۔ بانگ درا میں اقبال نے اس کے مفاسد کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

پانچواں شعر:۔ یہ شعر اقبال نے اٹلی کے پایۂ تخت روم کی سیر و سیاحت کے بعد لکھا ہے جس میں انہوں نے اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا ہے جو اس قدیم تاریخی شہر کو دیکھنے کے بعد ان کے دل پر طاری ہوئے کہتے ہیں کہ یہ شہر بھی دلی کی طرح عظیم الشان ہے۔ دلکش ہے اور بہت عبرت انگیز ہے۔

غزل ۱۸۰

یہ دیر کہن کیا ہے؟ انبارِ خس و خاشاک
مشکل ہے گذر اس میں بے نالۂ آتش ناک
نخچیرِ محبّت کا قصّہ نہیں طولانی
لطفِ خلشِ پیکاں آسودگیٔ فتراک
کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملّت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک
اک شرعِ مسلمانی اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی سرِّ فلک الافلاک
اے رہروِ فرزانہ! بے جذبِ مسلمانی
نے راہِ عمل پیدا نے شاخِ یقیں نمناک
رمزیں ہیں محبّت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بے باک
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

●

پہلا شعر:۔ اقبالؔ نے دنیا کو انبارِ خس و خاشاک سے تشبیہ دی ہے کیونکہ دنیا بھی انبار مذکور کی طرح بے قیمت اور ہیچ مایہ ہے۔ فانی اور غیر محکم ہے اور جس طرح اس کے کانٹوں میں انسان اُلجھ جاتا ہے اور اس

میں سے گذرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح دنیاوی علائق میں پھنس کر انسان کو زندگی بسر کرنی دشوار ہو جاتی ہے اس لئے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کی صورت یہ ہے کہ آدمی خس و خاشاکِ دنیوی سے اپنا دامن بچائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ عشق الٰہی اختیار کرے جس طرح آگ خس و خاشاک کے انبار کو فنا کر دیتی ہے اسی طرح عشق کی آگ دنیاوی علائق کے خس و خاشاک کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے شکار کا تلازمہ باندھا ہے نخچیر سے مراد ہے عاشق۔ پیکاں سے مراد ہے سختی۔ فتراک سے مراد ہے درجۂ شہادت یا کامیابی بوساطت مرشد۔

کہتے ہیں کہ اللہ کے عاشقوں کی داستان طویل نہیں ہوتی جب مومن پر عشق الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے تو شروع میں بیشک کچھ عرصہ تک اس کو مجاہدہ اور مراقبہ کرنا پڑتا ہے یعنی فراق کی سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں لیکن بعد ازیں یا وہ درجۂ شہادت حاصل کر لیتا ہے یا اگر یہ نعمت اس کے لئے مقدر نہیں تو وہ مرشد کی توجہ سے عرفان الٰہی حاصل کر لیتا ہے یعنی آسودگی، ان دونوں صورتوں میں حاصل ہو جاتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ ہفتاد و دو ملت سے مراد ہے مسلمانوں کے بہتّر فرقے جن میں ملت اسلامیہ منقسم ہو گئی ہے اور مطلب کے کھو جانے سے وحدت ملت کا فنا ہو جانا مراد ہے اسلام کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں میں شانِ وحدت پیدا ہو جائے لیکن مسلمانوں کے بہتّر فرقوں میں منقسم ہو جانے سے اسلام کا وہ مطلب (مقصد) فنا ہو گیا۔ اب اگر مسلمان اس مطلب کو سمجھنا یعنی اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ

اپنے ادراک کو "بیرنگ" بنالیں یعنی فرقہ بندی ترک کردیں صرف اللہ کا رنگ اختیار کرلیں۔

چوتھا۔ پانچواں اور چھٹا شعر:۔ یہ تینوں شعر قطعہ بند ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دین کا کام دو چیزوں کا مجموعہ ہے ایک کا نام شریعت ہے۔ دوسری کا نام اسی شریعت کا باطنی پہلو ہے جسے طریقت کہتے ہیں۔ محض سمجھانے کے لئے یہ دو لفظ وضع کئے گئے ہیں۔ ورنہ درحقیقت دوئی نہیں ہے سالک کو پہلے ارکان اسلام کی پابندی کرنی سکھائی جاتی ہے مثلاً اس سے کہا جاتا ہے کہ نماز پڑھو۔ روزہ رکھو۔ جب وہ ان پر عامل ہو جاتا ہے تو اس کو یہ نکتہ سکھایا جاتا ہے کہ وقت مقررہ پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا یہ "شرع مسلمانی" ہے لیکن جب نماز پڑھو تو اپنی توجہ اللہ کی طرف مبذول کردو نماز میں غیر اللہ کا تصور نہ آنے پائے نیز جب تم اللہ کے بندے ہوگئے تو اب غیر اللہ سے قطع تعلقات کرلو۔ غیر اللہ کی اطاعت مت کرو۔ جب اللہ تمہارا معبود ہے تو اپنے مطلوب بھی بناؤ یعنی اس سے محبت بھی کرو۔ یہ "جذب مسلمانی" یا شریعت کا باطن ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ صرف ارکان اسلام کی پابندی کرکے یہ مت سمجھو کہ شریعت کا تقاضا پورا ہوگیا۔ پابندی ارکان اسلام یعنی شرع مسلمانی سے بالاتر بھی ایک درجہ ہے جسے جذب مسلمانی کہتے ہیں یعنی مقام عشق و محبت اور یہ وہ درجہ ہے کہ جب مسلمان اسے حاصل کرلیتا ہے تو فلک الافلاک یعنی ساری کائنات کے اسرار و حقائق اس پر کھل جاتے ہیں۔

اے مسلمان! یاد رکھ کہ جب تک تو اللہ سے محبت نہیں کرے گا اس وقت تک نہ عمل صالح ممکن ہے اور نہ دل میں یقین کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے

اللہ کی محبت کا ثمرہ یہ ہے کہ مسلمان میں گستاخی اور بے باکی کی شان

پیدا ہو جاتی ہے یعنی وہ کسی دنیاوی طاقت یا مادی حکومت یا کسی بادشاہ سے نہیں ڈرتا لیکن یاد رکھ کہ یہ شان ہر محبت سے پیدا نہیں ہو سکتی ہر شوق بے باکی کی دولت عطا نہیں کر سکتا یہ دولت صرف اللہ کی محبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ساتواں شعر:۔ اے مسلمان! دنیاوی محبت خاتی ہے اس کا جلوہ صرف اسی دنیا میں نظر آتا ہے ہر محبت موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن اللہ کی محبت باقی ہے اس کو کبھی فنا نہیں ہے خدا کا عاشق مرنے کے بعد جب دوبارہ زندہ ہو گا اس وقت بھی اس میں شانِ عشق موجود ہو گی وہ محشر میں بھی جذبۂ عشق سے فارغ نہیں ہو سکتا۔

یا اپنا گریباں چاک ؟ یا دامنِ یزداں چاک یہ دونوں ترکیبیں شاعرانہ اسلوب بیان کی مثالیں ہیں۔ ان کے لفظی معنی مراد نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عاشقِ الٰہی مرنے کے بعد جب دوبارہ زندہ ہو گا تو اس کے عشق کی شدّت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ملنے کے لئے اس وقت بھی اسی طرح بیتاب و بیقرار ہو گا جس طرح اس دنیا میں مضطرب تھا۔

غزل ۱۹

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری
کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

سنے نہ ساقیِ مہوش تو اور بھی اچھا
عیارِ گرمیٔ صحبت ہے حرفِ معذوری

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عینِ مستوری

وہ ملتفت ہوں تو کنجِ قفس بھی آزادی
نہ ہوں تو صحنِ چمن بھی مقامِ مجبوری

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اُسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

•

پہلا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اسلام کی ایک خصوصیت کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح کیا ہے یعنی ترک دنیا کے اسلامی تصور اور غیر اسلامی

تصوّر میں جو فرق ہے اس کو دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کو ترک کر کے کسی پہاڑ کی کھوہ میں زندگی بسر کرنا یہ ترک دنیا نہیں ہے۔ بلکہ بزدلی ہے۔ ہمت کی پستی ہے اور خلاف فطرت زندگی ہے۔ اسلام کے زاویۂ نگاہ سے ترک دنیا کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پہلے اس کائنات کو مسخر کرے اور اس کی قوتوں پر غالب آنے کے بعد یعنی دولت ثروت۔ عزت اور حکومت حاصل کرنے کے بعد۔ پھر ان سب چیزوں کو اللہ کے لئے ترک کر کے شانِ فقر اختیار کرے۔ جس طرح حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ترک دنیا کا نمونہ دنیا والوں کے سامنے پیش کیا کہ وہ عرب عجم۔ عراق۔ ایران۔ شام اور مصر کے فرماں روا تھے۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں پر حکمراں تھے۔ اس کے باوجود ان کے کرتے میں پیوند لگے ہوئے تھے اور چٹائی پر سوتے تھے۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہی کے ایک غلام تے جس کا نام عالمگیرؒ تھا ہندوستان کے باشندوں کو ترک دنیا کا اسلامی نمونہ دکھایا کہ پچاس سال تک سارے ہندوستان پر حکومت کی۔ لیکن خزانہ شاہی سے کوئی رقم اپنی بسر اوقات کے لئے وصول نہیں کی۔ بلکہ ٹوپیاں اور رومال سی کر اپنی روزی کا سامان مہیّا کیا۔ ان تاریخی شواہد کو مدّنظر رکھ کر اس شعر کو پڑھئے تو اس کی صداقت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

دوسرا شعر:۔ اہل حلقہ سے مراد ہے صوفیوں کی وہ جماعت جو خانقاہوں میں حلقہ باندھ کر "ذکر" کرتی ہے لیکن شان فقر سے محروم رہتی ہے بلکہ محکومی بے دولتی اور مسکینی میں زندگی بسر کرتی ہے اسی لئے اس قسم کے "فقر" سے بیزار ہیں۔

تیسرا شعر:- وہ قوم جس نے عالمگیرؒ کی اس عظیم الشان سلطنت کو جو چاٹگام سے لے کر سومنات پٹن تک اور کابل سے لے کر مدراس تک پھیلی ہوئی تھی اپنی عیاشی اور بدکاری کی بدولت صرف ۳۲ سال کی قلیل مدت میں ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔ واقعی کسی عزت کی مستحق نہیں ہے وہ قوم نہ فقر کی صلاحیت رکھتی ہے نہ سلطنت کی۔

نوٹ:- واضح ہو کہ حضرت عالمگیرؒ نے ۱۷۰۷ء میں رحلت فرمائی اور نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں دلی میں قتل عام کر کے سلطنت مغلیہ کا وقار ختم کر دیا یعنی جاٹوں۔ راجپوتوں۔ مرہٹوں اور ایرانی پارٹی جملہ "ہوا خواہان سلطنت" کو معلوم ہو گیا کہ ہم تو اپنی نادانی کی بدولت ایک "نعش" کی پرستش کر رہے تھے چنانچہ دس پندرہ سال کے اندر اندر ان سب نے مل کر اس عظیم الشان سلطنت کا خاتمہ کر دیا جب شاہ عالم ثانی ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوا تو اس کی سلطنت کے رقبہ کا اندازہ اس مختصر جملہ سے ہو سکتا ہے۔

"حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم۔ دلی سے پالم کا فاصلہ صرف دس میل ہے۔

چوتھا شعر:- اگر ساقی میری طرف متوجہ نہیں ہے تو یہ کوئی رنجیدہ ہونے کی بات نہیں ہے کیونکہ وہ جس قدر تغافل کرے گا اسی قدر اس کی طرف میرا التفات زیادہ ہوگا اور یہ شدت التفات یقیناً کامیابی کی ضامن ہے میخانہ میں جتنا زیادہ وقت صرف ہو میخوار کے لئے قطعاً تکلیف دہ نہیں ہے اسی طرح سالک صحبت شیخ میں جس قدر زیادہ وقت صرف کرے گا اس کے حق میں اتنا ہی مفید ہوگا۔ اگر شیخ متوجہ نہ ہو تو

سالک اپنی ارادت کیشی اور اس کی خدمت میں حاضر رہنے کی بدولت یقیناً شیخ کی توجہ ایک نہ ایک دن اپنی طرف مبذول کرے گا اور یہ توجہ کامیابی کی بنیاد ہے۔

پانچواں شعر:۔ یہ شعر اقبال نے تصوّف کے رنگ میں ڈوب کر لکھا ہے۔ اس لئے اس کا سمجھنا تصوّف کے اس مسلّمہ اصول کے سمجھنے پر موقوف ہے کہ لَاتَکْرَارَ فِی التَّجَلِّیْ یعنی اللہ کی تجلیات میں تکرار نہیں ہوتی جو تجلی یا جس صفت کی تجلّی ایک مرتبہ ہو جاتی ہے وہ پھر نہیں ہوتی اسی نکتہ کو کسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

ہر لحظہ بشکل دگر آں یار بر آمد
دل بُرد و دردا‌ں درو شد

جگؔر مرادآبادی نے بھی اسی مضمون کو بہت خوبی کے ساتھ باندھا ہے۔

وہ جلوہ کون ہے کہ مکرّر کہیں جسے
وہ کون سی نظر ہے جو پہلی نظر نہیں

شاعر کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہر دفعہ نیا جلوہ ہوتا ہے اس لئے ہر نظر پہلی ہی نظر ہوتی ہے خواہ ہزار بار نظر کرو۔ ہر دفعہ نیا جلوہ نظر آئے گا۔ اس لئے ہر نظر ہر جلوہ کو پہلی ہی مرتبہ دیکھے گی۔ کسی جلوہ کو دوبارہ دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اقبال نے بھی اسی حقیقت کو واضح کیا ہے ان کا اسلوب بیان بہت دلکش ہے۔ کہتے ہیں کہ حکیم۔ عارف اور صوفی سب مست ظہور ہیں۔ یعنی مشاہدۂ تجلیات کی بنا پر عالم مستی میں ہیں اور اس عالم مستی کی وجہ سے وہ اس حقیقت سے غافل ہو گئے ہیں کہ جسے وہ تجلّی سمجھ رہے ہیں وہ تو عین

مستوری ہے۔

اقبال نے پہلے مصرع میں تین گروہوں یا جماعتوں کا ذکر کیا ہے جن میں مقصد کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف طریق کار میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔

حکیم سے مراد ہے فلسفۂ اشراق کا پیرو - Neo-Placomist

عارف سے مراد ہے فلسفۂ معرفت کا متبع - Gnostic -

صوفی سے مراد ہے فلسفۂ تصوف کا مقلد - Panheist -

یہ تینوں گروہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ

(ا) خدا رسی کا ذریعہ عقل نہیں بلکہ عشق ہے۔

(ب) مقصودِ حیات یہ ہے کہ قطرہ سمندر میں مل جائے۔

اقبال چونکہ شاعر ہونے کے علاوہ فلسفی بھی ہیں۔ اور اس کے تمام مدارس فکر سے آگاہ ہیں۔ اس لئے انہوں نے پہلے مصرع میں تصوّف کے تینوں مدارس کو بڑی خوبی کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔

اس شعر کے دو مطلب ہیں (ایک آسان ہے دوسرا مشکل ہے)

پہلا مطلب یہ ہے کہ حکیم۔ عارف اور صوفی سب مشاہدۂ تجلیات سے ازخود رفتہ ہو گئے۔ اس لئے ان کو اس حقیقت کا احساس نہیں ہو سکتا کہ ہمارے حق میں تجلّی انجام کار مستوری ہو گئی یعنی پہلے ہی ساغر میں مدہوش ہو گئے۔ دوسرے ساغر کی نوبت ہی نہ آسکی جب انہوں نے صفات کی تجلّی میں ہوش وحواس گم ہو گئے باقی ماندہ تجلیات نگاہ سے مستور ہو گئیں یعنی تجلّی باعث مستوری ہو گئی۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ حکیم۔ عارف اور صوفی یہ سب یہ سمجھتے ہیں کہ

وہ ہر تجلّی کے ساتھ ظاہر ہو رہا ہے اور اس لئے تجلیات صفات کا بار بار مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ معرفت صفات میں ہر لحظ اضافہ ہوتا رہے غرضکہ یہ سب مست مے ظہور ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

یہ لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر تجلی اس کو ظاہر کرتی جاتی ہے حالانکہ ہر تجلی اس کو مستور کرتی جاتی ہے۔ کیونکہ لا تکرار فی التجلی۔ پہلی تجلی جس سے اس کا کسی خاص رنگ میں ظہور ہوا تھا۔ اب دوبارہ نہیں ہو سکتی دوبارہ جو تجلی ہوگی وہ پہلی سے بالکل مختلف ہوگی یعنی معشوق کی صفات کا جو ظہور پہلے ہوا تھا جب انہی صفات کا دوبارہ ظہور ہوا تو سابقہ ظہور تو نگاہوں سے مستور ہو گیا۔ نیا ظہور نگاہوں کے سامنے آگیا۔ بالفاظ دگر ہر تجلّی سابقہ تجلیات کے حق میں مستوری بن گئی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صوفی تجلّیات کے مشاہدہ سے یہ سمجھتا ہے کہ معشوق کو بے پردہ دیکھ رہا ہوں اس طرح وہ رفتہ رفتہ مست مئے ظہور ہو جاتا ہے حالانکہ ہر تجلّی بظاہر تجلی ہے لیکن بباطن مستوری ہے کیونکہ لا تکرار فی التجلی دوسری تجلّی پہلی تجلی سے مختلف ہوتی ہے اور تیسری تجلی دوسری تجلی سے جداگانہ یعنی محبوب تو اپنی ہی تجلیات کے پردوں میں پوشیدہ اور مستور ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن ہم اپنی حالت مستی میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم پر ظاہر ہو رہا ہے ۔۔۔ ؏

کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری

چھٹا شعر:۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ ہم سے راضی ہو تو تکلیف میں بھی راحت محسوس ہوتی ہے لیکن اگر وہ راضی نہ ہو تو پھر ایک مسلمان کے زاویۂ نگاہ سے بادشاہت بھی ہیچ ہے یعنی مومن کا مقصود حیات یہ ہے کہ

محبوبِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) اس کی طرف ملتفت ہو۔ زندگی اگر اس حالی میں بسر ہو رہی ہے کہ وہ خوش ہے تو بوریے پر ہفت اقلیم کی بادشاہت قربان ہے لیکن اگر زندگی اس کی مرضی کے خلاف بسر ہو رہی ہے تو ساری دنیا بھی اس کے زیرِ نگیں ہو تو بیکار ہے۔

ساتواں شعر:۔ اے مسلمان! میں جب تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ فرنگی تہذیب تیرے حق میں مضر ہے تو تو مجھ سے ناراض ہو جاتا ہے لیکن یہ کوئی بُرا ماننے کی بات نہیں ہے اگر تجھے میرے قول کی صداقت میں شک ہے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔ فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری یعنی یورپین تہذیب کی بدولت تو سائنس اور حکمت میں بہت ترقی کرے گا لیکن تیری روح مردہ ہو جائے گی۔ اس تہذیب کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ذوق یقین سے بیگانہ ہو جاتا ہے پس وہ عقل اور وہ حکمت کس کام کی جو تجھے اسلام سے برگشتہ کر دے۔

غزل ۲۰

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنّت ہے جس میں حُور نہیں

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں
ایک بھی صاحبِ سُرور نہیں

اک جنوں ہے کہ باشعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ باشعور نہیں

ناصبوری ہے زندگی دل کی
آہ! وہ دل کہ ناصبور نہیں

بے حضوری ہے تیری موت کا راز
زندہ ہو تو تو بے حضور نہیں

ہر گہُر نے صدف کو توڑ دیا
تو ہی آمادۂ ظہور نہیں

اَرِنِیْ میں بھی کہہ رہا ہوں مگر
یہ حدیثِ کلیمؑ و طور نہیں

پہلا شعر:- یہ وہی مضمون ہے جس کو اقبالؔ نے ہر تصنیف میں بیان کیا ہے کہ عشق اللہ کی ہستی پر دلائل قائم کرکے ہمارے دل میں ظنؔ غالب پیدا کر دیتی ہے کہ اس کائنات میں کوئی خالق یا صانع ضرور ہے۔ لیکن وہ اس کی ہستی کا یقین پیدا نہیں کر سکتی شعر کا مطلب یہ ہے کہ عقل آستان محبوب تک تو پہونچ جاتی ہے لیکن اس کے دیدار سے مشرف نہیں ہو سکتی۔

دوسرا شعر:- چونکہ آنکھ صرف ظاہر کو دیکھ سکتی ہے اس لئے اقبالؔ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ دل بینا بھی خدا سے طلب کرو۔ تاکہ حقائق کا ادراک ہو سکے۔ واضح ہو کہ اقبال کی رائے میں حقیقت اشیاء کے دیکھنے کا آلہ حواس خمسہ یا آنکھ نہیں ہے بلکہ دل ہے۔

تیسرا شعر:- علم سے بھی انسان کو سرور حاصل ہوتا ہے لیکن یہ سرور محض عقل کے دائرہ میں محدود ہوتا ہے جسے ذہنی مُسَرّت کہتے ہیں اس سے انسان میں مستی کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن جو سرور عشق سے پیدا ہوتا ہے وہ پوری شخصیت کو محیط ہوتا ہے اور اس کی بدولت رگ و پے میں مستی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے یعنی عشق کا سرور جذبات اور احساسات کی دنیا میں بھی ہنگامہ برپا کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عالم سر بکف ہو کہ میدان جہاد میں نہیں جا سکتا۔ یہ کام صرف عاشق کر سکتا ہے۔

نوٹ:- لیکن افسوس کہ مسلمانوں میں آج کل علم کا سرور بھی نظر نہیں آتا۔

ل میں نے اس جگہ ظن کو اس کے اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے یعنی "نسبت خبریہ کا غیر جازم اور غیر راسخ اذعان" اگر اس اذعان میں جزم اور رسوخ پیدا ہو جائے تو اسی کو یقین کہتے ہیں۔

پانچواں شعر:۔ جنون کی دو قسمیں ہیں عشق حقیقی کی بنا پر انسان میں جو کیفیت جنون پیدا ہوتی ہے۔ اس میں شعور اور آگاہی کا رنگ شامل ہوتا ہے لیکن عورت کے عشق میں انسان عقل و شعور سب سے بیگانہ ہو جاتا ہے یہ وصف اللہ کے عشق میں ہے کہ انسان کو فرزانہ بنا دیتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ دل کی زندگی یہ ہے کہ وہ عشق حقیقی میں بیتاب رہے جس دل میں محبوب حقیقی سے ملنے کی تڑپ (ناصبوری) نہیں محض گوشت کا لوتھڑا ہے۔

ساتواں شعر:۔ اے مسلمان! اگر تیرا دل مردہ ہے تو سمجھ لے کہ اس کا باعث یہ ہے کہ تو عاشق نہیں ہے اگر تو اللہ سے محبت کا شیوہ اختیار کرے تو تجھے حضوری حاصل ہو جائے گی۔ اور اس حضوری سے تیرا دل زندہ ہو جائے گا۔

آٹھواں شعر:۔ اے مسلمان! فطرت کے نظام کو دیکھ یہاں ہر مرتبہ کمال کو پہونچ کر اپنے آپ کو ظاہر کر دیتی ہے مثلاً کسی بیج یا دانہ کو زمین میں پوشیدہ کر دیا جائے تو وہ کچھ عرصہ کے بعد اپنی ترقی یافتہ شکل میں ضرور ظاہر ہو جائے گا۔ لیکن افسوس کہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لانا نہیں چاہتا یعنی اپنے کمالات کو ظاہر کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کرتا۔

واضح ہو کہ جب تک خودی مرتبۂ کمال کو نہ پہونچ جائے۔ انسان اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ کمال کو پہونچ کر ظہور کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

نواں شعر:۔ "اَرِنِی" لغوی معنی ہیں۔ مجھے دکھا۔ حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اے رب مجھے اپنے آپ کو دکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "لَنْ تَرَانِیْ" تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ چونکہ اس کے جواب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اشتیاق میں کمی نہ ہوسکی اس لئے ازراہِ لطف وکرم بلکہ بندہ نوازی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا ہم اپنی صفت کی تجلی۔ کوہ طور پر فرماتے ہیں اگر تم صفت کی تجلی کی تاب لاسکے تو ذات کا جلوہ بھی دیکھ سکوگے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر اپنی تجلّی فرمائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوکر گر پڑے جب ہوش میں آئے تو وہ سمجھے کہ جب انسان اس کی تجلّی کی تاب نہیں لاسکتا تو ذات کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟

اقبالؔ کہتے ہیں کہ طالب دیدار تو میں بھی ہوں لیکن میں ایسی تجلّی کا خواہاں نہیں ہوں جو مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح بے ہوش کردے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ میری خودی کو اس درجہ مستحکم فرمادے کہ میں اس کی تجلیات کی تاب لاسکوں۔

واضح ہو کہ اس غزل کے آخری دو شعروں میں اقبالؔ نے اپنا مخصوص فلسفۂ زندگی بیان کیا ہے جسے انھوں نے ہر کتاب میں ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔

پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مقصودِ حیات ہے اور چونکہ مومن حیات کا اعلیٰ مظہر ہے۔ اس لئے اس کا مقصد حیات یہی ظہور ہے۔

چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں۔

پسند روح و بدن کی ہے وانمود اس کو
کہ ہے نہایتِ مومن خودی کی عریانی

اقبالؔ کی نظر میں جو شخص مومن بن کر اپنی خودی کو ظاہر کرنے کا آرزومند نہیں ہے وہ یقیناً اپنے مقام سے آگاہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ کا مصداق ہے۔

انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ

- سب سے پہلے اسلام لائے!
- اس کے بعد ایمان کا مرتبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔
- اس میں کامیابی کے بعد اپنی خودی کو دنیا پر ظاہر کرے۔
- یعنی خلافت الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہوکر اللہ کے نام کو بلند کرے۔

جو انسان اپنی خودی کو ظاہر نہیں کر سکتا اس میں اور دیگر حیوانات مثلاً فرس اور حمار میں کوئی فرق نہیں ہے۔

دوسرے شعر کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خودی کو اس قدر مستحکم کر لو کہ وہ تجلیات کی تاب لا سکے۔ اقبالؔ کے نزدیک کمال زندگی فنا یا وصل نہیں ہے جس کی تعلیم شنکر آچاریہ نے دی ہے بلکہ بقاء (ملاقات یا دیدار ذات) ہے۔ قرآن مجید جیسا کہ میں واضح کر چکا ہوں۔ فنا کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ بقاء کا علمبردار ہے چنانچہ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ۔ الخ اس پر شاہد ہے یعنی جو شخص اپنے رب سے ملاقات یا اس کے دیدار کا آرزومند ہو، اُسے لازم ہے کہ اعمال صالح بجا لائے اور شرک سے اجتناب کرے۔

ویدانت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنی انفرادی خودی کو حُسن مطلق میں فنا کر دے یعنی قطرہ سمندر میں مل کر خود سمندر ہو جائے۔ یہ تصور بڑا دلچسپ اور دلپذیر ہے لیکن اقبالؔ کو پسند نہیں، محض اس لئے کہ اسلام اس کا حامی نہیں ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

بہ بحرش گم شدن انجام اینست
اگر اورا تو درگیری فنا نیست

اقبال نے ان حقائق کو تفصیل کے ساتھ زبور عجم کے فلسفیانہ حصہ میں لکھا ہے جسے انہوں نے گلشن راز جدید سے تعبیر کیا ہے میں اس کان جواہر سے صرف دو شعر اس جگہ اپنے دعوے کے ثبوت میں نقل کئے دیتا ہوں لیکن ان کی شرح سے قصداً پہلو تہی کرتا ہوں کیونکہ اگر اللہ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے زبور عجم کی شرح لکھنے کی توفیق عطا فرمائی تو پھر اپنے فہم ناقص کے مطابق اس وقت کچھ عرض کر سکوں گا۔

اقبال لکھتے ہیں۔

کمال زندگی دیدار ذات است
طریقش رستن از بند جہات است
چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی
ترا او بیند اورا تو بینی

یعنی زندگی کا کمال یہ ہے کہ انسان ذات مطلق کو دیکھ سکے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تو اپنے آپ کو زمان ومکان کی قید سے آزاد کرے پھر تجھ میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ وہ تجھے دیکھے گا اور تو اسے دیکھے گا۔
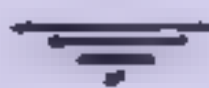
غزل ۲۱

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اُسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں
طلسمِ گنبدِ گردوں کو توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے سنگِ خارہ نہیں
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر اُبھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں
ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں
یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں
مرے جنوں نے زمانے کو خوب پہچانا
وہ پیرہن مجھے بخشا کہ پارہ پارہ نہیں
غضب ہے عینِ کرم میں بخیل ہے فطرت
کہ لعلِ ناب میں آتش تو ہے شرارہ نہیں

●

پہلا شعر: خودی ایک بحرِ ناپیدا کنارہ ہے یعنی خودی کے اند[ر]
لاانتہا قوتیں مخفی ہیں اگر کوئی شخص اپنی خودی کی مخفی طاقتوں کو محدود سمجھتا
ہے تو اس نادانی کا کوئی علاج نہیں ہے۔

دوسرا شعر: اگر ہم اپنی خودی کی تربیت کرلیں اور اس کی مخفی طاقتوں کو عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بدولت مرتبہ کمال تک پہونچادیں تو ہم زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو سکتے ہیں۔

"طلسم گنبد گردوں۔ کنایہ ہے قید زمان و مکان سے۔

"زجاج بمعنی شیشہ: کنایہ ہے ضعف یا شکست کی قابلیت سے۔

تیسرا شعر: ڈوبنا۔ بمعنی گیان دھیان۔ مراقبہ مجاہدہ۔ اُبھرنا۔ بمعنی معرفت نفس حاصل کرنا خودی کو مستحکم کرنا۔

خودی میں ڈوب کر ابھر بھی آتے ہیں لیکن اس کے لئے ہمت اور حوصلہ (روحانی طاقت) درکار ہے۔ بزدل غوّاص سیپی نکال کر نہیں لا سکتا اسی طرح جس کی خودی ضعیف ہو وہ نہ غوطہ لگا سکتا ہے نہ اُبھر سکتا ہے۔

چوتھا شعر: اے مسلمان! تو ناحق نجومیوں سے پوچھتا پھرتا ہے کہ میرا نصیبہ کیسا ہے؟ اور آج کل میں کس ستارہ کے زیر اثر ہوں؟ ارے نادان! جمادات اور نباتات ستاروں کے تابع ہوں تو ہوں تو ان کے تابع نہیں ہو سکتا اگر تو اپنی خودی کو مستحکم کرے تو یہ کائنات خود تیری مطیع ہوجائیگی اسی خیال کو اقبال نے یوں باندھا ہے۔

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

پانچواں شعر: چونکہ تو نے اپنی خودی کی ترتیب نہیں کی ہے اس لئے تیری نگاہ میں حقیقت بینی کی طاقت پیدا نہیں ہوئی اگر تیری نگاہ میں یہ طاقت پیدا ہوجائے تو پھر تجھے معلوم ہوگا کہ بہشت حور اور عالم ملکوت یہ تینوں نعمتیں اسی دنیا میں بھی موجود ہیں یعنی اگر تو عشق رسولؐ میں فنا ہوجائے تو جیتے جی

تجھے بہشتی زندگی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ کہتے ہیں کہ میرے جنوں نے موجودہ زمانہ کے لوگوں کی ذہنیت کو بخوبی پہچان لیا ہے۔ اسی لئے اس نے مجھے صحیح اور سالم پیرہن عطا کیا ہے مطلب یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں عاشق کی شناخت یہ تھی کہ اس کا پیرہن پارہ پارہ ہو اور یہ چیز اس کے لئے باعثِ افتخار تھی جب لوگ کسی عاشق کو دیکھتے تھے کہ اس کا گریباں چاک ہے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں بال بڑھے ہوئے ہیں سر پر خاک پڑی ہوئی تو اس کا بہت احترام کرتے تھے لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا خدا رسیدہ، یا عالم دین یا فلسفی ہو۔ اگر وہ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر کسی یونیورسٹی ہال یا کسی پبلک جلسہ میں اقبالؔ کے فلسفہ پر تقریر کرنے کی اجازت طلب کرے تو منتظمین جلسہ اسے اجازت دینے کے بجائے شاید جلسہ گاہ ہی سے باہر نکال دیں۔

اندریں حالات اقبالؔ کہتے ہیں کہ حضرت عشق نے مجھ پر خاص فضل و کرم کیا کہ مجھے یورپ کی ڈگریاں عطا کر دیں ورنہ اس زمانہ کے لوگ جو صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ سے مرعوب ہوتے ہیں شاید میری بات بھی نہ سنتے۔

ساتواں شعر:۔ یہ شعر شاعرانہ اسلوب بیان کی ایک عمدہ مثال ہے اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ فطرت اپنی قوتوں کو بلاوجہ صرف نہیں کرتی ہر شئے کو وہی خوبی عطا کرتی ہے جو اس کے مناسب حال ہوتی ہے مثلاً فطرت لعل تاب کو آتش (سرخی) تو عطا کرتی ہے لیکن شرر عطا نہیں کرتی چونکہ خالص لعل کی خوبی سرخ رنگ پر منحصر ہے۔ لہٰذا اسے سرخی تو عطا کر دیتی ہے کہ وہ دیکھنے میں انگارا معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے چنگاریاں نہیں نکلتیں کیونکہ اسے ان کی ضرورت نہیں ہے۔

غزل ۲۲

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقامِ پادشاہی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

نہ دیا نشانِ منزل مجھے اے حکیم تو نے
مجھے کیا گلہ ہو تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

مرے حلقۂ سخن میں ابھی زیرِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

تو ہُما کا ہے شکاری ابھی ابتدا ہے تیری
نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مرغ و ماہی

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لَآ اِلٰـہَ اِلَّا
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

•

پہلا شعر: ایک مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ جو شخص اپنی خودی سے آگاہ ہو جاتا ہے اسے خواہ تخت و تاج میسر ہو یا نہ ہو لیکن وہ بادشاہوں کی طرح انسانوں پر حکومت کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا والوں کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ اور اقبال کی رائے میں یہ شان بے نیازی

حقیقی بادشاہی ہے۔ اور دنیاوی بادشاہی سے برتر ہے۔

دوسرا شعر:۔ انسان کو حقیقی زندگی اور عزت و آبرو معرفت خودی ہی سے حاصل نہیں ہوتی ہے اور جو شخص معرفتِ ذاتِ خویش[1] سے محروم ہے وہ دنیا میں کسی کی عزت و آبرو حاصل نہیں کر سکتا۔

تیسرا شعر:۔ فلسفی کسی شخص کو خدا سے ملنے کا طریقہ نہیں بتا سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ رہ نشیں ہے نہ راہی ہے بلکہ محض ظنیات اور قیاسات میں گرفتار ہے اور جو خود گمراہ ہو وہ دوسروں کی رہبری کیسے کر سکتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ میری قوم دنیا میں بادشاہت کر چکی ہے اس لئے وہ رسم بادشاہی سے آگاہ ہے میں نے اسے دنیا میں دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کا طریقہ بتا دیا ہے۔ اور وہ میرے کلام کا مطالعہ کر رہی ہے جس دن اس نے میرے پیغام پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ انشاء اللہ پھر سربلند ہو جائے گی۔

پانچواں شعر:۔ طریق خانقاہی یا مزاجِ خانقاہی اقبالؒ کی اصطلاح ہے اور اس سے ان کی مراد ہے بے عملی کی زندگی جو اسلام کی روح سے خلاف ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! میں تجھے مجبور تو نہیں کر سکتا کہ تو میری تعلیم پر ضرور عمل کرے تیری مرضی ہے عمل کر یا نہ کر لیکن میں تجھ سے صاف لفظوں میں یہ بات کہنی چاہتا ہوں کہ تیرا یہ طریق خانقاہی یعنی تیری یہ بے عملی کی زندگی مجھے تو بالکل پسند نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام تو سراسر جہاد کی تعلیم دیتا ہے بے عملی تو اسلام کی ضد ہے اس پر بھی اگر تو اس طریقہ کو اختیار کرنے پر مصر ہے تو تیری مرضی۔

چھٹا شعر:۔ اے مسلمان! تیرا لقب العین بہت بلند ہے یعنی دنیا

---

[1] خویش سے مراد ہے خدا سے ملنے کا آرزومند۔ راہی سے مراد ہے سالک راہ معرفت۔ ہُما سے مراد ہے مقام نیابت الٰہیہ۔

میں نیابت الٰہیہ کے مقام پر فائز ہونا۔ لیکن اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو کائنات کی قوتوں کو مسخر کر اس کے بعد تو ثریا کا شکار کر سکے گا یہ دنیا اور اس میں جو کچھ ہے سب کو اللہ نے مصلحت سے پیدا کیا ہے کہ تو اسے اپنی خودی کی تکمیل کے لئے استعمال کر سکے۔

ساتواں شعر۔ مسلمان خواہ عرب کا رہنے والا ہو یا عجم کا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا جب تک اس کا دل اس حقیقت پر گواہی نہ دے کہ واقعی اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کوئی طاقت مجھ پر حکمراں نہیں ہے اسی نکتہ کو اقبال نے جاوید نامہ میں نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

لا الٰہ گوئی! بگو از روئے جاں   تا ز اندام تو آید بوئے جاں
ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست   لا الٰہ جز تیغ بے زنہار نیست

یعنی اے مسلمان! اگر تو لا الٰہ الّا اللّٰہ کہنا چاہتا ہے تو زبان سے مت کہہ بلکہ دل سے کہہ۔ تاکہ تیرے اعمال سے توحید کا رنگ ظاہر ہو سکے۔ کیونکہ یہ کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ گفتار نہیں ہے بلکہ ایسی تلوار ہے جو باطل کو فنا کرنے میں مطلق رعایت نہیں کرتی۔

اقبال کو مسلمانوں سے سارا شکوہ یہ ہے کہ وہ لا الٰہ الا اللّٰہ زبان سے تو کہتے ہیں لیکن اس کے اقتضا پر عمل نہیں کرتے وہ عرصۂ دراز سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ لا الٰہ الا اللّٰہ صرف زبان سے ادا کر دینا کافی ہے حالانکہ کامیابی کے لئے اس کے مفہوم پر عمل کرنا بھی ضروری ہے یعنی اگر ہم سچے دل سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں اور کوئی اِلٰہ (معبود) نہیں ہے تو پھر ہم اس کے سوا اور کسی کی اطاعت نہیں کر سکتے لیکن ہمارا طرز عمل ہمارے قول کی تکذیب کرتا ہے یعنی ہم نہایت خوشی کے ساتھ "غیر اللہ" کی اطاعت کرتے

ہیں اقبال کہتے ہیں کہ لا الٰہ گفتار نہیں ہے بلکہ تلوار ہے یعنی موحد غیر اللہ کی
اطاعت نہیں کر سکتا بلکہ اگر وہ اسے اپنی اطاعت پر مجبور کرے تو اس کے خلاف جہاد کرتا ہے

غزل ۲۳

تری نگاہ فرومایہ، ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ تخیل بلند کا ہے گناہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

حدیثِ دل کسی درویشِ بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

پہلا شعر:۔ میں اس کتاب کے مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ بال جبرئیل میں اقبالؔ نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ رمزو ایمااور کنایہ سے کام لیا ہے اکثر اشعار سراسر کنایات سے معمور ہیں مثلاً یہ شعر کہ اس میں کسی لفظ کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ ہر لفظ مجازی معنی میں مستعمل ہے: نگاہ فرمایہ۔ ہاتھ۔ کوتاہ۔ گناہ اور تخیل بلند۔ یہ سب کنایات ہیں میں نے بخوف طوالت ہر شعر کی تشریح میں ان رموز اور کنایات کی وضاحت احتراز کیا ہے لیکن یہ شعر چونکہ سراسر کنایات سے معمور ہے اس لئے ناظرین کی توجہ اس پہلو کی طرف مبذول کرنے کے لئے اس جگہ اس بات کی صراحت کر دی ہے۔

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو پست حوصلہ اور کم ہمت ہے اس لئے تو جدوجہد سے نفور ہے یعنی تو تن آسانی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

پس اگر تو اپنے مقصد بلند میں کامیاب نہیں ہو سکتا تو اس میں مقصد کا قصور نہیں بلکہ تیرا ہی قصور ہے۔ نیابت الٰہیہ بہت بلند نصب العین ہے اور اس کے حصول کے لئے اسی کے مطابق زبردست جدوجہد بھی شرط ہے لیکن تیری حالت قابل افسوس ہے کہ تیرا مقصد حیات تو اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس سے بلند تر کوئی مقصد متحقق نہیں ہو سکتا مگر تو اس کے حصول کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کرتا محض اپنی تقدیر پر صابر و شاکر بیٹھا ہے۔

دوسرا شعر:۔ چونکہ موجودہ نظام اور نصاب تعلیم انگریزوں کا وضع کردہ ہے اس لئے کالجوں کی تعلیم مسلمانوں لڑکیوں اور لڑکوں کو دین اسلام سے بیگانہ بنا دیتی ہے بلکہ اسلامی روح کو فنا کر دیتی ہے۔

اکبر الہ آبادی نے بھی اس تلخ حقیقت کو بایں الفاظ واضح کیا ہے۔

گذراں کا ہوا کیب عالمِ اللہ اکبر میں
ملے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

تیسرا شعر:۔ خدائی کے دو معنی ہیں (۱) ساری دنیا یا کائنات (۲) اقتدار یا حکومت کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تیری خودی میں غیر معمولی صلاحیتیں مخفی ہیں اگر تو اتباعِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بدولت ان کی صحیح طریق پر تربیت کرے تو تجھے کائنات پر اقتدار حاصل ہو جائے گا یا ساری دنیا تیرے قبضہ میں آجائے گی۔

چوتھا شعر:۔ حدیث دل۔ یعنی رموزِ عاشقی یہ کسی کتاب سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ان کو کسی درویش بے نوا سے پوچھنا چاہئے یعنی اے مسلمان! اگر تو اپنے مقام سے آگاہ ہونا چاہتا ہے (اور مسلمان کا حقیقی مقام عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اختیار کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے) تو کسی شیخ کامل کی صحبت اختیار کر درویش بے گلیم سے مراد ہے وہ عاشقِ رسولؐ جو علائق دنیوی سے بالکل پاک ہو۔

(ا) مقصدِ حیات۔ اللہ کی محبت ہے۔
اس کی صورت۔ اتباعِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے
اتباع:۔ محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بغیر ناممکن ہے۔
اس لئے مقصدِ حیاتِ مسلم:۔ عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

(ب) عاشقی ایک فن ہے۔
فن۔ فنکار کی صحبت اختیار کرنے کے بغیر نہیں آسکتا۔
اس لئے ہر اس شخص کے لئے جو عشقِ رسولؐ میں فنا ہو جانا چاہتا ہے۔
اس شخص کی شاگردی لازمی ہے جو فنا ہو چکا ہے۔

اقبالؔ کا سارا فلسفہ ان دو باتوں میں مضمر ہے۔

پانچواں شعر: اگر تم دنیا میں سرداری اور سروری کے آرزومند ہو تو عزم بلند پیدا کرو کیونکہ اس دنیا کا دستور یہ ہے کہ صرف شاہین صفت افراد کو سرداری اور عزت حاصل ہو سکتی ہے۔

چھٹا شعر: اے مسلمان! یا مسلمان قوم! تیرے زوال نعمت وجاہ کا سبب یہ ہے کہ تو نے اپنی خودی کو مردہ کر دیا تیرا یہ خیال کہ تیری تقدیر میں ذلت اور محکومی لکھی ہوئی تھی بالکل غلط ہے جب تو نے اللہ کے قوانین کی نافرمانی شروع کر دی تو لامحالہ اس کا نتیجہ ذلت کی شکل میں ظاہر ہو گیا کیونکہ اللہ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ جو قوم اسے بھلا دیتی ہے وہ بھی اس قوم کو بھلا دیتا ہے۔

ساتواں شعر: کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی خانقاہیں اور تعلیم گاہیں دونوں ناقص ہیں۔ مدرسوں کی تعلیم سے نہ مسلمانوں میں زندگی پیدا ہو سکتی ہے نہ محبت۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلامی مدارس میں زندگی نظر نہیں آتی یعنی وہاں طلبہ کو فقہی مسائل میں تو ماہرِ فن بنا دیا جاتا ہے لیکن جہاد کا ولولہ پیدا نہیں کیا جاتا۔ اب رہی خانقاہیں تو وہاں نہ معرفت پائی جاتی ہے نہ نگاہ یعنی خانقاہوں میں سجادہ رہ گئے یا گورکن، تو نگاہ کیسے پیدا ہو اور کون پیدا کرے اور جب سجادہ نشینوں میں اکثریت خان بہادروں کی ہو تو ان کے پاس نگاہ کا کام بھی کیا ہے؟ نگاہ تو خدا پرستوں کے پاس ہوتی ہے۔

❖

غزل ۲۴

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیاتِ سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں
عروسِ لالہ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں
جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ
وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں
بڑا کریم ہے اقبالؔ بے نوا لیکن
عطائے شعلہ شرر کے سوا کچھ اور نہیں

■

پہلا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے فلسفہ کی بے مائیگی اور صحبتِ شیخ کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ عقل کے پاس خبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے یعنی اس کا سرمایہ تمام تر وہ اطلاعات ہیں جو اسے حواس خمسہ سے حاصل

ہوتی ہیں اس لئے عقل بھی اس دولت سے محروم ہے۔

انسان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ رہا ہے کہ خدا ہے یا نہیں؟ عقل کا دارومدار حواس پر ہے (عقل براہِ راست علم حاصل نہیں کر سکتی) اور خدا حواس کی دسترس سے بالاتر ہے اس لئے عقل بیچاری نہ انکار کر سکتی ہے نہ اقرار۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو فلسفہ کی تاریخ میں منکرین تو بہت کم نظر آتے ہیں لیکن "لا ادری" زیادہ ملتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار کرتے ہیں۔

اس انکار یا تشکیک کا علاج کسی حکیم یا فلسفی کے پاس نہیں ہے یہ نعمت تو کسی صاحب نظر سے حاصل ہو سکتی ہے یعنی یقین صرف شیخ سے پیدا ہو سکتا ہے چراغ تو چراغ ہی سے جل سکتا ہے جس نے دیکھا ہو وہی یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ہاں واقعی خدا موجود ہے آؤ تمہیں بھی دکھا دوں۔

نظر کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مرشد کی نظر میں طاقت ہے کہ یقین پیدا ہو سکتا ہے یعنی وہ ایک نظر سے انسان کے اندر تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔

بہر حال عقل کا منتہائے پرواز اس سے زیادہ نہیں کہ نظام عالم اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا کوئی خالق یا کم از کم صانع ضرور ہونا چاہئے بس یہاں عقل کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اب عشق آتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں اس کائنات کا ایک خالق ہے اگر تمہیں شک ہو تو میری اتباع کرو تم اس کو بچشم خود دیکھ لوگے عقل کی رسائی حریم ناز کے دروازہ تک ہے لیکن عشق پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو جاتا ہے یعنی اسے حضوری حاصل ہو سکتی ہے یہ بات عقل کو کبھی ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ حضوری عقل کے حیطۂ اقتدار

سے باہر ہے۔

میری رائے میں یہ شعر اقبالؔ کے ہر مداح یا عقیدت مند کو روزمرہ پڑھنا چاہیئے تاکہ ان میں کوئی تبدیلی پیدا ہو سکے اقبالؔ کی رائے میں مسلمان قوم ضعفِ یقین کے مرض میں مبتلا ہے اور اس کا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

نظر کیا چیز ہے؟ اور کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ ان دونوں سوالوں کا جواب اقبال نے بہت وضاحت کے ساتھ دے دیا ہے اور اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم بندگانِ دین اور عاشقانِ رسولؐ کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے مرض کا ازالہ کریں۔

مجھے سب سے زیادہ افسوس اسی بات کا ہے کہ قوم اسی معالجہ کی طرف سب سے کم متوجہ ہے تقریریں تو سب کرتے ہیں عشقِ رسولؐ کوئی بھی اختیار نہیں کرتا۔

دوسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اسلام کے زاویۂ نگاہ سے زندگی مسلسل روحانی ترقی کا نام ہے مسلمان کسی منزل پر پہنچ کر بھی آسودہ نہیں ہو سکتا۔ اقبالؔ کا فلسفہ یہ ہے کہ مقام یا منزل سکون کا دوسرا نام ہے اور اسلام کی روح سکونی (Static) سے نہیں ہے بلکہ ڈرامہ (Dynamic) ہے اس لئے مسلمان کی زندگی میں منزل یا سکون کہیں نہیں ہے۔

تیسرا شعر:۔ مسلمان کی قدر و قیمت کا دار و مدار خودی کی حفاظت پر ہے جو شخص اپنی خودی کی حفاظت واسطے کام نہیں کرتا کائنات کے بازار میں اس کی کوئی عزت یا قدر و منزلت نہیں ہے۔ دیکھ لو۔ جوہر دنیا کی نگاہ میں وہی موتی قیمت پاتا ہے جس میں آب و تاب ہوتی ہے اگر آب نہ ہو

تو موتی کی کوئی قیمت نہیں ہے اسی طرح اگر کسی انسان کا گوہر خودی بے آب و تاب ہو تو اس انسان کی دنیا میں کوئی عزت (قیمت) نہیں ہے۔

چوتھا شعر:۔ زندگی۔ گردش خون کا نام نہیں ہے کیونکہ یہ گردش خون تو فرس اور حمار میں بھی پائی جاتی ہے بلکہ حیات انسانی کا دارومدار سوز جگر یعنی عشق پر ہے اسی لئے وہ یہ کہتے ہیں کہ۔ ع

حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں

نیز چونکہ عشق انسان کے اندر "ذوق سفر" کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اس لئے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ "حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں" پس ثابت ہوا کہ ان دونوں مصرعوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

پانچواں شعر:۔ پہلے مصرع میں گل لالہ کو عروس باندھا ہے اس لئے حجاب کا لفظ بہت مناسب ہے، نسیم سحر، گلوں کو شگفتگی عطا کرتی ہے اس لئے وہ ہر پھول کی، محرم راز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح گل لالہ اگر نسیم سحر سے اجتناب کرے تو اس کا یہ فعل خود اس کے لئے مضر ہے کیونکہ جس طرح نسیم سحر پھولوں کو آراستہ کرتی ہے اسی طرح شاعر معانی کو پیراستہ کرتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے تجارت کا تلازمہ باندھا ہے۔ کساد۔ تاجر اور متاع میں صنعت مراعاۃ النظیر پائی جاتی ہے۔ کساد کا مطلب ہے تجارت کا مندا ہو جانا۔

مطلب اس بے نظیر شعر کا یہ ہے کہ انگریز چونکہ اسلامی اقتدار کے دشمن ہیں اس لئے جس چیز کو وہ کم مایہ اور کم قیمت سمجھتے ہیں دراصل وہی شئے لائق تحسین و آفریں ہے اور جو شئے درحقیقت، متاع ہنر ہے ان کی نظروں میں

وہ کسی قیمت کی مستحق نہیں ہے۔

نوٹ:۔ یوں تو اس دلخراش حقیقت کی تصدیق ہماری زندگی کے ہر شعبہ سے ہو سکتی ہے لیکن ہماری درسگاہوں میں انگریزوں کے اس طرز عمل کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ دیوبند۔ بریلی۔ بدایوں۔ لکھنؤ یا بنارس و مئو کے عربی مدارس کے فارغ التحصیل طالب علم کو (جس نے دس سال تک علوم عربیہ پڑھے ہوں) کسی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا لیکن ایک شخص اگر لندن سے دو سال میں عربی میں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے آئے (خواہ عربی عبارت صحیح نہ پڑھ سکے) تو وہ بھی عربی کا ماہر سمجھا جاتا ہے اور اس کی قدر ہوتی ہے۔

ساتواں شعر:۔ اقبالؔ بے نوا۔ بڑا سخی ہے لیکن شعلہ اگر سخاوت کرے گا تو شرر کے علاوہ اور کیا دے سکتا ہے۔

اسی طرح اقبالؔ کے سینہ میں عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آگ جل رہی ہے اور وہ لامحالہ اپنی قوم کے نوجوانوں کو اس آگ ہی سے کچھ حصہ یا چند شرارے دے سکتا ہے۔ یعنی آنچہ در دیگ است۔ بہ چمچہ بر آمد والا مضمون ہے۔

—(۰)—

غزل ۲۵

نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے
فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے
فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے
اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے
کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

•

پہلا شعر:۔ بادشاہانِ عالم۔ خراج۔ فوج اور خزانہ کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ ان چیزوں کے بغیر ان کی بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی لیکن فقیر ان میں سے کسی چیز کی احتیاج نہیں رکھتا اس کے باوجود

دنیا اور دنیا والوں پر حکومت کرتا ہے اس لئے فقیر کی نگاہ میں بادشاہی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ بادشاہ تو ہمیشہ فقیروں کے دربار میں حاضر ہوتے رہے ہیں لیکن کوئی فقیر کبھی کسی بادشاہ کے دربار میں نہیں گیا۔

دوسرا شعر:۔ اگر کوئی شخص دنیا والوں کے سامنے دست سوال دراز کرے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر اعتماد نہ کرے تو اقبالؔ کی نظر میں وہ شخص کافر ہے۔

تیسرا شعر:۔ اقبالؔ نے اس شعر میں بادشاہوں کے طرز عمل پر تنقید کی ہے کہ یہ لوگ عموماً نااہلوں کو مراتب عالیہ عطا کرتے ہیں اور جو اشخاص فی الحقیقت عزت کے مستحق ہیں ان سے بے اعتنائی کا برتاؤ کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ صاحب کمال خوشامد کے فن سے ناآشنا ہوتا ہے اس لئے عزت وجاہ سے محروم رہتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ اگر کوئی شخص دوسرے کے دلوں پر حکومت کرنی چاہتا ہے تو اسے لازم ہے کہ اپنی نگاہ میں شوخی یا دلیری کی شان پیدا کرے کیونکہ دل کا فیصلہ عموماً نگاہ سے ہوتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ جب تک کسی کی شخصیت میں دلکشی نہ ہو تو لوگ اس کے گرویدہ نہیں ہو سکتے۔

پانچواں شعر:۔ چونکہ میں بادشاہوں کے سامنے برملا اس حقیقت کا اظہار کر دیتا ہوں کہ دنیاوی اقتدار، عارضی اور فانی شئے ہے اس پر گھمنڈ کرنا درست نہیں ہے اس لئے یہ طبقہ مجھ سے ناراض رہتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ دنیا میں ہر شخص سروری کا آرزومند ہے۔

یعنی حصولِ اقتدار ہر شخص کی فطرت میں داخل ہے۔ ہر شخص دوسروں پر حکومت کرنے کا خواہش مند ہے لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اگر قوم فروشی کر کے سروری حاصل ہو تو وہ انسان کے لئے عزت نہیں بلکہ ذلت کی بات ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ملّی تاریخ میں میر جعفر اور میر صادق کے معنی ہی غدّار اور قوم فروش کے ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے چند روزہ دنیاوی عزت کے لئے ابدی لعنت خرید لی۔

چنانچہ اقبالؔ لکھتے ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

ساتواں شعر:۔ کہتے ہیں کہ لوگوں کو میرا کلام اس لئے پسند ہے کہ میں قلندرانہ زندگی بسر کرتا ہوں اور اپنی قوم کو اللہ اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام سناتا ہوں ورنہ مجھ سے بدرجہا بہتر شاعر اور سخن گو دنیا میں موجود ہیں۔ مجھے جو عزت نصیب ہوئی ہے۔ وہ اس لئے نہیں کہ میں شاعر ہوں بلکہ اس لئے کہ میں اپنی قوم کا غمخوار ہوں اور اس کو عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا درس دیتا ہوں۔

غزل ۲۶

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بے کراں کے لئے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اُسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے

مرے گلو میں ہے اک نغمۂ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

●

پہلا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے انسان کا قرآنی تصور پیش کیا ہے جو یہ ہے کہ یہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کی ہے کہ وہ اس کی قوتوں کو مسخر کرے اور اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرے اور انسان کو اللہ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے اور زمین میں اس کی نیابت کا فرض انجام دے۔ بالفاظ دگر انسان اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ وہ دنیا کی لذتوں میں منہمک ہو جائے۔ اس کا مقصد حیات صرف اللہ کی عبادت یعنی اطاعت ہے۔

دوسرا شعر:۔ عقلؔ اور دلؔ۔ دونوں کی اصل یا بنیاد عشق ہے اور اللہ نے یہ دو قوتیں انسان کو اس لئے عطا فرمائی ہیں کہ وہ عقل کی مدد سے خار وخس یعنی مادی دنیا کو فتح کرے اور دل کی بدولت عالم روحانی کو اپنے قبضہ میں لا سکے۔

تیسرا شعر:۔ اے مخاطب! یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے اس لئے نہیں بنائی کہ تو اس کو اپنی مستقل اقامت گاہ بنائے یا اس کی لذتوں میں منہمک ہو کر اپنے مقصود سے غافل ہو جائے بلکہ تجھے اس دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ تو اپنی خودی کی تربیت کر سکے تیرا مقصدِ حیات، اللہ سے محبت کرنا ہے نہ کہ دنیا سے دل لگانا۔

چوتھا شعر:۔ اے مسلمان! تجھ کو اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا ہے اس لئے تیرا نادیہ نگاہ آفاقی ہونا چاہیے یعنی تیرا نصب العین یہ ہے کہ ساری دنیا میں اسلام کے اصولوں کی اشاعت ہو ساری دنیا اسلام کی حلقہ بگوش ہو جائے پس تو اپنی جدوجہد کو ہندوستان یا مصر یا عراق تک محدود مت کر تجھ کو اللہ تعالیٰ نے ساری اقوام عالم کا

سردار بنایا ہے۔ اس شعر کا مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے۔
کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ۔ یعنی اے مسلمانو! ہم نے تم کو تمام اقوام عالم کا سردار بنایا ہے تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔ اور تمہارا فرض یہ ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرو گے اور برائیوں سے روکو گے۔

یہ آیات نہیں ہے بلکہ وہ آئینہ ہے جس میں مسلمان اپنی صورت دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کس حد تک اللہ کے منشا کی تکمیل کر رہے ہیں۔

پانچواں شعر:۔ افسوس! مسلمان کسی زمانہ میں دوسروں کی رہنمائی کرتے تھے لیکن آج ان کی حالت یہ ہے کہ خود رہنماؤں کے محتاج ہیں بلکہ ایک عرصہ سے کسی رہنما کے منتظر ہیں۔

چھٹا شعر:۔ مسلمانوں کا رہنما وہ شخص ہو سکتا ہے جس کی نگاہ بلند ہو یعنی جس کا نصب العین یہ ہو کہ میں اسلام کو ساری دنیا پر غالب کر دوں گا جس کا سخن دلنواز ہو وہ قرآن اور حدیث کے علوم کا ماہر ہو کیونکہ اس کے بغیر اس کی گفتگو دلنواز نہیں ہو سکتی اور جس کی جان پرسوز ہو یعنی وہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں فنا ہو چکا ہو۔ واضح ہو کہ نگاہ میں بلندی سخن میں دلنوازی اور جان میں سوز۔ یہ تینوں باتیں عشق رسولؐ ہی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

ساتواں شعر:۔ یہ شعر اقبالؔ کے ایمانی اسلوب بیان کی بہترین مثال ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ توحید کا عقیدہ بہت آسان اور مختصر ہے اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے اتنی ہی بات ہے کہ

مسلمان اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کر سکتا یہی توحید ہے اور یہی اسلام ہے اور یہی قرآن کی روح ہے لیکن مسلمانوں نے اپنی نادانی سے اسی ذرا سی بات کو اتنا معمہ بنا دیا ہے کہ برسوں علم عقائد اور علم کلام کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں لیکن جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ دلوں میں پیدا نہیں ہوتا ہے۔

توحید۔ بظاہر تو عقیدہ ہے لیکن یہ کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی اس لائق نہیں ہے جس کی اطاعت کی جائے۔ لیکن بباطن چیلنج ہے۔ ساری دنیائے کفر کے نام ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تو دراصل وہ ساری دنیا کو الٹی میٹم دیتا ہے کہ میں کسی دنیاوی طاقتوں کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسے کفر سے برسر جنگ ہونا پڑے گا۔ اس لئے توحید کا اقتضاً یہ ہے کہ مسلمان ہر وقت جہاد کے لئے تیار رہے چنانچہ قرآن مجید صاف لفظوں میں اسی بات کی تلقین کرتا ہے۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸-۶۱) اے مسلمانو! اور جس قدر (مادی اور روحانی) قوت تم فراہم کر سکو۔ اور اپنی سرحدوں پر گھوڑے باندھ کر نگرانی کا جس قدر فرض انجام دے سکو۔ سب ان کے مقابلہ کے لئے تیار رکھو تاکہ تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ کر سکو۔

آٹھواں شعر:۔ میرے سینہ میں ایک نغمہ ایسا بھی پوشیدہ ہے کہ جبرئیل بھی اسے سن کر بے چین ہو جائے لیکن میں نے اسے لامکاں کے لئے محفوظ رکھا ہے یعنی اسے اس وقت سناؤں گا جب حضرت عشق کی بدولت قید زمان ومکان سے آزاد ہو جاؤں گا۔ بالفاظ دگر رموز عاشقی دنیا والوں پر ظاہر نہیں کئے جا سکتے کیونکہ وہ ان کو سمجھ نہیں سکتے۔

غزل ۲۷

توا ے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

وہ مرغزار کہ بیمِ خزاں نہیں جس میں
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

کہے نہ راہنما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو
یہ بات راہروِ نکتہ داں سے دور نہیں

•

یہ غزل اقبالؔ نے تصوف کے رنگ میں ڈوب کر لکھی ہے اور اس میں اوّل سے آخر تک ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے وہ بات کیا ہے وہی اپنا محبوب فلسفۂ حیات دہی تصوف کی روح کہ انسان اپنی اصل کے لحاظ سے لامکانی ہے کہ انسان خدا تو نہیں ہے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہے وہی بات جسے اقبالؔ برملا نہیں کہنا چاہتے جسے وہ • کماں سے دور نہیں ہے کے باریک پردہ میں چھپاتے ہیں وہی بات جسے نظامیؔ ۔ خسروؔ اور جامیؔ سے لے کر بیدلؔ غالبؔ

اور گرامی تک سب نے اپنے اپنے مخصوص طریقہ سے بیان کیا ہے تو اقبال بادہ نوشوں کی اس جماعت میں کیوں نہ شامل ہوئے؟ یہ وہی بات ہے جسے اقبال نے جاوید نامہ ص۱۱۵ میں برملا کہہ دیا ہے۔ اس جگہ صرف دو شعر لکھتا ہوں۔

کس ز سرّ عبدہٗ آگاہ نیست　　عبدہٗ جز سرّ الّا اللہ نیست

لَا اِلٰہ تیغ دوام او عبدہ　　فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر اقبال کا سارا کلام تلف ہو جائے تو یہی دو شعر ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ ان کی تشریح کا تو یہ موقع نہیں ہے۔ صرف ترجمہ کئے دیتا ہوں۔

کرۂ انسان عبدہ (سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص لقب ہے) کے راز (اس کی حقیقت) سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ؟ اس لئے عبدہٗ میں خود اللہ کا راز مضمر ہے جب کسی انسان کو اس کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی تو عبدہ کی حقیقت کا علم کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر عبدہٗ کی حقیقت کو مثالوں سے سمجھنا چاہتے ہو تو لا الٰہ الا اللہ کو تلوار تو نہیں ہے لیکن تلوار کی دھار سے تشبیہ دے سکتے ہو (دھار تلوار تو نہیں ہے لیکن تلوار سے جدا بھی نہیں ہے) اگر اس مثال سے بھی تسلی نہ ہو سکے اور صاف لفظوں میں سمجھنا چاہتے ہو تو کہہ سکتے ہو کہ ہو عبدہٗ یعنی عبدہٗ اللہ کی صفات کا مظہر کامل ہے۔

پہلا شعر:۔ اے انسان! یہ سچ ہے کہ تو "اسیر مکان" ہے یعنی زمان و مکان کی قید میں ہے لیکن اگر تو اپنی اصل و بنیاد پر غور کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو "لامکان" ہے اگر تو اپنی خودی (روح) کو اتباع رسولؐ کی بدولت مرتبۂ کمال تک پہنچا دے تو یقیناً تیرے اندر صفات باری کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔

دوسرا شعر:۔ وہ عالم جو دوش و فردا یعنی مرور ایام اور تغیرات

سے پاک ہے (بہار کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد بہار، یہ تغیر اور انقلاب ہے اور تغیر یا انقلاب زمان ومکان سے پیدا ہوتا ہے) تیرے آشیانہ (تیری زندگی یا تیری شخصیت) سے دور نہیں ہے یعنی اگر تو صحبتِ مرشد کی بدولت اپنی خودی کی معرفت حاصل کرے تو تجھے معلوم ہو جائے گا کہ تو لامکانی ہے تیری روح کی اصل مادّی نہیں ہے بلکہ وہ پرتو ہے صفاتِ الٰہی کا۔

تیسرا شعر:۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ علم قلندری یا علم تصوف کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ روح خدنگِ جستہ ہے لیکن کمان سے دور نہیں ہے یعنی روح اگرچہ خدا نہیں ہے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہے۔

(۱) خدنگ جستہ، کمان سے نکلا ہوا تیر۔ جو کمان سے جدا ہوتا ہے۔

(ب) اس کے باوجود، کمان سے دور نہیں ہے یعنی جدا نہیں ہے۔

اگر کمان نہ ہو تو تیر میں حرکت پیدا نہیں ہو سکتی اسی طرح اگر خدا نہ ہوتا تو روح بھی نہ ہوتی علاوہ بریں پہلے تیر کو کمان سے ملاتے ہیں پھر کمان کھینچتے ہیں تو تیر اس سے نکلتا ہے۔ نکل کر وہ بظاہر اس سے دور ہو جاتا ہے لیکن دانش مند جانتے ہیں کہ وہ نکلا تو کمان ہی سے ہے اسی طرح حیات خدنگ جستہ ہے لیکن اس کے باوجود کمان سے دور نہیں ہے تیر۔ خواہ کمان سے نکل کر سوگز کے فاصلہ پر جا پڑے لیکن تیر انداز جانتا ہے کہ تیر نکلا تو کمان ہی سے ہے پس "مکان" کو ملحوظ رکھو تو واقعی دور ہے لیکن اس کی اصل (Origin) پر غور کرو تو دور نہیں ہے۔ اس کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ وہ ہم سے بہت قریب ہے۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم تو انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اب سوچو کہ جب وہ ہم سے ہماری جان (روح) سے زیادہ قریب ہے تو پھر فرق ہی کیا رہا۔؟

انسان جب غور کرتا ہے تو اپنے آپ کو یعنی اپنی روح کو اپنے آپ سے سب سے زیادہ قریب پاتا ہے لیکن اللہ فرماتا ہے کہ ہم انسان سے اس سے بھی زیادہ قریب ہیں تو دوسرے لفظوں میں وہ ہم میں ہے اور ہم اس میں ہیں۔

یہ وہی حقیقت ہے جو میرے مرشد حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے یوں بیان فرمائی ہے۔

اے زاہد ظاہر بیں از قرب[1] چہ می پرسی
او در من و من در وے چوں بو بگلاب اندر

دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ ہم سے یا ہم اس سے جدا نہیں ہیں یہ جدائی جو نظر آتی ہے۔ تعینات کی وجہ سے ہے اور نہ اپنی اصل کے لحاظ سے روح انسانی صفات باری کا پرتو ہے۔ خواجہ میر دردؔ نے اس شعر میں کیسی پتہ کی بات کہی ہے۔

پردہ کو تعیّن کے در دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

اقبالؔ نے مصلحتاً سیدھی سادی بات کو پردہ میں بیان کیا ہے حیات اگرچہ خدنگِ جستہ ہے لیکن کمان سے دور نہیں ہے۔ تشبیہ۔ استعارہ اور کنایہ کے پردوں کو ہٹا کر اس عبارت کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حیات اسی کی صفات کا عکس ہے اس لئے اگر انسان کوشش کرے تو قید زمان و مکان سے آزاد ہو سکتا ہے۔

---

[1] آیت مبارکہ مذکورہ بالا سے مقتبس ہے یعنی قرب الٰہی کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ مجھ میں ہے اور میں اس میں ہوں جس طرح خوشبو گلاب کی رگ رگ میں پیوست ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر کا مطلب بھی وہی ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی اصل مادی نہیں ہے اگر وہ قدم اٹھائے یعنی اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لاسکے تو اپنے حقیقی مقام کو حاصل کر سکتا ہے یعنی دنیا میں رہ کر بھی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو سکتا ہے اور عناصر کائنات کو مسخر کر سکتا ہے قدم اٹھا۔ اس شعر کی جان ہے اقبال کا فلسفہ الٰہی دو لفظوں میں پوشیدہ ہے یعنی جدوجہد کر اپنی خودی کی تربیت کر۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ رہرو نکتہ داں کبھی راہنما سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ اس شعر میں اقبال نے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ خودی کی تربیت کے لئے مرشد کی ضرورت ہے از خود کوئی شخص اپنی خودی کی تربیت نہیں کر سکتا اس غزل کے پہلے چار شعروں کا مطلب ایک ہی ہے یعنی انسان اگر اپنی خودی کی تربیت کرے تو وہ قید زمان و مکان سے آزاد ہو سکتا ہے اس کے اندر بھی صفات باری کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے مرشد کی صحبت ضروری ہے۔

خودی کی تربیت کی تین منزلیں ہیں۔

پہلی منزل فنا فی الشیخ ہے یعنی شیخ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرنا۔

دوسری منزل فنا فی الرسولؐ ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ اپنے اندر پیدا کرنا۔

تیسری منزل فنا فی اللہ ہے یعنی اللہ کی صفات کا رنگ اپنے اندر پیدا کرنا۔

پس جو شخص عقلمند اور نکتہ داں ہے وہ صحبت شیخ یا مرشد کی رہنمائی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے بغیر سالک اللہ تک نہیں پہونچ سکتا۔ لفظ فنا سے فنائے ذات مراد نہیں ہے بلکہ شیخ اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آخر کار اللہ کی صفات اپنے اندر پیدا کرنا

غزل ۲۸

(یورپ میں لکھے گئے)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

نہ بادہ ہے نہ صراحی۔ نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیم سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

کوئی بتائے مجھے یہ غیاب ہے کہ حضور
سب آشنا ہیں یہاں ایک میں ہوں بیگانہ

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

•

پہلا شعر: مطلب یہ ہے کہ انسان عقل اور عشق دو قوتوں کے مجموعہ کا نام ہے عقل انسان کو حکمت عطا کرتی ہے اور عشق سے اس میں مستی کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ لیکن عشق کی مستی کی نوعیت شراب کی مستی سے مختلف ہوتی ہے یعنی اس کے لئے شراب، صراحی اور جام کی ضرورت نہیں ہے صرف مرشد کی نگاہ مست کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مخاطب! میری باتوں کو شاعری پر محمول مت کر میں جو کچھ کہتا ہوں یہ شاعری نہیں ہے بلکہ میں نے اسلام کے حقائق و معارف شاعری کے لباس میں بیان کئے ہیں اس لئے تو میرے کلام کو تفریح طبع کے لئے مت پڑھ بلکہ اس پیغام کو سمجھ جسے میں نے اشعار کی صورت میں پیش کیا ہے۔

چوتھا شعر:۔ جس طرح غنچہ کی شگفتگی۔ قانون قدرت کے مطابق ایک خارجی شئے منحصر ہے جسے سحر کہتے ہیں اسی طرح انسان کے دل کی شگفتگی (روحانی ترقی) اس کی ذاتی کوشش کے علاوہ اس چیز پر موقوف ہے جو خارج سے اس پر نازل ہوتی ہے یعنی فیضان الٰہی کی نسیم اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ آخر شب میں بیدار ہو کر اللہ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا کہ اس کا فضل و کرم نسیم صبح کے رنگ میں اس پر نازل ہو۔

خلاصۂ کلام یہ کہ عالم مادیات اور عالم روحانیات دونوں میں ایک ہی نوعیت کا قانون کار فرما ہے جس طرح غنچہ، شبنم اور نسیم سحر کا محتاج ہے اسی طرح انسان شیخ کی توجہ اور اللہ کے فضل کا محتاج ہے۔

پانچواں شعر:۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ یہاں اس دنیا میں سب میرے آشنا ہیں اس کے باوجود میں سب سے بیگانہ ہوں وجہ یہ ہے کہ میں اپنے محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوں اس لئے کسی سے آشنائی نہیں کر سکتا کسی کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنی غلط بینی کی وجہ سے دوسروں کو اپنا

آشنا سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں بیگانہ ہے کیونکہ دنیا اور اس کے متعلقات سب مادی ہیں اور انسان اپنی اصل کے لحاظ سے غیر مادی ہے۔ انسان کی اصل روحانی ہے یگانگت پیدا نہیں کرسکتا۔ بالفاظ دگر دنیا کی اصل مادی ہے انسان کی اصل روحانی ہے اس لئے ساری دنیا انسان کے لئے بیگانہ ہے انسان کا اصلی وطن مکان نہیں بلکہ لامکاں ہے۔

چھٹا شعر: مانا کہ یورپ میں علم و ہنر کی بہت روشنی ہے اور ہر قسم کی دلفریبیاں موجود ہیں لیکن میں تو جویائے حقیقت ہوں میں تو اللہ سے اپنا راستہ استوار کرچکا ہوں اس لئے میری نگاہ میں اس خطہ کی لادین تہذیب کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے یہ ملک صرف ان لوگوں کے لئے کشش کا باعث ہوسکتا ہے جو عیش و عشرت کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتے ہیں۔

ساتواں شعر: اس شعر میں اقبال نے مقامِ عقل اور مقامِ عشق کا موازنہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ انسان کے لئے عقل کے تقاضوں کو پورا کرنا تو آسان ہے لیکن عشق کے تقاضوں کو پورا کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ عقل انسان کو دشواریوں اور مشکلات سے بچاتی ہے لیکن عشق انسان کو دشواریوں اور مشکلات میں مبتلا کرتا ہے۔

غزل ۲۹

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اوّل سوز و تب و تاب آخر

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

کیا دبدبۂ نادر کیا شوکتِ تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مئے ناب آخر

خلوت کی گھڑی گذری جلوت کی گھڑی آئی
چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

●

پہلا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے سالکانِ راہِ خدا کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ اگر ابتدا میں کچھ دشواریاں لاحق ہوں یا مراقبہ اور ریاضت کا کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہو یا نزولِ فیضانِ سماوی نہ ہو تو ہرگز مایوس

نہ ہونا چاہیئے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں پر ضرور اپنا فضل و کرم نازل کرتا ہے جو اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں انجام کارناموں کا جواب بھی آتا ہے اور حجابات بھی اٹھ جاتے ہیں یعنی سالک اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے یہ مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے۔ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔[1] اور جو لوگ ہم سے ملنے کے لئے کوشش کرتے ہیں ہم یقیناً ان کو اپنے ملنے کے راستے دکھا دیتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ محبت کے احوال بظاہر مختلف ہوتے ہیں لیکن ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔ بالفاظ دگر محبت میں شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی حالت رہتی ہے یعنی سوز و تب و تاب کی جو کیفیت ابتدا میں ہوتی ہے وہی انتہا میں ہوتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ یہ شعر غایت شہرت کی وجہ سے محتاج تشریح نہیں ہے اقبال نے صرف ایک مصرع میں قوموں کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیا ہے ہر قوم کو جفاکشی سے حکومت حاصل ہوتی ہے حکومت سے دولت۔ ذولت سے عیش و عشرت اور عیش سے زوال ہوجاتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ یہ شعر اقبال کے اسلوب بیان کا بہترین نمونہ ہے مطلب یہ ہے کہ یورپ کی قوتیں جب کسی ایشیائی قوم کو اپنا غلام بناتی ہیں تو پہلے دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہیں اور اپنے ملک کی مصنوعات مثلاً سگریٹ

---

[1] اسی مضمون کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

ہو نہ مایوس ریاضت کا صلہ ملتا ہے
لوگ سچ کہتے ہیں ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے

سگار۔ پوڈر۔ کریم۔ ریشمی لباس۔ شیشہ و آلات۔ موٹر۔ اور ہوائی جہاز غرضکہ زندگی کی تمام ضروریات۔ نہایت ارزاں قیمت پر مہیا کرتی ہیں اس کے بعد ناصح مشفق کی حیثیت سے اقتصادی ترقی کا پنج سالہ پروگرام پیش کرتی ہیں اس ملک میں پل بناتی ہیں۔ ریلوں کا جال بچھاتی ہیں۔ تیل کے چشمے دریافت کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہوٹل اور کلب قائم کرکے اس کے اندر عورت اور شراب فراہم کرتی ہیں۔ رہی سہی کسر قرضہ بلا سود سے پوری کردیتی ہیں۔ اس طرز عمل کو اقبالؔ نے "لاتے ہیں سرور اوّل" سے تعبیر کیا ہے اور جب وہ قوم سرور کے انتہائی نقطہ پر پہونچ جاتی ہے تو پھر اسے اپنا غلام بنالیتی ہیں اس کو اقبالؔ "دیتے ہیں شراب آخر" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اقبالؔ نے ضرب کلیم میں میخانہ یورپ کے اس نرالے دستور پر بڑی مفصل تنقید کی ہے۔ صرف ایک شعر درج کرتا ہوں

صلۂ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے
مئے وقمار و ہجوم زنانِ بازاری

نوٹ:۔ میں ۱۹۴۶ء میں جب حج کے لئے گیا تو اس خیال سے کہ جس ملک کا بادشاہ شریعت کا اتنا پابند ہے کہ اس نے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کا مزار زمین کے برابر کردیا اور مسجد نبوی میں حضورؐ کے اسمائے مبارکہ میں یہ اسم رؤف اور رحیم کو بڑھا دیا۔ محض اس لئے کہ آیت رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم کے مصداق ہوجائے۔ اور پورے عربیہ میں شرک کی بو نہ آنے پائے۔ وہ بھلا سگریٹ کی بو کیسے برداشت کرسکتا ہے۔

میں اپنے ساتھ دو ۵ کے کچھ ٹن اپنے حساب سے خرید کر لیتا گیا تھا لیکن

بڑی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے مکہ اور مدینہ کے بازاروں میں اسی سگریٹ کو دو روپے فی ٹن کے حساب سے بکتا ہوا دیکھا اور چند ماہ کے بعد معلوم ہوا کہ ملک تو کسی کا ہے مگر حکومت کسی اور کی ہے بالفاظ دگر آج کل عربوں کو سرور آرہا ہے انجام کار آج تک عربوں میں شراب کی حرمت قرآنی اسی طرح باقی ہے جس طرح حضور کے زمانہ میں تھی کیا مجال ہے کہ کوئی شراب منہ تک لے جائے۔

پانچواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں نہ کسی فاتح کو دوام حاصل ہو سکتا ہے نہ اس کی فتوحات کو۔ شیخ سعدیؒ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

ہر کہ آمد عمارت نو ساخت
رفت و منزل بدیگرے پرداخت

تیمور کی سلطنت دیوار چین سے کر آب نائے باسفورس تک وسیع تھی لیکن آج نہ تیمور ہے نہ اس کی سلطنت صرف تاریخوں میں تذکرہ باقی ہے

چھٹا شعر:۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ مادی تعلقات کا انجام ہمیشہ مفارقت ہوا کرتا ہے۔ بجلی اگرچہ سحاب کی آغوش میں پرورش پاتی ہے لیکن ایک وقت ایسا ضرور آجاتا ہے جب وہ اس سے جدا ہو جاتی ہے۔

اقبال خود کہتے ہیں۔

تارے آوارہ و کم آمیز
تقدیر وجود ہے جدائی

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مومن پہلے خلوت میں اپنی خودی کی تربیت کرتا ہے اور جب وہ مرتبہ کمال کو پہونچ جاتا ہے تو پھر اس میں جلوت کی تمنا پیدا

ہوجاتی ہے یعنی مومن اپنی خودی کو دنیا پر آشکار کردیتا ہے کمال تقاضا ہی اظہار
ساتواں شعر:۔ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی شاعری میں قرآن مجید
کے حقائق اور معارف بیان کئے ہیں۔
نوٹ:۔ ہر اس شخص پر جو اقبال کے کلام کا بغور مطالعہ کرے گا اس
شعر کی صداقت واضح ہو سکتی ہے چنانچہ میں نے بھی بعض اشعار کی شرح کے
سلسلہ میں قرآن مجید کی آیات بطور ماخذ درج کی ہیں۔

غزل ۳۰

ہر شئے مسافر ہر چیز راہی
کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی
تو مردِ میداں تو میرِ لشکر
نوری حضوری تیرے سپاہی
کچھ قدر اپنی تو نے نہ جانی
یہ بے سوادی یہ کم نگاہی
دنیائے دوں کی کب تک غلامی
یا راہبی کر یا پادشاہی
پیر حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز گفتار واہی

یہ بالِ جبریل کی مشہور غزلوں میں سے ہے لیکن اس کی شہرت زیادہ تر اس کی موسیقیت کی بنا پر ہے۔

پہلا شعر:۔ کائنات میں ہر شئے متحرک ہے خواہ اجرام فلکی ہوں یا حیوانات ارضی اس حرکت سے انقلاب اور تغیر رونما ہوتا رہتا ہے دنیا کی کوئی شئے تغیر سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

خلاصۂ کلام یہ کہ حرکت یعنی تغیر، قانونِ حیات ہے۔

دوسرا شعر:۔ اشرف المخلوقات انسان کی ذات ہے اور ساری کائنات اس کی خادم ہے نوری سے فرشتے اور حضوری سے وہ فرشتے مراد ہیں جو مقرب بارگاہ ہیں۔

تیسرا شعر:۔ لیکن افسوس کہ انسان اس حقیقت سے بیگانہ ہو چکا ہے اللہ نے تو اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے لیکن وہ اپنے سے کمتر درجہ کے حیوانات کی پرستش کرتا ہے یا اپنے جیسے انسانوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے اور یہ باتیں اس کی جہالت اور کوتاہ بینی پر مبنی ہیں۔

چوتھا شعر:۔ اے انسان! یعنی اے مسلمان! تو کب تک اس ذلیل دنیا کی غلامی کرتا رہے گا؟ یہ حالت تو سراسر ناقابل برداشت ہے یا تو اپنے اندر شانِ فقر پیدا کر کے اس دنیا پر حکومت کر اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اسے ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لے یہ صورت بھی غلامی سے بہر حال بہتر ہے۔

پانچواں شعر:۔ ملتِ اسلامی کی بے سوادی اور کم نگاہی

کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس کے مذہبی رہنما گفتار اور کردار دونوں
اعتبار سے فرومایہ ہیں۔ ان کی تقریر (وعظ) میں دلائل کا زور نہیں ہوتا
سے سامعین متاثر ہو سکیں۔ اور ان کے طریقِ زندگی (اعمال) میں سوز
گداز کا رنگ نہیں پایا جاتا جو دوسروں کو ان کی اتباع پر مائل کر سکے۔

واضح ہو کہ قوم کی اصلاح کے یہی دو طریقے ہیں اور چونکہ قوم کے ر
گفتار اور کردار دونوں کے لحاظ سے ناقص ہیں اس لئے ساری قوم غلا
میں مبتلا ہے۔

غزل ۳۱

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی — ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی
تارے آوارہ و کم آمیز — تقدیرِ وجود ہے جدائی
یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند — بے رازِ و نیازِ آشنائی
تیری قندیل ہے ترا دل — تو آپ ہے اپنی روشنائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں — باقی ہے نمودِ سیمیائی

ہیں عقدہ کشا یہ خارِ صحرا
کم کر گلۂ برہنہ پائی

اس غزل میں شاعری کم ہے فلسفہ زیادہ ہے ہر شعر میں بلاغت کی شان پائی جاتی ہے اور پوری غزل اقبال کے مخصوص فلسفیانہ افکار کی حامل ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کائنات کی تخلیق اس نہج پر فرمائی ہے کہ یہاں ہر شئے اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہتی ہے اللہ نے ہر شئے کی فطرت میں نمود کا تقاضا ودلیعت کر دیا ہے ہر شئے اپنے مرتبہ کمال کو پہونچنے کیلئے بیتاب ہے

دوسرا شعر:۔ چونکہ زندگی کا تقاضا نمود اور ظہور ہے اس لئے جس انسان میں ذوق نمود نہ ہو جو شخص اپنی خودی کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا وہ اپنی فطرت کے اقتضا سے روگرداں ہے یعنی وہ شخص زندگی کے مفہوم ہی سے نا آشنا ہے بالفاظ دگر مردہ ہے پس ہر شخص کو لازم ہے کہ وہ اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہونچائے تاکہ اس کی زندگی میں خدائی صفات کا رنگ پیدا ہو سکے اور وہ کائنات پر حکمرانی کر سکے۔

تیسرا شعر:۔ اس شعر میں صنعتِ ردّ العجز علی الصدر پائی جاتی ہے یعنی جو لفظ پہلے مصرع کے شروع میں آیا ہے وہی دوسرے مصرع کے آخر میں ہے۔ کہتے ہیں کہ رائی کا دانہ کس قدر حقیر ہے لیکن اگر وہ اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہونچاوے تو اس میں پہاڑ کی سی مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے اور پہاڑ کس قدر عظیم الشان چیز ہے لیکن اگر اس کی خودی ضعیف ہو جائے تو رائی کے دانہ کی طرح حقیر ہو جاتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ ہستی کا قانون یہ ہے کہ ہر شئے ہر گھڑی منقلب اور متغیر ہے کسی شئے کو ایک حالت پر قرار نہیں ہے وجود کی تقدیر جدائی ہے یعنی ہر موجود کے لئے اللہ نے یہ انداز معین کر دیا ہے کہ وہ دوسرے موجودات سے دائمی

تعلق پیدا نہ کرے۔ تاروں کو دیکھو اسی قانون کی وجہ سے کم آمیز ہیں یعنی آپس میں دوامی رابط پیدا نہیں کرتے بلکہ فضائے کائنات میں منتشر اور متفرق زندگی بسر کرتے ہیں۔ پچھلے پہر (آخر شب) کے چاند پر نظر کرو اسے مفارقت کا احساس ہے اسی لئے اس کے چہرہ پر ہلکی ہلکی زردی چھائی ہوئی ہے۔ یہ حسن تعلیل ہے زردی کا اصلی باعث یہ ہے کہ جب سپیدۂ سحر نمودار ہو جاتا ہے تو چاند کی روشنی کم ہو جاتی ہے اور اسی لئے وہ دنیا والوں سے آشنائی پیدا نہیں کرتا۔

چھٹا شعر:۔ چونکہ مادی تعلقات کا انجام ہمیشہ جدائی ہوا کرتا ہے اس لئے سمجھ دار انسان کو لازم ہے کہ وہ دنیا سے دل نہ لگائے بلکہ سورج اور چاند سے بھی طلب نور نہ کرے اس کے بجائے وہ اپنے دل کی قندیل کو روشن کرے تاکہ خارجی روشنی سے بے نیاز ہو جائے۔

اگر انسان اپنے دل کو محبت الٰہی سے منور کرے تو اسے نہ سورج کی احتیاج باقی رہے گی نہ چاند کی۔ انسان محض اپنی بے سوادی اور کوتاہ بینی کی وجہ سے اپنے آپ کو خارجی اشیاء کا محتاج سمجھتا ہے حالانکہ وہ اگر اپنے من میں ڈوب جائے تو اسے معلوم ہو گا کہ وہ خود عالم صغیر ہے جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب خود اس کے اندر موجود ہے۔

ساتواں شعر:۔ آخر میں اقبال ہمیں اس حقیقت کبریٰ سے آگاہ کرتے ہیں جو ان کے فلسفیانہ افکار کی روح رواں ہے یعنی یہ کہ اے انسان! یہ تیری نادانی ہے کہ تو اپنے آپ کو اس عالم مادی کا محتاج تصور کرتا ہے اور اسی لئے زن۔ زر اور زمین کے حصول میں مقصد حیات ہی سے غافل ہو گیا ہے ارے نادان! ہوش میں آ۔ یہ جو کچھ تجھے نظر آتا ہے دراصل موجود ہی نہیں ہے

یہ تو محض نمود سیمیائی ہے یہ سارا کارخانہ عالم نقش بر آب اور فانی ہے صرف
تو حق ہے، صرف تو ہے جو فنا سے پاک ہے۔ صرف تیری خودی اس کائنات میں
ایک حقیقت ثانیہ ہے۔ صرف تو باقی ہے یہ ساری کائنات باطل ہے۔ اور مٹ
جانے والی ہے۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

پس جو شئے دراصل موجود ہی نہ ہو اس کی احتیاج کے کیا معنی؟

آٹھواں شعر:۔ صحرا کے خار یعنی دنیا کی مشکلات سے بالکل
مت گھبرا، یہ تو عقدہ کشا ہیں یعنی دنیا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے ہی سے تیری
خودی مرتبۂ کمال تک پہونچ سکتی ہے اس لئے تو برہنہ پائی کا گلہ مت کر یعنی
یہ شکایت مت کر کہ میرے پاس شیر کے سے ناخن اور گینڈے کی سی کھال
نہیں ہے یا اللہ نے مجھے دشواریوں میں مبتلا کر دیا ہے اگر تیری راہ میں دشواریاں
حائل نہ ہوں تو تیری خودی مرتبۂ کمال کو کیسے پہونچے گی۔

نوٹ:۔ غزل ۳۰ اور ۳۱ اس لحاظ سے بہت اہم اور غور طلب
ہیں کہ ان میں اقبال نے اپنے فلسفہ کے بنیادی اصول اجمالی طور پر بیان کر
دیئے ہیں اور ان کی تفصیل ان کتابوں میں موجود ہے میں نے ان کی شرح میں
قصداً اختصار کو مدنظر رکھا ہے کیونکہ یہ خیالات باندازِ دگر اس کتاب کے
دوسرے مقامات میں بھی مذکور ہیں۔

غزل ۳۲

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ

تعمیرِ آشیاں سے میں نے یہ راز پایا
اہلِ نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ

یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

رازِ حرم سے شاید اقبالؔ باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے اندازِ محرمانہ

•

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ خواہ اسے کسی مخفی طاقت کا معجزہ سمجھو یا انقلاب روزگار کا نتیجہ قرار دو۔ بہرصورت یہ یقینی بات ہے کہ

ایشیائی قوموں میں اقوام فرنگ کی غلامی سے نکلنے کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور وہ دن دور نہیں جب ایشیائی اقوام یورپ کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گی۔

دوسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسی دنیا میں اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں یعنی اپنے خیالات کا برملا اظہار کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے آشیانہ بنانا یعنی اسباب راحت و آسائش جمع کرنا قرین مصلحت نہیں ہے کیونکہ جب ایک شخص اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ساری دنیا ان سے اتفاق کرے ضرور کچھ لوگ اختلاف بھی کریں گے اور اختلاف رائے سے مخالفت پیدا ہونی یقینی ہے اس لئے مخالفین ہمیشہ نقصان پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ان کو اس کوشش میں کامیابی بھی ہو جاتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ جو شخص خدا کی بندگی کرتا ہے وہ دنیا میں خدائی یعنی حکومت کرتا ہے (قانون قدرت یہی ہے کہ اللہ اپنے بندہ کو ذلیل نہیں کرتا) اور جو شخص دنیا والوں کی بندگی کرتا ہے وہ ہمیشہ دوسروں کی غلامی میں مبتلا رہتا ہے۔ (انسانوں کی بندگی کے معنی ہی ان کی غلامی کے ہیں)

چوتھا شعر:۔ اے مخاطب! اگر تو احکام الٰہی کی کامل اتباع کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم کرلے تو تیرے اندر شان فقر پیدا ہو جائیگی اور جس شخص میں یہ شان پیدا ہو جاتی ہے دنیا کے لوگ اس کی چوکھٹ کو چومنا اپنے لئے باعث فخر اور موجب سعادت سمجھتے ہیں۔

پانچواں شعر:۔ اے مسلمان! افسوس کہ تیری شخصیت غیر اسلامی ہو چکی ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تیری گفتگو میں غیروں کے لئے کوئی دلکشی باقی نہیں رہی اور تیرے اعمال تجھے دنیا میں دوسروں پر غلبہ عطا

نہیں کر سکتے۔

واضح ہو کہ گفتار سے تبلیغ و اشاعت اسلام اور کردار سے جہاد فی سبیل اللہ مراد ہے اور جو شخص لا الٰہ الا اللہ کا قائل ہو اس کے لئے تبلیغ اور جہاد یہ دونوں باتیں اشد ضروری ہیں ورنہ اس کے مسلمان ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اقبالؔ نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے
کردار بے سوز گفتار واہی

چھٹا شعر: اے مسلمان! ایک زمانہ وہ بھی تھا جب دنیا کے لوگ تجھ سے خوف کھاتے تھے لیکن اب یہ حالت ہے کہ تو خود دوسروں سے ڈرتا رہتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تیرے اندر شان فقر موجود نہیں ہے۔

ساتواں شعر: کہتے ہیں کہ میں اسلام کی حقیقت سے واقف ہوں یہی وجہ ہے کہ میری شاعری کا انداز مجرمانہ ہے یعنی میں اپنے کلام میں اسلام کے حقائق و معارف پیش کرتا ہوں۔

غزل ۲۳

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
مقامِ گفتگو کیا ہے اگر میں کیمیا گر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے اور میری کیمیا کیا ہے
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے
نوائے صبح گاہی نے جگر خوں کر دیا میرا
خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

●

یہ غزل بلاغت مضمون آفرینی اور نکتہ سنجی کے اعتبار سے بال جبریل کی بہترین غزلوں میں سے ہے اس لئے اس کا ہر شعر بہت غور سے پڑھنے کے

ؔ جرمنی کا مشہور فلسفی مجذوب نیطشہ، جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا۔

لائق ہے۔

پہلا شعر:۔ ابتدار اور انتہا یہ دو لفظ دونوں مصرعوں کی جان ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے تقابل سے شعر میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں حکما، سے یہ دریافت کرنا نہیں چاہتا کہ میری ابتدا کیا ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کوئی فلسفی اس بنیادی سوال کا صحیح اور تسلی بخش جواب نہیں دے سکتا کہ انسان کی ابتدار کیونکر ہوئی! اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب عقل کی دسترس سے باہر ہے۔

جب یہ مسلّم ہے کہ مجھے اپنی ابتدا کا علم حاصل نہیں ہو سکتا تو میں اس ناممکن بات کے حصول میں اپنا وقت اور اپنی دماغی قوت کیوں ضائع کروں۔

اس کے بجائے میں یہ غور کرتا رہتا ہوں کہ میری انتہا کیا ہے؟ یعنی روحانی اعتبار سے انسان کہاں تک ترقی کر سکتا ہے؟ اور چونکہ اس سوال کا جواب مل سکتا ہے اس لئے میرا فرض یہ ہے کہ میں روحانی ترقی کے لئے کوشش کروں۔

واضح ہو کہ قرآن حکیم نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔ کہ انسانی ترقی کی معراج یہ ہے کہ نفس انسانی برائی کا حکم دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت میں ایسا پختہ ہو جائے اسے اطمینان حاصل ہو جائے اور اس حالت کو قرآن حکیم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے یہ وہ حالت ہے جب انسان اللہ سے اور اللہ انسان سے راضی ہو جاتا ہے یعنی بندہ اور خدا دونوں کے درمیان کامل موافقت اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ اپنی ابتدا پر غور نہ کرے (کیونکہ) اس سوال کا جواب نہ کسی نے دیا ہے نہ دے سکتا ہے۔ بلکہ پوری توجہ اس امر پر مبذول کرے کہ میں اپنے نفسِ امّارہ کو نفس مطمئنہ کے مقام پر کیسے پہونچاؤں؟

اللہ نے انسان کو ابتدار کا علم نہیں دیا لیکن انتہا کا علم دیدیا ہے پس معلوم ہوا کہ ابتدار کا علم نہ ہمارے لئے ضروری ہے نہ مفید ورنہ اللہ ہمیں ضرور مطلع فرما دیتا۔

اقبالؔ نے پہلے مصرع میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ انسان کو اپنی ابتدا کا علم حاصل نہیں ہو سکتا میں چاہتا ہوں کہ ان کے اس دعویٰ پر کچھ شواہد ضرور پیش کر دوں۔

واضح ہو کہ جب سے انسان نے غور و فکر کرنا شروع کیا ہے یہ سوال اسی وقت سے اس کے پیش نظر رہا ہے کہ انسان کی ابتدا کب ہوئی؟ کیسے ہوئی اور کیوں ہوئی؟ ہر زمانہ اور ہر ملک میں مختلف حکما نے اس سوال کے مختلف جواب دیئے ہیں جن کو پڑھ کر انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جاتا ہے میں اگر اس سوال کا جواب تفصیل کے ساتھ لکھوں تو یہ شرح فلسفہ کی ڈھائی ہزار سال کی تاریخ بن جائے گی اس لئے اختصاراً چند مشہور نظریات درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ انسان ازلی ہے اور اس میں روح نہیں ہے صرف سالمات مادّی کے امتزاج سے خود بخود پیدا ہو گیا ہے نہ اس کا کوئی خالق ہے اور نہ اس کی پیدائش کا کوئی مقصد ہے چنانچہ مرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گا۔

(مادّیّین)

(۲) دوسرے گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان سالمات مادی اور روح دو چیزوں کے مجموعوں کا نام ہے اور یہ دونوں ازلی ہیں۔ روح جسم کی قید میں ہے اور حیات انسانی کا مقصد یہ ہے کہ انسان جسم سے رہائی حاصل کر کے "سدّھ" ہو جائے۔ تاکہ اس کی روح دوبارہ جسم کی قید میں نہ آئے۔ (سانکھیہ درشن)

(۳) تیسرے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ جب روح جسم کی قید سے رہا ہو جائیگی تو ایک عرصہ معین تک آزاد رہے گی۔ لیکن اس کے بعد پھر قید میں مبتلا ہو جائے گی اور یہ سلسلہ ہمیشہ یونہی چلتا رہے گا۔ یہ گروہ خدا کی ہستی کا بھی معترف ہے۔ ([illegible])

(۴) چوتھے گروہ کا عقیدہ ہے کہ انسان میں روح تو نہیں ہے لیکن اسے اپنی ہستی کا شعور حاصل ہے اور یہ شعور یا "گیان دھارا" انسان کے مرنے کے بعد دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتا ہے اور جب انسان ترشنا (آرزو) کو اپنی زندگی سے بالکل خارج کر دے گا تو نروان حاصل ہو جائے گا۔ (نروان بمعنی فنا ہے) (بدھ مت)

(۵) پانچویں گروہ کا قول یہ ہے کہ انسان کی روح خدا سے صادر ہوتی ہے جس طرح شعاع آفتاب سے صادر ہوتی ہے انسان کا فرض ہے کہ مادّیات اور دنیاوی تعلقات سے بکلی کنارہ کش رہے کیونکہ مادّہ اور ہر مادّی شئے ناپاک ہے، اور خدا کی یاد میں زندگی بسر کرے تاکہ مرنے کے بعد قطرہ سمندر سے حاصل ہو جائے۔ (اشراقی)

(۶) چھٹے گروہ کا فیصلہ یہ ہے کہ درحقیقت صرف خدا موجود ہے انسان کا وجود فریب نظر ہے یعنی وہ نظر تو آتا ہے لیکن دراصل موجود نہیں ہے

(ہدایت)

اس کی مثال ایسی ہے جیسے دوپہر کے وقت دھوپ میں آپ بہت سے طشت محض حسّی ہے۔ درحقیقت صرف ایک آفتاب موجود ہے جس کا عکس مختلف برتنوں میں نظر آرہا ہے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے یعنی نیست سے ہست کیا ہے اور اس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ احکام الٰہی کی پابندی کرکے دنیا میں خلافت الٰہیہ کا مرتبہ حاصل کرے۔

ان مذاہب کے علاوہ اور بھی بہت سے مذاہب ہیں جن کا ذکر میں نے بخوف طوالت نظر انداز کردیا ہے۔ لیکن ان کے مطالعہ سے بھی اقبال کا دعویٰ ثابت ہوسکتا ہے کہ خردمندوں سے یہ دریافت کرنا بالکل بے سود ہے کہ انسان کی ابتدا کیا ہے عقل انسان اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی اس لئے اقبال نے مرشد رومیؔ کی اس نصیحت پر عمل کیا ہے۔

قال را بگذار و مرد حال شو

پیش مرد کاملے پامال شو

جب انسانی عقل اس سوال کا جواب دینے سے عاجز ہے تو عقلمند آدمی کے لئے صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ وہ "مرد کامل یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے سامنے سر تسلیم خم کردے اور اپنی توجہ حصول مقصد پر مرکوز کردے اور اقبال نے اس شعر میں مسلمانوں کو یہی پیغام دیا ہے کہ اس لایعنی بحث میں اپنا وقت ضائع مت کرو کہ میری ابتدا کیا ہے بلکہ اس بات پر غور کرو کہ میں اپنا مقصد حیات کیسے حاصل کرسکتا ہوں۔

دوسرا شعر:۔ خودی کی بلندی سے اقبال کی مراد ہے خودی کی

وہ حالت جبکہ وہ اللہ کی مرضی میں بالکل فنا ہو جائے جسے تصوف کی اصطلاح میں رضا بالقضاء کہتے ہیں یعنی بندہ اللہ کی مشیت کے سامنے سر تسلیم خم اس طرح کر دے کہ اس کی مرضی بالکل وہی ہو جائے جو اللہ کی مرضی ہے اور اسے اللہ کے احکام کی تعمیل میں ایسی لذت محسوس ہو گویا وہ حکم خود اسی نے جاری کیا تھا پس اقبال مسلمان سے یہ کہتے ہیں کہ اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دو یا اس کی مرضی میں فنا کر دو گویا تمہاری ذاتی مرضی اب کچھ نہیں ہے جو اس کی مرضی ہے وہی تمہاری بھی مرضی ہے اس یگانگت یا مطابقت کا نتیجہ ایک طرف تو یہ نکلتا ہے کہ مومن کو اللہ کے احکام کی تعمیل میں ناقابل تشریح روحانی لذت اور مسرت محسوس ہوتی ہے۔ دوسری طرف اللہ مومن پر اس قدر مہربان ہو جاتا ہے کہ بسا اوقات اپنی مشیت مومن کی خواہش کے مطابق کر دیتا ہے اس رنگ اتحاد کو اقبال نے شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ خدا خود بندے سے دریافت کرتا ہے کہ بتا تیری مرضی کیا ہے قرآن حکیم سے اس یک رنگی کی ایک مثال ذیل میں درج کرتا ہوں۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲-۱۴۴)

ہم آپؐ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں اس لئے ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جس کی طرف آپ کی مرضی ہے پس (آج سے) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف کر لیا کیجئے۔

اس آیت کی تشریح یہ ہے کہ جب آپؐ مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی لیکن آپؐ کی دلی آرزو تھی کہ اللہ کعبہ کو میرا قبلہ مقرر فرما دے چنانچہ اللہ نے

آپ کی یہ آرزو پوری فرمادی۔

گو میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا ظن غالب یہی ہے کہ جب اقبال نے یہ شعر لکھا تھا تو اس وقت یہی آیت ان کے ذہن میں ہوگی۔ بہر کیف اس آیت سے اقبال کا دعویٰ بخوبی ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر مومن پہلے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دے تو پھر ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ جب اللہ مومن کی مرضی کے مطابق احکام صادر کر دیتا ہے یعنی مومن کی خواہش اس کی مشیت ہو جاتی ہے اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود

بندۂ مومن قضائے حق شود

واضح ہو کہ خودی کو اس قدر باور کر لینا یعنی اس کو اللہ کی مرضی میں پورے طور سے فنا کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ملت اسلامیہ میں جن بزرگوں نے یہ مقام حاصل کیا ہے ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے برسوں ریاضت اور مشقت کی کیونکہ نفس امارہ چند روز میں مغلوب نہیں ہو سکتا اور ان بزرگوں نے اس بات کی صراحت بھی کی ہے کہ مرشد کی صحبت کے بغیر کوئی شخص بھی نفس امارہ کو مغلوب نہیں کر سکتا اور جب تک یہ سب سے بڑا دشمن زیر نہ ہو۔ انسان اللہ کی کامل اطاعت نہیں کر سکتا۔

سرآمد خواجگان نقش بند حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ ایک دن خانقاہ میں تشریف فرما تھے ایک مرید نے حاضر خدمت ہو کر عرض کی کہ حضرت آپ کا فلاں جہاز جو بصرہ سے آرہا تھا۔ راہ میں غرق ہو گیا۔ یہ سن کر انہوں نے فرمایا۔ الحمد للہ۔ اسی دن شام کے وقت اسی مرید نے پھر حضرت کی خدمت میں

عرض کی کہ "پہلی اطلاع غلط تھی۔ وہ جہاز کسی اور شخص کا تھا۔ یہ سن کر حضرت نے پھر فرمایا "الحمدللہ" اس پر حاضرین مجلس بہت متعجب ہوئے اور ایک مرید نے اس کا سبب دریافت کیا اس پر حضرت نے فرمایا کہ جب میں نے یہ سنا کہ میرا جہاز غرق ہو گیا تو میں نے اپنے دل کی کیفیت پر نظر کی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل کو اس خبر سے مطلق کوئی رنج نہ ہوا تو میں نے کہا کہ الحمدللہ میرا دل قضائے الٰہی پر بالکل راضی ہے پس میں نے جہاز کے ڈوب جانے پر خدا کا شکر ادا نہیں کیا بلکہ اپنے قلب کی سلامتی پر خدا کا شکر ادا کیا اس کے بعد جب یہ خبر سنی کہ میرا جہاز نہیں ڈوبا تو دوبارہ میں نے اپنے دل کی حالت کا معائنہ کیا کہ اس پر کیا اثر مرتب ہوا۔ معلوم ہوا کہ میرے دل کو اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی پس میں نے کہا کہ الحمدللہ کہ میرا دل قضائے الٰہی پر بالکل راضی ہے یہ دوسرا شکر بھی جہاز کی سلامتی پر ادا نہیں کیا بلکہ اپنے دل کی سلامتی پر ادا کیا کہ وہ نہ ڈوبنے کی خبر سے رنجیدہ ہوا۔ نہ محفوظ رہنے کی خبر سے مسرور ہوا۔

یہ ہے وہ حالت جس کو تصوف میں رضا بالقضاء سے تعبیر کرتے ہیں اور جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے تو مومن حقیقی معنی میں "عبداللہ" بن جاتا ہے اور اس کے بعد۔ اللہ اس پر اپنی نوازشات فرماتا ہے اور اپنے مقربین بارگاہ میں داخل فرماتا ہے اور اس تقریب کا اظہار دنیا والوں پر اس رنگ میں ہوتا ہے کہ مومن کی زبان سے جو بات نکل جاتی ہے اللہ اسے درجۂ قبولیت عطا فرماتا ہے۔

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جنت آشیانی نے بھی ایک شعر میں اسی مضمون کو ادا کیا ہے۔ وہ شعر رضائے الٰہی کا مظہر ہے۔

اُسؔ کی صحت ہمیں منظور ہے لیکن تجھ کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

تیسرا شعر:۔ کیمیاگر کے لغوی معنی ہیں وہ شخص جو ادنیٰ قسم کی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کردے لیکن اقبالؔ نے اس شعر میں اس لفظ کو بطور اصطلاح اپنے لئے استعمال کیا ہے جس سے ان کی مراد ہے کہ میرے کلام میں یہ تاثیر ہے کہ اگر کوئی شخص اسے سمجھ کر پڑھے تو اس کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے یعنی اس کے دماغ میں بلند روحانی خیالات پیدا ہو سکتے ہیں اس شعر میں وہ اس تاثیر کا سبب بیان کرتے ہیں کہ اگر میں کیمیاگر ہوں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے میرے سوز نفس (عشق) نے میرے کلام میں یہ تاثیر پیدا کردی ہے کہ پڑھنے والے کے خیالات میں پاکیزہ قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

چوتھا شعر:۔ تقدیر کی گہرائی، سے اقبالؔ کی مراد، وہ بلند ترین مقامات ہیں جو ایک سالک طریق اپنی جدوجہد سے حاصل کرسکتا ہے اور چشم سرمہ سا، سے ان کی مراد نگاہ مرشد سے ہے مطلب یہ ہے کہ مرشد کامل کی توجہ سالک کو روحانیت کے بلند ترین مقام پر فائز کرسکتی ہے۔

اگر اس شعر کو حقیقت پر محمول کیا جائے تو یہ اقبالؔ کے رنگ تغزل کا بہترین نمونہ ہو سکتا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ محبوبہ کی آنکھیں اس قدر دلکش ہیں کہ عاشق کو ان میں اپنا انجام زندگی نظر آسکتا ہے یعنی یہ کہ وہ جیتے جی اس کے عشق سے رہائی نہیں پاسکتا۔

---

[۱] اس کی صحت سے اپنی دختر آمنہ بیگم مرحومہ کی طرف اشارہ ہے۔

پانچواں شعر:۔ مجذوب فرنگی سے اقبال کی مراد مشہور جرمنی فلسفی اور ماہر فنون لطیفہ نیطشہ (NIETZSCHE) ہے جو ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا تھا اور سنہ ۱۹۰۰ء میں فوت ہوا اس کی زندگی بھی اس کے فلسفیانہ افکار کی طرح بہت عجیب و غریب اور دلچسپ ہے۔

اس کے والدین بڑے راسخ الاعتقاد مسیحی تھے اور اسی لئے اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت مذہبی فضا میں ہوئی تھی لیکن کالج میں پہونچ کر اس نے مشہور جرمن فلسفی شوپن ہار کی مطالعہ کیا۔ اور چونکہ یہ شخص خدا کا منکر تھا اس لئے نطشہ کے اندر بھی الحاد کا رنگ پیدا ہو گیا جو آخر وقت تک قائم رہا۔

یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جبکہ نطشہ کی عمر ۲۴ سال کی تھی وہ یونانی زبان کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ لیکن اس نے گیارہ سال تک پروفیسری کرنے کے بعد ۱۸۷۹ء میں خرابی صحت کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا اور تصنیف و تالیف کو مشغلۂ حیات بنا لیا۔ ۱۸۸۹ء میں اس کا دماغ خراب ہو گیا اور بقیہ زندگی اسی دیوانگی کے عالم میں بسر ہوئی۔

اس کی تصانیف میں "فرمودہ زرتست (THUS SPOKE ZARATHUSTRA) سب سے زیادہ مشہور ہے کیونکہ اسی کتاب میں اس نے اپنا مخصوص فلسفہ" یعنی "فوق البشر" کا نظریہ کامل وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اس کے فلسفیانہ افکار کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

۱۔ یہ کائنات ازلی اور ابدی ہے روح اور مادہ دونوں قدیم ہیں۔
۲۔ اس کی ساخت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خدا کو کوئی دخل نہیں ہے بالفاظ دیگر وہ خدا کا منکر ہے۔

۳۔ چونکہ مادہ اور قوت کی مقدار معین ہے اس لئے اس کائنات میں ابدی تکرار (ETERNAL RECURRENCE) کا قانون کارفرما ہے یعنی جو کچھ پہلے وقوع پذیر ہو چکا ہے وہی آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

۴۔ جس طرح اسلام نے انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے مومن اور کافر اسی طرح نطشہ نے بنی آدم کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے طاقتور لوگ اور کمزور لوگ اور چونکہ مسیحیت انسانوں کے اندر غلامانہ اخلاق (SLAVE MORALITY) پیدا کرتی ہے اس لئے وہ اپنے آبائی مذہب کا سخت دشمن تھا اور اس مذہب کو انسانوں کے حق میں سب سے زیادہ مضر سمجھتا تھا۔

۵۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات میں ارتقار کا قانون کارفرما ہے اس لئے آئندہ زمانہ میں طاقتور انسانوں کی نسل پیدا ہو گی جس کا ہر فرد فوق البشر ہو گا۔

۶۔ پس انسانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ فوق البشر بننے کی کوشش کریں تاکہ دوسروں پر یعنی کمزوروں پر حکومت کر سکیں۔

۷۔ نطشہ کے نظام اخلاق میں طاقت (POWER) سب سے بڑی اور سب سے اعلیٰ نیکی (VIRTUE) ہے۔

نطشہ کے اسی نظریہ نے جرمن قوم کے اندر، دوسری اقوام پر تفوق حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ جس کی طرف اقبال نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

میرا مقصد اس جگہ نطشہ کے فلسفہ پر تنقید نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اس کے بنیادی افکار میں تضاد پایا جاتا ہے کیونکہ اگر یہاں ابدی تکرار کا قانون نافذ ہے تو پھر ارتقاء کے قانون کی عقلی طور پر گنجائش نہیں نکل سکتی اس لئے ابدی تکرار کا قانون تو ارتقاء کے قانون کی ضد ہے۔

اقبالؔ کو نطشہ کی شخصیت سے بہت دلچسپی تھی اسی لئے انہوں نے اپنی تصانیف میں کئی جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اقبالؔ کے مردِ مومن اور نطشہ کے فوق البشر میں جزوی مماثلت پائی جاتی ہے یعنی یہ کہ نطشہ بھی انسان کی سربلندی اور ترقی کا آرزومند ہے لیکن اقبالؔ اور نطشہ کے درمیان بعض اختلاف بھی پائے جاتے ہیں مثلاً اقبالؔ کا مردِ مومن دنیا میں اللہ کا نائب ہے اور دنیا والوں کے لئے رحمت ہے لیکن نطشہ کا فوق البشر کسی بالاتر ہستی کا معترف نہیں ہے مختصر یہ کہ اقبال اور نطشہ کے تصورِ فوق البشر میں وہی فرق ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ اور ہٹلر میں پایا جاتا ہے۔

اقبالؔ کا خیال یہ ہے کہ نطشہ اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پر ڈال دیا یعنی وہ خدا کا منکر ہوگیا لیکن اس انکار کا سرچشمہ اس کا دل نہ تھا بلکہ دماغ تھا اس لئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگر اسے کسی مومن کی صحبت نصیب ہوجاتی تو وہ ضرور اللہ کی ہستی کا معترف ہوجاتا۔

چنانچہ اقبالؔ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

مردِ رہ دانے نبود اندر فرنگ	پس فزوں شد نغمہ اش از تارِ چنگ
رہ رو را کس نشاں از رہ نداد	صد خلل در وارداتِ او فتاد
او بہ لا در ماند و تا الّا نرفت	از مقامِ عبدہٗ بیگانہ رفت

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

آخری شعر میں اقبال نے یہ کہا ہے کہ کاش نطشہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے عہد میں پیدا ہوا ہوتا تو ان کے فیض صحبت سے اسے دولت ایمان حاصل ہو جاتی چونکہ اقبال بھی حضرت مولانا رومؒ اور حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے متبع ہیں اس لئے انہوں نے بال جبریئل کے اس شعر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر نطشہ میرے زمانہ میں ہوتا تو میں نے چونکہ ان بزرگوں کی تصانیف سے روحانی فیض حاصل کیا ہے اس لئے اللہ کے فضل سے مجھ میں بھی یہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے کہ میں اسے توحید الٰہی کی نعمت سے بہرہ ور کر دیتا۔

اقبال نے یہ آرزو اس لئے ظاہر کی کہ نطشہ کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگرچہ اس کا دماغ سوپن ہادر کے ملحدانہ افکار سے متاثر ہو گیا تھا لیکن اس کا دل کسی محبوبِ حقیقی کی تلاش میں بیتاب تھا افسوس یہ ہے کہ یورپ میں اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس کو صحیح راستہ دکھا دیتا۔

چھٹا شعر:۔ اس شعر کا اسلوب بیان بہت دلکش ہے۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! آخر شب کی پیہم گریہ و زاری نے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے آننا تو بتا دے کہ مجھے کس خطا کی یہ سزا مل رہی ہے۔؟

دوسرے مصرع میں تجاہل عارفانہ کا رنگ ہے اور اسی سے شعر میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے اقبال جانتے ہیں کہ وہ خطا۔ (اگر اسے خطا کہہ سکیں) یہ ہے کہ انسان کی فطرت سلیمہ کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ اس ہستی سے محبت کرے جس نے اسے پیدا کیا ہے چنانچہ دنیا میں آنے سے پہلے تمام روحوں نے اللہ کے سامنے صاف لفظوں

میں اس کی الوہیت اور ربوبیت کا اقرار کیا۔ جب اللہ نے یہ سوال کیا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؟ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں! تو سب روحوں نے یک زبان ہوکر کہا۔ بَلٰی۔ یعنی بیشک تو ہمارا پروردگار ہے!

ارباب ذوق سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اس مختصر سوال وجواب کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان دنیا میں آنے سے پہلے ہی اللہ سے محبت کا وعدہ کرچکا ہے یعنی جب ہم نے یہ تسلیم کرلیا کہ اللہ ہمارا رب ہے یعنی ہمارا خالق ہے ہمارا پروردگار ہے ہمارا محافظ اور ہمارا نگراں ہے ہماری تمام ضروریات کا مہیا کرنے والا ہے تو پھر کس قدر ناشکری کی بات ہے کہ ہم اس کو چھوڑ کر اپنی محبت کا مرکز کسی دوسرے کو بنائیں۔

ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر اب یہ آسان شعر پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اقبال نے دو مصرعوں میں کس درجہ بلاغت اور اثر آفرینی کا رنگ پیدا کردیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ غزل بال جبریل کی بہترین غزلوں میں سے ہے جس میں فلسفہ طرازی کے علاوہ اقبال کا شاعرانہ آرٹ بھی اپنے مرتبۂ کمال پر نظر آتا ہے۔ فلسفہ اور شاعری کے اسی دلکش امتزاج نے اقبال کے کلام کو غیرفانی بنادیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

(پیام مشرق)

—— (•) ——

غزل ۲۴

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

•

پہلا شعر:۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب عشق کی بدولت یک شخص اپنی خودی سے آگاہ ہو جاتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ میں تو بادشاہ ہوں یعنی اپنی اصل کے لحاظ سے اس کائنات میں سب سے ارفع ہوں اشرف المخلوقات ہوں خلیفۃ اللہ علی الارض ہوں اللہ کا نائب ہوں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص کو اپنی ذات کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو اس میں اس قدر قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ غلامی کی زنجیریں توڑ دیتا ہے اور دنیا میں سرداری اور شوکت خسروی حاصل کر لیتا ہے۔

پہلے مطلب کی مثال ان بزرگان دین کی زندگیوں سے مل سکتی ہے جو بوریا نشین ہونے کے باوجود بادشاہی کرتے تھے اور دوسرے کی مثال عربوں کی فتوحات میں نظر آتی ہے کہ جب ان میں شان فقر ہو گئی تو ایک عالم ان کے زیر نگیں ہو گیا۔

تیسرا شعر:۔ آہِ سحرگاہی۔ اقبالؔ کی اصطلاح ہے بمعنی نوائے صبح گاہی۔ اس کے لفظی معنی تو صبح کے وقت آہ و فریاد یعنی اللہ سے دعا کرنا ہے لیکن اس سے مراد، عاشقانہ زندگی ہے یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ جب تک انسان کو اپنے نصب العین کے ساتھ عشق نہ ہو زندگی میں کامیابی نہیں ہو سکتی مثال کے طور پر حضرت عطارؔ حضرت رومیؒ امام رازیؔ اور امام غزالیؔ کی زندگیوں کا مطالعہ کرو تمہیں ان میں سے ہر ایک کے اندر عشق کا رنگ صاف جھلکتا ہوا نظر آئے گا۔

امام غزالیؔ علم و فضل میں امام رازیؔ کے ہم پلہ ہیں اور بحیثیت مجموعی یعنی سیرت کی اور زہد و اتقا کے اعتبار سے ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں ان کی تصانیف میں احیاء العلوم۔ کیمیائے سعادت۔ مقاصد الفلاسفہ اور تہافۃ الفلاسفہ بہت مشہور ہیں امام صاحب ۴۵۰ھ میں بمقام طوس واقع صوبہ خراسان پیدا ہوئے اور ۱۱۱۱ء میں وفات پائی۔

چوتھا شعر:۔ طائر لاہوتی سے مسلمان مراد ہے لاہوت تصوف کی اصطلاح ہے اور اس کے کئی معنی ہیں مثلاً (۱) سالک کی آخری

منزل جس میں اسے فنا فی اللہ کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ (۲) ذات الٰہی (۳) حیاتِ کلی جو کائنات کی ہر شئے میں جاری وساری ہے۔ (۴) وہ عالم جو ناسوت کی ضد ہے یعنی جہاں نہ زماں ہے نہ مکاں۔

اقبالؔ نے مسلمان کو طائر اس لئے کہا کہ مسلمان بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے طائر کی طرح (۱) جذبِ خاک سے آزاد ہوتا ہے۔ (۲) بلند پرواز ہوتا ہے۔ (۳) ساری دنیا کو وطن سمجھتا ہے۔ (۴) اور وسیع النظر ہوتا ہے۔

طائر لاہوتی سے مراد یہ ہے کہ مسلمان کا مقصدِ حیات اس بلند روحانی مقام کا حصول ہے جہاں پہونچ کر اس کے اندر اللہ کی صفات کا پرتو نظر آنے لگے جسے تصوف کی اصطلاح میں فنا فی اللہ کا مرتبہ کہتے ہیں اقبال چونکہ صوفیانہ مذاق رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے اس حقیقت کو ہر کتاب میں واضح کیا ہے مثلاً

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

زندگی جز لذّتِ پرواز نیست
آشیاں با فطرت او ساز نیست

اب اس شعر کا مطلب بالکل واضح ہو گیا کہ اے مسلمان! تیرا مقصدِ حیات پرواز ہے یعنی تجھے اس عالم مادی سے طائر کی طرح اڑ کر عالم لاہوت تک پہونچنا ہے۔ لہٰذا جس رزق سے تیری پرواز میں کوتاہی یا ضعف پیدا

ہوجائے اس سے موت اچھی ہے۔

موت کیوں بہتر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فرض کرو۔ زید نے وہ رزق کھانا اختیار کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے مقصد حیات سے محروم ہوجائے گا۔ گویا اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہوجائیں گے لیکن بکر نے اس کے کھانے سے انکار کر دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مر جائے گا مگر یہ موت اسے حصولِ مقصد کے سلسلہ میں آئی اس لئے وہ اپنے مقصد حیات میں کامیاب ہوجائے گا پس ثابت ہوا کہ لقمہ حرام کھانے سے موت بہتر ہے۔

نوٹ:۔ قوم کی بدبختی یہ ہے کہ آج روئے زمین پر کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں صدق مقام اور اکل حلال یہ دو نعمتیں میسر آسکیں حالانکہ شارع علیہ السلام نے دین اسلام کی بنیاد ہی ان دو چیزوں پر رکھی ہے۔ چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں۔

سرِّ دیں صدقِ مقال اکلِ حلال
خلوت و جلوت تماشائے جلال

پانچواں شعر:۔ دارا۔ ایران کا مشہور بادشاہ جسے سکندر نے ۳۳۰ ق م میں اربیلہ کی جنگ میں شکست دی۔ بوئے اسد اللٰہی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان فقر مراد ہے۔ مطلب واضح ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں سے وہ فقیر مرتبہ کے لحاظ سے افضل ہے جس کی فقیری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کا رنگ جھلکتا ہو۔

واضح ہو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی اس شان فقر کا بہترین نمونہ ہے جو اقبال ہر مسلمان میں دیکھنا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ہر تصنیف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے سامنے بطور آئیڈیل (نصب العین) پیش

کیا ہے اور بانگ درا کا یہ شعر اقبالی آئیڈیلزم کا بہترین مظہر ہے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

چھٹا شعر:۔ یہ شعر دراصل بوئے اسد اللہی کی تشریح ہے کہتے ہیں کہ مومن کی زندگی کا قانون یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے ہمیشہ حق بات کہتا ہے اور اس حق گوئی اور حق پرستی میں کسی سے نہیں ڈرتا یعنی مومن کے اندر دو خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی اور غور سے دیکھو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یہی دو خوبیاں سب سے زیادہ نمایاں ہیں اور اقبال کی رائے میں ان میں یہ دو بنیادی صفات شان فقر کی بدولت پیدا ہوئی تھیں۔ روباہی سے خوشامد مکر و فریب، دھوکہ اور جھوٹ مراد ہے کیونکہ روباہ (لومڑی) میں یہی صفات پائی جاتی ہیں اور اللہ کے شیروں یعنی مومنوں میں یہ صفات رذیلہ مطلق نہیں پائی جاتیں۔

غزل ۳۵

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا

چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے
وہ محفل اٹھ گئی جس دم تو مجھ تک دورِ جام آیا

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

پہلا شعر: - مطلب یہ ہے کہ جب زندگی میں کوئی "مشکل مقام" آجائے تو مسلمان کو پریشان یا مضطرب یا مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ پچھلی رات کو اٹھ کر اللہ کی جانب میں نہایت خضوع اور خشوع کے ساتھ دعا کرنی چاہئے یا بالفاظ دگر زندگی میں دشواری آتی ہی اس لئے ہے کہ انسان (مسلمان) اللہ کی طرف زیادہ

توجہ کے ساتھ مشغول ہو۔ مقام، تصوف کی اصطلاح ہے سالک کو روحانی سفر (پرواز) میں کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فیضانِ الٰہی کے نزول میں کچھ کمی ہو گئی ہے یا ترقی رک گئی ہے۔ اسے "مشکل مقام" کہتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ تقدیر کی گہرائیوں سے خودی کی مخفی صلاحیتیں یا بلند ترین روحانی مقامات مراد ہیں جنگاہ جنگ گاہ کا مخفف ہے بمعنی میدان جنگ یعنی خودی کی تربیت بھی جہاد کی ایک قسم ہے جسے اصطلاح میں جہاد بالنفس کہتے ہیں اور اس سلسلہ میں سالک کو اس طرح مشقت اور محنت برداشت کرنی پڑتی ہے جس طرح سپاہی کو میدان جنگ میں۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا یعنی مرشد کی صحبت میں رہ کر اپنی خودی کو مستحکم کرے اگر تو اس معرکہ کو سر کرے گا تو تیغ بے نیام بن جائے گا یعنی تیرے اندر باطل کو شکست دینے کی طاقت پیدا ہو جائے گی جو مومن کا مقصودِ حیات ہے۔

تیسرا شعر:۔ یہ شعر اقبال کے اسلوب بیان کی بہت عمدہ مثال ہے مطلب یہ ہے کہ اس وقت حجروں میں بیٹھ کر "اللہ ھو" کے نعرے بلند کرنے سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ مسلمانوں کو جہاد کی تیاری کرنی چاہئے۔

لفظ "قیام" اس شعر کی جان ہے اور اسی لفظ میں شعر کا سارا لطف مضمر ہے قیام کے دو معنی ہیں لغوی اور اصطلاحی۔ لغوی معنی قیام کرنا۔ وقوف کرنا۔ کھڑا ہونا اور فقہ کی اصطلاح میں قیام سے نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا (ایک ہیئت مخصوصہ) مراد ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ سجدوں کا وقت نہیں ہے یعنی نمازیں پڑھ پڑھ کے دشمنوں کے لئے بد دعا کرنے کا وقت نہیں ہے بلکہ قیام کا وقت ہے یعنی دشمن کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کا وقت ہے (دشمن کا مقابلہ کرتے وقت

انسان سجدہ کی حالت میں نہیں ہوتا بلکہ قیام کی حالت میں ہوتا ہے۔[1]

چوتھا شعر:۔ یعنی اے مخاطب! تو کیا میری حالت زار پر ہنستا ہے۔ جانے بھی دے کیا کرے گا میری داستان سن کے؟ میں تجھے کیا بتاؤں کہ میرے دل میں کیا کیا آرزوئیں مچل رہی ہیں؟ افسوس اس بات کا ہے کہ مجھ تک دورِ جام آیا تو بیشک۔ مگر اس وقت آیا جب ساری محفل اٹھ گئی یعنی ملی نظام ہی درہم برہم ہوگیا۔

یہ شعر رمز و ایما، کی بہت عمدہ مثال ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے علمی قابلیت تو عطا فرمائی لیکن پیدا کیا اس دور میں جب نہ کوئی علم و فن کا قدردان ہے (نہ شاہجہاںؒ ہے۔ نہ عالمگیرؒ) اور نہ کوئی مبصر ہے نہ جوہری (نہ قوم میں کوئی غلام یحییٰ بہادری ہے نہ فضل حق خیر آبادی)[2]

ارباب ذوق سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ بادہ نوشی کا لطف خلوت یا تنہائی میں بالکل نہیں بلکہ محفل یا مجلس میں ہے اسی طرح عالم کو علمی کمالات کے اظہار کا لطف اس وقت آتا ہے جب قوم میں اس فن کے سمجھنے والے موجود ہوں۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اپنی قومی خدمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے اندر عمل (جہاد) کی قوت تو موجود نہیں

---

[1] اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اقبالؔ سجدہ کی اہمیت کے منکر ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ کے وقت ضرور سجدہ کرو لیکن میدان جنگ میں کامیابی تلوار چلانے سے ہوتی ہے نہ کہ سجدہ کرنے سے۔

[2] ان کی سوانح حیات کے لئے دیکھو صفحہ ۲۲۲۔

ہے ہاں دل میں اسلام کی محبت ضرور موجزن ہے چنانچہ میں نے اپنے کلام کے ذریعہ سے وہ جذبہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی پیدا کر دیا ہے اب آئندہ جل کر کوئی انور پاشا۔ یا مہدی سوڈانی۔ یا سید احمد رائے بریلوی بھی پیدا ہو جائیگا جو اس سوز و گداز سے (جو میں نے پیدا کر دیا ہے) صحیح کام لے سکے گا یعنی قوم کو دشمن کے مقابلہ میں صف آرا کر سکے گا۔

چھٹا شعر:۔ کہتے ہیں کہ میرے اندر سوز و گداز کا رنگ یعنی محبت اسلام کا یہ جذبہ برسوں کے مطالعہ قرآن و حدیث اور مدتوں کے غور و فکر کے بعد پیدا ہوا ہے۔ واضح ہو کہ اقبالؔ نے اپنی زندگی ایک پروفیسر، وکیل، شاعر مصنف اور لکچرار کی حیثیت سے شروع کی تھی لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اسلام کی روح سے آگاہی حاصل کی اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ اسلام تو عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دوسرا نام ہے جب انہیں اس حقیقت کا علم حاصل ہو گیا تو انہوں نے اپنی قانون دانی۔ فلسفہ طرازی۔ تصنیف و تالیف کی صلاحیت شاعری کی خداداد نعمت۔ غرضکہ اپنے دل و دماغ کی ساری طاقتوں کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص ابتدائے عمر سے خدا کے بندوں سے یہ آرزو کیا کرتا تھا کہ۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے انہیں عار کیا تھی

اس کے اندر آخر عمر میں خدا سے یہ کہنے کی جرأت پیدا ہو گئی کہ۔

تو باس ایتجا و باخاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

غزل ۳۶

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے؟ یہی طغیانِ مشتاقی

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں ہے شاید کوئی دردآشنا باقی

وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے
طلب صادق نہ ہو تیری تو پھر کیا شکوۂ ساقی

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

خزاں میں بھی کب آ سکتا تھا میں صیاد کی زد میں
مری غماز تھی شاخِ نشیمن کی کم اوراقی

اُلٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

●

پہلا شعر: طغیانِ مشتاقی بمعنی وفورِ عاشقی اس سے مراد ہے
محبت الٰہی کی شدت مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی زندگی بموجب ارشاد قرآنی

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ اور جو لوگ مومن ہیں اللہ کی محبت میں بہت شدید ہوتے ہیں) شدّتِ محبت کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے خلاصۂ کلام یہ کہ اگر مومن کی زندگی سے محبت الٰہی کے عنصر کو خارج کر دیا جائے تو اس کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔

دوسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ فطرت مجھے نوا (شاعری) پر مجبور کر رہی ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ قوم میں ابھی دردمند مسلمان ضرور باقی ہیں جو میرے پیغام کو سمجھ سکتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ میخانہ میں شراب کی کمی نہیں ہے آج بھی ساقی (مرشد کامل) تجھے اتنی پلا سکتا ہے کہ تو ماسوی اللہ سے بالکل بیگانہ ہو جائے لیکن اگر تیرے اندر اللہ سے ملنے کی سچی تڑپ ہی نہ ہو تو پھر کیا شکوۂ ساقی۔

چوتھا شعر:۔ فرنگیوں کی زندگی بہت تابناک (روشن) ہے یعنی بہت دلکش معلوم ہوتی ہے لیکن یہ سب ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے ان کا باطن نورِ ایمان سے بالکل خالی ہے یعنی جس قدر روشنی نظر آتی ہے یہ سب بجلی کے چراغوں کی ہے ایمان کی نہیں ہے ظاہر میں سب کچھ ہے باطن میں کچھ بھی نہیں ذرہ بھر نہیں ہے اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے ع

چہرہ روشن اندرون دل چنگیز سے تاریک تر

پانچواں شعر:۔ جب تک انسان کا زاویۂ نگاہ آفاقی نہ ہو جائے اس کے دل میں آفاق گیری کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ آفاقی انداز اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب مسلمان قرآنی تعلیمات کو اپنا وظیفۂ حیات بنا لے اور یہ نعمت صحبت مرشد سے حاصل ہو سکتی ہے آفاق گیری کے ولولے سے اقبال کی مراد ہے ساری دنیا میں تبلیغ اسلام کرنے کا جذبہ یا

ساری دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی آرزو۔

چھٹا شعر:۔ یہ شعر رمز و ایما اور کنایہ کی بہترین مثال ہے حقیقی معنی تو بالکل واضح ہیں کہ استعارات کا پردہ ہٹا دیا جائے تو شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میں مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں پیدا ہوا ہوں لیکن قوم کے افراد میں اگر اخوت کا جذبہ کارفرما ہوتا تو اس بے سرو سامانی کے باوجود دشمنوں کو مجھ پر دست درازی کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ واضح ہو کہ لفظ "کم ادراقی" اس شعر کی جان ہے اور اس سے مراد ہے جذبۂ اخوت کا فقدان۔

ساتواں شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے یہ پیش گوئی کی ہے کہ مغربی اقوام کی روش سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تمام تدابیر جو وہ مسلمان ممالک کو اپنا غلام بنانے کے لئے کر رہی ہیں خاک میں مل جائیں گی اور مسلمانوں کی تقدیر بدل جائے گی اگرچہ آج وہ ان اقوام کے محکوم ہیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کو آزادی نصیب ہو جائے گی۔ اقبال کو اپنی فراست پر اعتماد تھا کہ انہوں نے دوسرے مصرع میں ہمیں متنبہ کر دیا ہے کہ یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سب حقیقت پر مبنی ہے صرف شاعرانہ خیال آرائی نہیں ہے۔

غزل ۳۷

فطرت کو خرد کے روبرو کر — تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے — کھوئی ہوئی شئے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ — تو بھی یہ مقامِ آرزو کر
عریاں ہیں ترے چمن کی حوریں — چاکِ گل و لالہ کو رفو کر
بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

●

یوں کہنے کو تو یہ بھی غزل ہے لیکن اس میں تغزل کا رنگ کہیں نظر نہیں آیا اس کے بجائے ہر شعر میں سنجیدگی اور غور و فکر پائی جاتی ہے اقبالؔ نے اس فلسفیانہ غزل کے لئے جو بحر اختیار کی ہے اس میں بھی ترنم یا موسیقیت کا رنگ نہیں ہے اس لئے وہ نفسِ مضامین کے ساتھ کامل مطابقت رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس غزل کے پڑھنے والے پر سنجیدگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی فلسفی مسجد کے گوشہ میں بیٹھا ہوا حقائقِ زندگی کا درس دے رہا ہے۔

پہلا شعر:۔ اے مخاطب! اگر تو کائنات کو مسخر کرنا چاہتا ہے تو اپنی عقلِ خداداد سے کام لے یعنی فطرت کے قوانین کا مطالعہ کر۔ اس مطالعہ کی بدولت تیرے اندر تسخیرِ کائنات کی قابلیت پیدا ہو جائے گی۔

دوسرا شعر:۔ یہ شعر سہلِ ممتنع کی بہت عمدہ مثال ہے سلاست

اور روانی کا یہ عالم ہے کہ دونوں مصرعے بالکل نثر میں ہیں اگر اس کی شرح کی جائے تو اس شعر کی سلاست کا خون ہو جائے گا یعنی شرح متن سے زیادہ مشکل ہو جائیگی اس شعر میں کس قدر تاثیر پیدا کر دی ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مخاطب! جس طرح تاروں کی دنیا غیر محدود ہے۔ اسی طرح تو بھی اپنی خودی میں غیر محدودیت کی شان پیدا کر تاکہ تو نیابت الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو سکے۔ **چوتھا شعر:۔** یہ شعر ایمانی شاعری کی بڑی عمدہ مثال ہے جیسا کہ میں قبل ازیں واضح کر چکا ہوں بال جبریل کی دلکشی کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں اقبال نے رمز و ایما، اور کنایہ سے جگہ جگہ کام لیا ہے اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ بنی آدم مبتلائے آلام و مصائب ہیں پس تو ہمدردی اور دلسوزی کا شیوہ اختیار کر اور ان کے مصائب کا ازالہ کر اس کی صورت یہ ہے کہ دنیا والوں کو اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کر۔

پانچواں شعر:۔ اگرچہ فطرت بھی حیات انسانی کو خوشگوار بنانے کے لئے ہر وقت سرگرم عمل رہتی ہے لیکن خالق فطرت نے تجھ کو فطرت سے بڑھ کر صلاحیت کار عطا فرمائی ہے پس تو فطرت کا مطالعہ کر اور اس کے کاموں میں جہاں کہیں تجھے کوتاہی یا عیب نظر آئے تو اپنی عقل خداداد سے کام لے کر اس کا ازالہ کر دے اس شعر میں اقبال نے ہمیں اختراع اور ایجاد کا درس دیا ہے مثلاً فطرت نے انسان کو پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنا نہیں سکھایا اس لئے انسان کا فرض ہے کہ وہ ایسے آلات ایجاد کرے کہ انسان بھی فضا میں پرندوں کی طرح اڑ سکے چنانچہ اہل مغرب کے سامنے یہی اصول تو تھا جس کی بنا پر انہوں نے ہوائی جہاز ایجاد کیا اسی پر دوسری ایجادات کو قیاس کیا جا سکتا ہے سائنس کا سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہے کہ انسان فطرت کی عطا کردہ نعمتوں میں اضافہ کر سکتا ہے۔

غزل ۳۸

یہ پیرانِ کلیسا و حرم ! اے وائے مجبوری
صلہ ان کی کدوکاوش کا ہے سینوں کی بے نوری

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

کبھی حیرت کبھی مستی کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

حدِ ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی
سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبورِ پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسبابِ مستوری

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبالؔ آگیا کیونکر
میسّر میر و سلطاں کو نہیں شاہین کافوری

•

پہلا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ مذہبی علماء خواہ مغرب میں ہوں یا مشرق میں چونکہ تحقیق اور اجتہاد کی لذت سے محروم ہو چکے ہیں اس لئے ان کی

دماغی کاوشیں اور علمی کوششیں سب بیکار ہیں نیز یہ لوگ ذات وصفات باری تعالیٰ میں منطقی بحثیں تو بہت کرتے ہیں اور ان مباحث پر کتابیں بھی لکھتے ہیں لیکن ان کے سینے "بے نور" ہیں یعنی ان لوگوں میں محبت الہٰی کا رنگ نظر نہیں آتا۔

دوسرا شعر:۔ یقین۔ اقبالؔ کی اصطلاح ہے اور اس سے مراد ہے اللہ کی ہستی پر یقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین اور قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے پر یقین یعنی اسلام کی صداقت اور حقانیت پر یقین۔ واضح ہو کہ کسی قوم کی زندگی اور ترقی کا انحصار دولت تجارت اور صنعت پر نہیں ہوتا بلکہ ان بنیادی افکار پر ہوتا ہے جن کی صحت اور صداقت پر وہ قوم یقین رکھتی ہے یہ یقین ان افکار کی نشر واشاعت کے لئے سب سے بڑا محرک عمل بن جاتا ہے جب تک کسی فرد یا قوم کو اپنے بنیادی افکار کی صداقت پر وہ قوم یقین رکھتی ہے یہ یقین ان افکار کی نشر واشاعت کے لئے سب سے بڑا محرک عمل بن جاتا ہے جب تک کسی فرد یا قوم کو اپنا بنیادی افکار کی صداقت پر یقین کامل حاصل نہ ہو (اسی کو شریعت نے ایمان سے تعبیر کیا ہے) افراد میں عمل کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا مختصر یہ کہ یقین انسان کے اندر بے پناہ قوت پیدا کر دیتا ہے اس لئے اقبالؔ مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ اے نادان! اگر تو دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے سربلند ہونا چاہتا ہے تو اپنے اندر یقین پیدا کر۔ اس یقین کی ہی بدولت تیرے اندر شان فقر پیدا ہو سکتی ہے اور یہ شان فقر وہ طاقت ہے کہ بادشاہ بھی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں چونکہ یقین فقر کے لئے بمنزلہ سنگ بنیاد ہے اسی لئے اقبالؔ نے اپنی ہر کتاب میں یقین کی اہمیت کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے مثلاً بانگ درا میں لکھتے ہیں۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

تیسرا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے واردات عشق کا بیان کیا ہے۔ واضح ہو کہ عاشق پر مختلف کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں کبھی وہ یہ سوچتا ہے کہ کہاں میں؟ ایک ذرہ ناچیز۔ عاجز اور ناتواں۔ مجبور اور ضعیف کہاں وہ؟ خالق ارض و سما۔ قادر مطلق۔ بادشاہوں کا بادشاہ اور ساری کائنات کا فرماں روا تو اس پر حیرانی کا عالم طاری ہو جاتا ہے پھر جب وہ اس محبوب حقیقی کے فضل و کرم کا مشاہدہ کرتا تو اس پر مستی کا رنگ چھا جاتا ہے اور کبھی وہ جدائی کا احساس کرتا ہے تو آہ و فریاد کرنے لگتا ہے غرض کہ عاشق ہر وقت کسی نہ کسی حال میں ہوتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ کہتے ہیں کہ اگرچہ عاشقی کے اسرار و رموز انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتے لیکن ایک بات ایسی ہے کہ اسے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ "دل کی موت ہے دوری" یعنی اگر عاشق معشوق کے تصور سے غافل ہو جائے گا تو کاروبار عاشقی سب ختم ہو جائے گا۔ دوری یعنی غفلت۔ دل کی موت یعنی جذبۂ عشق کا فنا ہو جانا۔

واضح ہو کہ تصوف میں سالک کو سب سے پہلے جس بات کی تلقین کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ اس کی یاد سے خالی نہ گذرنے پائے چنانچہ سلوک کی الف بے تے یہ ہے کہ "جو دم غافل سو دم کافر" یعنی جو سانس اس کی یاد سے خالی ہو۔ اس سانس میں انسان کفر کی زندگی بسر کرتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے حقیقت کی شراب کو مجاز کی بوتل میں بھر کر پیش کیا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ سراپا حسن و جمال

اور منبع فضل و کمال ہے اور جمال اور کمال دونوں کا اقتضا یہ ہے کہ صاحب جمال و کمال اپنے جمال و کمال کو ظاہر کرے اس لئے ہر شئے سے اس کی قدرت کا ظہور ہو رہا ہے۔ ہر شئے اس کے وجود پر گواہی دے رہی ہے کائنات کا ہر ذرہ اس کے جمال و کمال کا مظہر ہے۔ ع

ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

غرض وہ پوشیدہ نہیں ہے سارا قصور انسان کی آنکھوں کا ہے کہ جب وہ مظاہر کائنات کو دیکھتا ہے تو وہیں رک جاتا ہے آگے نہیں بڑھتا یعنی انسان ظاہر ہیں ہے مظاہر میں الجھ کر رہ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت اس کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتی ہے مثلاً انسان گلاب کا پھول دیکھتا ہے تو اس کی رنگت اور خوشبو پر ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ یہ غور نہیں کرتا کہ جس نے یہ پھول بنایا ہے وہ خود کس قدر حسین ہوگا۔

چھٹا شعر:۔ تقدیر کی منطق سے مراد ہے مشیت ایزدی ترکان عثمانی سے ترکوں کا کوئی خاص قبیلہ مراد نہیں ہے بلکہ وہ ترک مراد ہیں جو اپنے سردار ارطغرل کی زیر قیادت ایشیائے کوچک میں آباد ہو گئے تھے اور جب عثمان بن ارطغرل نے ۱۲۸۸ء میں اپنی حکومت قائم کی تو اس کے نام سے منسوب ہو کر تاریخ میں ترکان عثمانی کے لقب سے پانچ سو سال تک یورپ کے لئے مستقل خطرہ بنے رہے۔ ترکان تیموری سے وہ ترک مراد ہیں جنہوں نے بابر کی قیادت میں ۱۵۲۶ء میں ہندوستان فتح کیا اور تاریخ میں "مغلوں" کے لقب سے مشہور ہوئے۔

اقبال نے اس شعر میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ بظاہر ترکان تیموری ترکان عثمانی سے کسی بات میں کمتر نہیں تھے دونوں کی رگوں میں وہی ترکی خون

گردش کر رہا تھا لیکن مشیت ایزدی میں کون دم مار سکتا ہے اور اللہ کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے؟ ترکان تیموری کی سلطنت کا مدتیں گذریں۔ خاتمہ ہوگیا۔ لیکن ترکان عثمانی ابھی تک برسر حکومت ہیں۔

ساتواں شعر:۔ شاہین کافوری۔ شاہین کی ایک غیرمعروف نوع ہے جو سفید رنگ کی ہوتی ہے لیکن سرخ گندھک کی طرح نایاب ہے بہرحال جیسا کہ خود دوسرے مصرع سے عیاں ہے۔ شاہین کافوری تو میر و سلطان کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اقبالؔ تو شاہین کافوری ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتا یہ نادرۂ روزگار شخص فقیران حرم کے قبضہ میں کیونکر آگیا؟ پہلے مصرع میں تجاہل عارفانہ کا رنگ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ میرے دل میں اللہ اور اس کے رسول برحق صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت جاگزیں ہے اس لئے میں نے بخوشی اللہ والوں کی غلامی اختیار کرلی۔ حالانکہ میں اس قدر خوددار ہوں کہ بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

غزل ۳۹

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

عقل عیّار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ ملّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

عیش منزل ہے غریبانِ محبت پہ حرام
سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم

ہے گراں سیر غمِ راحلہ و زاد سے تو
کوہ و دریا سے گذر سکتے ہیں مانندِ نسیم

مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

●

پہلا شعر:۔ دانشِ حاضر۔ اقبال کی مشہور اصطلاح ہے یعنی یورپ کا فلسفہ اور سائنس یا حکمتِ مغرب۔ جو لادینی اور انکارِ خدا پر مبنی ہے سحرِ قدیم میں تلمیح ہے ساحرانِ مصر و شام و عراق کی طرف۔ چوبِ کلیم سے عصائے موسوی مراد ہے جس میں ہر قسم کے طلسم اور سحر کو باطل کر دینے کی تاثیر موجود تھی اور اسی کی مدد سے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کے جادوگروں پر غالب آئے تھے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پہلے زمانہ میں نمرود

اور فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اسی طرح اس زمانہ میں بھی مدعیان الوہیت پیدا ہو گئے ہیں مثلاً لینن (Lenin) اور اسٹالن (Stalin)
لہٰذا مسلمانوں کو لازم ہے کہ ان دشمنان اسلام کی سرکوبی کے لئے اپنے آپ کو عصائے موسوی سے مسلح کر لیں۔

واضح ہو کہ لینن (Lenin) جس نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی ہے روس کی اشتراکی حکومت کا ڈکٹیٹر تھا یعنی اشتراکیت کے پردہ میں زار روس سے بڑھ کر مطلق العنان تھا۔ نمرود کی طرح اللہ کا منکر تھا اور اگرچہ اس نے زبان سے تو نہیں کہا لیکن طریق عمل ایسا اختیار کیا کہ روس کے جاہل اشتراکی اسے خدا کا قائم مقام تصور کر لیں چنانچہ اس کی وفات کے بعد ان ملحدوں نے اپنے "مردہ خدا" کی نعش کو ادویہ کے ذریعہ سے محفوظ کر لیا اور آج یہ نعش ماسکو کے قلعہ کے باہر ایک عظیم الشان مقبرہ میں رکھی ہوئی ہے اور ہر روز ہزاروں منکرین "خدا" اپنے نقلی "خدا" یا اس زمانہ کے نمرود کے مردہ جسم کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ بالفاظ دگر جو شخص ساری عمر انسانوں کو "خدا" اور مذہب کے خلاف تعلیم دیتا رہا وہ خود مرنے کے بعد اشتراکیوں کا "خدا" بن گیا یا یوں کہو کہ اشتراکیوں نے اسے اپنا خدا بنا لیا۔

اسٹالین ۱۹۲۴ء میں لینن کی وفات حسرت آیات کے بعد روس کا مطلق العنان فرمانروا مقرر کیا گیا اور اس نے ۱۹۲۵ء میں اپنی آمریت کا ثبوت اس طرح دیا کہ ٹراٹسکی کو جو اشتراکیت میں کسی سے کم نہیں تھا محض اس لئے جلاوطن کر دیا کہ وہ اس کی غلامی کے لئے تیار نہیں تھا۔

واہ کیا دنیا ہے؟ اگر کوئی بادشاہ اپنے مخالفین کو قتل کر دے۔ تو یورپ کے حکما کی نظر میں مجرم ہے چنانچہ سلطان عبدالحمید ثانی جمہوریت اور

اشتراکیت دونوں کی نگاہ میں بہت بڑا مجرم ہے کہ اس کے زمانہ میں کسی کو حریت فکر حاصل نہیں تھی لیکن اگر کوئی ڈکٹیٹر مثلاً مصطفےٰ کمال یا اسٹالین۔ اپنے مخالفوں کو گولی کا نشانہ بنادے یا جلا وطن کردے تو یہ فعل عین "ثواب" ہے خالص وطن پرستی ہے۔

مسلمان اگر مدینہ منورہ جاکر گنبد خضرا کی زیارت کریں تو ان کا یہ فعل رجعت پسندی ہے لیکن اشتراکی اگر ماسکو پہونچ کر لینن کے جسد بے روح کی "زیارت" کریں تو یہ فعل سراسر دانشمندی بلکہ ترقی پسندی ہے۔

اسٹالین نے کبھی صاف لفظوں میں فرعون وقت ہونے کا اقرار نہیں کیا ہے لیکن اس کے درباری شاعر یعنی یو ایس۔ ایس۔ آر (U.S.S.R) کے سرکاری اخبار پراوڈا (Pravda) نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء میں حسب ذیل "قصیدہ غیر منقولہ" اس فانی معبود کی شان میں شائع کیا تھا۔

"اسٹالین اعظم! اے اقوام عالم کے رہنما!"
"تو وہی ہے جو انسانوں کو خلعت وجود عطا کرتا ہے"
"تو وہی ہے جو اس زمین کو پاک اور صاف کرتا ہے"
"تو وہی ہے جو ازمنہ سالقہ کو پھر زندہ کرتا ہے۔"
"تو وہی ہے جو موسم بہار میں پھولوں کو شگفتہ کرتا ہے۔"
"تو وہی ہے جو موسیقی کے سازوں کے تاروں میں تموّج پیدا کرتا ہے۔"
"تو میرے موسم بہار کی شادابی ہے اور تو وہ آفتاب ہے جس کا عکس کروڑوں دلوں میں جلوہ گر ہے۔"

میں اس نظم پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا صرف اپنے

ناظرین سے اتنا کہتا ہوں کہ اس نظم کے پڑھنے کے بعد وہ خود فیصلہ کرلیں کہ لینن اور خدا میں کیا فرق ہے۔

مقام عبرت ہے کہ اگر ایک مسلمان یہ کہے کہ

"اے خدا! اے اقوام عالم کے رہنما! تو بنی آدم کو خلعتِ وجود عطا کرتا ہے تو موسم بہار میں پھولوں کو شگفتہ کرتا ہے! تو زمین اور ازمنہ سالفہ کو از سر نو زندہ کرتا ہے تیرا عکس کروڑوں دلوں میں جلوہ گر ہے۔ تو وہ رجعت پسند اور دشمنِ انسانیت ہے لیکن اگر ایک اشتراکی۔ یہی صفات ایک عاجز انسان سے منسوب کرے تو وہ ترقی پسند ہے اور بنی نوعِ آدم کا محسن ہے۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

میں نے اشتراکیت کی یہ جھلک اس لئے دکھائی ہے کہ اقبال کے شعر کی وضاحت بھی ہو جائے اور کالج کی سادہ لوح مسلمان نوجوانوں کو یہ حقیقت بھی معلوم ہو جائے کہ اگر وہ اسلام کو ترک کر کے اشتراکیت اختیار کرلیں گے تو مذہب سے پھر بھی چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا۔ اسلام اگر اللہ اور رسولؐ اور قرآن پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے تو روس کا اشتراکی مذہب مارکس۔ لینن۔ اور سرمایہ[1] کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا سکھاتا ہے۔

جس طرح ایک مسلمان قرآن مجید پر ایمان لاتا ہے اور اس کو ساری دنیا کے لئے دستور العمل سمجھتا ہے اسی طرح ایک ملحد اشتراکی سرمایہ۔ پر ایمان لاتا ہے

---

[1] کتاب سرمایہ یہودی فتنہ گر کارل مارکس کی وہ شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس کو روس کے اشتراکی اپنی نظر میں وہی درجہ دیتے ہیں جو عیسائی لوگ بائبل کو دیتے ہیں۔

اور اس کو تمام عالم کے لئے ضابطۂ زندگی تصور کرتا ہے اگر اسلام پر یہ اعتراض ہے کہ کوئی مسلمان سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف رائے نہیں کر سکتا تو اس میں بھی کوئی شخص اسٹالین کی رائے سے انحراف نہیں کر سکتا اگر اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ تو اشتراکی روس میں بھی اسٹالین کے مخالف کا انجام یا رائفل کی گولی ہے یا میکسیکو کا جنگل ہے۔

ٹراٹسکی نے اپنی دوسری جلاوطنی کے بعد ستمبر ۱۹۲۷ء میں میکسیکو (امریکہ) جانے سے پہلے جو بیان دیا تھا اس میں سے صرف ایک فقرہ درج کر کے اس مواز نہ کو ختم کرتا ہوں۔

> آج روس میں آزادیٔ رائے کا کہیں وجود نظر نہیں آتا
> چنانچہ افسرانِ حکومت (اسٹالین کے تنخواہ یاب ملازمین) کے
> آمرانہ طرزِ عمل کا مقصد ہماری پارٹی (حزب الاختلاف) کو خورد برد
> کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

امریکہ۔ روس اور انگلستان کے اسی طرزِ عمل کو دیکھ کر اقبالؔ نے یہ دو غیر فانی شعر کہے تھے۔

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

دوسرا شعر: شعر تو نہایت آسان ہے لیکن اقبالؔ نے حسبِ عادت اسلوبِ بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ شعر میں بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے یعنی یہ کہنے کے بجائے کہ عشق عیار نہیں ہے انہوں نے یہ کہا کہ عشق نہ ملا ہے

نہ زاہد ہے نہ فلسفی ہے اور ملّا اور زاہد پر جو طنز کیا ہے اس نے شعر کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے چونکہ عقل اور عشق کا موازنہ اقبالؔ کا محبوب موضوع ہے اور اس کی وضاحت سابقہ اشعار میں ہو چکی ہے اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

تیسرا شعر:۔ دنیا میں لوگ مقیم نظر آتے ہیں لیکن غور سے دیکھو تو کوئی بھی مقیم نہیں ہے سب مسافر ہیں اس کے دو مطلب ہیں۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو ہمیشگی یا دوام کی صفت حاصل نہیں ہے۔ کوئی شخص اس دنیا میں ہمیشہ زندہ نہیں رہے گا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں کسی شئے کو سکون یا قرار نہیں ہے ہر شئے ہر وقت متغیر ہے اور جو شئے بظاہر ساکن یا جامد نظر آتی ہے وہ بھی اندرونی طور پر متحرک اور متغیر ہے مثلاً مکان پتھر درخت وغیرہ۔

چوتھا شعر:۔ انسان اس دنیا میں علائق دنیوی میں انہماک کی وجہ سے روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔ گراں سیر کے لغوی معنی ہیں وہ شخص جو بہت آہستہ آہستہ راستہ طے کرے لیکن اگر انسان مادیات سے قطع تعلق کر لے تو وہ نسیم کی مانند پہاڑوں اور دریاؤں کو یعنی دنیاوی مشکلات کو نہایت آسانی کے ساتھ عبور کر سکتا ہے۔

پانچواں شعر:۔ یہ شعر حاصل غزل ہے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ نے نصاب زر و سیم۔ ہم جیسے ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے لئے مقرر کیا ہے (جن کا ایمان کمزور ہے) ورنہ مومن تو زر و سیم کی محبت سے بالکل پاک ہوتا ہے اور دولت سے بے نیاز ہوتا ہے وہ اپنے پاس سونا یا چاندی رکھتا ہی نہیں جو سال بھر کے بعد اس پر زکوٰۃ لازم آئے اس کا مایہ یعنی راس المال روپیہ اشرفی نہیں ہوتا بلکہ آزاد زندگی یا میدان جنگ میں

شہادت ہے اور یہ وہ سرمایہ یعنی سامان حیات ہے جس پر کسی قسم کی زکوٰۃ عائد نہیں ہو سکتی۔ "نصاب زر و سیم" فقہ کی اصطلاح ہے یعنی سونے یا چاندی کی وہ مقدار جو اگر کسی شخص کے پاس اس کی ضروریات سے زائد ایک سال تک رہے تو پھر اس پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ یہ مقدار بروئے حدیث ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا ہے یعنی اگر کسی کے پاس اس سے کم ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی لیکن اگر اتنی ہو جائے تو پھر اسے چالیسواں حصہ یعنی ۲½ فیصدی خدا کی راہ میں دینا لازمی ہے۔

واضح ہو کہ زکوٰۃ کا منکر۔ اسی طرح کافر ہے جس طرح رسالت کا منکر کافر ہے چنانچہ جانشین رسولؐ برحق حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں مانعین زکوٰۃ کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا تھا۔ جیسا کہ کفار کے خلاف کیا جاتا تھا لیکن یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں ان باتوں کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا مسلمان سرمایہ داروں کو مژدہ ہو کہ اب بفضل خدا جہاد کی پانچوں قسمیں منسوخ ہو چکی ہیں اس لئے وہ شوق سے اسٹیٹ بنک اور نیشنل بنک میں لاکھوں روپیہ جمع کریں دنیا کی کوئی طاقت ان سے زکوٰۃ طلب نہیں کر سکتی۔ اکبر الہ آبادی نے کیا پتہ کی بات کہی ہے۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

●

غزل ۴۰

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

●

یہ بال جبریل کی بہت مشہور اور مقبول غزلوں میں سے ہے چھوٹی بحر ہے جس میں ترنم کا رنگ پایا جاتا ہے ساری غزل مسلسل ہے یعنی صرف ایک بنیادی خیال ہے جس کو حضرت اقبال نے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے

اور وہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی صرف اس دنیاوی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے بعد دوسری دنیا ہے اور اس کے بعد تیسری اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا کیونکہ اللہ کے فضل و کرم کی کوئی انتہا نہیں ہے مومن امتحان دیئے جائے گا اور روحانی ترقی کی منزلیں طے کئے جائے گا۔

یہ مت سمجھو کہ ستاروں سے آگے کوئی دنیا نہیں ہے بالفاظ دگر کائنات محدود نہیں ہے بلکہ ستاروں سے آگے بھی بے شمار دنیائیں آباد ہیں اس عالم کے علاوہ دوسرے عالم بھی ہیں چنانچہ مومن کا جہاں محدود نہیں ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کا مقصد اس نظم سے یہ ہے کہ وہ مسلمان کے زاویۂ نگاہ کو آفاقی بنانا چاہتے ہیں یعنی مسلمان کو اس بات پر یقین رکھنا چاہیئے کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے اور اس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا یہ مطلب ہے اس مصرع کا "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" اسی بات کو انہوں نے یوں بیان کیا ہے کہ :- ع

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا

یعنی مسلمان کا تصور حیات سکونی نہیں ہے بلکہ حرکی (Dynamic) ہے اسلام انسانی زندگی کو مسلسل سفر سے تعبیر کرتا ہے اسلام کی رو سے سکون اور قیام یعنی جمود تو موت کا پیغام ہے اسی طرز حیات کو اقبال نے سوختن ناتمام سے تعبیر کیا ہے اس بنیادی تصور کو ذہن میں رکھ کر اس غزل کا مطالعہ کیجئے تو ہر شعر کا مطلب واضح ہو جائے گا۔

غزل ۱۷۱

(فرانس میں لکھے گئے)

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام
وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام

پیرِ حرم نے کہا سن کے مری روئداد
پختہ ہے تیری فغاں اب نہ اسے دل میں تھام

تھا اَرِنی گو کلیمؑ میں اَرِنی گو نہیں
اس کو تقاضا روا مجھ پہ تقاضا حرام

گرچہ ہے افشائے رازِ اہلِ نظر کی فغاں
ہو نہیں سکتا کبھی شیوۂ رِندانہ عام

حلقۂ صوفی میں ذکر بے نم و بے سوز و ساز
میں بھی رہا تشنہ کام تو بھی رہا تشنہ کام

عشق تری انتہا عشق مری انتہا
تو بھی ابھی ناتمام میں بھی ابھی ناتمام

آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر سلطنتِ روم و شام

●

پہلا شعر:- یورپ کی مادہ پرست قومیں اس کوشش میں منہمک ہیں کہ ان کا اقتدار دنیا میں قیامت تک اسی طرح برقرار رہے لیکن یہ تمنائے خام ہے جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی چنانچہ عاؔد اور ثمودؔ کے زمانہ سے لے کر رومی اور ایرانی اقوام تک تاریخ عالم کا مطالعہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جب کوئی قوم عورت اور شراب اور موسیقی کو مقصد حیات بنا لیتی ہے تو کچھ عرصہ کے بعد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے لہٰذا اقوام یورپ اس کلیہ سے کس طرح مستثنیٰ ہوسکتی ہیں؟

دوسرا شعر:- مطلب یہ ہے کہ میں جو پیغام اپنی قوم کو دے رہا ہوں وہ برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے، اور جب مجھ کو یہ یقین ہو گیا کہ میرے خیالات میں پختگی آگئی ہے اس وقت میں نے ان کو نظم کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو میرے کلام کا مطالعہ بہت غور کے ساتھ کرنا چاہیئے۔

تیسرا شعر:- اس شعر کے دو مطلب سمجھ میں آتے ہیں۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے دیدار کی درخواست اس لئے کی کہ وہ اپنا اطمینان قلب چاہتے تھے لیکن مجھے بطفیل عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا یقین حاصل ہے کہ مشاہدہ کی ضرورت نہیں ہے یہ مطلب میں نے حضرت علیؓ کے اس قول سے اخذ کیا ہے کہ "اگر میں اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں تو بھی میرے یقین میں کوئی بیشی نہیں ہوسکتی۔"

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے مقرب بارگاہ تھے اس کی جناب میں درجۂ اختصاص رکھتے تھے اس لئے ان میں اس درخواست کی جرأت پیدا ہوسکی لیکن میں تو ایک عاجز اور گنہگار بندہ ہوں مجھے یہ حق نہیں ہے بلکہ

میری یہ مجال کہاں کہ میں حرفِ تمنا اپنی زبان پر لاسکوں دیدار کی درخواست سے پہلے طاقت دیدار تو پیدا کر لوں۔

چوتھا شعر:۔ اگرچہ اہل نظر کی فغاں سے عاشقی کے رموز و نکات آشکارا ہو سکتے ہیں اور ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود عاشقی کا شیوہ عام نہیں ہو سکتا کیونکہ اس راہ میں پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی اپنا سر ہتھیلی پر رکھ لے اور یہ وہ شرط ہے کہ دنیا میں بہت کم لوگ اس کو پورا کر سکتے ہیں۔ نظیری نے کیا خوب کہا ہے۔

گریہ واز صفِ مرداں کہ مردغوغا نیست
کسیکہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

پانچواں شعر:۔ آج کل بھی خانقاہوں میں "ذکر" ہوتا ہے لیکن اس سے نہ قلب میں رِقّت پیدا ہوتی ہے نہ سوز و گداز۔ چنانچہ اس کی بدولت کوئی شخص بھی منزل مقصود کو نہیں پہنچتا۔

چھٹا شعر:۔ مسلمان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ مرتبۂ عشق پر فائز ہو جائے بس جب تک یہ رنگ پیدا نہ ہو قوم کو جدوجہد سے باز نہیں آنا چاہیئے۔

ساتواں شعر:۔ افسوس! مسلمان قوم شان فقر سے بیگانہ ہو گئی یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہے اگر وہ شان مذکور اپنے اندر پیدا کرے تو وہ دنیا کی حکومت جس کے لئے آج وہ سرگرداں ہے خود اس کے قدم چومے گی۔

غزل ۴۲

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریلؑ
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیلؑ

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

فریب خوردۂ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحتِ منزل سے ہے نشاطِ رحیل

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

●

پہلا شعر:- مطلب یہ ہے کہ اگر انسان علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کرے تو فرشتوں کو اس پر رشک آنے لگے گا لیکن اگر وہ عشق اختیار کرے تو اس میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ وہ مردوں کو زندہ کر دے گا۔

دوسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ مغربی تعلیم کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان دین اسلام سے بیگانہ ہو کر ایک ناقابلِ بیان ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے گویا دانش حاضر انسان کے حق میں عذابِ الٰہی ہے اور میں اس عذاب سے واقف ہوں کیونکہ میں نے خود مغربی تعلیم حاصل کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس کا نتیجہ اسلام سے بیگانگی ہے۔

تیسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ انسان دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں اس قدر منہمک ہو گیا ہے کہ وہ دنیا کو اپنی منزلِ مقصود سمجھنے لگا ہے اور اس لئے موت کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ رحیل میں منزل سے زیادہ نشاط ہے کیونکہ سفر میں انسان کو نئے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں اور نئے تجربے حاصل ہوتے ہیں اور موت بھی سفر ہی کی ایک صورت ہے۔ ع

موت کیا شئے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر

چوتھا شعر:۔ تیغ اصیل اس تلوار کو کہتے ہیں جس کی دھار میں کاٹتے وقت اور زیادہ تیزی پیدا ہو جاتی ہے کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تجھ میں خودی کا فلسفہ کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے تو میرے کلام کا مطالعہ مت کر کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ نفع کے بجائے تجھے نقصان ہوگا۔

واضح ہو کہ خودی کا فلسفہ تیغ اصیل کی طرح ہے اگر کوئی شخص تیغ زنی کا فن نہ جانتا ہو تو تلوار اس کے حق میں بلائے جان ثابت ہو سکتی ہے۔ بہت ممکن ہے وہ اپنے آپ کو زخمی کرلے اسی طرح جو شخص صاحبِ نظر نہیں ہے وہ نکاتِ خودی سے مستفید نہیں ہو سکتا مثلاً وہ خودی اور خود بینی اور خود پرستی میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

نوٹ:۔ جب ۱۹۱۴ء میں اسرارِ خودی پہلی مرتبہ شائع ہوئی تو

بعض لوگوں نے خودی کو خود بینی کا مرادف سمجھ کر اقبالؔ کو ہدفِ اعتراض بنالیا کہ ڈاکٹر صاحب تو مسلمانوں کو خود بینی یعنی تکبر کی تلقین کر رہے ہیں حالانکہ خودی کا مفہوم خود بینی یعنی تکبر نہیں ہے۔ علاوہ بریں خود بینی بھی اقبالؔ کی مخصوص اصطلاح ہے یعنی اپنی خودی کی نگہداشت یا مطالعۂ باطن جسے تکبر سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

پانچواں شعر:۔ درسِ فرنگ سے اقبالؔ کی مراد اپنا وہ زمانۂ تعلیم ہے جو انگلستان اور جرمنی میں بسر ہوا جبکہ وہ فلسفہ کی ان کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے جن میں خدا کی ہستی کو عقلی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے لیکن عقلی دلائل سے جیسا کہ اہلِ علم جانتے ہیں خدا کی ہستی پر یقینِ کامل پیدا نہیں ہو سکتا اس بات کو اقبالؔ نے "حجابِ دلیل" سے تعبیر کیا ہے یعنی عقلی دلائل اور دراصل ایمان کے بجائے شکوک پیدا کر دیتی ہیں اس کا تجربہ دنیا میں ہر فلسفہ داں کو ہوا ہے۔

یورپ سے واپسی کے بعد اقبالؔ نے قرآن حکیم اور مثنوی رومی کا مطالعہ شروع کیا اور ان دونوں کتابوں کی بدولت ان کے اندر اللہ کی ہستی پر ایمان پیدا ہوا ان کتابوں نے اقبالؔ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ ایمان باللہ کا ذریعہ عقل نہیں ہے۔ بلکہ قلب ہے اس بات کو اقبالؔ نے "حضور" کی لذت سے تعبیر کیا ہے۔

اب اس شعر کا مطلب واضح ہو گیا۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ جب مثنوی کی بدولت مجھ پر قرآن حکیم کے حقائق و معارف منکشف ہوئے تو اب کبھی کبھی اپنا وہ زمانہ یاد آتا ہے۔ جب میں فلسفہ کی رو سے خدا کی معرفت حاصل کرنے کے درپے تھا لیکن فلسفہ میرے حق میں "حجابِ اکبر" بن گیا تھا مگر جب میں نے عقلی طریق ترک کر کے عشق کا طریق اختیار کیا تو مجھے حضوری کی لذت حاصل ہو گئی۔ غرضکہ اقبالؔ

نے اپنے تیتیس[۳۰] سالہ علمی تجارب کا خلاصہ اس مصرع میں پیش کردیا ہے۔ ع

کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل

نوٹ:۔ واضح ہو کہ ابتدائے عمر میں مجھے بھی یہی مغالطہ لاحق تھا کہ منطق اور فلسفہ کی مدد سے خدا مل سکتا ہے چنانچہ جب ۱۹۳۵ء میں علامہ سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی اور میں نے اپنا مقصد ملاقات بیان کیا کہ آپ سے الٰہیات کا فن حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ وجود باری کو عقلی دلائل سے مبرہن کرسکوں تو مرحوم نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ عقلی دلائل سے تم خدا کو ثابت نہیں کرسکتے پس فلسفہ کے بجائے قرآن اور مثنوی کا مطالعہ کرو۔ ان کے اس ایک فقرہ نے میری ذہنیت میں انقلاب عظیم پیدا کردیا۔

چھٹا شعر:۔ اے مسلمان! تو غیر اسلامی ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے اس کے علاوہ تو اپنی روایاتِ ملّی اور شعائر اسلامی سے بھی بیگانہ ہوچکا ہے اس لئے مناسب ہے کہ تو میرے کلام کو جو قرآن اور حدیث سے مقتبس اور ماخوذ ہے اپنا رہنما بنالے تاکہ تو منزل مقصود کو آسانی کے ساتھ پہونچ سکے۔

ساتواں شعر:۔ یہ شعر بلاغت کی بہت عمدہ مثال ہے۔ دوسرے مصرع میں اقبالؔ نے اسلام کی روح صرف دو لفظوں میں واضح کردی ہے کہتے ہیں کہ اسلام کی داستان (تعلیم) بہت انوکھی اور آسان اور دلکش ہے اس کی ابتدا حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی سے ہوتی ہے اور نہایت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قربانی پر ہوتی ہے یعنی اسلام اللہ کی راہ میں جان اور مال دونوں کو قربان کردینے کا نام ہے پس جو شخص اسلام کا مدعی ہو اُسے ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔

غزل ۴۳

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے
خانقاہوں میں کہیں لذّتِ اسرار بھی ہے
منزلِ راہ رواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانہ میں کوئی حیدرِ کرارؓ بھی ہے
علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے
لذّتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے
پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

•

پہلا شعر:۔ مدرسہ میں اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر رعنائی افکار پیدا ہو جائے یعنی اس کی عقل و خرد یا قوتِ فکر میں دلکشی پیدا ہو جائے اور خانقاہ میں مرشد کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کو "لذتِ اسرار" حاصل ہو جائے یعنی اس کے دل پر اسرارِ حیات منکشف ہو جائیں۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس زمانہ میں مکتب اور خانقاہ کسی جگہ بھی مقصدِ حیات حاصل نہیں ہو سکتا یعنی نہ مکتبوں کی تعلیم سے رعنائی افکار پیدا ہوتی ہے اور نہ خانقاہ

کی تربیت سے لذتِ اسرار حاصل ہوتی ہے۔

دوسرا شعر:۔ مسلمان کا نصب العین بہت بلند ہے لیکن افسوس کہ اس وقت ملت اسلامیہ میں کوئی شخص ایسا نہیں جو ان کی رہنمائی کی اہمیت رکھتا ہو یہی وجہ ہے کہ ملت سرگشتہ و حیران ہے۔

تیسرا شعر:۔ یہ بہت مشہور و معروف شعر ہے اقبال کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں دین اسلام اور نظریۂ وطنیت میں جو معرکہ آرائی ہو رہی ہے وہ معرکۂ خیبر سے بھی زیادہ اہم ہے یعنی اس کے نتائج جنگ خیبر سے بھی زیادہ دور رس ہوں گے اس لئے میں اپنی قوم سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اس معرکہ کو سر کرنے کے لئے کوئی حیدر کرار بھی ہے؟

واضح ہو کہ غزوۂ خیبر جو اسلام کی ملی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے، ۷ھ میں واقع ہوا تھا اس جنگ میں یہودیوں کا زور ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس جنگ کے ہیرو ہیں کیونکہ انہی کے ہاتھ پر قموص کا قلعہ فتح ہوا اور اسی معرکہ میں انہوں نے عرب کے مشہور بہادر مرحب کو ذوالفقار کے ایک وار میں ختم کر کے سارے ملک میں اپنی شجاعت کا سکہ بٹھا دیا۔

اقبال نے اس غزوہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ ہجرت کے بعد کامل چھ سال تک یہودی مسلمانوں کے خلاف خفیہ یا علانیہ طور پر برسر جنگ رہے اور خیبر کے یہود نے بیس ہزار یہودیوں کا لشکر جمع کر کے اپنی دانست میں ہمیشہ کے لئے اسلام کو ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا اس لئے جنگ خیبر (خصوصاً معرکۂ قموص) کفر اور اسلام کے درمیان فیصلہ کن جنگ تھی اگر اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو یہود اسلام کے

پودے کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتے گویا معرکہ قموص میں مسلمانوں کی نہیں بلکہ خود اسلام کی زندگی یا موت کا سوال درپیش تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مرحب کو قتل کر کے اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ان واقعات کو مدنظر رکھنے کے بعد اقبالؔ نے دوسرے مصرع میں جو سوال کیا ہے اس کی معقولیت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں دین اور وطن کے درمیان جو آویزش ہو رہی ہے یہ خیبر سے بھی بڑھ کر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خیبر میں صرف ایک قوم سے مقابلہ تھا لیکن اس وقت ساری اقوام عالم اسلام کے خلاف صف آرا ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں تمام اقوام عالم نے نظریہ وطنیت کو قبول کر لیا ہے صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جو اس غیر معقول نظریہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لہذا ان کا یہ انکار دوسرے لفظوں میں ساری دنیا کو چیلنج ہے۔

مسلمان یہ کہتے ہیں کہ وطنیت کا نظریۂ اسلام کے بنیادی اصول کی بیخ کنی کرتا ہے اس کو قبول کر لینے کے بعد اسلام ایک ضابطۂ حیات یعنی دین کی حیثیت سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا کیونکہ نظریۂ وطنیت کی تعلیم یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد وطن ہے مثلاً عرب کے رہنے والے ایک جداگانہ قوم ہیں۔ شام کے رہنے والے دوسری قوم ہیں۔ مصر کے رہنے والے باشندے تیسری قوم ہیں عراق کے باشندے چوتھی قوم ہیں۔ ترکی کے رہنے والے پانچویں قوم ہیں اور ان کے مقاصد بھی آپس میں جداگانہ بلکہ باہم دگر متخالف ہو سکتے ہیں۔

دین اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے کلمۂ توحید ہے اس لئے عرب شام۔ مصر۔ عراق اور ترکی کے باشندے پانچ مختلف

اقوام نہیں ہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور چونکہ ان کی قومیت کی بنیاد اسلام ہے اس لئے ان کے مقاصد بھی یکساں ہوں گے ان میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اقبال مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ اسلام اور وطنیت میں جو آویزش اس زمانہ میں ہو رہی ہے وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے جنگ خیبر سے بھی بڑھ کر ہے لیکن افسوس کہ اس وقت تمام دنیائے اسلام میں کوئی مسلمان ایسا نہیں جو حیدر کرارؓ کی طرح اپنے بازو میں اس (دشمن اسلام) کی سرکوبی کی طاقت رکھتا ہو کوئی مسلمان ایسا نہیں جو عربوں۔ ترکوں، مصریوں، عراقیوں، شامیوں اور ایرانیوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکے اور ان سے یہ کہہ سکے کہ تم نہ عرب ہو۔ نہ ترک ہو نہ مصری نہ عراقی نہ شامی نہ افغانی بلکہ صرف مسلمان ہو اور تمہارا مقصد حیات صرف اس کلمہ طیبہ کی حفاظت اور اشاعت ہے جس نے تم کو ایک قوم بنا دیا۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے اپنے محبوب موضوع کو نئے انداز میں پیش کیا ہے بات تو نئی نہیں ہے لیکن اسلوب بیان میں جدت ضرور ہے اسی مضمون کو اس سے پہلے یوں باندھا ہے۔

ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

ان دونوں شعروں میں ایمائی انداز اختیار کیا گیا ہے وضاحت اس لئے نہیں کی کہ پڑھنے والے کے دل میں تلاش کا جذبہ پیدا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں موجود ہیں علم اور عشق یا فکر اور ذکر جب علم کی سرحد ختم ہو جاتی ہے تو عشق کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور اس عالم میں لذت شوق بھی ہے۔ اور نعمت دیدار بھی ہے لیکن ان دونوں چیزوں سے بہرہ ور ہونے کے

لئے ایمان کی شرط ہے فلسفی علم کی بدولت خدا کو جان سکتا ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا اس لئے اس سے وہ کشتے مراد ہے جس میں حرکت اور زندگی نہ ہو۔ ایوان فرنگ سے مغربی تہذیب مراد ہے۔ پیر میخانہ سے مردِ مومن یا عارف مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی بنیاد چونکہ مادیت پر ہے۔ اس لئے نہ اس میں پائیداری ہے نہ زندگی اس لئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ بہت جلد فنا ہو جائے گی۔

غزل ۴۴

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
نہ ستارے میں ہے نے گردشِ افلاک میں ہے
تری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے
یا مری آہ میں کوئی شررِ زندہ نہیں
یا ذرا نم ابھی تیرے خس و خاشاک میں ہے
کیا عجب! مری نوا ہائے سحرگاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے
توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز
گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے

پہلا شعر:- مطلب یہ ہے کہ مومن کو اپنی فراستِ ایمانی کی بدولت آئندہ واقعات کا علم ہو جاتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ انبیاء کو اپنی مہربانی سے یہ طاقت عطا فرما دیتا ہے کہ وہ آئندہ واقعات کا روحانی طور پر ادراک کر سکتے ہیں چونکہ مومن کے اندر انبیاء کے کمالات ظلی طور پر منعکس ہوتے ہیں اس لئے وہ بھی اس صفت سے متصف ہو جاتا ہے چنانچہ مرشد رومیؒ فرماتے ہیں۔

بینی اندر خود علوم انبیاءؑ
بے کتاب و بے معین و اوستا

یعنی اے مسلمان! اگر تو اتباعِ شریعت سے فنافی الرسول کا مرتبہ حاصل کرے تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تو کتاب نائب استاد اور استاد کی مدد کے بغیر (محض مرشد کامل کی توجہ کی بدولت) حضرت انبیائے کرام کے علوم کا رنگ اپنے اندر پائے گا اور اس بات کی صراحت چنداں ضروری نہیں ہے کہ علم غیب بھی علوم انبیا کا ایک جزء ہے۔

دوسرا شعر:- اے مخاطب! اگر تو اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہونچانا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ نہیں کہ تو نجومیوں سے اپنی تقدیر (تمہارے کمال ذات خویش) کا حال پوچھتا پھرے بلکہ تجھے عشق رسولؐ اختیار کرنا چاہئے۔

تیسرا شعر:- اے مخاطب! اگر تیرے اندر ابھی تک عشق رسولؐ کا جذبہ پیدا نہیں ہوا تو اس کا سبب یا تو یہ ہے کہ میرے کلام میں تاثیر نہیں ہے یعنی میری شاعری عشق رسولؐ کی تلقین سے خالی ہے یا پھر تیرے اندر ابھی تک سوز و گداز کا رنگ پیدا نہیں ہو سکا یعنی تیرے اندر میرے کلام سے متاثر ہونے کی استعداد پیدا نہیں ہوئی ہے منطقی انداز میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ فاعل کا قصور ہے یا قابل میں کچھ نقص ہے اب تو خود فیصلہ کرے کہ کس کا قصور ہے؟

چوتھا شعر:- اے مخاطب! چونکہ میری شاعری عشق رسولؐ میں ڈوبی ہوئی ہے اس لئے مجھے یقین ہے کہ میرے کلام کی تاثیر سے تیرے اندر بھی عشق رسولؐ کا رنگ

پیدا ہو جائے گا (بشرطیکہ تو میرے کلام کو غور سے پڑھے)

پانچواں شعر:۔ اگر تو میرے پیغام پر عمل پیرا ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ اگرچہ اس وقت تو زمان و مکان کی قید میں گرفتار ہے لیکن انجام کار ضرور اس قید سے رہا ہو جائے گا کیونکہ عشق میں یہ طاقت ہے کہ وہ طلسم شب و روز کو باطل کر دیتا ہے۔

غزل ۴۵

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی

خراب کوشکِ سلطان و خانقاہِ فقیر
فغاں کہ تخت و مصلّٰی کمالِ زرّاقی

کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک دن
کتابِ صوفی و ملّا کی سادہ اوراقی

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

مئے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن
کھٹک رہا ہے دلوں میں کرشمۂ ساقی

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطاں سے
وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و برّاقی

پہلا شعر: موجودہ زمانہ میں مجھے صوفیوں کے حلقہ میں عشق رسولؐ کا رنگ تو کہیں نظر نہیں آتا ہاں یہ لوگ خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے گذشتہ زمانہ کے بزرگوں کی کرامات کی داستانیں بیان کرتے رہتے ہیں۔

دوسرا شعر: بادشاہوں کے محلات اور درویشوں کی خانقاہیں دونوں عشق رسولؐ سے خالی ہیں کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تخت شاہی اور مسند درویشی دونوں جگہ عیاری کا بازار گرم ہے۔

تیسرا شعر: صوفی اور ملّا دونوں عمل صالح سے محروم ہیں اس لئے جب یہ لوگ قیامت کے دن خدا کے سامنے حاضر ہوں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ دونوں بہت شرمندہ ہوں گے۔

چوتھا شعر: مومن کا زاویۂ نگاہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ملک اور خطۂ ارض سے وابستہ نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ عشق انسان کو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر کر دیتا ہے بلکہ اس کے اندر آفاقی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں اقبالؔ نے ملّت اسلامیہ کے روحانی اور اخلاقی انحطاط کی تصویر کھینچی ہے مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی غیر معمولی روحانی قوت کی بدولت صدر اول کے مسلمانوں کو عشق الٰہی سے سرشار کر دیا تھا۔ افسوس کہ ملت اسلامیہ دنیاوی لذات میں منہمک ہو کر اس نعمت سے تو محروم ہو گئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات روحانی کا تذکرہ ابھی تک باقی ہے۔

چھٹا شعر: کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو دنیاوی عشرت کا جام پی رہا ہے اس لئے میرا پیغام تجھے ضرور تلخ معلوم ہو گا کیونکہ میرے پیغام کا مقصد

یہ ہے کہ تو اس دنیاوی عیش وعشرت سے کنارہ کش ہوجائے اور یہ بات یقیناً تجھے ناگوار معلوم ہوگی لیکن تو میرے پیغام کو غور سے سن اور دل میں جگہ دے بظاہر میرا پیغام تجھے زہر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے اندر زہر نہیں ہے بلکہ تریاق پوشیدہ ہے۔ تیری یہ زندگی خودی کے حق میں زہر ہے اور میرا پیغام اس زہر کا تریاق ہے۔

ساتواں شعر:۔ یاد رکھ! میرے کلام (پیغام) میں بجلی کا سوز پوشیدہ ہے اس پر عمل کرنے سے تیرے اندر حرکت (زندگی) پیدا ہوجائے گی یعنی تو زندہ ہوجائے گا اور اسلامی زندگی اتنی بڑی نعمت ہے کہ بادشاہت بھی اس کے سامنے ہیچ ہے۔

———(∴)———

غزل ۴۶

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک
اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک

مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز
نصیبِ مدرسہ یارب یہ آبِ آتشناک

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

تو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مومن جہاں خس و خاشاک

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

•

پہلا شعر:۔ اگرچہ اقوامِ مغرب بھی لذتِ عشق سے آشنا ہیں اور ان کے عشق میں بھی فرزانگی کی شان پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود کسی کا

گریباں چاک نہ ہو سکا یعنی کوئی شخص اللہ کے راستہ میں سر نہ کٹا سکا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا جنوں قوت فکر کا نتیجہ ہے نہ کہ قوت ذکر کا۔

اقبال کا مطلب یہ ہے کہ جنون کا رنگ مغربی اقوام میں بھی پایا جاتا ہے یعنی کسی مقصد کے حصول کے لئے جان قربان کر دینا چنانچہ قطب شمالی اور قطب جنوبی اور کوہ ہمالیہ کی بلندی دریافت کرنے اور سائنٹیفک تحقیقات کے سلسلہ میں آئے دن یورپ کے لوگ اپنی جانیں قربان کرتے رہتے ہیں لیکن یہ جنون علمی تحقیقات یا دنیاوی معاملات میں ظاہر ہوتا ہے نہ ان کو ماسوی اللہ سے بیگانہ بنا سکا ہے اور نہ اللہ کے لئے جان دینے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ ہاں دنیاوی مقاصد کے لئے بیشک وہ لوگ سر ہتھیلی پر رکھ لیتے ہیں۔

دوسرا شعر:۔ زندگی میں سوز و گداز کا رنگ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی کو اللہ کی ہستی پر یقین کامل حاصل ہو جائے۔ خدا کرے کالج اور مدرسوں میں پڑھنے والے بھی اس شراب کی لذت سے آشنا ہو جائیں اقبال کا مطلب یہ ہے کہ کالج اور مدرسہ کی تعلیم سے یقین کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا اس کے لئے مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھنا لازمی ہے۔

تیسرا شعر:۔ اللہ نے تمام کائنات کو محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ انسان اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہونچا کر اس پر حکومت کرے۔ کہکشاں تارے اور نیلگوں افلاک یہ سب انسان کے خادم ہیں۔

چوتھا شعر:۔ نہایت بلیغ شعر ہے اقبال نے تین لفظوں میں عصر حاضر کی حقیقت واضح کر دی ہے اس جگہ کائنات سے مراد کسی شئے کی حقیقت یا اس کے عناصر ترکیبی ہیں یہ اردو زبان کا محاورہ ہے اور چونکہ اس میں تحقیر کا رنگ پایا جاتا ہے لہٰذا اس مصرع میں بہت برمحل استعمال ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ عصر حاضر یعنی تہذیب مغرب سے انسانوں کو جو فوائد حاصل ہوئے ہیں ان کی کل کائنات یہ ہے کہ ان کے دماغ تو بیشک روشن ہو گئے ہیں لیکن دل بے نور ہو گیا ہے اور نگاہ میں بے حیائی پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی بنیاد مادیت پر ہے اور مادہ پرستی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور نگاہ میں بے حیائی پیدا ہو جاتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ اے مسلمان! اگر تجھ میں روحانیت نہ ہو یعنی اگر تیرا نصب العین اللہ نہ ہو تب تو یہ دنیا بے شک مانع نگاہ بن سکتی ہے یعنی تجھ کو اس کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی لیکن اگر تو صاحب بصیرت ہے تو تجھے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا محض خس و خاشاک ہے اور تیری ہستی اس کے حق میں بمنزلہ آتش ہے۔

چھٹا شعر:۔ دنیا تو یہ سمجھتی ہے کہ صرف عقل انسان کی رہنمائی کر سکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عشق بھی صاحب ادراک ہے یعنی انسان کی رہنمائی کر سکتا ہے لیکن وہ عشق زن۔ زر اور زمین کا عشق نہیں بلکہ عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔

ساتواں شعر:۔ اس شعر کا مضمون وہی ہے جو قبل ازیں اس شعر میں مذکور ہو چکا ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

٭٭٭٭٭

غزل ۴۷

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ
یک رنگی و آزادی اے ہمّتِ مردانہ

یا سنجر و طغرل کا آئینِ جہانگیری
یا مردِ قلندر کے اندازِ ملوکانہ

یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی
یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ

یا عقل کی روباہی یا عشقِ یدُاللّٰہی
یا حیلۂ افرنگی یا حملۂ ترکانہ

یا شرعِ مسلمانی یا دَیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ کعبہ ہو کہ بت خانہ

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

•

اس غزل میں ایک مرکزی خیال پایا جاتا ہے جسے اقبالؔ نے مختلف طریقوں سے ذہن نشین کیا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کو کامیاب بنانا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے مقصدِ حیات کا تعیّن کر لینا چاہیئے جو دو حال سے خالی نہیں ہے یا وہ مقصد دینی ہوگا یا دنیاوی ہوگا یا خدا کا حصول ہوگا

یا دنیا کا حصول ہوگا۔ تیسری کوئی صورت نہیں ہے اور ان دونوں کا اجتماع بھی ممکن نہیں ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں
ایں خیال است ومحال ست وجنوں

یعنی مسلمان کو پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کیا چاہتا ہے دنیاوی بادشاہت اور اس کی شان وشوکت یا قلندری اور اس کا انداز حکومت! فارابی کی حیرت اور ذہنی کشمکش یا رومی کا سوز وگداز اور اطمینان قلب یا عقل کی پُرفریب زندگی یا عشق الٰہی کی پاکیزگی! اقوام یورپ کی عیاری یا ترکوں کی صداقت شعاری۔ شریعت اسلامی کی پابندی یا بتوں کی غلامی؟

غرض ان دو راستوں میں سے اسے اپنے لئے ایک راستہ انتخاب کرنا ہوگا۔ اس کے بعد انسان کو چاہئے کہ یکسو ہو کر اپنی پوری قوت اس مقصد کے حصول میں صرف کردے خدا رسی ہو یا دنیا طلبی۔ فقیری ہو یا بادشاہی جو مقصد بھی ہو اس کے حصول مقصد کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ لینا اور سر سے کفن باندھ کر میدان عمل میں کود پڑنا اور حصول مقصد کے لئے جرأت رندانہ درکار ہے اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔

جرأت رندانہ اقبال کی اصطلاح ہے اور اس سے اس کی مراد ہے نتائج سے بے پروا ہو کر حصول مقصد کے لئے جان ہتھیلی پر رکھ لینا اور سر سے کفن باندھ کر میدان عمل میں کود پڑنا۔

اس کے بغیر وہ گوہر ایک دانہ یعنی مقصد حیات حاصل نہیں ہو سکتا۔

"گوہر یک دانہ" کے لغوی معنی ہیں وہ موتی جس کے ساتھ کا دوسرا پہلو یک رنگی سے مراد ہے کہ جب مقصد متعین ہو جائے تو پھر اس کے علاوہ کوئی

اور خیال دل میں نہ آنے پائے کیونکہ جو شخص دو کشتیوں میں پاؤں رکھتا ہے وہ راستہ ہی میں غرق ہو جاتا ہے کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتا جسے شک ہو وہ تجربہ کرکے دیکھ لے۔

آزادی سے مراد ہے انسان کا اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرنے میں آزاد ہونا کیونکہ جو شخص پابند غیر ہے وہ اس لائق ہی نہیں کہ کوئی مقصد اپنے سامنے رکھ سکے۔ اگر کوئی شخص غلام ہے تو اسے سب سے پہلے آزادی حاصل کرنی چاہئے اس کے بعد مقصدِ حیات متعین کرنا مناسب ہے۔

ہمتِ مردانہ۔ یہ اس ساری نظم کی جان ہے کیونکہ انسان کا مقصد حیات کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور کوشش ہمت پر منحصر ہے جس شخص میں ہمت نہیں وہ کوشش (جد و جہد) نہیں کر سکتا۔

فارابی کا اصلی نام محمد بن محمد طرخان ابو نصر الفارابی ہے غالباً ۸۷۰ء میں پیدا ہوا اور ۹۵۰ء میں وفات پائی۔ ابن خلکان کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس سے بڑا کوئی فلسفی پیدا نہیں ہوا۔ وہ ارسطو کے فلسفہ کا سب سے بڑا شارح گذرا ہے۔ چنانچہ ابن سینا۔ ابن رشد اور دوسرے حکماء نے اس کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے۔ خود اس کا بیان ہے کہ میں نے ارسطو کی "مابعد الطبیعات" کی شرح لکھنے سے پہلے چالیس مرتبہ پورے انہماک کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اگرچہ اسے اپنے زمانہ کے تمام علوم و فنون میں کامل دستگاہ تھی لیکن منطق میں بلا شبہ اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔

———

غزل ۴۸

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالہٰ میں ہے
وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے
مہ و ستارہ سے آگے مقام ہے جس کا
وہ مشتِ خاک ابھی آوارگانِ راہ میں ہے
خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے
تو مے کدہ کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

●

پہلا شعر:۔ جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے وہ نہ تخت و تاج میں ہے اور نہ لشکر و سپاہ میں ہے۔ کیونکہ بادشاہ صرف لوگوں کے جسموں پر حکومت کرتے ہیں اور قلندر دلوں پر حکمراں ہوتا ہے پس دنیا میں جو عزت

فقیر کو حاصل ہو سکتی ہے۔ بادشاہ کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

دوسرا شعر:۔ لاالٰہ الا اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں اور کوئی ہستی نہ مجھ پر حکمراں ہے نہ ہو سکتی ہے پس جو شخص اس کلمہ پر ایمان رکھتا ہے وہ لازمی طور سے تمام معبودان باطلہ سے برسر پیکار ہو جاتا ہے لہٰذا اس کے لئے یہ دنیا صنم کدہ ہے اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چل کر ساری عمر بتوں کے خلاف جہاد کرتا رہتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے اپنا مخصوص فلسفہ جسے میں اقبالؔ تصوریت (Dynamic Idealism) سے تعبیر کر سکتا ہوں شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے اس لئے یہاں اس شعر کے لفظی معنی مراد نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔

اقبالؔ نے اس تصور کو اپنی ہر کتاب میں مختلف صورتوں سے پیش کیا ہے مثلاً جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

بندۂ آزاد را آید گراں
زیستن اندر جہانِ دیگراں

یعنی مومن دوسروں کی پیدا کردہ دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتا وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرتا ہے چنانچہ بانگ درا میں خود کہتے ہیں۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

اس دنیا کو پیدا کرنے سے اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ مومن اپنی قوتِ فکر اور قوتِ ذکر کی مدد سے دنیا میں کوئی نہ کوئی کارنامہ ایسا انجام دیتا ہے

جو ایک طرف دنیا کے لئے مفید ہوتا ہے دوسری طرف اس کے نام کو زندۂ جاوید کر دیتا ہے۔

اس تصور کا ماخذ یہ ہے کہ مومن مظہر صفات الٰہیہ ہوتا ہے اور اللہ کی ایک نمایاں صفت "تخلیق" بھی ہے اس لئے مومن کو بھی کچھ نہ کچھ ضرور پیدا کرنا چاہئے یہاں سے اقبال نے اپنا خاص نظریہ قائم کیا کہ مومن کو اپنی دنیا آپ پیدا کرنی چاہئے یعنی اپنی عقل خداداد سے کام لے کر تحقیق و اجتہاد۔ ایجاد و اختراع اور انکشاف حقائق کے میدان میں گامزن ہونا چاہئے۔

اقبال نے "نئی دنیا" پیدا کرنے کا طریقہ بھی ہمیں بتا دیا ہے چنانچہ ضرب کلیم میں لکھتے ہیں۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یعنی اگر کوئی شخص نئی دنیا پیدا کرنی چاہتا ہے اور اقبال کے مذہب میں کسی قوم کی زندگی کا ثبوت صرف اس کے افراد کی تحقیقی قوت سے مل سکتا ہے تو اسے دوسروں کی تقلید کے بجائے اپنی فکر خداداد سے کام لے کر پہلے کوئی نیا خیال اپنے سامنے رکھنا چاہئے جب تک ذہن میں نیا تصور پیدا نہیں ہوگا انسان خارج میں نئی دنیا نہیں بنا سکتا اسی نکتہ کو اقبال نے پیام مشرق کے دیباچہ میں یوں بیان کیا ہے۔

"کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن حکیم نے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک

وہ قوم خود اپنے اندر تبدیلی کی صلاحیت پیدا نہ کرے) کے سادہ
مگر بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے انفرادی اور اجتماعی
دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں
اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ (انتہی بلفظہ)

نوٹ:۔ جب میں ایک طرف اقبال کی اس تشریح آیت قرآنی پر نظر کرتا ہوں
اور دوسری طرف اپنی قوم کے طرز عمل کو دیکھتا ہوں کہ وہ اپنے ضمیر میں حکومت الٰہیہ
قائم کرنے سے پہلے خارجی دنیا میں اس حکومت کے قیام کی کوشاں ہے تو ہنسی بھی
آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ مسلمان کا حقیقی مقام اقبال کی نظر میں آسمان سے
بھی اونچا ہے لیکن چونکہ مسلمانوں نے ابھی تک ایمان (فقر) کی شان اپنے اندر پیدا
نہیں کی ہے اس لئے وہ اپنی منزل مقصود سے دور راستہ ہی میں بھٹک رہے ہیں۔

چوتھا شعر: کارکنان قضا و قدر نے مجھے اس حقیقت سے آگاہ
کر دیا ہے کہ مغربی دنیا عنقریب تباہ ہو جائے گی یا لفاظ دگر ہو منانہ فراست کی
بدولت یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی ہے کہ عذاب الٰہی کا سیلاب عنقریب ان اقوام
کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دے گا۔

واضح ہو کہ اقبال نے یہ شعر ۱۹۳۴ء میں لکھ دیا تھا جبکہ دوسری جنگ عظیم
کے آثار بظاہر کہیں نظر نہیں آرہے تھے لیکن اقبال کی دور رس نگاہوں نے
آنے والے عذاب کو دیکھ لیا تھا جس کی پہلی قسط یورپ کو ۱۹۳۹ء ۱۹۴۵ء میں وصول ہو گئی

پانچواں شعر:۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں پہلا تو یہ کہ جہان
تازہ " آہ صبح گاہی یعنی عشق کی بدولت وجود میں آسکتا ہے کیونکہ انسان میں
تخلیق کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان! میرے کلام کا مطالعہ کرو تاکہ تجھے نئی دنیا پیدا کرنے کا طریقہ معلوم ہوسکے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں وہ طریقہ عشق رسول ؐ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ طارق نے اسی عشق کی بدولت نئی دنیا پیدا کردی تھی جسے مسلمانوں نے اپنی حماقت کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کردیا۔

چھٹا شعر: کہتے ہیں کہ اے مسلمان! میرے کلام کو غنیمت سمجھ اور اس کا بغور مطالعہ کر کیونکہ بادۂ ناب (قرآن حکیم کے حقائق و معارف) اس وقت نہ مدرسوں میں مل سکتے ہیں نہ خانقاہوں میں۔ اقبال نے در پردہ اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ میرا کلام حقائق و معارف قرآنی سے لبریز ہے اس لئے قوم کو چاہیئے کہ اس کو حرز جان بنائے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

نوٹ: خوشی کی بات ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے علامہ اقبال کی بعض تصانیف کو نصاب تعلیم میں داخل کر کے بہت بڑی قومی خدمت انجام دی ہے اللہ وہ دن جلد لائے جب مرحوم کی ساری کتابیں تمام درسگاہوں میں داخل نصاب ہوجائیں خصوصاً زبور عجم اور جاوید نامہ جن کے اندر بلا مبالغہ جواہرات بھرے ہوئے ہیں مجھ سے نہیں خود اقبال سے سنئے کہ انہوں نے ان کتابوں کے اشعار کو کس قسم کے جواہرات سے سجایا ہے۔

غوطہ ہا زد در ضمیر زندگی اندیشہ ام
تا بروں آوردہ ام افکار پنہان شما

سچ تو یہ ہے کہ اقبال نے زبور عجم اور جاوید نامہ میں بہت سے اشعار موتیوں میں تولنے کے قابل لکھے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی شاہجہاں موجود نہیں ہے اقبال اس دور میں پیدا ہوئے جب جہالت اپنی زمانہ سازی یعنی خوشامد کی مدد سے علمیت اور اسلامیت کی مسند پر متمکن ہوچکی تھی۔

غزل ۴۹

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک
وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی
چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو
کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

●

یہ غزل مسلسل ہے اور اس میں اقبال نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ فطرت نے مجھے غیر معمولی قوتِ غور و فکر عطا نہیں کی ہے لیکن اس کی تلافی اس طرح کر دی ہے کہ مجھے دولت عشق سے مالا مال کر دیا چنانچہ عشق کی بدولت میری خاک یعنی زندگی یا شخصیت میں طاقتِ پرواز پیدا ہو گئی ہے۔

اس کے بعد وہ عاشق کی شخصیت کی بعض خصوصیات بیان کرتے ہیں مثلاً عاشقِ رسولؐ میں جو رنگ جنوں پایا جاتا ہے وہ انسانی عقل کے لئے صیقل (پالش) کا کام دیتا ہے یعنی اس کی بدولت انسان کی عقل تیز ہو جاتی ہے بلکہ فرشتے بھی عاشق کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں عاشق علائق دنیوی سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اس کی نگاہ میں نشیمن (محلات۔ باغات اور خطابات)

کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں جب اس کی آنکھ سے آنسو نکلتے ہیں تو آسمان کے ستارے ان کی آب و تاب دیکھ کر شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ آنسو ستاروں سے بھی زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

غزل ۵
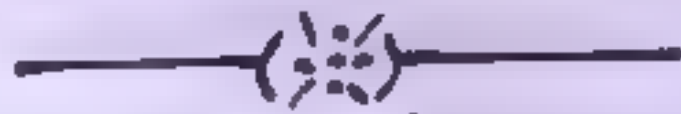
کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

یہ مدرسہ یہ جواں یہ سرور و رعنائی
انہیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد

فقیہِ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمؑ ہے کارِ بے بنیاد

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ میری قوم میں جو لوگ اہل نظر اور صاحب فہم ہیں وہ اس باب میں یقیناً مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہمیں اکتساب علوم و فنون جدیدہ کے لئے نئے علمی مرکز اور فنی ادارے قائم کرنے لازم ہیں کیونکہ جو علوم و فنون آج سے ایک ہزار سال پہلے مسلمانوں کے علمی اداروں میں پڑھائے جاتے تھے وہ اس زمانہ میں ہمارے اقتصادی۔ معاشی۔ تمدنی اور سیاسی مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتے۔

دوسرا شعر:۔ اس شعر میں طنز کا رنگ پایا جاتا ہے جو بال جبریل کی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کالجوں (انگریزی درسگاہوں) میں نوجوانوں کی درستیٔ اخلاق یا تشکیل سیرت پر توجہ نہیں کی جاتی بلکہ انہیں تہذیب و افکار مغرب کا پرستار بنایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو مسجدوں کے بجائے "میخانہ فرنگ" کو آباد کرتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ میں فلسفی اور ملّا دونوں سے بیزار ہوں کیونکہ فلسفی تو ساری عمر منطق اور فلسفہ میں بسر کر دیتا ہے اور تزکیۂ نفس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بالفاظ دیگر فلسفہ سے قوت ذکر مردہ ہو جاتی ہے اب رہا ملّا تو وہ چونکہ کم سواد اور کور ذوق اور تنگ نظر ہوتا ہے اس لئے ملائیت سے قوت فکر مردہ ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو لازم ہے کہ دونوں قوتوں کی صحیح طریق پر تربیت کرے تاکہ مقصد حیات حاصل ہو سکے۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں بھی نہایت لطیف قسم کا طنز پوشیدہ ہے۔ کہتے ہیں کہ میں اگر فقیہ کی صحبت سے اجتناب کرتا ہوں تو اس لئے نہیں کہ اس کی تحقیر مقصود ہے بلکہ اس لئے کہ فقہا کے پاس بیٹھ کر دل زندہ نہیں ہو سکتا

یہ لوگ ظاہر بیں ہوتے ہیں اس لئے ساری توجہ شریعت کے ظاہری پہلو پر کوز کردیتے ہیں۔ تزکیۂ نفس اور درستیٔ اخلاق ان کے پروگرام سے خارج ہے۔

مثلاً زید نے امام کی قرأت جہری کے بعد آمین زور سے کہی (حالانکہ زور سے کہنا ہی سنت ہے) تو مسلمانوں کے ایک طبقہ کے فقہا کے نزدیک اس کی نماز ناقص یا فاسد ہو گئی حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ جب اس نے آمین کہی خواہ زور سے یا آہستہ سے۔ تو وہ تھا کہاں ؟ مسجد میں یا منڈی میں ؟ اللہ کے سامنے یا صاحب کے سامنے ؟

پانچواں شعر:۔ خوب بات کہی ہے ؟ واقعی انسان حکومت اور دولت تو اپنی قوت بازو سے حاصل کرسکتا ہے لیکن "سرمایۂ غم فرہاد" یعنی عشق یہ نعمت جدوجہد سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

چھٹا شعر:۔ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی شاعری میں اسلام حقائق و معارف اس لئے بیان کئے ہیں کہ مسلمانوں کی درسگاہوں اور خانقاہوں کے اندر انقلاب پیدا ہو جائے یعنی ان اداروں کے اساتذہ اور طلبا اپنی عقل خداداد سے بھی کام لے سکیں۔

ساتواں شعر:۔ رشی سے ہندو قوم کے مشہور رہنما مسٹر گاندھی کی طرف اشارہ ہے اور برہمن سے برطانیہ مراد ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر عصا (طاقت) نہ ہو تو کلیمی حکومت سے مقابلہ کرنا سراسر بے معنی ہے عصائے موسوی کے بغیر کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

❀

غزل ۱۵

کی حق سے فرشتوں نے اقبالؔ کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی

●

یہ تین اشعار کی غزل ہے اور اس میں اقبالؔ نے اپنی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ میں نے انسانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہونچاؤ تاکہ تم اس دنیا کو بہتر بنا سکو۔ فطرت کی حنا بندی سے مراد ہے دنیا کی خوبی اور خوبصورتی میں اضافہ کرنا۔

میں اگرچہ خاکی ہوں لیکن خاک سے پیوند نہیں رکھتا میری طرز حیات مادہ پرستانہ نہیں ہے اور میرا زاویۂ نگاہ محدود نہیں ہے بلکہ آفاقی ہے (اور یہی تعلیمات اسلامی کا منشا ہے۔)

میں نے فضیلت آدم کو اس قدر نمایاں کیا ہے کہ فرشتوں کے اندر بھی رشک کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور انسانوں کو اپنے اندر خدائی صفات کا رنگ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔

غزل ۵۲

نے مُہرہ باقی نے مُہرہ بازی — جیتا ہے رومیؔ ہارا ہے رازیؔ
روشن ہے جامِ جمشید اب تک — شاہی نہیں ہے یہ شیشہ بازی
دل ہے مسلماں میرا نہ تیرا — تو بھی نمازی میں بھی نمازی
میں جانتا ہوں انجام اس کا — جس معرکے میں مُلّا ہوں غازی
ترکی بھی شیریں تازی بھی شیریں — حرفِ محبت ترکی نہ تازی
آذر کا پیشہ خارا تراشی — کارِ خلیلانؑ خارا گدازی

تو زندگی ہے پائندگی ہے
باقی ہے جو کچھ سب خاک بازی

■

پہلا شعر:۔ دنیا میں جو لوگ صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں وہ مقصدِ حیات یعنی استرضائے باری میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کامیابی صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو عشق و محبت کی زندگی بسر کرتے ہیں دیکھو مولانا رومیؒ اپنے مقصدِ حیات میں عشق کی بدولت کامیاب ہو گئے اور امام رازیؒ نے عقل کی مدد سے خدا تک پہونچنا چاہا لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے کہ مطلب یہ ہے کہ مقصدِ حیات خدا رسی ہے اور وہ عشق سے حاصل ہو سکتا ہے عقل سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

دوسرا شعر:۔ ملوکیت کے لئے عیاری اور چالاکی ضروری ہے بادشاہوں کو انسانوں پر حکومت کرنے کے لئے شیشہ بازی یعنی عیاری سے کام لینا

پڑتا ہے چنانچہ وہ انسانوں کو غلام بنانے کے لئے نت نئی عیاریوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔ جام جمشید۔ کنایہ ہے عیاری سے۔

مطلب یہ ہے کہ ملوکیت میں عیاری کا طریقہ شروع سے چلا آرہا ہے جام جمشید اب تک کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے اور موجود رہے گا۔

تیسرا شعر:۔ بظاہر مسلمان شرع کی پابندی کرتے ہیں لیکن تزکیۂ نفس کی طرف سے ہم سب غافل رہتے ہیں۔ حالانکہ شریعت کی پابندی کا مقصود یہی ہے کہ نفس امارہ مغلوب ہوسکے۔

چوتھا شعر:۔ چونکہ ملّا جہاد کے جذبہ سے بیگانہ ہوچکا ہے اس لئے وہ کسی معرکہ میں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

پانچواں شعر:۔ محبت کسی خاص قوم باطل یا زبان سے متعلق نہیں ہے بلکہ وہ تو تمام خودساختہ امتیازات کو مٹا دیتی ہے۔ اظہار محبت کے لئے کسی زبان کی قید یا خصوصیت نہیں ہے محبت کا اظہار جس زبان میں بھی کروگے وہ زبان شیریں اور دلپذیر معلوم ہوگی۔

چھٹا شعر:۔ بت پرستوں کا کام تو ہمیشہ سے یہی ہے کہ وہ بت تراشتے رہتے ہیں تاکہ بت پرستی عام ہوجائے پس مسلمان کو لازم ہے کہ وہ اپنے فرض منصبی یعنی بت شکنی سے غافل نہ ہو۔

ساتواں شعر:۔ اے مسلمان! اس نکتہ کو کبھی فراموش نہ کر کہ دنیا میں صرف ایسا دین ہے جو پائندہ ہے اور زندہ رہے گا اس کے علاوہ باطل کی جتنی صورتیں نظر آرہی ہیں سب مٹ جانے والی ہیں ان کو دوام حاصل نہیں ہوسکتا۔

ــــــــــــ

غزل ۵۳

گرم فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ
وائے وہ رہرو کہ ہے منتظرِ راحلہ

تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ

دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد
سالکِ رہ ہوشیار سخت ہے یہ مرحلہ

اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ

تیرے نفس سے ہوئی آتشِ گل تیز تر
مرغِ چمن! ہے یہی تیری نوا کا صلہ

•

پہلا شعر:۔ راحلہ سے یہاں وہ جانور مراد ہے جس پر اسباب سفر لادا جائے مطلب یہ ہے کہ اے مخاطب! زمانہ کسی کے لئے انتظار نہیں کرسکتا۔ پس اگر تو منزلِ مقصود پر پہونچنا چاہتا ہے تو اپنی زندگی کا ہر لمحہ سفر کی تیاری میں صرف کر۔ افسوس ہے اس رہرو پر جس کا قافلہ روانہ ہو رہا ہو اور وہ راحلہ کا منتظر ہو۔ قافلہ یقیناً اسے تنہا چھوڑ کر روانہ ہو جائے گا

دوسرا شعر:۔ اے مسلمان! تو جس دین کا پیرو ہے وہ عمل صالح اور جدوجہد کا علم بردار ہے یعنی اسلامی زندگی سراپا عمل ہے لہذا خانقاہی

زندگی یعنی رہبانیت تیرے مزاج کے موافق نہیں ہو سکتی اگر تو رہبانیت اختیار کرے گا تو اسلامی زاویۂ نگاہ سے کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو اسلامی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے تو تجھے لازم ہے کہ اپنی عقل کو اپنے دل کے تابع کر یعنی عشق کا راستہ اختیار کر اگر تیرا دل خرد کا غلام ہو گیا تو مقصد حیات حاصل نہیں ہو سکے گا۔

چوتھا شعر:۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ مجھے زمانہ نے مبتلائے مصائب کر رکھا ہے سمجھ لو کہ ابھی تک اس نے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک نہیں پہونچایا کیونکہ جب خودی کامل ہو جاتی ہے تو گردشِ دوراں پر حکمراں ہو جاتی ہے یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے اسی لئے انہوں نے اس کو ہر کتاب میں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ مومن کبھی گردشِ روزگار کی شکایت نہیں کرتا کیونکہ وہ تو اس کے تابع فرمان ہوتی ہے۔

پانچواں شعر:۔ اے بلبل! تیرے نغموں سے گلاب کی رنگت اور بھی پھوٹ نکلی ہے عاشق کی بدولت معشوق حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور یہی تیری آہ و فریاد کا صلہ ہے جو فطرت کی طرف سے تجھے مل سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ عاشق کی نواسنجی اور خون آشامی کا صلہ اسے اس شکل میں ملتا ہے کہ معشوق کی دلکشی اور شہرت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

غزل ۱۴۵

مری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج
کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیّری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

مجھے یہ ڈر ہے مقامر ہیں پختہ کار بہت
نہ رنگ لائے کہیں تیرے ہاتھ کی خامی

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ؟

قبائے علم و ہنر لطفِ خاص ہے ورنہ
تری نگاہ میں تھی میری ناخوش اندامی

•

پہلا شعر: میرے کلام (پیغام) سے عالم اور جاہل دونوں کے اندر زندگی پیدا ہوگئی ہے کیونکہ اس کی بدولت ان میں شراب نوشی (عشق) کا ذوق پیدا ہوگیا ہے۔

دوسرا شعر: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حرم کعبہ میں کوئی اللہ کا بندہ

(عاشق) اپنی واردات عشق بیان کر رہا ہے جس کی تاثیر سے حاجیوں میں بھی عشق و مستی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

جامۂ احرام، فقہ کی اصطلاح میں اُن بغیر سلے ہوئے دو کپڑوں کو کہتے ہیں جو حاجی حج کے موقع پر استعمال کرتے ہیں اس کو محاورہ میں احرام باندھنا کہتے ہیں۔ ایک کپڑے کو بطور تہمد باندھ لیتے ہیں اور دوسرے کو کاندھوں پر ڈال لیتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ مقامِ شبیری سے اللہ کی محبت مراد ہے جس کا مظاہرہ جناب شبیرؓ نے کربلا کے میدان میں دنیا کے سامنے کیا۔

اندازِ کوفی و شامی سے اہل کوفہ کی بیوفائی اور اہل شام کی سنگدلی کی طرف اشارہ ہے اس شعر میں اقبالؔ نے جو بات کہی وہ تو نئی نہیں لیکن اس کے کہنے کا انداز بیشک نیا ہے اور اس جدّتِ اسلوب ہی کی بدولت اس میں دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کرنا یہ اسلام کی روح ہے اور ایسی صداقت ہے جس میں قیامت تک کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی ساری دنیا ابدالآباد تک اس حقیقت کا اعتراف کرتی رہے گی۔ لیکن کوفیوں کی غدّاری اور شامیوں کی سنگدلی پر ایک فانی اور مٹ جانے والی بات ہے دیکھ لو شبیرؓ کا نام آج بھی زندہ ہے اور دوست دشمن دونوں اس کی عظمت کے آگے سر جھکاتے ہیں اور کوفیوں اور شامیوں کو کوئی شخص بھولے سے بھی یاد نہیں کرتا۔

چوتھا شعر:۔ مقام، لغوی معنی جواری لیکن یہاں اس سے انگریز قوم مراد ہے۔ جس کی عیاری دنیا میں ضرب المثل ہے۔ پختہ کار

بمعنی تجربہ کار یا چالاک۔ ہاتھ کی خامی۔ قمار بازوں کی اصطلاح ہے یعنی پانسہ پھینکنے میں عدم مزاولت۔ یہاں مراد ہے سادہ لوحی یا ناتجربہ کاری۔ رنگ لانا محاورہ ہے۔ یہاں اس سے بر انتیجہ برآمد ہونا مراد ہے اقبال مسلمانوں سے خطاب کرتے ہیں کہ انگریز قوم بڑی عیارہے اور تو بھولا اور بہت ناتجربہ کار ہے مجھے اندیشہ ہے کہ تو کہیں مات نہ کھا جائے۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے منطق اور فلسفہ سے قطع نظر کرکے جذباتی رنگ میں یہ بات کہی ہے کہ گو مسلمان تو کسی عزت کے مستحق نہیں ہیں لیکن اللہ کے فضل و کرم سے کچھ بعید نہیں۔ اگر وہ انہیں دوبارہ سلطان سنجر کی سی شان و شوکت اور حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامی کی سی شانِ فقر عطا کردے۔

اقبال نے سلطان سنجر کا تذکرہ اس لئے کیا کہ مشرق میں اس سے زیادہ شان و شوکت والا بادشاہ شاید ہی کوئی اور گذرا ہو۔ چنانچہ اس کی عظمت و شوکت و سطوت کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب حضرت امام غزالیؒ اس کے دربار میں تشریف لائے تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر ان کے بدن میں رعشہ طاری ہو گیا اگرچہ سلطان نے ان کی انتہائی تعظیم و تکریم کی۔ تخت شاہی سے اتر کر استقبال کیا اور اپنے برابر مسند پر جگہ دی لیکن اس کے باوجود ہیبت کا اثر دور نہ ہوا تو امام صاحب نے اس قاری سے جو اُن کے ہمراہ تھا۔ درخواست کی مجھے کوئی آیت سناؤ۔ قاری چونکہ موقع شناس تھا اس نے یہ آیت پڑھی۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ۔ یعنی کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے تب جا کر ان کا دل قابو میں آیا اور حواس بجا ہوئے اس کے بعد پھر امام

صاحب نے سلطان کی فرمائش پر ایک عالمانہ تقریر ارشاد فرمائی ۔

حضرت جنید بغدادیؒ جو صوفیا کے طبقۂ ثانیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور سید الطائفہ کے لقب سے مشہور ہیں بلاشبہ اولیائے کبار میں سے ہیں اور ان کا نام غایتِ شہرت کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں ہے تیسری صدی کے شروع میں بغداد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والدین نے جو ایرانی النسل تھے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ جوانی میں حضرت سری سقطیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور زہد و اتقا کی بدولت طبقۂ صوفیا میں بہت بلند مرتبہ حاصل کیا چنانچہ حضرت شبلیؒ کا قول ہے کہ اِمَامُنَا فِیْ هٰذَا الْعِلْمِ وَمَرْجِعُنَا الْمُقْتَدٰی بِهِ الْجُنَیْدُ ۔ ایک دن خلیفۂ بغداد نے اپنے کسی مصاحب کو بے ادب کہہ کر پکارا تو اس نے کہا کہ اب مجھ سے بے ادبی کا صدور نہیں ہو سکتا کیونکہ میں نصف دن تک حضرت جنیدؒ کی خدمت میں رہ چکا ہوں۔ ۲۹۸ھ میں وفات پائی ۔

حضرت بایزید بسطامیؒ طبقۂ اولیٰ سے تعلق رکھتے ہیں دوسری صدی کے آخر میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۳۱ھ میں وفات پائی۔ طبقۂ صوفیا میں اتباعِ شریعت کے لئے ان کا نام ضرب المثل ہو گیا ہے ان کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے جس میں خود ان کی شخصیت منعکس ہے ۔ الاستقامۃ فوق الکرامۃ یعنی شریعت اسلامیہ پر استقامت دکھانا۔ کرامت دکھانے سے بڑھ کر ہے یا یوں سمجھو کہ سب سے بڑی کرامت جو ایک مسلمان سے ظاہر ہو سکتی ہے یہ ہے کہ وہ اتباعِ شریعت میں کامل ہو۔

چھٹا شعر:۔ یہ شعر اقبالؔ نے حمد و ثنا کے رنگ میں لکھا ہے کہتے ہیں کہ اے مولائے کریم! میں بذاتِ خویش اس لائق نہ تھا کہ تو مجھے علمِ

فضل کی بدولت اس قدر فراوانی کے ساتھ عطا فرماتا۔ لیکن یہ محض تیرا لطف خاص ہے جو تو نے مجھ عاجز اور مسکین بندے پر ارزانی فرمایا ہے۔

ناخوش اندامی کے لغوی معنی ہیں کسی شخص کے جسم کا ایسا بے ڈھنگا ہونا کہ کوئی لباس اس پر موزوں نظر نہ آئے۔ اقبال یہ لفظ قبائے علم و ہنر کی رعایت کے لئے لائے ہیں یعنی میرا جسم علم کی اس قبا کے لئے موزوں نہیں تھا جو تو نے عطا فرمائی ہے۔

غزل ۵۵

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا مہ نو
کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دل سوز
کہ ساز گار نہیں یہ جہانِ گندم و جو

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

●

پہلا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ حصول کمال کے لئے جدوجہد لازمی ہے۔

دوسرا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ مرشد کی توجہ کے بغیر اگر کوئی شخص اپنی ذاتی کوشش سے کوئی روحانی مرتبہ حاصل کر بھی لے تو دنیائے روحانیت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے جس طرح وہ غنچہ جسے آفتاب کی روشنی نصیب نہیں ہوتی اگر اپنی ذاتی خاصیت کی بنا پر شگفتہ بھی ہو جائے تو اس میں وہ رنگت یا خوشبو پیدا نہیں ہو سکتی جو اس غنچہ میں پیدا ہو سکتی ہے جسے آفتاب کا پرتو بھی نصیب ہو جائے۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ اللہ نے انسان کے دل کو اس کی نگاہ کے تابع بنایا ہے پس اگر تو دل کی پاکیزگی کا آرزومند ہے تو اپنی نگاہ کے اندر پاکیزگی (عفت) کا رنگ پیدا کر دے۔

واضح ہو کہ عفتِ نگاہ جو منجملہ خصوصیاتِ اسلام ہے، شانِ فقر سے پیدا ہو سکتی ہے اور شانِ فقر عشق رسولؐ پر موقوف ہے چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد

فقر کا مقصود ہے عفّتِ قلب و نگاہ

چوتھا شعر:۔ جہاں گندم و جو، کنایہ ہے مادیات کی دنیا سے اور "لالہ دل سوز" کنایہ ہے عشق و محبت کی دنیا سے۔ مطلب یہ ہے کہ اس مادہ پرست دنیا میں عشق اور عاشقوں کی نہ جگہ ہے نہ قدر و منزلت ہے کیونکہ اس دنیا کے رہنے والے عموماً ظاہر بیں ہوتے ہیں اور انسان کی خوبی کا اندازہ اس کی سیرت کی بلندی سے نہیں کرتے بلکہ موٹر کے ماڈل اور شوفر کے لباس کو انسانی شرافت اور عزت کا معیار سمجھتے ہیں دنیا کے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ فلاں شخص کتنا بڑا عالم ہے بلکہ اس پر نظر کرتے ہیں کہ اس کی جاگیر کا رقبہ کتنا بڑا ہے سچ کہا ہے اقبال نے کہ یہ جہان گندم

دجو کا ہے علم و فضل کا نہیں ہے۔

پانچواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں بادشاہوں کی فتوحات کا چرچا محض چند روز تک رہتا ہے پھر دنیا انہیں اور ان کی فتوحات دونوں کو بھول جاتی ہے لیکن عاشقوں کی قربانی کا ذکر ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھ لو! آج کتنے لوگ ہیں جو سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان شہاب الدین غوری کے کارناموں سے واقف ہیں؟ لیکن لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کا نام آج بھی بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

دوسرے مصرع میں لفظ شیریں میں صنعت ایہام پائی جاتی ہے شیریں سے دلچسپ شئے بھی مراد ہو سکتی ہے اور فرہاد کی معشوقہ بھی۔

سلطان شہاب الدین غوری وہ نامور اور خوش نصیب بادشاہ گذرا ہے جس نے ۱۱۹۲ء میں تراوڑی (ضلع کرنال) کے نزدیک ہندوستان کے آخری ہندو حکمراں پرتھوی راج کو شکست فاش دے کر اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت قائم کر دی ۱۲۰۶ء میں ایک بدبخت باطنی فدائی نے رات کے وقت سوتے میں شیر بیشہ شجاعت کو دھوکہ سے قتل کر دیا۔ وجہ یہ ہے کہ سلطان چونکہ دین اسلام کا شیدائی تھا اس لئے اس نے ملتان اور اس کے گرد و نواح میں اس فرقہ ضالہ مبتدعہ کا قلع قمع کر دیا تھا۔

سلطان قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء) ہندوستان جنت نشاں کا پہلا مسلمان فرمانروا۔ سلطان شہاب الدین غوری کا معتمد غلام اور سپہ سالار اور نائب السلطنت تھا۔ نہایت شریف النفس شجاع عادل اور سخی سلطان گذرا ہے۔ تاریخوں میں اس کا لقب "سالکھ بخش" ہے اس کی قبر لاہور کے ایک کوچہ میں قوم کی بے حسی کا مرثیہ پڑھتی رہتی ہے۔

غزل ع۵۶

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدّت سے خموش

میں نے پایا ہے اسے اشکِ سحر گاہی میں
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش

نئی تہذیب تکلّف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش

صاحبِ ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے
گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

●

پہلا شعر:۔ اے مسلمان! اس دنیا کے علاوہ جو تجھے آنکھوں سے نظر آتی ہے جس میں صبح و شام ہوتی رہتی ہے ایک باطنی دنیا اور بھی ہے جس میں نہ ماضی ہے نہ مستقبل ہے بلکہ ہر وقت ایک ہی وقت رہتا ہے یعنی حال اگر تو اپنی خودی کو اس کے انتہائی نقطۂ کمال تک پہونچا دے یعنی اس کے اندر خدائی صفات کا عکس پیدا کرے (فنا فی اللہ کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان اپنے اندر خدائی صفات کا عکس پیدا کرے جسے قرآن مجید نے صبغۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے) تو تجھ کو بھی اس جہاں سے آگاہی حاصل ہو سکتی ہے بالفاظ دگر

جب تو دنیاوی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جائے گا تو تجھے اس روحانی زمان (TIME) کا باطنی طور پر احساس ہوگا جس میں نہ فردا ہے نہ دوش لیکن اس کے لئے تجھے اپنے اندر جمالِ خداوندی کا عکس پیدا کرنا لازمی ہے کیونکہ اس کے جمال میں یہ وصف ہے کہ زمانہ ہر وقت "حال" میں رہتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اللہ کی اسی شانِ جمال کو اس طرح واضح کیا ہے۔

کیا بات ترے جمال میں ہے
ہر وقت زمانہ حال میں ہے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جس طرح اللہ زمان و مکان سے بالاتر ہے مومن بھی جب مرشد کامل کی توجہ سے اپنے اندر صفات ایزدی کا عکس پیدا کر لیتا ہے تو زمان و مکان سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

دوسرا شعر:- چونکہ مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں جہاں لوگوں کو عشق الٰہی یا معرفت کی شراب پلائی جاتی ہے، مدتوں سے خاموش اور سنسان پڑی ہوئی ہیں اس لئے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان قوم کل یعنی زمانہ مستقبل میں کوئی ہنگامہ برپا کرے گی یا نہیں۔ اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے۔

ایں مسلماں از پرستاران کیست
در گریبانش یکے ہنگامہ نیست

تیسرا شعر:- جب ایک مسلمان پچھلی رات کو اللہ کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے اور آنسوؤں سے اپنی ندامت کا اظہار کرتا ہے تو وہ آنسو موتیوں سے بڑھ کر قیمتی اور خوبصورت ہوتے ہیں بلکہ یہ آنسو وہ موتی ہیں جو کسی صدف سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

چوتھا شعر:۔ مغربی تہذیب سراسر تصنع پر مبنی ہے لیکن جس شخص کا چہرہ ایمان کے نور سے روشن ہو اسے غازہ اور گلگونہ کی حاجت نہیں ہوتی۔

پانچواں شعر:۔ صاحب ساز سے مراد ہے وہ سالک جو اپنے باطن کی اصلاح کر رہا ہو۔ اقبال نے دوسرے مصرع میں ساز کی مناسبت سے آہنگ کا لفظ استعمال کیا ہے آہنگ کے لغوی معنی سرود یا نغمہ کے ہیں غلط آہنگ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی راگنی کو غلط طریقہ سے گائے یا بجائے سروش کے لغوی معنی فرشتہ یا آوازِ غیب کے ہیں لیکن یہاں اس سے کشف مراد ہے۔

اقبال نے اس شعر میں تصوف کا ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی سے اپنی وحی کا مطلب سمجھنے میں غلطی کا امکان نہیں ہے لیکن ایک ولی یا صاحب کشف کا کشف کبھی غلط بھی ہوتا ہے یعنی کبھی اس سے اس کا مطلب سمجھنے میں غلطی بھی ہو جاتی ہے اس لئے علمائے کرام کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اولیاء کا کشف حجت شرعی نہیں ہو سکتا اس لئے اقبال نے سالکِ راہ طریقت کو متنبہ کیا ہے کہ اس بات کو یاد رکھنا چاہئے کہ کشف کی تاویل میں بھی غلطی ہو سکتی ہے اور اس میں استدراج شیطانی کا رنگ بھی پایا جا سکتا ہے اس لئے لازم ہے کہ سالک اپنے کشف پر اعتماد نہ کرے بلکہ ہر کشف کو کتاب اور سنت پر پیش کر کے دیکھے اگر ان کے مطابق و موافق ہو تو القائے ربانی سمجھے ورنہ استدراج شیطانی قرار دے کر رد کرے۔ ع

گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش

یعنی کبھی کبھی کشف کے سمجھنے اور اس کی صحیح تاویل کرنے میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ سید الاولیاء غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز

فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حالت کشفی میں ابر کے اندر سے نور ظاہر ہوا اور اس میں سے آواز آئی کہ، اے عبدالقادر! میں تیرا رب ہوں اور تجھ سے راضی ہوں پس اب تجھ پر پابندی شریعت ضروری نہیں ہے۔ یہ سن کر میرا ذہن فوراً اس آیت کی طرف منتقل ہوا کہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ. چونکہ یہ کشف اس آیت کے خلاف تھا اس لئے میں نے تیسرا کلمہ پڑھا چنانچہ شیطان میرے سامنے آیا اور کہا کہ آپ واقعی بہت خوش نصیب ہیں جو میرے پھندے سے نکل گئے ہیں۔ میں نے تو اس طریقہ سے صدہا اولیاء کو گمراہ کر چکا ہوں۔

غزل ۵۷

تھا جہاں مدرسۂ شیری و شاہنشاہی
آج ان خانقہوں میں ہے فقط روباہی

نظر آئی ہے نہ مجھے قافلہ سالاروں میں
وہ شبانی ہے کہ تمہیدِ کلیم اللّٰہی

لذتِ نغمہ کہاں مرغِ خوش الحان کے لئے
آہ اس باغ میں کرتا ہے نفس کوتاہی

ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک
ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی

پہلا شعر:۔ جب مسلمان اسلام کی روح سے آشنا تھے تو ان کی خانقاہوں میں سربلندی اور کامرانی کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن آج ان میں حرف خوشامد اور دنیا طلبی کا درس دیا جاتا ہے۔

دوسرا شعر:۔ قوم کے رہنماؤں کی زندگی میں وہ پاکیزگی نظر نہیں آتی جو ان کو انعامات الٰہیہ کا مستحق بنا دے۔

شبانی کے لغوی معنی ہیں۔ گلہ بانی۔ یہاں مراد ہے ترکِ علائقِ دنیوی یا شانِ فقر۔ تمہید کلیم اللٰہی سے مراد ہے۔ نزول رحمت باری کا آغاز۔

تیسرا شعر:۔ اس دنیا میں راستباز انسان رحمت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ راحت تو بڑی چیز ہے انسان اس دنیا میں اگر سچ بولنا چاہے تو اس کی راہ میں صدہا دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات وہ چاہتا بھی ہے تو سچ نہیں بول سکتا اس کا نفس شدت مخالفت دنیا کی وجہ سے کوتاہی کرنے لگتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ فلسفہ اور عشق دونوں کا نتیجہ سرمستی اور حیرت ہے لیکن جو حیرت فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے وہ سر یا تاریک ہوتی ہے یعنی فلسفی شک اور شبہ کی تاریکی میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کی ساری عمر دلائل و براہین مرتب کرنے میں بسر ہو جاتی ہے لیکن ہستی باری پر یقین کامل دل میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

مگر جو حیرت عشق سے پیدا ہوتی ہے وہ سراسر آگاہی ہوتی ہے یعنی عاشق (صاحب فقر) کو اللہ کی ہستی پر یقین کامل پیدا ہو جاتا ہے۔

واضح ہو کہ فلسفہ اور عشق میں وہی فرق ہے جو شنیدن اور دیدن میں ہے اسی لئے عقلاء نے کہا ہے۔ ع شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

ایک دن حکیم ابو علی ابن سینا۔ حضرت سلطان ابو سعید ابو الخیر کی خدمت

میں آیا اور ان کو اپنی مشہور کتاب "اشارات" کا وہ حصہ پڑھ کر سنایا جس میں اس نے خدا کی ہستی کا عقلی دلائل سے اثبات کیا ہے جب وہ چلا گیا تو انہوں نے اپنے مریدوں سے ارشاد فرمایا "آنچہ او می داند ما می بینیم"

پس دیکھنے کے بعد جو مستی اور حیرت پیدا ہوتی ہے وہ تمام آگاہی ہوتی ہے

پانچواں شعر: ظلمت شب سے مراد ہے بیدینی اور الحاد کی وہ فضا جس میں موجودہ زمانہ کے مسلمان زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے کلام میں جو حقائق و معارف بیان کئے ہیں چونکہ وہ قرآن سے ماخوذ ہیں اس لئے بجلی کی طرح چمکتے ہیں تاکہ اس زمانہ کے لوگ کفر کی تاریکی سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آجائیں اور گمراہ ہونے سے محفوظ ہو جائیں۔

غزل ۵۸

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان[1] خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسّس
جی سکتے ہیں بے روشنیِ دانش و فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

■

[1] سلمان مسعود سعد سلمان غزنوی دور کا نامور ایرانی شاعر جو غالباً لاہور میں پیدا ہوا تھا۔

پہلا شعر:۔ خوش آہنگ یعنی وہ شخص جس کی طرز شاعری دلپذیر ہو کہتے ہیں کہ مجھے سلمان کا یہ شعر بہت پسند ہے جس میں اس نے یہ نکتہ دلپذیر بیان کیا ہے کہ جفاکش انسان کبھی گردش روزگار کی شکایت نہیں کرتا اگر اسے اپنے وطن میں روزی نہیں ملتی تو وہ بخوشی ترک وطن کر دیتا ہے اور اپنی ہمت اور قوت سے دوسرے ملک میں جاکر کسب معاش کرتا ہے۔ چونکہ سلمان کا یہ شعر اقبال کے مسلک کے مطابق ہے اس لئے انہوں نے اس کے فارسی شعر کا مضمون اپنے اس شعر میں نظم کر دیا۔

دوسرا شعر:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی بسر کرنے کے لئے دانش و فرہنگ یعنی منطق و فلسفہ دانی کی چنداں ضرورت نہیں ہے اگر کسی شخص میں چیتے کا سا حوصلہ اور شاہین کی سی نگاہ ہو تو وہ علوم وفنون عقلیہ میں مہارت کے بغیر بھی اس دنیا میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

تیسرا شعر:۔ اے مخاطب! اگر تو اس دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنی چاہتا ہے تو بلبل اور طاؤس کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ ہرگز نہ بنانا یہ دونوں پرندے ضعیف اور عاجز ہیں ان میں کوئی باطنی خوبی نہیں پائی جاتی بلبل کے پاس آواز کے سوا اور طاؤس کے پاس رنگ کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ آواز اور رنگ سے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس کے لئے جسمانی طاقت کی ضرورت ہے۔

ان تینوں شعروں کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے انسان کو اپنے اندر طاقت اور حوصلہ پیدا کرنا لازمی ہے۔

٭٭٭

غزل ۵۹

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

علم فقیہ و حکیم فقر مسیح[۱] و کلیم[۲]
علم ہے جویائے راہ فقر ہے دانائے راہ

فقر مقامِ نظر علم مقامِ خبر
فقر میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ

علم کا موجود اور فقر کا موجود اور
اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ

•

حقائق و معارف کے اعتبار سے یہ غزل بالِ جبریل کی بہترین غزلوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے اس میں اقبالؔ نے علم (عقل) اور فقر (عشق) کا موازنہ

کر کے فقر کی فضیلت واضح کی ہے چونکہ موازنہ کے سلسلہ میں انہوں نے اپنے فلسفہ کی وضاحت بھی کردی ہے۔ اس لئے یہ غزل ہماری خاص توجہ کی مستحق ہے۔

پہلا شعر:۔ کہتے ہیں کہ تاج و تخت و سپاہ عزت اقتدار اور سربلندی یہ سب شان فقر ہی کے معجزات ہیں یعنی اس کی بدولت دین اور دنیا دونوں میں عزت اور سروری حاصل ہوسکتی ہے بلکہ فقیر درحقیقت بادشاہوں سے بڑھ کر ہوتا ہے اس کی مثالیں سابقہ اشعار کی تشریح کے سلسلہ میں گذر چکی ہیں۔

دوسرا شعر:۔ اس مختصر تمہید کے بعد اقبال علم اور فقر میں موازنہ کرتے ہیں کہتے ہیں کہ علم (حکمت فلسفہ اور سائنس) کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی عقل میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ استدلال اور استنباط مسائل میں غلطی نہ کرے لیکن فقر کی غایت یہ ہے کہ قلب و نظر دونوں گناہ یعنی اللہ کی نافرمانی سے محفوظ ہو جائیں فلسفہ انسان کو حکیم بنا سکتا ہے متقی اور خدا ترس نہیں بنا سکتا۔

اس شعر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ علم اور فقر دونوں کا دائرہ عمل مختلف ہے اور دونوں انسان کے لئے ضروری ہیں لیکن فقر کو علم پر فوقیت حاصل ہوسکتی ہے کیونکہ اللہ کی نظر میں مکرم اور لائق عزت وہ شخص ہے جو متقی ہو نہ کہ وہ جو فلسفی ہو متقی کو شریعت کی رو سے فلسفی پر فضیلت حاصل ہے چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ یعنی اللہ کی نظر میں تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

تیسرا شعر:۔ علم انسان کو فقیہ یا فلسفی تو بنا سکتا ہے لیکن نہ اللہ سے ہم کلامی کا شرف عطا کر سکتا ہے اور نہ میدان جہاد میں سرفروشی پر آمادہ کر سکتا ہے دوسرا فرق یہ ہے کہ عالم راہِ حق کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے لیکن فقیر خدا تک پہونچ جاتا ہے۔

چوتھا شعر:۔ فقر سے انسان میں وہ نظر پیدا ہو جاتی ہے جس کی بدولت وہ حقیقت کو دیکھ سکتا ہے لیکن علم انسان کو حقیقت سے آگاہ نہیں کر سکتا اسی لئے اقبالؔ نے یہ کہا ہے کہ

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اسی لئے فقر سے جو مستی پیدا ہوتی ہے وہ انسان کے حق میں مفید ہے لیکن علم سے جو مستی پیدا ہوتی ہے وہ مضر ہے کیونکہ علم آگاہی کے مقام تک نہیں پہونچ سکتا اس لئے بسا اوقات گمراہی کا باعث ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے ہمیں متنبہ کر دیا ہے کہ

ایک سرمستی و حیرت ہے سراپا تاریک
ایک سرمستی و حیرت ہے تمام آگاہی

پانچواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عالم (متکلم) اور فقیر (صوفی) دونوں توحید الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں لیکن عالم کے ذہن میں اللہ کے موجود ہونے کا مفہوم صوفی کے مفہوم سے مختلف ہوتا ہے عالم جب یہ کہتا ہے کہ اللہ موجود ہے تو وہ اس کو خالق اور صانع کائنات کا تصور کرتا ہے جو اس کائنات سے بالکل جدا بلکہ وراء الورا ہے اس لئے وہ خدا کے علاوہ کائنات کا بھی حقیقی وجود تسلیم کرتا ہے لیکن جب صوفی یہ کہتا ہے کہ اللہ موجود ہے تو وہ اس کے علاوہ اور کسی شے کو حقیقی معنی میں موجود نہیں سمجھتا ۔ اور کائنات کے وجود کو اس کی صفات کا پرتو یعنی ظل قرار دیتا ہے اسی لئے وہ ذات باری کو لعینہٖ محیط کائنات یقین کرتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ جب ایک مسلمان اپنی خودی کو فقر کی سان پر چڑھا لیتا ہے یعنی جب اس کے اندر شان فقر پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس اکیلے آدمی میں

پوری فوج کی طاقت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس شعر میں فقر کو "سان" سے تعبیر کیا ہے لیکن ضرب کلیم میں توحید الٰہی کو بمنزلہ سان قرار دیا ہے۔ ع

خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اس سے معلوم ہوا کہ فقر اور توحید الٰہی دونوں میں شدید مناسبت پائی جاتی ہے یعنی فقر توحید سے جدا کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں عقیدہ کے لحاظ سے دیکھو تو توحید ہے۔ عمل کے اعتبار سے دیکھو تو فقر ہے جب ایک مسلمان عقیدۂ توحید کو اپنی عملی زندگی سے ظاہر کرتا ہے تو وہی عقیدہ فقر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ مسلمان اپنی خودی کو مرشد کامل کی توجہ کے بغیر از خود فقر کی سان پر نہیں چڑھا سکتا اگر یہ صورت ممکن ہوتی تو اللہ تعالیٰ دنیا میں بعثت انبیاء کا سلسلہ قائم نہ فرماتا محض کتاب آسمان سے نازل ہو جایا کرتی لیکن قرآن مجید شاہد ہے کہ اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض نبوت و رسالت میں تزکیۂ نفوس انسان کو بھی شامل فرمایا ہے چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری بعثت کا حقیقی مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ تزکیۂ نفس ہی کا دوسرا نام تکمیل مکارم اخلاق ہے اقبال نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

ہے وہی تیرے زمانہ کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

یعنی اقبالؔ کی رائے میں مسلمانوں کی امامت اور رہنمائی کا اہل وہی شخص ہو سکتا ہے جو ان کے اندر شانِ فقر پیدا کر سکے۔

ساتواں شعر:۔ اے مسلمان! اگر تو اپنے دل کو زندہ کرے تو یہ ساری کائنات تیری تابع فرمان ہو جائے گی۔

دل کو زندہ کرنے کا طریقہ اقبال اس سے پہلے واضح کر چکے ہیں کہ دل شانِ فقر سے زندہ ہو سکتا ہے اور شانِ فقر مرشدِ کامل کی صحبت اختیار کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے اور مرشدِ کامل وہ ہے جس کا سلسلہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں سے کسی غلام سے ملتا ہو۔

غزل ۶۰

کمالِ جوشِ جنوں میں رہا میں گرمِ طواف
خدا کا شکر سلامت رہا حرم کا غلاف

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازیؔ نہ صاحبِ کشاف

سرور و سوز میں ناپائدار ہے ورنہ
مئے فرنگ کا تہ جرعہ بھی نہیں ناصاف

پہلا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ مومن جب مقام فقر پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی میں جذب و مستی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے لیکن چونکہ اس کی مستی تمام تر آگاہی ہوتی ہے اس لئے وہ جوش جنوں کے کمال میں بھی شریعت کی پابندی سے غافل نہیں ہوتا اور اس کے کسی قول یا فعل سے حرم کے خلاف (احکام) شریعت کی توہین نہیں ہو سکتی۔

دوسرا شعر:۔ اس شعر میں طنز کا رنگ پایا جاتا ہے جو بال جبریل کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے مطلب یہ ہے کہ فقہا چونکہ عموماً ظاہر بین ہوتے ہیں اس لئے ارباب طریقت پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔

تیسرا شعر:۔ افلاطون دورِ قدیم کے خدا پرست حکماء کا سرتاج ہے ۴۲۶ ق م میں یونان کے مشہور شہر ایتھنز میں پیدا ہوا اور ۳۴۷ ق م میں وفات پائی۔ مسلمان حکماء اس کو افلاطون کے لقب سے یاد کرتے ہیں اس نے اپنے شہرۂ آفاق مکالمات میں سے ایک مکالمہ موسوم بہ ٹائی میئس (timaeus) میں حکمائے یونان کے عام روش کے خلاف خدا کو صرف علت تامہ ہی ثابت نہیں کیا ہے بلکہ اُسے ہر قسم کی خیر و خوبی اور پاکیزگی کا سرچشمہ بھی قرار دیا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس مصرع میں افلاطون سے فرد معین مراد نہیں لیا ہے بلکہ خدا پرست حکماء کی پوری جماعت مراد لی ہے جو اللہ کو عقلی دلائل سے ثابت کرتی ہے۔ غیب سے مراد ہے شک اور حضور سے مراد ہے یقین۔ اعراف۔ یہ لفظ مسلمانوں کے ادب میں قرآن مجید سے آیا ہے۔ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ (۷، ۴۶) اور مقام اعراف پر کچھ لوگ ہوں گے جو (اہل جنت اور اہل نار) سب کو ان کے نشانوں سے پہچانتے ہوں گے چونکہ اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان واقع ہے اس لئے اردو ادب میں اس کے معنی درمیانی حالت

کے ہوگئے شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں۔ ؏

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

شعر کا مطلب یہ ہے کہ حکماء اور فلاسفر چونکہ عقل کو اپنا رہنما بناتے ہیں اس لئے ان کے دل میں یقین کی کیفیت کبھی نہیں ہوسکتی ان کی حالت عموماً یہ ہوتی ہے کہ عقلی دلائل سے کبھی تو ان کے اندر ہستی باری تعالیٰ پر یقین کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے اور کبھی وہ شکوک میں گرفتار ہوجاتے ہیں کامل یقین جس میں شک کی گنجائش نہ ہو صرف حضرات انبیائے کرام کی اتباع سے نصیب ہوسکتا ہے۔

چوتھا شعر:- امام رازی پر تعارفی سطور اس سے پہلے لکھ چکا ہوں وہاں دیکھ لیجئے۔ صاحب کشاف سے ابوالقاسم محمود ابن عمر بن محمد بن عمر الخوارزمی الزمخشری مراد ہیں۔ جو تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ اصول حدیث و فقہ۔ عقائد۔ کلام۔ نحو۔ صرف۔ لغت۔ معانی اور بیان میں بقول ابن خلکان اپنے وقت کے امام گذرے ہیں۔ یوں تو انہوں نے ہر فن میں اپنے کمالات کا اظہار کیا ہے لیکن ان کی تین کتابیں بہت مشہور ہیں۔ تفسیر میں کشاف۔ لغت میں اساس البلاغۃ اور نحو میں المفصل۔ علمائے اسلام کی رائے میں دنیائے اسلام میں صرف دو شخص ایسے گذرے ہیں جو عربیت کے نام سے قرآن عزیز کے معجزہ ہونے کی حقیقت سے آگاہ ہوسکے ایک شیخ عبدالقاہر جرجانی صاحب تلخیص المفتاح دوسرے امام موصوف صاحب کشاف ۵۳۸ھ میں وفات پائی۔

میری رائے میں اقبالؔ نے یہ شعر اس آیت کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (۱۶-۴۴)

اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ کے اوپر اس غرض سے نازل کیا ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے اس کے وہ مطالب (حقائق و معارف) کھول کر بیان کردیں جو (احکام)

انہی کے لئے نازل کئے گئے ہیں تاکہ ہمارا فعل تنزیل بار آور ہو سکے اور قرآن کے نزول کا مقصد پورا ہو سکے۔

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطالب کو لوگوں پر واضح فرما دیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان مبارک سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ کے صحیح مصداق ہوں یعنی جو اس کتاب کی تلاوت کے وقت یہ محسوس کریں کہ یہ کلام پاک ان پر نازل ہو رہا ہے۔ اقبال نے ان دو باتوں سے یہ قابل قدر نکتہ اخذ کیا ہے کہ جب تک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے مستفید نہیں ہو سکتا اور اگر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے مستفید نہ ہو سکا تو کوئی نفر گرہ کشا نہیں ہو سکتی بالفاظ دگر قرآن فہمی کا طریقہ یہ ہے کہ تو اپنے قلب کو اس قدر پاک صاف کرے کہ پڑھتے وقت تجھے یہ محسوس ہو کہ یہ کلام تجھ پر نازل ہو رہا ہے۔

اقبال نے خود بیان کیا ہے کہ میرے والد مرحوم نے ایک دن مجھ سے کہا کہ جب تک کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اترا ہے جس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک و اقدس پر نازل ہوا تھا تلاوت میں کوئی مزہ نہیں۔

واضح ہو کہ تلاوت قرآن کے وقت یہ احساس ہو کہ یہ کلام مجھ پر نازل ہو رہا ہے اس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب مسلمان اللہ کے ساتھ اپنا روحانی رابطہ استوار کرے جسے تصوف کی اصطلاح میں تعلق باللہ کہتے ہیں اگر اللہ کے ساتھ قلب کو تعلق پیدا نہ ہو تو یہ احساس ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا اور تعلق باللہ

درست اور صحیح طریق پر قائم نہیں ہوسکتا جب تک انسان کسی مرشد کامل کی صحبت اختیار نہ کرے۔ مرشد کا یہی تو کام ہے کہ وہ مرید کا تعلق اللہ کے ساتھ استوار کر دیتا ہے۔

جب تک پوائنٹ میں ایک لائن کو دوسری لائن سے صحیح طریق پر مربوط نہ کر دے۔ ڈرائیور لاکھ کوشش کرے۔ انجن کو مطلوبہ لائن پر نہیں لے جاسکتا اسی طرح جب تک مرشد سالک کے قلب کو اللہ سے مربوط نہ کر دے سالک لاکھ کوشش کرے اپنے کو مطلوب حقیقی تک نہیں پہونچا سکتا۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اس زمانہ تک خدارسی کا یہی طریقہ ملت اسلامیہ میں متداول رہا ہے۔

نوٹ:۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین و توضیح قرآنِ حکیم۔ احادیث مرفوعہ متصلہ میں محفوظ ہے پس جو شخص احادیث رسولؐ سے استفادہ نہیں کرتا اس کے قلب پر نزول کتاب بھی نہیں ہوسکتا اور اس لئے وہ حقائق قرآنی سے یقیناً محروم رہے گا۔

پانچواں شعر:۔ تہِ جرعہ بمعنی تلچھٹ۔ کہتے ہیں کہ یورپ کی شراب کی تلچھٹ بھی صاف ستھری ہے اور اس میں مزہ بھی ہے لیکن اس کا سرور اور سوز پائیدار نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ادنیٰ قسم کے مغربی علوم بھی مفید ہیں لیکن ان کا فائدہ عارضی ہے یعنی دنیا کی چند روزہ زندگی تو آرام سے بسر ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ علوم و فنون اُخروی زندگی میں کارآمد نہیں ہوسکتے بالفاظ دگر مغربی علوم سے دنیا تو درست ہوسکتی ہے عاقبت درست نہیں ہوسکتی۔

٭٭٭٭

غزل ۶۱

شعور و ہوش و خرد کا معاملہ ہے عجیب
مقامِ شوق میں ہیں سب دل و نظر کے رقیب

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائلِ نظری میں اُلجھ گیا ہے خطیب

اگرچہ میرے نشیمن کا کر رہا ہے طواف
مری نوا میں نہیں طائرِ چمن کا نصیب

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترکِ عثمانی
سنائے کون اُسے اقبال کا یہ شعرِ غریب

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

■

پہلا شعر: کہتے ہیں کہ عقل انسانی بہت اچھی چیز ہے اس سے انسان کو بہت دنیاوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن اس کی نوعیت ایسی ہے کہ جب انسان عشقِ الٰہی اختیار کرتا ہے تو یہ عقل انسان کے دل کی دشمن بن جاتی ہے یعنی ہر معاملہ میں دل کی مخالفت کرتی ہے اور اس کی ترقی میں حائل ہو جاتی ہے قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کرتی ہے مثلاً عشق انسان سے یہ کہتا ہے کہ " اللہ کے راستہ میں جہاد کر، سر سے کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں کود

پڑا" تو عقل فوراً دل کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ خبردار میدان جنگ میں مت جانا وہاں جان کا خطرہ ہے اسی مضمون کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

دوسرا شعر: جماعت سے مراد ہے ملت اسلامیہ۔ مسائل نظری سے وہ مسائل مراد ہیں جن میں غور و فکر کی احتیاج ہو۔ نظری، منطق اور فلسفہ دونوں کی اصطلاح ہے۔

(۱) منطق میں نظری ان معقولات معلومہ کو کہتے ہیں جن کی وساطت سے معقولات مجہولہ معلوم ہو سکتے ہیں اور جب معقولات مجہولہ معلوم ہو جاتے ہیں تو اس نظری کو نظریہ کہتے ہیں جیسے حکیم آئینس ٹائن کا نظریۂ اضافیت

(۲) فلسفہ کی دو قسمیں ہیں۔ نظری اور عملی۔ حکمت نظری میں علم کی غایت محض علم ہے لیکن حکمت عملی میں علم کی غایت عمل ہے طبیعات مابعد الطبیعات۔ الٰہیات اور ریاضی یہ علوم نظری ہیں۔ اخلاقیات، معاشیات اقتصادیات اور سیاسیات یہ علوم عملی ہیں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ الٰہیات کے مسائل نظری ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ان سے ہمارا مقصد اصلاح حال یا تزکیۂ نفس کرنا یا اعمال صالحہ بجا لانا نہیں ہے بلکہ محض ذہنی مسرت حاصل کرنا ہے۔ مثلاً زید۔ یہ جانتا ہے کہ صفات باری۔ عین ذات ہیں۔ غیر ذات نہیں ہیں اور خالد اس کے برعکس یہ سمجھتا ہے کہ صفات باری۔ غیر ذات ہیں۔ عین ذات نہیں ہیں چونکہ دونوں اپنے آپ کو صحیح سمجھتے ہیں اس لئے اپنے اپنے دعویٰ کے اثبات میں عقلی دلائل پیش کریں گے

ان پر آپس میں ردّ و قدح ہو گی۔ جوابات اور جواب الجوابات کا سلسلہ شروع ہو گا۔ اول تو نخوت علم۔ کسی عالم کو اعتراف شکست کی اجازت نہیں دے گی لیکن اگر ایک عرصۂ دراز تک مصروف مجادلہ رہنے کے بعد زید یا بکر نے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا تو خود زید یا بکر کی عملی زندگی میں کیا تغیر پیدا ہو سکتا ہے؟ مقصد حیاتِ مسلم تو جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس کے لئے ایمان محکم اور یقین کامل یعنی عشق رسولؐ درکار ہے نہ کہ الٰہیات کے ان مسائل نظری میں انہماک یا استغراق جن بزرگوں نے بدر اور حنین کے معرکے سر کئے وہ ان مسائل سے بالکل ناواقف تھے۔

فرض کیجئے زید ان مسائل سے بالکل واقف نہیں ہے وہ صرف اس قدر جانتا ہے کہ اللہ ایک ہے اور اس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء بنا کر دنیا میں بھیجا ہے لیکن وہ جہاد فی سبیل اللہ میں زندگی بسر کرتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں بکر الٰہیات کے تمام مسائل نظری میں ید طولیٰ رکھتا ہے اور ہر وقت ان میں مستغرق رہتا ہے اور اپنے مخالفین کے رد میں کئی کتابیں لکھ چکا ہے لیکن جہاد فی سبیل اللہ کی لذت نعمت اور سعادت سے محروم ہے (جس طرح اکثر علما محروم رہے اور آج بھی محروم ہیں) تو اقبالؔ کے مذہب کی رو سے زید کامیاب ہے اور بکر خائب و خاسر ہے کیونکہ قیامت کے دن کو جانے دیجئے اسی دنیا میں اسلام کی سربلندی مجاہدین کی تلوار سے وابستہ ہے نہ کہ متکلمین کے مناقشات یا مکابرات سے۔

اب ان علمی مناقشوں اور منطقی موشگافیوں کے دوسرے مضر پہلو پر غور کیجئے یقیناً شہر میں کچھ باا ثر لوگ زید کے ہمخیال اور متبع ہوں گے اور کچھ افراد بکر کے ہم مشرب اور پیرو ہوں گے وہ جب ایک دوسرے سے بازاروں

دکانوں، ہوٹلوں اور کلبوں میں ملیں گے تو یقیناً اپنے اپنے لیڈر کی حمایت میں گفتگو کریں گے اور اس مفاخرت کا نتیجہ یقیناً محاربت پر منتج ہوگا یعنی کفر کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کے بجائے یہ دونوں مسلمان جماعتیں آپس ہی میں ایک لغو اور لایعنی بات پر کٹ مریں گے۔ سوال یہ ہے کہ جب مسلمان آپس میں لڑنے کے عادی ہو جائیں گے تو کفار کے مقابلہ میں متحدہ محاذ کیسے پیش کر سکیں گے؟ ہر وقت آپس میں لڑتے رہنا اور کسی وقت متحد ہو جانا یہ تو نفسیاتی زاویہ نگاہ سے ممکن العمل نہیں ہے۔

یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے میری ذاتی قیاس آرائی نہیں ہے بلکہ تاریخی حقائق ہیں جنہیں میں نے اپنے انداز میں سپرد قلم کیا۔ یہ ملت اسلامیہ کی گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ کا خلاصہ ہے یہ ہماری قومی ٹریجڈی کا سب سے زیادہ المناک باب ہے چونکہ ان سطور کا ہر پڑھنے والا تاریخ کا طالب علم نہیں ہو سکتا اس لئے تاریخ سے دو تین مثالیں بھی پیش کئے دیتا ہوں۔

چھٹی صدی ہجری میں جب سلطنت عباسیہ کا آفتاب لب بام آچکا تھا۔ احناف اور شوافع فروعی مسائل میں اس قدر غلو اختیار کر چکے تھے کہ کئی دفعہ بغداد کی گلیاں محض اتنی سی بات پر مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہو گئیں کہ امام کے پیچھے مقتدی سورۂ فاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے یہی وجہ ہے کہ بغداد کے مسلمان ۶۵۶ھ میں وحشی مغلوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

پانچویں صدی ہجری میں ذات باری کی تنزیہ اور تجسیم کے مسئلہ میں اسی بغداد کے اشاعرہ اور حنابلہ میں سخت خونریزی واقع ہوئی تھی بات یہ تھی کہ اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ استوٰی اور ید اللہ میں تاویل کرنا جائز ہے اور ان کے مقابلہ میں حنابلہ کا مسلک یہ تھا کہ مسلمانوں کو قرآن مجید کے الفاظ

میں تاویل کرنی مناسب نہیں ہے پس جو مطلب ظاہری الفاظ سے سمجھ میں آئے اسی پر ایمان رکھنا واجب ہے۔

تیسری مثال سنئے متوکل کے عہد میں معتزلہ اور اشاعرہ میں اس مسئلہ پر سخت فساد برپا ہوگیا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اس میں فریقین کے بہت سے آدمی مارے گئے چونکہ متوکل بہت شریف النفس تھا اس لئے اس نے بذریعۂ قانون اس قسم کے تمام مباحثوں کو ممنوع قرار دیا۔

اقبال کہتے ہیں کہ مسائل نظری[1] میں انہماک کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم

---

[1] ملا غلام یحییٰ بہاری بارہویں صدی ہجری کے شروع میں پٹنہ (بہار) کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کی اس کے بعد جونپور میں ملا باب اللہ شاگرد ملا محمد اللہ سندیلوی کی درسگاہ میں شامل ہو کر منقول و معقول دونوں میں مہارت تامہ حاصل کی مدتوں تک لکھنؤ میں فلسفہ اور منطق کا درس دیا اور اسی زمانہ میں میر زاہد پر حاشیہ لکھا جو غلام یحییٰ بر میر زاہد کے نام سے مشہور ہوا اس کتاب کے علمی پایہ کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ پہلے زمانہ میں کسی شخص کے عالم ہونے کا معیار یہ تھا کہ وہ اس حاشیہ کے مطالب پر تقریر کر سکے اور آج بھی یہ کتاب درس نظامیہ میں تبحر علمی کی آخری منزل سمجھی جاتی ہے ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی۔

مولانا فضل حق خیر آبادی جنہوں نے ۱۲۷۸ھ میں انقلاب ۱۸۵۷ء میں شرکت کی پاداش میں جزائر انڈمان میں انتقال فرمایا منطق اور فلسفہ میں اپنے وقت کے امام گذرے ہیں ان کے بعد ان سے بڑا منطقی آج تک اس ملک میں پیدا نہیں ہوا ان کی تمام تصانیف بہت بلند پایہ ہیں لیکن قاضی مبارک کا حاشیہ بلاشبہ ان کا شاہکار ہے یہ کتاب منطق میں اس پایہ کی ہے کہ اگر جان اسٹوارٹ مل (J. S. Mill) عربی داں ہوتا تو یقیناً لندن سے چل کر دہلی آتا اور مولانا کے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتا۔

جذبہ عمل سے بیگانہ اور قوت عمل سے محروم ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے مسلمانوں کو اس قسم کے مسائل میں گفتگو کرنے سے منع فرما دیا ہے کہ خدا کی ذات کا صفات سے کیا علاقہ ہے؟ کلام اللہ حادث ہے یا قدیم ہے؟ استویٰ علی العرش کا مفہوم اور اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ سب مسائل نظری ہیں اور ان میں گفتگو یا انہماک ذوق عمل کے لئے سم قاتل ہے چنانچہ مسلمانوں کی ملی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب ان مسائل میں منہمک ہوئے تو جہاد کا جذبہ فنا ہو گیا ان حقائق کو ذہن میں رکھ کر آپ اقبال کا وہ شعر پڑھیے تو آپ کو بآسانی معلوم ہو جائے گا کہ جماعت کا حشر کیا ہو گا۔

تیسرا شعر:- نصیب بمعنی حصہ کہتے ہیں کہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ میری قوم کے نوجوان اگرچہ میرے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن وہ میری شاعری کی غرض و غایت سے آگاہی حاصل نہیں کرتے دن رات میرے نشیمن کا طواف کرنے کے باوجود میری نوا میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

چوتھا اور پانچواں شعر:- غریب بمعنی عجیب۔ ہمجوار بمعنی ہمسایہ۔ کہتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ ترک بہت سخن فہم۔ نکتہ نواز ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کوئی اللہ کا بندہ میرا یہ پیغام ان تک پہونچا دے کہ "تم یورپ کو اپنا ہمسایہ سمجھ رہے ہو حالانکہ اس کے مقابلہ میں ستارے تم سے زیادہ قریب ہیں اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ ستاروں سے شام۔ فلسطین اور حجاز یعنی عربی زبان بولنے والے ممالک مراد لئے جائیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ یورپ اور یورپین تہذیب کے بجائے عرب اور عربی تہذیب کی تقلید اولیٰ اور انسب ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ستاروں سے اسلامی حقائق و معارف مراد لئے جائیں اس تقدیر پر اس شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ غیر اسلامی تہذیب کے سجائے اسلامی اصولوں کی اتباع نیوں نہیں کرتے۔

نوٹ:۔ اس شعر میں اقبالؔ نے مصطفےٰ کمال پاشا کی فرنگیت مآبی اور یورپ نوازی پر لطیف پیرایہ میں تنقید کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح راقم الحروف نے ۱۹۲۲ء میں "فتح سمرنا" کی خوشی میں چراغاں کیا تھا اور مصطفےٰ کمال کو "بطل اسلام" قرار دیا تھا۔ اسی طرح حضرت اقبالؔ نے اس فولادی آدمی سے کچھ توقعات وابستہ کر لی تھیں جن کی جھلک پیغام مشرق میں نظر آسکتی ہے لیکن جب اس مرد باکمال نے مطلق العنان ہو کر قرآنی ضابطہ کے بجائے سوئیس کوڈ (SWISS CODE) کو اپنا دین و ایمان بنا لیا تو اقبالؔ مرحوم کی توقعات کا شیشہ بھری محفل میں چکنا چور ہو گیا اسی لئے انہوں نے جاوید نامہ۔ مسافر۔ پس چہ باید کرد۔ بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز یعنی پیام مشرق کے علاوہ ہر تصنیف میں سجدۂ سہو ادا کیا ہے۔ مثلاً ضرب کلیم میں کیسی خوبصورتی کے ساتھ اور کیسے مؤثر انداز میں اس قوم کو تنبیہ کی ہے۔

لادینی و لاطینی! کس پیچ میں اُلجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کی لَاغَالِبَ اِلَّاھُو

―――(٭)―――

رُباعیات

رہ و رسمِ حرم نامحرمانہ
کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہنِ چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

•

تمہید ان رباعیات کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں تشبیہات استعارات اور کنایات کی فراوانی ہے بہت کم مصرعے ایسے ہیں جن کے لفظی معنی مراد ہیں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہر رباعی حقائق ومعارف سے لبریز ہے اور ان دونوں خصوصیات کے امتزاج سے ان رباعیات میں غیر معمولی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

پہلی رباعی :۔ رہ و رسم حرم سے۔ ملت اسلامیہ کی روش یا طرز حیات مراد ہے۔ نامحرمانہ سے۔ روح اسلام یعنی عشق سے بیگانگی مراد ہے۔ کلیسا کی ادا سے۔ اقوام مغرب کا طریق عمل مراد ہے۔ سوداگرانہ سے۔ اخلاق حسنہ سے محرومی مراد ہے۔ تبرک سے۔ قابل قدر شے مراد ہے۔ پیراہن چاک سے درس عشق ومحبت الہٰی مراد ہے۔ اہلِ جنوں سے بندگانِ خدا یعنی اللہ سے محبت کرنے والے مراد ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اللہ والوں کا فقدان ہے چنانچہ مسلمان قوم تو عشق الٰہی سے بیگانہ ہو چکی ہے اب رہیں مغربی اقوام تو ان کا زاویۂ نگاہ بالکل مادہ پرستانہ ہو چکا ہے ان کی پوری زندگی تجارتی اصولوں پر بسر ہو رہی ہے یعنی ان کا مقصد حیات جلب منفعت ہے۔ آندریں حالات میرا پیغام (درس خودی) دنیا والوں کے حق میں لیا غنیمت ہے بلکہ موجب صد خیر و برکت ہے کیونکہ اس پر عمل کرنے سے بنی آدم اپنی خودی کی تربیت کر کے اپنا مقصد حیات حاصل کر سکتے ہیں اور اس بات کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ خودی صرف عشق سے مستحکم ہو سکتی ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ میں نے اس دور مادیت میں بنی آدم کو عشق الٰہی کا پیغام دیا ہے جو اس لائق ہے کہ اسے "تبرک" کی طرح محترم قرار دیا جائے۔

واضح ہو کہ میں نے مثال کے طور پر اس رباعی کے ہر لفظ کے مجازی معنی واضح کر دئے ہیں تاکہ ناظرین کو میرے مذکورہ بالا قول کی تصدیق کرنے میں آسانی ہو سکے آئندہ صرف مطلب بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔

(۲)

ظلامِ بحر میں کھو کر سنبھل جا
تڑپ جا پیچ کھا کھا کر بدل جا
نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج
ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

•

دوسری رباعی:۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! دنیا کی مشکلات (ظلام بحر) سے مطلق ہراساں نہ ہو اگر ناکامی ہو تو ہمت مت ہار مسلسل جد و جہد کر۔

ایک تدبیر کارگر نہ ہو تو دوسری تدابیر اختیار کر (بدل جا) یاد رکھ کہ تیری تقدیر میں سکون نہیں ہے کیونکہ سکون موت کا دوسرا نام ہے تو دنیا میں عیش و آرام کی زندگی اختیار کرکے کامیابی حاصل نہیں کرسکتا جب تک تو زندہ ہے سعی پیہم ہی تیری تقدیر ہے۔ ساحل کی آرزو مت کر اس کے بجائے دنیا کی کشمکش میں حصہ لے کامیابی ساحل کی طرف جانے سے نہیں ہوگی بلکہ ابھرنے یعنی مشکلات پر غالب آنے سے حاصل ہوگی اقبال نے اسی مضمون کو پیام مشرق میں یوں بیان کیا ہے۔

بدریا غلط و باموجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(۳)

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں

■

تیسری رباعی :- اس رباعی کے تیسرے مصرع میں تغزل پایا جاتا ہے جس سے عجیب دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ پہلے مصرع میں خدا سے یہ سوال کیا ہے کہ میں زمان و مکان کی قید میں ہوں یا آزاد ہوں؟ کمال شاعری یہ ہے کہ بظاہر جواب نہیں دیا لیکن جو شخص اقبال کے فلسفیانہ افکار سے واقف ہے جانتا ہے کہ جواب خود سوال میں موجود ہے یعنی اقبال کی رائے میں اگرچہ انسان زمان و مکان کی قید میں ہے لیکن وہ اپنی اصل کے لحاظ سے "آزادِ مکاں"

ہے کیونکہ انسان کی روح مادی نہیں ہے بلکہ پرتو ہے تجلی صفات باری کا۔

دوسرے مصرع میں اسی سوال کو پہلو بدل کر بیان کیا ہے یعنی "جہاں میں (جہاں سے جدا) ہوں یا خود ہی سارا جہاں ہوں؟ واضح ہو کہ انسان اگر جہاں بیں یعنی ناظر ہے اور جہاں منظور ہے تو دونوں ایک دوسرے سے جدا ثابت ہو گئے یہاں بھی وہی سوال کیا ہے اور جواب اس سوال ہی میں موجود ہے یعنی بظاہر جہاں بیں نظر آتا ہوں لیکن دراصل خود جہاں ہوں۔ اقبال تصوریت کی رو سے جہاں کی مستقل جداگانہ ہستی متحقق نہیں ہے چونکہ نفس مدرک (Perceiving mind) سے باہر کسی شئے کا وجود نہیں ہے اس لئے جہاں کا وجود نفس مدرک کے تحقیق پر موقوف ہے چنانچہ زبور عجم میں کہتے ہیں۔

این جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندار من است
جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من
چہ زمان و چہ مکاں شوخی افکار من است

اسی حقیقت کو ضرب کلیم میں یوں واضح کیا ہے۔

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے۔ تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

مرزا بیدل نے بھی اسی انداز میں نغمہ سرائی کی ہے۔

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود این چمن
رنگ مے بیروں نشست از بسکہ مینا تنگ بود

اقبال اور بیدل دونوں مرشد رومی کے متبع ہیں جو اس فلسفہ کے بہت بڑے شارح گذرے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

قالب از ماهست شد نے ما ازو
بادہ از ما مست شد نے ما ازو

یعنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مستی شراب میں ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی مستی شراب میں نہیں ہے۔ بلکہ ہم میں ہے اور ہماری ہی بدولت اس میں پیدا ہوتی ہے۔

یورپ میں بارکلے (Barkley) متوفی ۱۷۵۳ء اس مسلک کا مشہور شارح اور وکیل گذرا ہے۔ جس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کی ہستی ہمارے مشاہدہ (perception) پر موقوف ہے مرشد رومی بھی یہی فرماتے ہیں کہ قالب (کائنات) پر ہماری بدولت ہستی کا اطلاق ہو سکتا ہے کیونکہ ہم نہ ہوتے تو کائنات کی تحقیق کون کرتا؟

چونکہ انسان بلحاظ اصل مکانی نہیں ہے اور کائنات کا وجود "نمود سیمیائی" سے زیادہ نہیں ہے۔ جیساکہ ناظرین اسی کتاب میں پڑھ چکے ہیں۔

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمیائی

یعنی انسان کائنات یا زمان و مکان میں نہیں ہے بلکہ کائنات اور زمان و مکان یہ دونوں خود انسان میں ہیں یہ دونوں اسی کے افکار کی شوخیاں ہیں تو لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر انسان کہاں ہے؟ اسی سوال کو اقبال نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں

سوال کا جواب دینے سے پہلے اس بات کی صراحت ضروری معلوم

ہوتی ہے کہ اس شعر کا پہلا مصرع شاعری کے لحاظ سے اس قدر بلند ہے کہ اس کی شرح نہیں ہو سکتی اس وقت اس بات سے قطع نظر کر لیجئے کہ شاید ہی کسی شاعر نے خدا کو اس انداز سے مخاطب بنایا ہو قابل تحسین نکتہ یہ ہے کہ اقبال نے "لامکانی" کی کیفیت کو مستی سے تعبیر کر کے مصرع میں اس قدر دلکشی پیدا کر دی ہے کہ کوئی صاحب ذوق اس مصرع کو پڑھے اور خود اس پر مستی کی کیفیت طاری نہ ہو جائے۔

اس میں اس حقیقت کی طرف بھی نہایت بلیغ اشارہ ہے۔ لامکانی ہونے کے بعد قدرتی طور پر مستی کا انداز پیدا ہو جاتا ہے اس لئے کہ جو ذات لامکان ہو گی وہ یقیناً زمان و مکان پر حکمراں ہو گی اور حکومت سے مستی کا رنگ پیدا ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ ع

وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست

اگر اس مصرع میں "مست رہنے" کو محاورہ قرار دیا جائے تو رنگ تغزل پیدا ہو جائے گا۔ یعنی عاشق اپنے معشوق سے غائبانہ خطاب کرتا ہے کہ اگر وہ میری طرف ملتفت ہونا نہیں چاہتے تو ان کی مرضی۔ میں بھی اصرار نہیں کرتا۔ بڑے شوق سے اپنی شان لامکانی میں مست اور عشاق کی طرف سے غافل رہیں صرف اتنا بتا دیں کہ میں کہاں ہوں۔؟ یہ وہی سوال ہے جو ناظرین اس سے پہلے اس شعر میں پڑھ چکے ہیں۔

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے
یہ جہاں میرا جہاں ہے۔ کہ تری کرشمہ سازی

چونکہ یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے اس لئے انہوں نے ہر کتاب میں اس کو بار بار نئے انداز سے باندھا ہے اس سوال کے جواب میں اقبال کا ذاتی

فلسفہ پوشیدہ ہے جسے میں اقبالؔ تصوریت (Idealism) سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی روح چونکہ اللہ کی صفت خالقیت کا پرتو ہے اس لئے انسان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ علم الٰہی میں موجود ہے یہاں پہونچ کر اقبالؔ کے فلسفہ کی سرحد مشہور فرانسیسی مفکر مالی برانش (Malebranche) متوفی پیرس ۱۷۱۵ء سے مل جاتی ہے جس کے فلسفہ کو ہم صوفیانہ تصوریت (Mystic Idealism) کہہ سکتے ہیں اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب اسی کے اندر زندگی بسر کرتے ہیں یعنی اس کا فلسفہ لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ کی اعتدالی تعبیر ہے۔ جسے ہمہ از دوست کہتے ہیں۔
چنانچہ ارمغان حجاز میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

کفِ خاکے کہ دارم از در اوست　　گل و ریحانم از ابر تر اوست
نہ من رامی شناسم من نہ او را　　ولے دانم کہ من اندر بر اوست

یعنی اتنا جانتا ہوں کہ میں اس کے اندر ہوں۔

اس جگہ اس شبہ کا ازالہ ضروری ہے کہ اقبالؔ کی تصوریت افلاطون اور ہیگل کی تصوریت سے مختلف ہے کیونکہ وہ اسلام پر مبنی ہے اور اسلام تصوریت اور خارجیت دونوں کا جامع ہے بایں طور کہ اس میں روحانی لطائف (دین) کے دوش بدوش مادی حقائق (دنیا) کو بھی تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ اس مشہور دعا میں تصوریت اور خارجیت دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً
وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

بیشک اقبالؔ کا شمار تصوریت پسندوں میں ہے لیکن ان کی تصوریت میں حقائق پسندی (خارجیت) کا رنگ بھی شامل ہے اس لئے ان کا راستہ

افلاطون اور ہیگل۔ بارکلے اور مالی برانش سب سے جدا ہے بہرحال اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس کی تفصیل اپنی مجوزہ کتاب اقبال اور تصوف میں پیش کروں گا۔

(۴)

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں
خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست
قیامت میں تماشا بن گیا میں

•

چوتھی رباعی:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب میں نے اپنی خودی کی تربیت کی تو اس میں خدائی کا رنگ پیدا ہو گیا پس جب بروز قیامت میں خدا کے سامنے حاضر ہوا تو چونکہ مجھ میں اسی کا جلوہ منعکس تھا اس لئے میرے اندر اس کی طرف دیکھنے کی آرزو پیدا نہیں ہوئی جب میں نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور اپنے ہی دیدار میں مست رہا تو ساری دنیا حیرت سے میری طرف تکنے لگی کہ یہ کیسا عاشق ہے کہ معشوق کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا نتیجہ یہ نکلا کہ :۔ ع

قیامت میں تماشہ بن گیا ہوں

یعنی میں اپنی طرف دیکھ رہا تھا اور ساری دنیا میری طرف دیکھ رہی تھی چونکہ لفظ "تماشہ" کے دو معنی ہیں۔ اس لئے اقبال نے اس کیفیت کو تماشہ سے تعبیر کر کے مصرع میں عجیب دلکشی کی شان پیدا کر دی ہے۔

اس تمثیلی طرز بیان سے قطع نظر کر لی جائے تو مطلب یہ ہے کہ روح

انسانی اپنی اصل کے لحاظ سے خدا سے جدا نہیں ہے اور اگر کوئی شخص اپنے آپ کو عشق رسولؐ میں فنا کر دے تو اس میں خدائی صفات پیدا ہو جاتی ہیں چنانچہ ارمغان حجاز میں اس بات کو بصراحت بیان کر دیا ہے۔

اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز

لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اگر خدا کو دیکھنا چاہتے ہو تو خودی کو دیکھنے کا طریقہ (کسی مرشد کامل سے) سیکھ لو۔ دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ خدا اور خودی میں اصل حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے بس یہی نکتہ فقر کی روح ہے اور علم قلندری کا خلاصہ ہے اور یہی مرشد رومی کا فیضان ہے۔ ارمغان حجاز کی یہ رباعی اس باب میں قول فیصل کا حکم رکھتی ہے۔

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی — کہ او پیدا است تو زیر نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی — تلاشِ خود کنی جز او نیابی

(۵)

پریشاں کاروبارِ آشنائی
پریشاں تر مری رنگیں نوائی
کبھی میں ڈھونڈتا ہوں لذتِ وصل
خوش آتا ہے کبھی سوزِ جدائی

•

پانچویں رباعی: مطلب یہ ہے کہ عاشق کی زندگی میں یکسانیت نہیں ہوتی اسے کسی ایک پہلو پر قرار نہیں آتا محبت کا کاروبار یعنی محبت کی زندگی سراپا اضطراب اور پریشانی ہوتی ہے۔ عاشق جب معشوق کے فراق میں آہ

و نالہ کرتا ہے یا جب وہ اپنی واردات عشق کو شعر کی صورت میں پیش کرتا ہے تو اس کا کلام اس کے قلبی اضطراب کا آئینہ دار بن جاتا ہے یعنی اس میں اضطراب اور سوز و گداز کا رنگ اس کی زندگی سے بھی بڑھ کر نظر آتا ہے۔

دوسرے شعر میں اقبالؔ نے واردات عشق کی مختلف کیفیات میں سے دو کیفیتوں کا تذکرہ کیا ہے یعنی عاشق کبھی وصال کا آرزومند ہوتا ہے اور کبھی اسے فراق کی آگ میں لذت محسوس ہوتی ہے حالانکہ فراق اور وصال ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(۶)

یقین مثل خلیلؑ آتش نشینی
یقین اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے ہے بدتر بے یقینی

•

چھٹی رباعی:۔ اس رباعی میں اقبالؔ نے "یقین" کی اہمیت اور قدر و قیمت کو واضح کیا ہے۔ واضح ہو کہ یقین اقبالؔ کے فلسفۂ فقر کا سنگ بنیاد ہے۔ قرآن مجید نے اس کو ایمان سے تعبیر کیا ہے اور عمل صالح کے لئے پہلی اور لازمی شرط قرار دیا ہے۔

پہلے شعر میں اقبالؔ نے یقین کی ماہیت بیان کی ہے کہ یقین اللہ کی ایسے پختہ اعتقاد کا نام ہے جس کی بدولت انسان اپنی جان کو خطرہ میں ڈال سکتا ہے چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خوشی خوشی آگ میں داخل ہو گئے تھے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ اللہ ضرور میری حفاظت کرے گا۔ یقین اللہ کے عشق میں از خود

رفتہ ہو جانے کو کہتے ہیں کیونکہ جب اللہ کی ہستی پر اعتقاد کامل نہ ہو عشق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اللہ مست کا لقب۔ علمائے یورپ نے حکیم اسپنوزا Spinoza کی متوفی ۱۶۷۷ء کے لئے وضع کیا تھا کیونکہ اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

"خدا کے سوا اور کوئی شئے موجود نہیں ہے" حکیم موصوف "
ہمہ اوست کا مبلغ اور شیخ اکبر کا ہمنوا ہے پس اللہ مستی کے
معنی ہوئے خدا کی ہستی پر کامل اور پختہ اعتقاد رکھنا۔

خود گزینی کے معنی ہیں اپنی خودی کو اللہ کے رنگ میں رنگنے کے لئے منتخب کر لینا اور یہ بات بھی اسی وقت ممکن ہے جب انسان کو اللہ کی ہستی پر یقین کامل اور اعتقاد جازم حاصل ہو۔ خود گزینی اقبال کی خاص اصطلاح ہے چنانچہ مسافر میں لکھتے ہیں۔

آں مسلمانے کہ بیند خویش را
از جہانے برگزیند خویش را

یعنی جو مسلمان اپنے مقام سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ دنیا کی تمام چیزوں میں سے صرف اپنی ذات کو اور صرف اپنی خودی کو اپنے لئے منتخب کر لیتا ہے بالفاظ دگر عہدوں اور جاگیروں اور دنیاوی عیش و آرام سے یکسر قطع تعلق کر کے اپنی خودی کو اللہ کے رنگ میں رنگنا شروع کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان یہ کام نہیں کر سکتا جب تک اسے اللہ کی ہستی پر یقین حاصل نہ ہو جس شخص کو اللہ کی ہستی پر یقین کامل حاصل ہو جاتا ہے وہ زن۔ زر اور زمین کے بجائے اپنی خودی کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیتا ہے چنانچہ اس حقیقت کو اقبال نے ضرب کلیم میں یوں بیان کیا ہے۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق — فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آتش نشیتی۔ اللہ مستی اور خود گزینی یہ سب یقین کے نتائج یا ثمرات ہیں۔

اس کے بعد وہ مغرب زدہ مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ بے یقینی اس دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے لیعنی غلامی سے کبھی بدتر ہے وہ اس لئے کہ اگر غلاموں کے دل میں ذوقِ یقین پیدا ہو جائے تو وہ غلامی کی زنجیریں توڑ سکتے ہیں۔ چنانچہ بانگ درا میں انہوں نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں!
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

(۷)

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے
حرم کا رازِ توحیدِ اُمم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

•

ساتویں رباعی:۔ ملتِ اسلامیہ کا طغرائے امتیاز عشقِ الٰہی ہے اور اسی میں تمام عالم کی بہبود مضمر ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان عشقِ الٰہی سے سرشار ہو جائیں تو وہ توحیدِ الٰہی کی اشاعت میں سرگرم ہو جائیں گے اور توحیدِ الٰہی کی اشاعت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام اقوام عالم میں وحدت کا رنگ پیدا ہو جائے گا اسلام چونکہ توحیدِ الٰہی کا علمبردار ہے اس لئے اس کا مقصود اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا دنیا میں توحیدِ اُمم قائم ہو جائے۔ توحیدِ الٰہی کا منطقی نتیجہ توحیدِ اُمم یا وحدتِ اقوام ہے اسی نکتہ کو

اقبالؔ نے ضربِ کلیم میں یوں بیان کیا ہے۔

مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّتِ اقوام کہ جمعیّتِ آدم

مغربی اقوام کے ذہن میں وحدتِ امم (جمعیت آدم) کا تصور اس لئے پیدا نہیں ہو سکتا کہ ان کی تہذیب (نظامِ فکر) عقیدۂ توحید الٰہی سے بیگانہ ہے یہی وجہ ہے کہ یورپین اقوام کا وجود دنیا والوں کے لئے ایک مستقل لعنت بن گیا ہے۔ جب تک یہ قومیں توحید الٰہی کے عقیدہ کو قبول نہیں کریں گی۔ دنیا میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔

(۸)

کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ
طبیعت غزنوی قسمت ایازی

•

آٹھویں رباعی:۔ دراصل اس رباعی میں اقبالؔ نے اپنی شخصیت کے پردہ میں اپنی قوم کی تصویر کھینچی ہے۔ کہتے ہیں کہ میری شاعری کی کیفیت یہ ہے کہ الفاظ تو ہندی ہیں لیکن مضامین اور خیالات اسلامی ہیں میری ذہنیت مغربی تعلیم کی بدولت افرنگی اندازِ فکر سے آلودہ ہو گئی ہے یعنی طریق غور و فکر غیر اسلامی ہو گیا ہے خدا نے مجھے پیدا تو حکمرانی کے لئے کیا تھا لیکن اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

---

(۹)

ہر اک ذرّہ میں ہے شاید مکیں دل
اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیرِ دوش و فردا ہے ولیکن
غلامِ گردشِ دوراں نہیں دل

•

نویں رباعی۔ کائنات کے ہر ذرہ میں دل یعنی عشق جلوہ فرما ہے ہر شئے زبانِ حال سے معشوقِ حقیقی کے وجود پر شہادت دے رہی ہے یہ مضمون اس آیتِ شریفہ سے ماخوذ ہے۔

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ یعنی زمین اور آسمانوں میں جو شئے بھی پائی جاتی ہے وہ زبانِ حال سے اللہ کی حمد و ثنا کر رہی ہے بالفاظ دگر کائنات میں جس قدر اشیاء نظر آتی ہیں سب میں عشق کا جذبہ پوشیدہ (خلوت نشین) ہے خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عشق ہی بنائے عالم ہے۔

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق (جاوید نامہ)

عشق کی شان ہے کہ چونکہ وہ اشیائے کائنات یا انسان سے مربوط ہے اور انسان زمان و مکان کی قید میں ہے اس لئے عشق بھی اسیرِ دوش و فردا تو بیشک ہے لیکن بلحاظ اصل خویش غلامِ گردشِ دوراں نہیں ہے یعنی اگر کوئی شخص اپنی عقل کے بجائے حضرتِ عشق کی اتباع کرے تو وہ گردشِ دوراں (قیدِ زمان و مکان) سے آزاد ہو سکتا ہے۔

اس شعر میں اسیر اور غلام یہ دو لفظ بہت غور طلب ہیں اسیر وہ ہے

جو بذات خود تو آزاد ہو لیکن کسی وجہ سے گرفتار ہو گیا ہو۔ غلام وہ ہے جو اپنی آزادی سے محروم ہو چکا ہو اور غلامی ہی کی زندگی بن گئی ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ جوہر عشق قلب انسانی میں آ کر اسیر زمان و مکاں تو بیشک ہو گیا ہے لیکن اس کی غلامی کی زندگی قبول نہیں کی ہے کیونکہ بلحاظ اصل خویش وہ زمان و مکان سے بالاتر ہے اس لئے اگر انسان اس کے کہنے پہ چلے تو اس کی بدولت خود بھی زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو سکتا ہے

(۱۰)

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

•

دسویں رباعی :۔ اس رباعی میں اقبال نے مسلمانوں کی موجودہ حالتِ زار پر تبصرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بات تو درست ہے کہ تیری اصل شاہینی ہے یعنی اللہ نے تجھے حکمرانی کے لئے پیدا کیا ہے لیکن تو چونکہ اپنی حقیقت سے بیگانہ ہو گیا ہے اس لئے تو نے اپنی صفات بھی سب زائل کر دی ہیں۔ چنانچہ اب نہ تیرے اندر ترقی کا جذبہ پایا جاتا ہے نہ تسخیر کائنات کا حوصلہ نظر آتا ہے نہ تیرے اندر سرفروشی کا مادہ باقی ہے اور نہ اعلائے کلمۃ الحق کا ولولہ ہی کارفرما ہے۔ اندریں حالات تو خود فیصلہ کر کہ تو کس طرح اپنے منصب (خلافت الٰہیہ) کو حاصل کر سکتا ہے۔

(۱۱)

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

•

گیارھویں رباعی :۔ اس رباعی کا مضمون مذکورہ بالا رباعی سے مربوط ہے۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت یہ ہے کہ نہ ان میں ایمان کا رنگ باقی ہے اور نہ ان کو دنیا میں سروری اور حکومت حاصل ہے صوفی تو بہت سے موجود ہیں لیکن ان میں روشن ضمیری یا روحانیت کی شان نظر نہیں آتی اس لئے اے مسلمان! تو اللہ سے اسی شانِ فقر کے حصول کی دعا کر جو تیرے اسلاف میں پائی جاتی تھی کیونکہ جب تک تیرے اندر فقیری کی شان پیدا نہیں ہوگی تو امیری نہیں کر سکتا۔

نوٹ :۔ امیری سے اقبالؔ کی مراد خلافتِ الٰہیہ ہے اور اس کے لئے ایمان اور عمل صالح شرط ہے جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت سے ثابت ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ الخ اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لانے کے بعد اعمالِ صالحہ بجا لائیں یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ اور عمل صالح جیسا کہ میں قبل ازیں واضح کر چکا ہوں۔ شانِ فقر پر موقوف ہے۔

(۱۲)

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

•

بارھویں رباعی :۔ مطلب یہ ہے کہ جب مومن دنیا والوں سے ملتا جلتا ہے تو اہل عالم کے لئے اس کا وجود سراپا خیر و برکت اور موجب رحمت ہوتا ہے اس کی پبلک لائف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کا مظہر ہوتی ہے۔ یعنی اس کی جلوت میں شان محمدی کا رنگ نظر آتا ہے یعنی ایک دنیا اس کی ذات سے فیضیاب ہوتی ہے۔

اور جب وہ اپنے حجرہ میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہے تو اس کی خلوت میں شان ایزدی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے یعنی دنیا والے اس کے دروازہ پر اپنی حاجتیں لے کر حاضر ہوتے ہیں اور وہ بلا امتیاز مذہب و ملت سب کی دادرسی اور حاجت روائی کرتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ بوریا نشین ہوتا ہے لیکن ایک دنیا اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے اور اس کے دروازہ پر دست بستہ حاضر رہتی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر زمانے میں بڑے بڑے بادشاہ فقیروں کے آستانے پر حاضر ہوتے رہے ہیں چنانچہ ملا عبدالحمید لاہوری نے شاہجہان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے اپنی ساری عمر درویشوں کی آستانہ بوسی میں بسر کی ہے اور اپنی

مملکت کے طول وعرض میں جہاں کہیں درویش کی شہرت سنی میں ضرور اس کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن صرف دو درویشوں کو روحانیت کے اس بلند مقام پر پایا کہ میری مملکت میں ان کی نظیر موجود نہیں ہے ایک حضرت شیخ فضل اللہ بر ہانپوری دوسرے حضرت شیخ میاں میر لاہوریؒ۔

اس سے ثابت ہوا کہ خودی اگر کمال کو پہنچ جائے تو انسان میں خدائی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے یعنی انسان دنیا میں خدا کا نائب بن جاتا ہے۔

خودی کی زد میں ہے ساری خدائی۔ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ مومن ساری کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔ عرش و کرسی کی تسخیر سے مراد یہ ہے کہ مومن کی رسائی یہاں تک ہو سکتی ہے یعنی مومن مقرب بارگاہ الٰہی ہو سکتا ہے درحقیقت عرش و کرسی کا خودی کی زد میں ہونا۔ یہ شاعرانہ انداز بیان ہے یہاں لفظی معنی مراد نہیں ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن عرش تک پہنچ سکتا ہے اس میں اشارہ ہے واقعہ معراج کی طرف جو غایت شہرت کی بنا پر محتاج تشریح و تعارف نہیں ہے۔

(۱۳)

نگہ اُلجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں
نہ چھوڑ اے دل فغانِ صبح گاہی
اماں شاید ملے اللہ ھُو میں

▪

تیرھویں رباعی :- اس بلیغ رباعی میں اقبالؔ نے انسان کی تینوں قوتوں (Faculties) پر تبصرہ کیا ہے اقبال کے فلسفہ کی رو سے

انسان میں تین قوتیں ہیں (۱) نگاہ یعنی حواس خمسہ (۲) خرد یعنی عقل یا قوت مدرکہ (۳) فغاں یعنی عشق۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے انسان! تیرے حواس کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ رنگ و بو میں الجھے ہوئے ہیں یعنی ان کا تقاضا یہ ہے کہ تو ہر وقت دنیا کی فانی دلچسپیوں میں گرفتار رہے اور ان میں اس طرح الجھ جائے کہ تادم آخر خلاصی نہ ہو سکے اور تیری عقل ہر وقت مسائل کائنات کے حل کرنے میں منہمک رہتی ہے لیکن ان کا حل اس کی طاقت سے باہر ہے کیونکہ وہ یا تو چارسو یعنی زمان و مکان کی قید میں ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو ضرب کلیم میں یوں بیان کیا ہے۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اور پیام مشرق میں اس بات کو اس طرح واضح کیا ہے۔

زماں زماں سکندآنچہ می تراشد عقل
بیاں کہ عشق مسلمان و عقل زناری است

پس ان دونوں کی مدد سے تجھ کو اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے میں تجھ کو مشورہ دیتا ہوں کہ تو عشق کی پیروی کر یقیناً اس کی بدولت تجھے اماں (طمانیت) حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ عشق تجھ کو رنگ و بو اور چارسو دونوں سے نجات دے کر اللہ سے واصل کر سکتا ہے اور اس کی یاد سے انسان کو اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ نکتہ اقبال نے اس آیت سے اخذ کیا ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ اے لوگو! آگاہ ہو جاؤ کہ صرف اللہ ہی کے ذکر سے قلب کو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

چوتھے مصرع میں اقبالؔ نے لفظ "شاید" کو یقین کے معنی میں استعمال کیا ہے اور صاحب ذوقِ سلیم اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ یقین کا لفظ استعمال کرنے سے یہ دلکشی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے شروع میں یہ کہا ہے کہ یہ رباعی بہت بلیغ ہے چنانچہ میں اس کی بلاغت واضح کرنے کے لئے ناظرین کی توجہ اس طرف مبذول کرتا ہوں کہ اقبالؔ نے نگاہ کے لئے الجھی ہوئی اور عقل کے لئے کھوئی ہوئی کی ترکیب استعمال کی ہے انہی لفظوں میں بلاغت کی شان مضمر ہے یعنی اقبالؔ نے دو لفظوں میں ان کی پوری مادی زندگی کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ نگاہ کی بدولت انسان مناظر کائنات میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور عقل کی بدولت مسائل حیات میں گم ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ان دونوں کی بدولت خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کی تصدیق انسانی زندگی کے مطالعہ سے بآسانی ہو سکتی ہے ہر شخص حواس اور عقل کی پیروی ہی کی بنا پر اطمینانِ قلب سے محروم ہے مطمئن وہی ہیں جو عالم دیوانگی میں زندگی بسر کرتے ہیں اسی لئے تو کہا ہے

آزمودم عقل دور اندیش را
بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(۱۴)

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازیؒ

●

چودھویں رباعی:۔ اس رباعی میں اقبال کی شاعری کا رنگ بلاغت اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے اقبال نے چار مصرعوں کی مدد سے دریائے حقائق کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ بلاغت کلام کے علاوہ کنایات کے استعمال نے رباعی کی دلکشی میں چار چاند لگا دیئے ہیں بس یوں سمجھ لیجئے کہ بلاغت میں کنایہ بھی شامل ہو جائے تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ اس امتزاج سے جو طلسماتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس کو لفظوں کے ذریعہ سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔

عشق یعنی عاشق جب اپنی شانِ جمال دکھاتا ہے تو اس کا وجود دنیا والوں کے حق میں رحمت الٰہی بن جاتا ہے شانِ جمال عاشق کو بنی آدم کی خدمت پر آمادہ کر دیتی ہے اور شانِ جمال اس کو دنیا والوں سے خدمت کا صلہ طلب کرنے سے باز رکھتی ہے کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے۔

جب یہ دونوں شانیں اپنے مرتبہ کمال کو پہنچ جاتی ہیں تو مومن (عاشق) کے اندر حیدر کرار رض کی پختگی سیرت کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ یعنی مومن صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے زندہ رہتا ہے اور چونکہ اس کا مقصد حیات استرضائے خدائے تعالیٰ ہو جاتا ہے اس لئے وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی لطف و کرم سے پیش آتا ہے۔ یہ معنی ہیں ظرف کے یعنی مومن کے قلب میں اس قدر وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ ساری کائنات اس میں سما جاتی ہے اور دشمن تک اس کے دستر خوانِ کرم سے فیضیاب ہو سکتے ہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ "ظرف حیدر رض" کو ایک تاریخی مثال سے واضح کر دوں۔

جب لوگ ابن ملجم (قاتل حضرت علی رض) کو گرفتار کر کے ان کی خدمت میں لائے تو اس کو دیکھ کر انہوں نے اپنے علو ظرف کا ثبوت دیا یعنی لوگوں سے

یہ کہا کہ یہ شخص پیاسا معلوم ہوتا ہے اسے پانی پلاؤ۔ اگر حضرت علیؓ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ایسا نہیں کرتا بلکہ یقیناً اپنے قاتل کو ملامت کرتا یا اس کے ساتھ بدسلوکی روا رکھتا لیکن جب حضرت علیؓ نے ابن ملجم کو دیکھا تو انہیں قاتل نظر نہیں آیا بلکہ ایک ایسا انسان نظر آیا جو پیاسا تھا اس لئے انہوں نے ذاتی جذبۂ انتقام سے قطع نظر کر لی اور ایک انسان کی تکلیف رفع کرنے کا حکم دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جب تک ایک شخص حضرت علیؓ کے اس طرز عمل کو نہ سمجھ سکے وہ اقبال کے اس شعر کا مفہوم کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

آدمیت ؟ احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی (جاوید نامہ)

جس چیز نے حضرت علیؓ کو اپنے دشمن بلکہ قاتل کے ساتھ حسن سلوک پر آمادہ کر دیا اسی کو اقبال نے "ظرف حیدرؓ" سے تعبیر کیا ہے اور یہ "ظرف" اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب مومن میں شانِ جمال اور شانِ جلال دونوں مرتبۂ کمال کو پہنچ جائیں۔ اور یہ مرتبہ جناب علی کرم اللہ وجہہ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کی بدولت حاصل ہوا تھا اسی لئے اقبال نے حضرت علیؓ کی ذات کو عشق کے لئے باعثِ افتخار قرار دیا ہے۔

مسلم اوّل شہِ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ (اسرار خودی)

اسی لئے میرا مسلک یہ ہے کہ مرد کامل کی غلامی یا اتباع کے بغیر کوئی شخص کامل نہیں ہو سکتا کمال تو منبع کمال ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جو شخص مرد کامل کی صحبت سے بہرہ ور نہیں ہے۔ وہ نہ خود کامل ہو سکتا ہے نہ دوسروں کو کامل کر سکتا ہے اسی لئے ہر زمانہ میں علماء نے کاملوں کی صحبت

اختیار کی ہے مثلاً غلام یحییٰ بہاری مرحوم جن کا حاشیہ بر میر زاہد آج تک اہل علم کی نگاہ میں معقولات کی معراج تصور کیا جاتا ہے حصول صحبت ہی کے لئے لکھنؤ کی مسند علم و فضل کو چھوڑ کر دلی آئے اور حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان کے کفش برداروں میں داخل ہو گئے اور برسوں ان کی صحبت سے استفادہ کرتے رہے۔

میں نے یہ وضاحت اس لئے کی ہے کہ چوتھے مصرع کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آسکے چنانچہ اقبال کہتے ہیں کہ جب انسان عشق و مستی کی صفت سے محروم ہو جاتا ہے تو رازی بن جاتا ہے امام صاحب موصوف منطق، فلسفہ اور کلام تینوں علوم میں اپنے زمانہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے چنانچہ ان کی تفسیر اور دیگر تصانیف میرے قول پر شاہد ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے "ضعیف یقین" کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اور اگر یہ دولت نصیب نہ ہو سکی تو انسان مقصد حیات حاصل نہیں کر سکتا اور اگر مقصد حیات حاصل نہ ہوا تو متون اور حواشی سب بیکار ہیں اس لئے اقبال نے زبور عجم میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے۔

من آں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را
بہر ترے کہ ایں کالا بگیری سود مند اُفتد
بزور بازوئے حیدر بدہ ادراک رازی را

۱۵

وہ میرا رونقِ محفل کہاں ہے
مری بجلی مرا حاصل کہاں ہے
مقام اس کا ہے دل کی خلوتوں میں
خدا جانے مقامِ دل کہاں ہے

•

پندرھویں رباعی :- اس رباعی میں تصوف اور تغزل دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے اس لئے پڑھنے والے پر عالمِ وجد طاری ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ نے انتہائی بلیغ انداز میں "دل" کا مقام واضح کیا ہے۔ چوتھے مصرع میں رنگ استفہام نہیں ہے بلکہ شاعری کی ساری روح سمٹ کر آگئی ہے۔

عاشق اپنے دل کی تلاش میں سرگرداں ہے اس لئے پوچھتا ہے کہ کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ میرا دل جو رونقِ محفل بھی ہے اور بجلی اور حاصل بھی ہے یعنی باعثِ ایجادِ عالم ہے۔ کہاں ہے؟ یعنی اُس کا مقام کہاں ہے؟ لفظ مقام اس ساری رباعی کی جان ہے اور اس سے مراد ہے حقیقت یا ماہیت۔

پھر کہتا ہے کہ میں یہ تو نہیں جانتا کہ دل کا مقام کہاں ہے ہاں اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ "اس" کا مقام دل کی خلوتوں میں ہے یعنی وہ میرے دل میں رہتا ہے۔ یہاں سے دو مفہوم پیدا ہو جاتے ہیں۔

پہلا مفہوم یہ ہے کہ چوتھے مصرع کو شاعرانہ اندازِ بیان قرار دیا جائے تو اس صورت میں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اے مخاطب! تو خود فیصلہ کر جب مقامِ خدا دل ہے تو مقامِ دل کس قدر رفیع ہو گا یعنی شاعر نے اس رباعی میں مقامِ دل کی رفعت اور عظمت واضح کی ہے چونکہ دل مقامِ کبریا ہے اس

لئے بلاشبہ عرش کا ہم پایہ ہے۔

دوسرا مفہوم جو میرے مذاق کے مطابق ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کا مقام میرے دل میں ہے تو مخاطب خود غور کرے کہ دل کا مقام کہاں ہوگا یعنی جب وہ مجھ میں ہے تو لامحالہ میں اس میں ہوں اسی مضمون کو حضرت سیدی چراغ دہلیؒ نے یوں ادا کیا ہے۔

اے زاہد ظاہر بیں از قرب چہ می پرسی
او در من و من در وے چوں بو بگلاب اندر

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دوسری ہستی موجود ہی کہاں ہے جو دوئی کا رنگ پیدا ہو۔ چنانچہ عارف جامیؒ فرماتے ہیں۔

لَا اَریٰ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا ھُوْ — محو شد نام غیر و نقش سویٰ
ہستی مطلق است وحدت صرف — اَیْنَ ھُوَ۔ اَیْنَ اَنْتَ۔ اَیْنَ اَنَا

یعنی اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے اس لئے غیر کا نام اور دوسرے کا نقش میرے دل سے محو ہو چکا ہے۔ ہستی مطلق تو صرف وحدت ہے اس لئے اس میں من و تو کی گنجائش نہیں ہے یعنی نہ وہ ہے۔ نہ میں ہوں۔ نہ تو ہے۔

(۱۶)

سوارِ ناقہ و محمل نہیں میں
نشانِ جادہ ہوں منزل نہیں میں
مری تقدیر ہے خاشاک سوزی
فقط بجلی ہوں میں حاصل نہیں میں

●

سولھویں رباعی:۔ اس رباعی میں اقبالؔ نے مومن کی شان

واضح کی ہے کہ مومن میں نہیں رہتا بلکہ اپنی خودی کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے اس کی زندگی سراپا حرکت اور عمل ہوتی ہے نیز وہ بنی آدم کے حق میں رہنما کا کام دیتا ہے اور اس کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ باطل سے برسر جنگ رہتا ہے اور کفر کے خرمن کو جلا کر خاک کر دیتا ہے کیونکہ مومن ماسوی اللہ کے حق میں بجلی ہوتا ہے۔
چوتھے مصرع کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مومن آلائش دنیوی سے پاک ہوتا ہے کیونکہ حاصل بہرحال مادی شے سے عبارت ہے اور بجلی غیر مادی ہے۔ بہرحال مومن کو بجلی سے تشبیہ دینا۔ ارباب ذوق کی نظر میں لطف سے خالی نہیں ہے۔

(۱۷)

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

■

سترھویں رباعی:۔ اس رباعی میں اقبالؔ نے مسلمان کی حالت پر تبصرہ کیا ہے اور اس کے بعد اسے مناسب حال مشورہ دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تیرے سینے میں دل نہیں ہے صرف دم ہے لیکن وہ بھی ناقص ہے کیونکہ تو دنیا میں کوئی ہنگامہ بپا نہیں کر سکتا۔
یہ صورت حال اس لئے ہے کہ تو نے عقل کو اپنا رہنما بنا رکھا ہے پس اگر تو کامیاب ہونا چاہتا ہے تو مرتبۂ عقل سے ترقی کر کے مرتبۂ عشق تک پہونچ عقل بھی کارآمد ہے لیکن چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے۔ منزل تو اللہ ہے اور

اس تک رسائی صرف عشق کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔
واضح ہو کہ اقبال نے عقل کو انسان کا خادم قرار دیا ہے وہ انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتی یہ کام عشق کا ہے اور یہی اقبال کے فلسفہ کا خلاصہ ہے۔

(۱۸)

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

●

اٹھارھویں رباعی:۔ اس رباعی میں اقبال نے مسلمان کی حقیقت واضح کی ہے کہ اے مسلمان! تو اپنے آپ کو عناصر اربعہ کے امتزاج کا نتیجہ مت سمجھ بیشک تیرا جسم مادی ہے لیکن تیرا جوہر تو نوری ہے اور وہ کثافت مادی سے بالکل پاک ہے تو اشرف المخلوقات اور نائب خدا ہے ساری کائنات میں تجھ سے برتر کوئی ہستی نہیں ہے۔ فرشتے اور دوسری نوری مخلوقات سب تیری خادم ہیں بلکہ تو اگر کوئی کوشش کرے تو ان کو مسخر کر سکتا ہے اپنا تابع فرمان بنا سکتا ہے کیونکہ تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام اور دست پروردہ اور فیض یافتہ ہے۔ اور اس بات کا تذکرہ تو تحصیل حاصل ہے کہ جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا شرف حاصل ہو جائے وہ ساری کائنات پر حاکم ہو جاتا ہے۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اس بات کی زندہ مثال ہمارے سامنے موجود ہیں۔
نوٹ:۔ اگر ناقص انسانوں کا تربیت زادہ شاہین بڑے بڑے پرندوں کا شکار کر سکتا ہے تو جس انسان کی تربیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرمائیں

اگر وہ فرشتوں اور حوروں کا شکار کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

(۱۹)

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

•

انیسویں رباعی:۔ یہ بڑی مشہور و معروف رباعی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت پر اس سے بہتر تبصرہ ناممکن ہے۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں حرارت ایمانی بالکل مفقود ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت سے منحرف ہو گئے ہیں اور اس بنیادی کمزوری کے علاوہ ان میں دیگر عیوب بھی پیدا ہو گئے ہیں مثلاً ان میں اتحاد اور اتفاق نہیں ہے ان کے دل اطمینان سے محروم ہیں اور اگر وہ عبادت کرتے ہیں تو اس میں انہیں کوئی لطف نہیں آتا اور ان سب نقائص کا سبب یہ ہے کہ ان میں محبت کا جنوں جسے جذب اندرون سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ باقی نہیں رہا پس اگر مسلمان اپنی تمام کمزوریوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں تو از سر نو مسلمان ہو جائیں یعنی عشق رسولؐ اختیار کر لیں۔

(۲۰)

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا
برنگِ بحر ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

•

بیسویں رباعی:۔ اے مسلمان! بڑے شوق سے دنیا پر حکومت کر لیکن چنگیز اور ہلاکو کا جانشین بن کر نہیں بلکہ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کا غلام بن کر۔ اور ان کے نقش قدم پر چل کر اور اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی خودی کی تربیت کر۔ جب تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کرے گا تو تجھ پر اس دنیا کی حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ یہ تو تیری کنیز اور خادمہ ہے نہ کہ محبوبہ یا مقصود حیات نہیں بنا سکتا کیونکہ وہ اس کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ سراسر ہیچ ہے۔ فانی ہے بلکہ متاع الغرور ہے پس جو شے محض کھیل تماشا ہو کوئی عقلمند آدمی اس سے دل نہیں لگا سکتا۔ یا اس کو مقصود حیات نہیں بنا سکتا۔

جب یہ دنیا فانی ہے اور ہیچ ہے تو مومن کا طرز عمل اس کے ساتھ کیا ہونا چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مومن کو چاہئے کہ دنیا میں بیشک رہے لیکن علائق دنیوی یعنی زن۔ زر۔ اور زمین (کف ساحل) سے دل نہ لگائے ان سے استفادہ بیشک کرے لیکن ان کو مقصود حیات نہ بنائے جس طرح سمندر ساحل سے رابطہ تو بیشک رکھتا ہے لیکن کف ساحل (کوڑ کرکٹ یا کثافت وغلاظت) سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھتا ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے مومن کی زندگی کو پچھلی رباعی میں بجلی سے تشبیہ دی تھی یہاں سمندر سے دی ہے اور حق یہ ہے کہ تشبیہ بڑی ہی دلکش ہے کیونکہ سمندر کا قاعدہ ہے کہ ہر قسم کی کثافت ساحل پر جمع کر دیتا ہے ساحل کو مس تو کرتا ہے لیکن اس کی کثافتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا چونکہ یہ تشبیہ نام ہے اس لئے نہایت لطف انگیز ہے۔

(۲۱)

چمن میں رختِ گل شبنم سے تر ہے
سمن ہے سبزہ ہے بادِ سحر ہے
مگر ہنگامہ ہو سکتا نہیں گرم
یہاں کا لالہ بے سوزِ جگر ہے

•

اکیسویں رباعی :۔ اس رباعی میں اقبال نے باغ کا تلازمہ باندھا ہے یعنی چمن رخت گل شبنم۔ تری۔ سمن۔ سبزہ۔ باد سحر اور گل لالہ بالفاظ دگر انہوں نے چمن کے پردہ میں ملت اسلامیہ کی بے کیف زندگی پر ماتم کیا ہے۔ غور سے دیکھئے یہ رباعی نہیں ہے بلکہ اقبال نے مسلمان کی بے حسی پر مرثیہ لکھا ہے کہتے ہیں کہ اگرچہ مسلمانوں کو اس دنیا میں ترقی کرنے کے سارے ذرائع حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہنگامہ گرم نہیں کر سکتے یعنی مسلمان سر سے کفن باندھ کر باطل کے مقابلہ میں نہیں آسکتے کیوں؟ اس لئے کہ لالہ سوز جگر سے محروم ہے۔ یعنی وہ عشق رسولؐ سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ باغ میں سب کچھ ہے لیکن کوئی ہنگامہ گرم نہیں ہو سکتا کیوں؟ اس لئے کہ باغ کا لالہ نمائشی ہے اس میں داغ تو ہے لیکن سوز نہیں ہے بالفاظ دگر جب تک دل میں واقعی محبت رسول کی آگ نہ بھڑکے اس وقت تک محض سیاہ داغ یعنی زبان سے عشق رسولؐ کا ادعا مسلمانوں کو عمل پر آمادہ یا سر فروشی کا شیدا نہیں بنا سکتا۔

—(۲۲)—

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغِ رہ گذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گذر کو کیا خبر ہے

●

بائیسویں رباعی :۔ اس رباعی میں اقبال نے اپنے محبوب موضوع کو نئے لباس میں پیش کیا ہے وہی عقل اور عشق کا موازنہ اور وہی عشق کی برتری کا افسانہ وہی رومیؒ کی پیروی اور رازیؒ سے اجتناب کی تلقین۔ کہتے ہیں کہ عقل بھی مفید اور کارآمد ہے بلکہ سالک کے لئے لوازمات زندگی میں سے ہے کیونکہ عقل وہ چراغ ہے جو سرِراہ رکھا ہوا ہے اور اس کی بدولت راہ رو اپنا راستہ باسانی طے کرسکتا ہے لیکن جس طرح چراغ رہ گذر کو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے اسی طرح عقل اس بات سے آگاہ نہیں ہوسکتی کہ عاشق کی زندگی میں کیا کیا مقامات آتے ہیں اور کونسی کیفیات اس پر طاری ہوتی ہیں۔

انسان کیا ہے؟ دنیا کیا ہے؟ اس کی اصل کیا ہے؟ خدا سے انسان کا رشتہ کیا ہے؟ اس رشتہ یا تعلق کو کن باتوں سے ضعف پہونچ سکتا ہے؟ انسان اپنی خودی میں خدائی صفات کیسے پیدا کرسکتا ہے؟ عقل ان سوالات میں سے کسی کا جواب نہیں دے سکتی؟ کیوں؟ اس لئے کہ

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گذر کو کیا خبر ہے

دُعَا

(مسجد قرطبہ میں لکھی گئی)

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
صحبتِ اہلِ صفا نور و حضور و سرور
سرخوش و پرسوز ہے لالہ لبِ آبجو
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ میرے رہ گئی ایک مری آرزو
میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو
تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ھُو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تو ہی مری آرزو تو ہی مری جستجو

پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام
تُو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو
پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو
چشم کرم ساقیا دیر سے ہیں منتظر
جلوتیوں کے سبو خلوتیوں کے کدو
تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لئے لامکاں میرے لئے چار سو
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنّا جسے کہہ نہ سکیں رُو برو

دم عارف نسیم صبح دم ہے — اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسّر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

•

تجزیہ یہ پُرسوز، پُرکیف اور پُرتاثیر دعا جیسا کہ خود حضرت علامہؒ نے صراحت کی ہے انہوں نے مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی تھی پہلے تین شعروں میں دعا کا فلسفہ بیان کیا ہے اور اس کے بعد چار شعر حمد وثنا کے رنگ میں ہیں پھر دو شعروں میں دعا کی ہے اور ایک شعر میں فلسفہ اور شعر کی حقیقت بیان کی ہے۔ چونکہ یہ نظم ایک خاص ماحول میں اور خاص جذبہ کے تحت لکھی گئی ہے اس لئے اس کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والے کے دل میں بھی اسی قسم کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس نظم میں بظاہر نہ کسی لفظ میں اشکال ہے نہ کسی ترکیب میں اغلاق ہے۔ دشواری جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ اقبال کی شاعری سراسر رمز و کنایہ سے معمور ہے اور اس قسم کے اشعار کی خصوصیت یہ ہے کہ بظاہر مطلب کچھ ہوتا ہے لیکن بہ باطن شاعر کی مراد کچھ اور ہوتی ہے بالفاظ دیگر ایسا کے اشعار کا ظاہری مطلب جہاں ختم ہوتا ہے دراصل حقیقی مفہوم وہاں سے شروع ہوتا ہے یہ بات بال جبرئیل ہی سے مختص نہیں ہے اقبال کی ہر تصنیف میں یہی رنگ پایا جاتا ہے اس لئے میں اس نظم کا لفظی مطلب بیان کرنے کے بجائے اشعار کا حقیقی مفہوم ناظرین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا

پہلا شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ نماز بروئے شریعت سب سے بڑی عبادت ہے اور عبادت کا مغز دعا ہے لیکن دعا کی شرط یہ ہے کہ اس میں خلوص کا رنگ ہو یعنی دل کی گہرائیوں سے نکلے اس طرح کہ اس میں دعا کرنے والے کے جگر کا خون یعنی عشق کا رنگ منعکس ہو۔

"خون جگر" اقبال کی خاص اصطلاح ہے اور اس سے ان کی مراد عشق یا "خلوص قلب" ہوتی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

یا نزع میں ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

دوسرا شعر:۔ لیکن یہ خلوص یہ رنگ فدویت یہ تضرع اور یہ خضوع و خشوع اہل صفا یعنی عشاق کی صحبت سے پیدا ہو سکتا صحبت مرشد

کے بغیر انسان للّٰہیت اور خلوص کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

گل لالہ میں دلکشی اور رعنائی حسن اور زیبائی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ آبجو کے قریب ہوتا ہے اسی طرح انسان میں سرخوشی اور سوز و گداز اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ مرشد کی صحبت اختیار کرتا ہے جس طرح پانی پھولوں کی آبیاری کرتا ہے اسی طرح مرشد کی نگاہ دل کو ترو تازہ کرتی ہے۔

تیسرا شعر:۔ پس دعا میں اس وقت خلوص پیدا ہو سکتا ہے جب انسان اللہ کے عشق میں فنا ہو جائے لیکن اس راستہ میں نہ دوست کام آسکتا ہے نہ کوئی عزیز مدد کر سکتا ہے عاشق کو یہ راہ اپنی فانی کوشش اور ہمت سے طے کرنی پڑتی ہے ہاں اس راہ میں اگر کوئی رفیق ہو سکتا ہے تو وہ عاشق کا جذبہ عشق ہی ہے جو آخر تک اس کا ساتھ دے سکتا ہے اسی جذبہ عشق کو اقبال نے آرزو سے تعبیر کیا ہے۔

چوتھا شعر:۔ دعا کی حقیقت واضح کرنے کے بعد اب اقبال اللہ سے خطاب کرتے ہیں کہ اے رب کریم! میں تیرا ایک عاجز بندہ ہوں اور دنیا میں تیرے سوا کسی کو اپنا دست گیر اور حاجت روا نہیں سمجھتا میرا نشیمن بھی تو ہی ہے اور شاخ نشیمن بھی تو ہی ہے یعنی میں صرف تجھ ہی پر تکیہ کرتا ہوں اور اس تکیہ کی توفیق بھی تجھی سے طلب کرتا ہوں۔ میں صرف تجھی کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتا ہوں اور یہ سمجھ جو مجھ میں پیدا ہوئی ہے یہ بھی تیری ہی پیدا کردہ ہے۔

پانچواں شعر:۔ تیری ہی مہربانی سے میرے اندر عشق کا یہ رنگ پیدا ہوا ہے تیری ہی محبت کی بدولت میرے سینہ میں قیامت کا سا ہنگامہ برپا ہے تیرے ہی عشق کی آگ میرے دل میں بھڑک رہی ہے تیری ہی یاد میں اللہ ھو

کا نعرہ میرے لبوں سے نکل رہا ہے۔

اس شعر کے پہلے مصرع کے مضمون کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

چھٹا اور ساتواں شعر:- میری زندگی میں تیری ہی محبت کی بدولت سوز و گداز اور سرمستی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے تو ہی میرا مقصود اور مطلوب ہے اور تجھ کو حاصل کرنا ہی میری زندگی کا نصب العین ہے تیری معیت اور سنگت نصیب ہو جائے۔ تو ویرانہ میں آبادی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ نعمت مجھے نصیب نہ ہو تو پھر ساری دنیا میرے لئے ہیچ ہے۔

آٹھواں شعر:- اے خدا! میں بڑی ندامت کے ساتھ اپنے قصور کا اعتراف کرتا ہوں کہ تو نے تو اپنے فضل و کرم سے مجھ کو دولت ایمان عطا فرمادی تھی مگر میں نے کوتاہی عمل کی بنا پر اسے ضائع کر دیا لیکن اب مجھے اپنی غلطی کا شدید احساس ہے اس لئے تو پھر مجھ کو عشق رسول کی دولت عطا فرمادے۔

نواں شعر:- اور اے میرے مولی کریم میں اس دعا میں اپنی قوم کے تمام افراد کو شریک کرتا ہوں وہ لوگ جو امور دنیاوی میں مشغول ہیں اور وہ جو عزلت گزیں ہیں سب تیری نگاہ کرم کے منتظر ہیں۔

دسواں شعر:- اے خدا! میں بڑے ادب کے ساتھ تیری جناب میں عرض کرتا ہوں کہ میرا جذبۂ محبت زمان و مکان کی قید گوارا نہیں کر سکتا اس لئے تو اپنے فضل و کرم سے مجھ میں بھی لامکانی کی صفت پیدا کر دے۔

نوٹ:- چونکہ اقبال کی رائے میں خودی کا کمال یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جائے اس لئے انہوں نے ہر کتاب میں مسلمانوں کو

اسی نصب العین کے حصول کی تلقین کی ہے اور خود بھی اس نظم میں اللہ سے اسی دولت عظمیٰ کے حصول کی دعا کی ہے چنانچہ وہ اپنے مشہور خطبات میں ص۱۲۵ پر لکھتے ہیں کہ۔

ثقافت اسلامیہ کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ عقلیات خالص اور نفسیات مذہبی یعنی تصوف دونوں میں غیر محدود کے حصول کو مسلمانوں کا نصب العین قرار دیا گیا ہے اور ارباب علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ ایسی ثقافت میں زمان و مکان کا مسئلہ قوم کے حق میں زندگی اور موت کا حکم رکھتا ہے۔

(مذہبی فکر تشکیل جدید ص۱۲۵ پر)

گیارھواں شعر: آخری شعر میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ میں نے اللہ سے جو دعا کی ہے اس میں اپنے جذبات قلبی کی عکاسی مکمل طور سے نہیں کی ہے کیونکہ میں نے یہ دعا نثر میں نہیں کی ہے بلکہ شعر کی صورت میں کی ہے اور شاعری اور فلسفہ کی حقیقت یہ ہے کہ شاعر و فلسفی اپنے خیالات کو واشگاف بیان نہیں کرتا محض اس لئے کہ وہ بیان کر نہیں سکتا یعنی فلسفہ اور شعر کی خوبی رمز و ایما میں مضمر ہے چنانچہ دنیا کے تمام بڑے بڑے شعراء نے اسی صفت کی بدولت اپنی شاعری میں دلکشی کا رنگ پیدا کیا ہے۔

جن لوگوں نے کلام اقبالؔ کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی واقف ہیں۔ کہ اس میں یہ صفت سب سے زیادہ نمایاں ہے چنانچہ خود اقبالؔ نے اس شعر میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

برہنہ حرف نگفتن کمال گویائی است
حدیث خلوتیاں جز بہ رمز وایما نیست

یعنی شاعر کا کمال فن یہ ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو واضح طور پر بیان نہ کرے بلکہ رمز وایما، (اشارہ وکنایہ) سے کام لے کر اپنے پڑھنے والوں کی جولانیٔ طبع کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کر دے۔ اسی حقیقت کو مرشد رومیؒ نے جو اس انداز یا اسلوب کے سب سے بڑے علمبردار ہیں یوں واضح کیا ہے

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے — اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیبؑ آئے میسّر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

رباعی :۔ اس رباعی کا مطلب یہ ہے کہ عارفوں (اللہ والوں) کی صحبت انسانوں کے حق میں، نسیم صبح کا حکم رکھتی ہے اسی کی صحبت کی بدولت دنیا والوں پر انکشاف حقائق ہوتا ہے اور ان کی روحانی تربیت اور آبیاری ہوتی ہے اگر صحبت مرشد کا سلسلہ ختم ہو جائے تو باغ معانی یکلخت ویران ہو جائے بلکہ دنیا میں روحانیت ہی کا فقدان ہو جائے۔

اس کی مثال درکار ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا مطالعہ کر لو انہوں نے چند سال تک حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائیں اور اس سلسلے میں ان کو حضرت موصوف کی صحبت نصیب ہوئی چنانچہ اس فیض صحبت نے ان کو شبانی سے کلیمی کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔

شبانی سے کلیمی دو قدم ہے :۔ بلاشبہ بہت بلیغ مصرع ہے شبانی

کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو اوپر مذکور ہوئے۔ دوسرے معنی ادنیٰ حالت کے بھی ہو سکتے ہیں یعنی صحبت مرشد میں وہ تاثیر ہے کہ اس کی بدولت ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی بھی جس کے پاس نہ علم و فضل ہو نہ دنیاوی وجاہت نہ کوئی ہنر ہو نہ کسی قسم کی لیاقت وہ بھی اعلیٰ مرتبہ یعنی شرف مکالمت الٰہیہ حاصل کر سکتا ہے۔

مسجدِ قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں بے ثبات
اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم۔ عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود
عرشِ معلّٰی سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسّر تو کیا
اس کو میسّر نہیں سوز و گدازِ سجود
کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے
تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل

تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ
اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیٔ اربابِ ذوق فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل
مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقامِ بلند اس کا خیالِ عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ
کعبۂ اربابِ فن سطوتِ دینِ مبین
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقین
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے
دیدۂ انجم میں ہے تیری زمین و آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُر سوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر[1] تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

---

[1] وادالکبیر۔ قرطبہ کا مشہور دریا جس کے قریب ہی مسجد قرطبہ واقع ہے۔

یہ غیر فانی نظم جیسا کہ خود حضرت علامہ نے واضح کر دیا ہے قرطبہ (ہسپانیہ) کے دوران قیام میں اس ابڑے دیار کی جامع مسجد کی زیارت کے بعد لکھی گئی ہے۔ یہ مسجد صدیوں سے محروم اذاں ہونے کے باوجود آج بھی تمام دنیا کی مساجد کی سرتاج ہے اس کی وسعت اور شان و شوکت کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ :۔

ا۔ اس کا طول و عرض ۶۴۸ × ۴۴۰ فٹ ہے یعنی وسعت کے لحاظ سے دنیا میں سب سے بڑی مسجد ہے۔

ب۔ جامع مسجد دہلی کی تعمیر پر دس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا لیکن اس مسجد پر ۱½ کروڑ روپیہ سے زائد خرچ ہوا تھا۔

بلاشبہ یہ مسجد عجائبات عالم میں سے ہے اس کو سلطان عبدالرحمٰن الداخل نے جامع دمشق کے نمونہ پر تعمیر کرایا تھا۔ اور اس کے بعد اس کے جانشینوں نے اسے پایۂ تکمیل تک پہونچایا ۱۲۳۶ء میں زوال قرطبہ کے بعد یہ عدیم المثال مسجد گرجا بن گئی یعنی فاتحین نے اس کی محراب کے سایہ میں ایک چھوٹا سا گرجا تعمیر کر لیا۔ اسی انقلاب کو دیکھ کر اقبال نے یہ مصرع موزوں کیا تھا۔

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں

جس طرح یہ مسجد عربوں کے فن تعمیر کا شاہکار ہے اسی طرح اقبال کی یہ نظم جدید اردو ادب کا شاہکار ہے اس میں رمزیت اور ایمائیت (Symbolism) رومانیت اور جذبات نگاری (Romanticism) حقیقت پسندی اور شعریت (Realism) یعنی فن شاعری کی تمام خوبیاں بیک وقت جمع ہو گئی ہیں اور اقبال نے اپنی خداداد شاعرانہ قوت سے کام لے کر ان تمام صوری اور معنوی خوبیوں کو اس طرح باہم دگر مربوط کر دیا ہے کہ ایک طرف اس طرح باہم

دگر مربوط کر دیا ہے کہ ایک طرف اس نظم میں غیر معمولی دلکشی پیدا ہو گئی ہے
تو دوسری طرف خود ان کا شمار دنیا کے صف اول کے شعراء میں ہو گیا ہے۔ گوئٹے
(Goethe) کی طرح اقبال محض ایک مفکر یا مصلح قوم ہی نہیں بلکہ وہ اپنی
شاعری کی بدولت انسانوں کے دلوں پر بھی حکومت کرتے ہیں محاسن مذکورہ بالا
کے نہایت حسین امتزاج ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کے کلام کی اپیل عالمگیر ہو گئی ہے
یعنی موافق اور مخالف دونوں ان کے کلام سے یکساں طور پر متاثر ہوتے ہیں۔

اس نظم میں محاسن شعری کے علاوہ تاریخ فلسفہ اور رجائیت کے
عناصر بھی موجود ہیں اقبال نے اختصار کے ساتھ مسلمانانِ اندلس کی تاریخ
بھی بیان کر دی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بھی کھینچ دیا ہے اور مسلمانوں کو
ان کے شاندار مستقبل کی جھلک بھی دکھائی ہے ان تمام ظاہری اور باطنی
خوبیوں کی بنا پر اس نظم میں بے اندازہ جاذبیت اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

اس نظم میں آٹھ بند ہیں اور ہر بند میں ایک مرکزی خیال پایا جاتا ہے

۱ ۔ پہلے بند میں زمانہ کی حقیقت اور کار جہاں کی بے ثباتی بیان کی ہے

۲ ۔ دوسرے بند میں عشق کی صفات واضح کی ہیں یہ دو بند بطور تمہید لکھے ہیں۔

۳ ۔ تیسرے بند میں مسجد قرطبہ سے خطاب کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس مسجد کی بنیاد عشق پر رکھی گئی تھی۔

۴ ۔ چوتھے بند میں مسجد کی شان و شوکت کا تذکرہ ہے اور ضمناً ملت اسلامیہ کی بقا کا مژدہ بھی سنایا ہے۔

۵ ۔ پانچویں بند میں مردِ مومن کا تصور پیش کیا ہے۔

۶ ۔ چھٹے بند میں عربوں کی فتوحات اور عظمت رفتہ کا بیان ہے۔

۷ ۔ ساتویں بند میں یورپ کے بعض اہم انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۸۔ آٹھویں بند میں شاعر نے الہامی رنگ میں مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ کی پیشگوئی کی ہے اور آخری شعر میں اپنا فلسفہ پیغام کی صورت میں پیش کیا ہے تاکہ اس نظم کا مقصد واضح ہو سکے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اس نظم کی شرح لکھتا ہوں۔

پہلا بند

پہلے بند میں آٹھ شعر ہیں جن میں سے پہلے چھ شعروں میں اقبال نے سلسلۂ روز و شب کی جسے عام طور سے لوگ زمانہ کہتے ہیں حقیقت واضح کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تیرے شب و روز کی یعنی جسے تو زمانہ سمجھتا ہے۔ ماہیت یہ ہے کہ وہ حقیقی زماں کی ایک رو ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات ہے نہ ماضی ہے نہ حال ہے نہ مستقبل ہے۔

اقبال نے یہاں سلسلۂ روز و شب کی حقیقت تو واضح کر دی ہے کہ وہ زمانہ کا نام ہے لیکن اس رو یا حقیقی زماں کی ماہیت واضح نہیں کی اس کی وجہ یہ ہے کہ۔

اولاً۔ علامہ اقبال نے ایک مرتبہ دوران گفتگو میں مجھ سے فرمایا تھا کہ زمانہ کی حقیقت کو سمجھنا یا سمجھانا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنی خودی سے واقف نہ ہو۔ زمانہ کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً۔ زمانہ کی حقیقت بیان کرنے کا یہ کوئی موقع نہیں تھا اس مسئلہ پر انہوں نے اجمالاً دوسری نظموں میں اور تفصیلاً اپنے خطبات موسومہ مذہبی فکر کی تشکیل جدید میں اظہار خیالات کیا ہے۔ (ملاحظہ ہوں صفحات ۴۳ تا ۵۵ اور ۱۲۶ تا ۱۳۵) اس لئے میں بھی اس جگہ اس مسئلہ پر تفصیلی

بحث کرنے کے بجائے صرف چند اشارات پر اکتفا کر دوں گا۔

واضح ہو کہ اقبال متکلمین اور بعض حکمائے مغرب[1] کے مقابلہ میں زمانہ کو حقیقی مانتے ہیں بایں معنی کہ وہ خارج میں موجود ہے اور "الحقیقہ" کا ایک لازمی عنصر ہے[2] لیکن اس کی مادیت مجہول الکنہ ہے یعنی اس کی منطقی تعریف نہیں ہو سکتی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم اس کی حقیقت کو اپنے باطن میں محسوس کر سکتے ہیں۔ گویا حقیقی زمانہ ہمارے ایک باطنی احساس کا نام ہے یہ حقیقی زماں ایک نوع کی تخلیقی فعلیت (creative movement) ہے جس میں نہ ماضی ہے نہ حال ہے نہ مستقبل ہے۔ بلکہ اس کو مرور یا دوران خالص (pure duration) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اس حقیقی زمانہ یعنی مرور خالص سے زمان مسلسل پیدا ہوتا ہے جسے ہم سلسلۂ روز و شب کہتے ہیں۔ حقیقی زمانہ ایک رو کا نام ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات اور نہ اوقات ہیں نہ لمحات بلکہ وہ ایک وحدت ہے۔

اس حقیقی زمانہ کا ادراک حواس خمسہ سے نہیں ہو سکتا لیکن ہمارا شعور اس کا ادراک کر سکتا ہے اور اس کا طریقہ انہوں نے اسرار خودی میں یہ بتایا ہے۔

---

[1] مثلاً ڈاکٹر میک ٹیگرٹ۔

[2] لیکن وہ متکلمین کے دلائل کے وزن کا بھی اعتراف کرتے ہیں جن کا مسلک یہ ہے کہ زمانہ ایک امر موہوم ہے خارج میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے چنانچہ ڈاکٹر صاحب اپنے خطبات کے ص۵۵ پر تسلیم کرتے ہیں کہ زمانہ کی حقیقت کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

نکتۂ غیب و حضور اندر دل است
رمز ایام و مرور اندر دل است
نغمۂ خاموش دارد ساز وقت
غوطہ در دل زن کہ بینی راز وقت

یعنی زمانہ کی حقیقت خود تمہارے دل میں پوشیدہ ہے اس لئے اگر تم اس سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو اپنے دل میں غوطہ لگاؤ۔[1]

اس تصریح سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ زمانہ کی حقیقت دل میں پوشیدہ ہے اب رہی یہ بات کہ ایسا کیوں ہے اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے۔

ایں و آں پیداست از رفتارِ وقت
زندگی سرّیست از اسرارِ وقت

یعنی زندگی خود زمانہ کے اسرار میں سے ایک سرّ و بھید ہے بلکہ دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے۔

زندگی از دہر و دہر از زندگی است
لَاتَسُبُّوا الدَّھْرَ فرمانِ نبی است

یعنی زمانہ کی اصل زندگی ہے اور زندگی کی اصل زمانہ ہے زندگی سے یہاں مراد "الحقیقۃ" یعنی ذات باری ہے جیسا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ لَاتَسُبُّوا الدَّھْرَ فَاِنِّیْ اَنَا الدَّھْرُ یعنی زمانہ کو برا مت کہو کیونکہ میں خود زمانہ ہوں۔ اسی لئے محققین صوفیہ کا یہ مسلک ہے کہ زمانہ دراصل استمرار وجود باری ہی کا دوسرا نام ہے۔

---

[1] دل میں غوطہ لگانے کا طریقہ تفصیل کے ساتھ سابقہ اوراق میں بیان کر چکا ہوں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حقیقی زمانہ روح انسانی کی طرح ایک راز ہے جس سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو اپنی خودی سے واقف ہو اور میں پہلے واضح کر چکا ہوں کہ خودی سے آگاہ ہونے کا طریقہ دنیا میں ایک ہی ہے اور عشق الٰہی ہے یعنی صرف عاشق. زمانہ کی حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے اور ارباب نظر سے یہ نکتہ مخفی نہیں ہے کہ جب تک آپ کسی شے کی حقیقت سے آگاہ نہ ہوں اس وقت تک اس کو مسخر نہیں کر سکتے اسی لئے مرشد رومیؒ فرماتے ہیں۔

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سیّد جملہ موجودات را

یعنی جو شخص عشق الٰہی اختیار کرتا ہے وہ ساری کائنات پر حکمراں ہو جاتا ہے اور انسان کائنات پر حکمراں ہو نہیں سکتا جب تک وہ زمان و مکان پر حکمراں نہ ہو۔

پس اقبالؔ اور رومیؔ دونوں کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر زمانہ کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو دل میں غوطہ لگاؤ یعنی عشق الٰہی اختیار کرو کیونکہ عشق خود اصل حیات ہے اور زمانہ کی دست برد سے بالاتر ہے چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں۔

عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ خدا، خودی (روح) عشق اور زمانہ میں ایک ایسا مخفی ربط رکھا ہے جو عقل کی گرفت سے بالاتر ہے اس کی حقیقت صرف عاشق کو معلوم ہو سکتی ہے اب رہے ہم لوگ تو ہمارا حال یہ ہے کہ

ع چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

نوٹ:۔ بات بھی یہی ہے کہ زمان و مکان کی بحثوں میں عمریں صرف

ہو جاتی ہیں لیکن حقیقت کا سراغ نہیں ملتا اور نہ کوئی فلسفی زمانہ کے چہرے سے نقاب اٹھا سکتا ہے بلکہ ابھی تک اس مقام پر اپنے قلم کو روکتا ہوں۔

پہلے بند کو سمجھنے کے لئے صرف اس قدر ذہن نشین کر لینا کافی ہے کہ

۱۔ زمانہ کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی زماں اور تسلسل زماں جو اول الذکر کی بدولت عالم وجود میں آتا ہے۔

۲۔ حقیقی زماں کی ماہیت۔ روح کی طرح عقل کی گرفت سے بالاتر ہے وہ زندگی کی ایک شان ہے اور زندگی خود اس کی ایک شان (ت ع ه ك و ٩) ہے۔ وہ زندگی میں پوشیدہ ہے اور زندگی اس میں پوشیدہ ہے وہ زندگی سے ہے اور زندگی اس سے ہے۔

۳۔ جب تک خودی کی معرفت حاصل نہ ہو۔ زمان حقیقی کی معرفت بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

۴۔ زندگی۔ زماں میں ایک مسلسل حرکت کا نام ہے دوسرے لفظوں میں زمانہ کی مسلسل حرکات کو زندگی کہتے ہیں۔

اب میں اس بند کا مطلب بیان کرتا ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام واقعات اور حادثات زمان مسلسل (جو زمان خالص سے پیدا ہوتا ہے) ہی میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ سلسلۂ روز و شب یعنی زمان مسلسل زندگی اور موت کی بنیاد ہے بایں معنی کہ پیدا ہونا اور مر جانا تغیر کی نشانی ہے اور تغیرات اور انقلابات سب اسی زمانہ کی حرکت مسلسل سے پیدا ہوتے ہیں اللہ چونکہ تغیر اور انقلاب سے منزہ ہے اس لئے وہ زمان و مکان کی قید سے بھی بالاتر ہے۔

زمانہ بقول فلاسفہ مقدار حرکت کا نام ہے اور حرکت کا لازمی نتیجہ تغیر

ہے اور تغیر دلیل حدوث ہے اور جو حادثات ہے وہ نیست سے ہست ہوا ہے اور جو نیست سے ہست ہوا ہے وہ کبھی نہ کبھی پھر نیست ہو جائے گا اس دلیل سے یہ ثابت ہوا کہ ہر حادث اسیر زمان و مکان ہوتا ہے یہ عقلاً ناممکن ہے کہ حرکت ہو اور اس کے ساتھ یہ دو تصورات ذہن میں نہ آئیں کہ کب ہوئی اور کہاں آئی ؟

دوسرے شعر میں اقبالؔ نے سلسلۂ روز و شب کو تانے بانے سے تشبیہ دی ہے جس سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے یعنی اللہ کی تمام صفات مثلاً پیدا کرنا۔ رزق دینا۔ مارنا۔ زندہ کرنا وغیرہ زمان و مکان ہی میں ظاہر ہوتی ہیں۔

تارِ حریر دو رنگ یعنی کالے اور سفید رنگ کے ریشم کا تار سفید سے دن مراد ہے اور کالے سے رات۔

تیسرے شعر میں اقبالؔ نے زمانہ کو سازِ ازل کی فغاں سے تشبیہ دی ہے یعنی زمانہ کیا ہے ؟ ازل کے ساز سے ایک نغمہ نکل رہا ہے یعنی زمانہ اللہ کی تخلیقی فعالیت کا نام ہے اور تمام مخلوقات (ممکنات) جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ بقیدِ زمان و مکان ہی عالم وجود میں آتی ہیں۔

ممکنات کے لئے "زیر و بم" کا لفظ "سازِ ازل" کی رعایت کے لئے لائے ہیں۔ مراد ہے ظہورِ ممکنات۔

چوتھا اور پانچواں شعر:۔ زمانہ۔ بلاشبہ کائنات میں سب سے بڑا صیرفی یعنی کھرے کھوٹے کا پرکھنے والا ہے چنانچہ جو افراد و حادثات کم عیار یعنی ناقص اور کھوٹے ہوتے ہیں۔ زمانہ انہیں فراموش کر دیتا ہے۔

چھٹا شعر:۔ اے مخاطب ! سلسلۂ روز و شب کی حقیقت یا اصل

زمان خالص ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات۔ نہ حال ہے نہ استقبال! بس یہ زمان خالص ایک رَو (مرورِ) ہے جس میں کہیں سکون نہیں ہے۔

زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دَموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے

بالفاظ دگر زمانہ زندگی ہے اور زندگی ہی زمانہ ہے لیکن اس راز کو سمجھنے کے لئے خودی کی معرفت لازمی ہے جب تک عارفانہ نظر پیدا نہ ہو زمانہ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ؎

ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

ساتواں شعر: چونکہ حوادث یعنی معجزہ ہائے ہنر سب زمان و مکان میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے لازمی طور سے سب کے سب آنی اور فانی ہیں (جو آنی ہوگا وہ فانی بھی ہوگا) یعنی کارِ جہاں۔ یا کارخانۂ عالم سراسر بے ثبات ہے۔

آٹھواں شعر: کائنات میں انسان کی بنائی ہوئی ہر شے کی ابتدا نیستی سے ہوتی ہے اور انتہا بھی نیستی ہے یعنی کسی نہ کسی دن وہ شے ضرور مٹ جائے گی یعنی اول اور آخر فنا ہے۔

اسی طرح ہر مادی شے کا ظاہری پہلو بھی فانی ہے اور باطنی پہلو بھی فانی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ کائنات میں انسان کی بنائی ہوئی ہر شے کی خواہ وہ پرانی ہو یا نئی آخری منزل فنا ہے۔

دوسرا بند

لیکن اس نقش (آرٹ کا معجزہ) میں دوام کی صفت پائی جاتی ہے جسے کسی مردِ مومن نے پایۂ تکمیل کو پہونچایا ہو کیونکہ مومن اس کام کو عشق کی وساطت سے انجام دیتا ہے اور عشق چونکہ زمانِ مسلسل سے بالاتر اور جہاتِ ستہ سے آزاد ہوتا ہے (اس کا تعلق زمانِ خالص سے ہوتا ہے) اس لئے زمانِ مسلسل اس کے کارناموں کو فنا نہیں کر سکتا۔

آئندہ اشعار میں اقبال نے عشق کی صفات بیان کی ہیں۔

عشق۔ مومن کے اعمال و افعال میں رنگِ دوام پیدا کر دیتا ہے اور چونکہ عشق اصلِ حیات ہے اس لئے اس پر فنا طاری نہیں ہو سکتی۔

زمانہ اگرچہ بمنزلۂ سیل ہے لیکن عشق خود اس سے بڑھ کر سیل ہے اس لئے وہ زمانہ پر غالب آجاتا ہے اور اس کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

عشق۔ زمانہ کا بڑی کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے زمانہ ہر شئے کو ہلاک کر دیتا ہے لیکن عشق اور اس کے کارناموں پر اس کا قابو نہیں چلتا اس کی وجہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ عشق بلحاظ ذاتِ خویش زمانہ کی دستبرد سے بالاتر ہے۔

عشق میں جاودانی یعنی ابدیت کی صفت پائی جاتی ہے اس لئے اس کی تقویم میں عصرِ رواں کے علاوہ اور بہت سے (زمانے) اعصار بھی ہیں جن سے دنیا والے واقف نہیں ہیں اسی لئے ہماری زبان میں ان کے نام وضع نہیں کئے گئے۔

عشق کوئی مادی یا دنیاوی یعنی کثیف شئے نہیں ہے بلکہ نہایت پاکیزہ

اور روحانی ملکہ آسمانی جوہر ہے اس حقیقت کو اقبالؔ نے دمِ جبرئیلؑ اور دلِ مصطفےٰؐ سے واضح کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عشق کی عظمت، رفعت، پاکیزگی طہارت اور روحانیت کے اظہار کرنے کے لئے ان دو ناموں سے بڑھ کر کوئی نام ذہن میں نہیں آسکتا۔ دوسرے مصرع میں اقبالؔ نے پہلے مصرع کا مطلب بیان کیا ہے یعنی خدا کے رسول سے مراد۔ دلِ مصطفےٰؐ ہے اور خدا کے کلام سے مراد۔ دمِ جبرئیلؑ ہے۔

کہتے ہیں کہ مٹی کے پتلے یعنی انسان میں جو یہ تابناکی یہ چمک دمک یہ روشنی اور یہ روحانیت نظر آتی ہے یہ سب عشق ہی کا کرشمہ ہے۔

"کاس الکرام" کے لغوی معنی ہیں۔ فراخ دلی اور سخی۔ مے نوش کا پیالہ جس سے دوسرے بھی سیراب ہوتے ہیں یہ مشہور ترکیب عربی کے اس شعر سے مقتبس ہے۔

شَرِبْنَا وَصَبَبْنَا عَلَی الْاَرْضِ جُرْعَۃً
فَلِلْاَرْضِ مِنْ کَاسِ الْکِرَامِ نَصِیْبٌ

جب ہم نے شراب پی تو اس کا ایک گھونٹ زمین پر بھی بہا دیا۔ پس ثابت ہوا کہ سخی پیالہ میں زمین یعنی دوسروں کا حصہ بھی ہوتا ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ عشق وہ شراب ہے جس کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے اور عشق وہ پیالہ ہے جس سے ہر شخص کو فیض پہونچتا ہے یعنی عاشق کا وجود دنیا والوں کے حق میں باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

عشق۔ شریعت اسلامیہ کا سب سے بڑا محافظ اور شارح ہے اور عشق مجاہدوں کی فوج کا سردار ہے یعنی عشق ہی مومنوں کے دل میں جذبۂ جہاد پیدا کر دیتا ہے۔

عشق چونکہ "ابن السبیل" یعنی مسافر ہے اس لئے اس کے ہزاروں مقامات ہیں اقبال نے عشق کو مسافر سے تعبیر کیا ہے کیونکہ عشق ہی کی بدولت۔ سالک روحانی منازل طے کرتا ہے۔

اگر عشق نہ ہوتا تو زندگی کے ساز سے کوئی نغمہ برآمد نہ ہوتا یعنی زندگی ہی موجود نہ ہوتی نیز عشق ہی کی بدولت زندگی میں شان جمال اور شان جلال پائی جاتی ہے۔

اس بند کے مطالعہ سے ناظرین پر یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے کہ اقبال عشق کو باعث ایجادِ عالم یقین کرتے ہیں۔ یعنی اس باب میں مرشد رومیؒ کے سچے مقلد ہیں۔

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق

تیسرا بند

اس بند میں اقبال یہ کہتے ہیں کہ مسجد قرطبہ کا وجود بھی عشق ہی پر منحصر ہے یعنی جذبۂ عشق ہی کی بدولت عرب ایسی شاندار مسجد تعمیر کر سکے اور یہ چونکہ اپنے اندر صفتِ دوام رکھتا ہے اس لئے زمان مسلسل کی گرفت سے بالاتر ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مسلمان آج ہسپانیہ میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن ان کی ثقافت کا یہ عظیم الشان کارنامہ آج بھی اپنی جگہ قائم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مصوری۔ تعمیر۔ موسیقی۔ شاعری اور خطاطی ان تمام فنون لطیفہ کا وجود عشق پر موقوف ہے "خونِ جگر" سے یہاں جذبۂ عشق مراد ہے۔

صاحب فن کا خلوص یا جذبہ عشق غیر ذی روح اشیا میں زندگی کی شان پیدا کر دیتا ہے اور اس خلوص یا عشق ہی کی بدولت آواز میں تاثیر پیدا ہو جاتی ہے یعنی موسیقی میں جو سوز و گداز پایا جاتا ہے اس کی اصل نے نواز کا دل ہے نہ کہ لکڑی کا بنا ہوا ساز۔

کہتے ہیں کہ چونکہ یہ مسجد اور میری شاعری دونوں خلوص پر مبنی ہیں اس لئے اگر مسجد کی فضا دل فیروز ہے تو میرا کلام بھی دل گداز ہے اگر مسجد کا نظارہ ناظر کے دل میں اللہ کی ہستی کا یقین پیدا کرتا ہے تو میرے کلام کے مطالعہ سے بھی قلب میں محبت الٰہی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

اگرچہ مومن کا جسم مادی ہوتا ہے لیکن اس کا دل عرش معلیٰ سے کم نہیں ہے کیونکہ اس میں خدا کی محبت جاگزیں ہوتی ہے اور اس جذبہ عشق ہی کی بدولت انسانوں کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ فرشتے بھی اگرچہ اللہ کی حمد و ثنا کرتے ہیں لیکن ان میں عشق کا جذبہ نہیں ہے۔

اس کے بعد اقبال یہ کہتے ہیں کہ اس مسجد کو دیکھ کر میرے دل میں عشق الٰہی کی آگ اور بھی تیز ہو گئی اور میری زبان پر بے اختیار درود اور سلام جاری ہو گیا چنانچہ یہ نظم اسی والہانہ کیفیت کی آئینہ دار ہے۔

چوتھا بند

اے مسجد قرطبہ! تیری شان جلال و جمال اس بات کا ثبوت ہے کہ تجھے کسی مرد مومن نے تعمیر کیا تھا۔ نیز جس طرح تو جلیل و جمیل ہے اسی طرح وہ بھی صاحب جلال و جمال تھا۔

تیری بنیاد نہایت مستحکم ہے اور تیرے اندر بے شمار ستون ہیں (اس مسجد میں ۸۱۷ استون ہیں) جیسے شام کے نخلستان میں کھجوروں کے درخت (نہایت دلکش تشبیہ ہے۔)

تیرے در و بام پر نور برس رہا ہے اور تیرا مینارہ (جو ایک سو دس فٹ بلند ہے) جبریل کی جلوہ گاہ معلوم ہوتا ہے یعنی اس پہ برکات سماوی کا نزول ہوتا ہے۔

مسجد کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد اقبال کا ذہن مسلمان قوم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ اے مسجد! تجھے دیکھ کر میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ مسلمان اگرچہ ہسپانیہ سے مٹ گیا لیکن دنیا سے ہرگز نہیں مٹ سکتا کیونکہ وہ اس عالم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کا پاسباں اور اسلامی روایات کا محافظ ہے۔

مسلمان قوم کسی خاص خطۂ ارض میں محصور نہیں ہے بلکہ ساری دنیا اس کا وطن ہے نہ اس کی زمین کی کوئی حد ہے اور نہ اس کے آسمان کی کوئی نہایت ہے اس کی حکومت دریائے دجلہ سے لے کر دریائے ڈینوب اور دریائے نیل تک وسیع اور عریض رہ چکی ہے۔ (ثغور کا واحد ثغر ہے۔ یعنی سرحد۔)

اس مصرع میں سلطنت عثمانیہ کی وسعت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ سلطان سلیمان اعظم کے زمانہ میں یہ تینوں دریا سلطنت عثمانیہ میں شامل تھے دریائے دجلہ عراق میں ہے دریائے ڈینوب وسط یورپ میں اور دریائے نیل مصر میں ہے۔

مسلمانوں کی ملی تاریخ حیرت انگیز کارناموں سے بھری ہوئی ہے انہوں نے اپنے زمانہ عروج میں دنیا کے تمام علوم و فنون میں اس قدر ترقی کی تھی کہ دنیا

کی تاریخ میں نئے دور کا افتتاح ہو گیا۔

نوٹ:۔ میں ان کے کارناموں کی تفصیل اس مقام پر درج نہیں کرسکتا اس کے لئے ناظرین ڈاکٹر ڈریپر کی بلند پایہ تصنیف یورپ کی علمی ترقی کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔

اگرچہ مسلمان اپنے عہد عروج میں ساری دنیا پر اپنی سطوت کا سکہ جما چکے ہیں لیکن وہ اس گئی گذری حالت میں بھی محبت اور شجاعت میں کسی قوم سے کم نہیں ہیں آج بھی دنیا کو درس وفا دے سکتے ہیں آج بھی اللہ کے نام پر سر کٹانے کا جذبہ ان میں موجود ہے آج بھی وہ عشق رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی دولت کے مالک ہیں۔ ان کی شراب محبت میں آج بھی وہی تیزی ہے اور ان کی تلوار آج بھی جوہر دار ہے اور اعدائے دین کی سرکوبی کرسکتی ہے۔

مسلمان اس دور انحطاط میں بھی اپنے اندر سپاہیانہ اوصاف رکھتے ہیں اور توحید الٰہی کو زندہ رکھنے کے لئے سر بکف ہو سکتے ہیں۔

پانچواں بند

اس بند میں اقبالؔ مرد مومن کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔

مسلمان جب عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اپنے اندر شان فقر پیدا کر لیتا ہے تو اس کی زندگی میں انقلاب عظیم رونما ہو جاتا ہے اقبال نے اس بند میں انقلاب کی تصویر کھینچی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس مسجد کو دیکھ کر مومن کی

لہ رحیق کے لغوی معنی فسردہ کے ہیں۔ مراد ہے خالص یا تیز۔

شان سمجھ میں آسکتی ہے اور اس کے قلب کے سوز و گداز اس کی بلندیٔ خیال اور اس کے جذبۂ عشق و مستی کا تصور ذہن میں قائم ہو سکتا ہے۔

جب مومن میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے یعنی اس میں صفات ایزدی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جس کی بدولت اس کے اندر طلب کارآفرینی کارکشائی اور کارسازی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔

مومن اپنے جسم کے لحاظ سے بیشک خاکی ہوتا ہے لیکن روح کے لحاظ سے نوری ہوتا ہے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اس میں خدائی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا دل دونوں جہان سے غنی ہوتا ہے وہ محض اللہ کی خوشنودی کا طلبگار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا اور دنیا والوں سے کسی قسم کی توقعات نہیں رکھتا اس کا بھروسہ صرف اللہ پر ہوتا ہے اور اس کا نصب العین بہت بلند ہوتا ہے اس کی طرز زندگی میں دلکشی اور نگاہوں میں دلنوازی کی شان پائی جاتی ہے۔

مومن کی گفتگو میں نرمی اور محبت کا رنگ ہوتا ہے جب وہ میدان جنگ میں جاتا ہے تو سراپا جد و جہد بن جاتا ہے لیکن ان دونوں حالتوں میں خواہ وہ مجلس احباب میں ہو خواہ میدان جہاد میں۔ پاک طینت اور پاکباز ہوتا ہے۔

مومن اپنے یقین کی بدولت دنیا میں حق و صداقت کی تبلیغ کرتا ہے اور اس کے یقین ہی کی بدولت دنیا میں حق کو ثبات حاصل ہوتا ہے نیز اس دنیا میں صرف اس کا یقین ایک ایسی شئے ہے جسے حق کہہ سکتے ہیں۔ باقی یہ تمام دنیا بے حقیقت عارضی اور فانی شئے ہے۔

وہم۔ سے یہاں وہ شے مراد ہے جس کی کوئی اصلیت (قیمت) نہ ہو۔
طلسم۔ سے وہ شئے مراد ہے جس کا ظاہر کچھ ہو۔ باطن کچھ ہو یعنی دھوکہ۔
مجاز۔ سے وہ شئے مراد ہے جس کی کوئی حقیقت (بنیاد) نہ ہو۔

وہم یقین کی ضد ہے، طلسم صداقت کی ضد ہے اور مجاز حقیقت کی ضد ہے۔
خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مومن میں عقل اور عشق دونوں صفات اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں جلوہ گر ہوتی ہیں اور اس دنیا کی ساری رونق اور شان وشوکت اسی کے دم سے وابستہ ہے۔

چھٹا بند

اس بند میں اقبال نے پہلے دو شعروں میں مسجد کی تعریف کی ہے پھر اس مسجد کے بنانے والوں کی عظمت اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔
کہتے ہیں کہ اے مسجد! تو فنون لطیفہ کے ماہروں کی نظر میں ایسی ہی لائق احترام جیسے کعبہ مسلمانوں کی نظر میں تجھ کو دیکھ کر اسلام کی عظمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور تیری بدولت ہسپانیہ کی سرزمین بھی مکہ معظمہ کی طرح محترم اور معزز ہو گئی۔
تیرے حسن وجمال کی نظیر اس دنیا میں اگر کہیں مل سکتی ہے تو وہ صرف قلب مومن ہے۔ واضح ہو کہ اقبال نے مسجد کو قلب مومن سے تشبیہ دے کر دو باتیں ثابت کی ہیں۔
پہلی بات یہ کہ مومن کا دل حسن وجمال کا مرکز اور منبع ہوتا ہے (مومن کے دل کو منبع حسن وجمال قرار دینا اقبال کی ندرت فکر کا کمال ہے) دوسری بات یہ کہ دنیا کی کوئی مسجد حسن وجمال کے اعتبار سے جامع قرطبہ کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔
میں اس شرح میں اس مسجد کی خوبصورتی کی تفصیل تو لکھ نہیں سکتا اس

سلسلہ میں صرف چند باتیں درج کر سکتا ہوں۔

اس بے نظیر مسجد کی تعمیر عبدالرحمٰن اول نے شروع کی اور اس کے جانشین ہشام نے ۱۸۰ھ سنہ ۷۹۶ء میں اسے پایۂ تکمیل پہونچایا۔ اور اس کے جانشین عبدالرحمٰن ثانی نے اس میں توسیع کی، اور اس کے جانشین سلطان اعظم عبدالرحمٰن ثالث نے ۲۶۱۵۳۲ دینار سرخ اس کی آرائش و زیبائش پر صرف کر کے اسے مساجد عالم کی ملکہ بنا دیا۔

اس مسجد کی آرائش و زیبائش کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کا منبر خالص ہاتھی دانت کا تھا۔ اور اس میں بہت سے جواہرات لگے تھے اس پر ۳۵ ہزار دینار صرف ہوئے تھے یعنی موجودہ زمانہ میں اس کی قیمت ۲۵ لاکھ دینار کے قریب ہوگی۔

اس مسجد میں ۱۴۱۷ خالص سنگ مرمر کے ستون ہیں جن کے نقش و نگار کمال فن کی دلیل ہے۔ شام کے وقت اس میں دس ہزار جھاڑ فانوس روشن رہتے تھے۔ وسط میں تین سب سے بڑے جھاڑ خالص چاندی کے تھے باقی سب پیتل کے تھے ان میں سے ہر ایک میں ۱۴۸۰ پیالے روشن ہوتے تھے جن میں شبانہ ۲۶ سیر تیل جلتا تھا تین سو فراش اس کی صفائی پر متعین تھے۔

مسجد کا ذکر کرتے کرتے اقبالؔ کا ذہن قدرتی طور پر اس قوم کے کارناموں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس نے یہ عدیم المثال مسجد بنائی تھی چنانچہ اس بند کے تیسرے شعر سے آخر تک انہوں نے عربوں کی عظمت رفتہ کی داستان بیان کی ہے چونکہ اقبالؔ کو یہ معلوم تھا کہ وہ چار یا چھ شعروں میں ہسپانیہ کی تاریخ نظم نہیں کر سکتے اس لئے انہوں نے رنگ اختصار کو مد نظر رکھ کر اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں مسلمانان اندلس کی چھ سو سال کی تاریخ

مضمر ہے۔ اسی لئے ان چھ شعروں کے پڑھنے سے دل میں وہ اثر پیدا ہو سکتا ہے جو پوری تاریخ پڑھنے سے بھی شاید نہ ہو سکے۔

مثال کے طور پر پہلے شعر کے الفاظ پر غور کیجئے۔

اقبالؔ نے اس شعر کو لفظ آہ سے شروع کیا ہے یہ لفظ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ مسلمانانِ اندلس کی تاریخ ایک دردناک المیہ (ٹریجیڈی) ہے یعنی ان کی پوری تاریخ اس ایک لفظ میں پوشیدہ ہے۔

"مردانِ حق" کی ترکیب یہ بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے ہسپانیہ کو فتح کیا تھا یعنی طارقؒ اور ان کے ہمراہی وہ سچے مسلمان تھے ان کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ حق کا بول بالا ہو۔

"عربی شہسوار" کی ترکیب یہ بتاتی ہے کہ وہ لوگ عربی النسل تھے۔ اور شہسواری میں ممتاز تھے بلکہ یہ ان کی قومی خصوصیت تھی علاوہ بریں اس لفظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہسپانیہ میں تجارت کرنے کے بہانے سے داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس ملک پر فوج کشی کی تھی۔

"خلق عظیم" اقبالؔ نے یہ ترکیب قرآن کریم سے مستعار کی ہے اسی لئے اس کو واوین (" ") میں لکھا ہے قرآن کریم میں اللہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرمایا ہے۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ یعنی یقیناً آپؐ بہت بلند اخلاق رکھتے ہیں۔ حامل خلق عظیم میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ بھی چونکہ سچے مسلمان تھے اس لئے بلند اخلاق کے مالک تھے۔

"صاحب صدق ویقین" یہ ترکیب بھی ان عربوں کی سیرت کو واضح کرتی ہے جنہوں نے طارقؒ کی ہمراہی میں اس ملک کو فتح کیا تھا۔

ان لوگوں کی طرز حکومت سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ سچے مسلمان کی

شاہی میں بھی فقر کا رنگ پایا جاتا ہے یعنی مومن کی حکومت انسانوں کے حق میں باعث رحمت ہوتی ہے۔

ان لوگوں نے یعنی عربوں نے مشرق اور مغرب کو اسلام کے نور سے منور کر دیا اور انہی کی بدولت یورپ میں جو ان کی آمد سے قبل جہالت اور اوہام باطلہ کی تاریکی میں مبتلا تھا علم وفن کی روشنی پھیل گئی چنانچہ یورپ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اس خطہ میں علوم وفنون کی اشاعت عربوں ہی کی وساطت سے ہوئی قرطبہ اور غرناطہ کے مدرسوں میں انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی اور اطالیہ کے طلبہ مختلف علوم وفنون حاصل کرتے تھے اور ٹامس اکوئیناس۔ جان اسکوٹس۔ راجر بیکن وغیرہم۔ یہ سب فلسفی مشہور اندلسی حکیم ابن رشد ہی کے خوشہ چین ہیں بلکہ فرانس اور اطالیہ میں تو فلسفۂ ابن رشد کے مرکز قائم تھے جہاں سے اس نامور حکیم کے فلسفہ کی باقاعدہ اشاعت ہوتی تھی۔

آج بھی ہسپانیہ کے باشندوں میں عربی خون کی آمیزش کی وجہ سے خوش مزاجی۔ مہمان نوازی۔ سادہ دلی اور حسن ظاہری کا رنگ پایا جاتا ہے۔

آج بھی اندلس کی ہوا میں یمن کی خوشبو اور وہاں کے باشندوں کی گفتگو میں حجازی لب ولہجہ کا اثر موجود ہے۔

ساتواں بند

پہلے شعر میں مسجد سے خطاب ہے کہ مسلمان کی نگاہ میں تیری زمین آسمان کی ہم پلّہ ہے لیکن افسوس ہے کہ صدیوں سے تیرے صحن میں نماز نہیں ہوئی اور تیرے مینارہ سے اذان کی آواز بلند نہیں ہوئی۔

دوسرے شعر سے بعد اقبال اپنے جذبات کا اظہار شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا معلوم اب تک اندلس میں انقلاب کیوں نہیں برپا ہوا؟ خدا معلوم مسلمانوں کا قافلہ کس منزل میں رکا ہوا ہے جو ابھی تک یہاں نہیں پہونچا؟ جب کہ انقلاب اس جہان کا آئین ہے تو خدا معلوم ابھی تک یہ سرزمین ہلالی پرچم سے کیوں محروم ہے؟

اس کے بعد چار شعروں میں اقبال نے کمال بلاغت کے ساتھ یورپ کے بڑے بڑے انقلابات کا ذکر کیا ہے جو ان کے قیاس کے موید ہیں یعنی جب جرمنی فرانس اور اطالیہ میں انقلاب رونما ہو چکا ہے؟ تو اگر ہسپانیہ میں بھی عنقریب کوئی انقلاب رونما ہو جائے تو بعید از قیاس نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ زوالِ غرناطہ کے بعد یورپ میں بہت سے انقلابات رونما ہو چکے ہیں مثلاً سولہویں صدی میں جرمنی میں لوتھر نے اصلاح کلیسائے روم کے نام سے ایک تحریک شروع کی جس نے یورپ میں ایک عظیم الشان انقلاب برپا کر دیا جس کی بدولت نصف سے زائد مسیحی دنیا پاپائے روم سے مذہبی اقتدار سے آزاد ہو گئی۔

لہ ۔ اصلاحِ دین سے مراد تحریک ہے جو لوتھر نے پوپ اور کلیسائے روم کے خلاف شروع کی تھی میں اس کی تفصیل تو اس شرح میں درج نہیں کر سکتا صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

صورت یہ ہوئی کہ رومن کیتھولک کلیسا کی تعلیمات عجیبہ میں سے یہ دو باتیں بھی تھیں (اور اب بھی ہیں) کہ

(۱) پوپ (یا پائے روم) عیسائیوں کے گناہ معاف کر سکتا ہے چنانچہ معافی ناموں کی فروخت کا باقاعدہ محکمہ قائم تھا اور پوپوں کو اس تجارت سے کافی آمدنی

(بقیہ صفحہ پر)

نیز اس اصلاح (Reformation) کا ایک زبردست نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پیر کلیسا کی عصمت کا عقیدہ باطل ہو گیا یعنی جو ممالک مثلاً جرمنی، انگلستان یا پاپائے روم کے اقتدار سے آزاد ہو گئے ہیں وہاں کے عیسائی اس کو معصوم نہیں سمجھتے ہیں۔

واضح ہو کہ کلیسائے روم یعنی رومن کیتھولک چرچ کا یہ عقیدہ ہے کہ پوپ معصوم عن الخطا ہے اس سے غلطی یا گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ لوتھر نے اس عقیدہ کا ابطال کیا جس کی بدولت پروٹسٹنٹ کلیسا کے پادریوں کو بائبل میں غور و فکر

(بقیہ صفحہ ۵۷۰ کا)
ہوتی تھی کلیسائی اصطلاح میں اس فروختِ تذکرات الغفران (Sale of Indulgences) کہتے ہیں۔

(ب) حقانیت کا دار و مدار کلیسا پر ہے نہ کہ بائبل پر یعنی حق وہ ہے جسے کلیسا حق قرار دے۔

۱۵۱۷ء میں مارٹن لوتھر نامی ایک پادری نے جو وٹن برگ یونیورسٹی واقع سیکسی (جرمنی) میں پروفیسر تھا ان دونوں عقیدوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ۳۱ اکتوبر ۱۵۱۷ء کو کافی غور و فکر کے بعد شہر کے سب سے بڑے گرجے کے دروازے پر پوپ اور کلیسا کے ان دونوں عقائد (تعلیمات) کی تردید جلی قلم سے لکھ کر چسپاں کر دی۔ یہ گویا کلیسا کے خلاف اعلان جنگ تھا جو ایک نحیف پادری کی طرف سے کیا گیا تھا چونکہ لوتھر نے کلیسائی طریق کار کے خلاف پروٹسٹ کیا تھا اس لئے اس کے ہم خیال پروٹیسٹنٹ فرقہ کے نام سے مشہور ہو گئے ۱۵۲۰ء میں پوپ لیو دہم (Leo X) نے لوتھر کو کلیسا سے خارج کر دیا لیکن لوتھر کی تحریک نے رفتہ رفتہ نصف عیسائی دنیا کو پوپ کی غلامی سے نجات دلا دی۔

کرنے اور اس کی تفسیر لکھنے کی آزادی نصیب ہوئی۔

رومن کیتھولک دنیا میں کوئی شخص، کوئی مذہبی یا فلسفیانہ یا علمی کتاب شائع نہیں کرسکتا جب تک کلیسا اس کے مضامین کی صحت کی تصدیق نہ کردے اس کام کے لئے پوپ کی طرف سے احتساب کتب کا ایک باقاعدہ محکمہ قائم ہے۔

اسی طرح اٹھارہویں صدی میں بھی عظیم الشان انقلاب[۱] برپا ہوا جس کا نام ہی انقلاب فرانس ہے اس کی مفصل تاریخ کارلائل (۱۸۸۱ء تا ۱۷۹۵ء) نے انگریزی زبان میں لکھی ہے اس انقلاب سے اہل مغرب کی دنیا ہی بدل گئی کیونکہ اس انقلاب کی بدولت یورپ کی قومیں حریت اخوت اور مساوات کے الفاظ سے آشنا ہوئیں۔ شاید کبھی مفہوم سے بھی آگاہ ہو جائیں۔

نوٹ:۔ میں نے جو یہ لکھا ہے کہ اقوام مغرب ان لفظوں کے معانی سے ہنوز

---

[۱] "انقلاب فرانس"، کی داستان بھی بہت طویل ہے اس جگہ صرف اتنا بتانا کافی ہوگا کہ فرانس کے باشندے چونکہ شخصی حکومت کے تلخ ثمرات سے تنگ آچکے تھے اس لئے "تنگ آمد بجنگ آمد" والا معاملہ ہوگیا کہ ۵ مئی ۱۷۸۹ء کو پیرس میں سارے ملک کے نمائندوں کی مجلس منعقد ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملوکیت کو ختم کرکے جمہوریت قائم کرنی چاہیئے چنانچہ تین سال کی جدوجہد کے بعد ۱۷۹۲ء میں فرانس میں ری پبلک (جمہوریت) قائم ہوگئی اور لوئی شانزدہم (۱۷۵۴ء تا ۱۷۹۳ء) کو جنوری ۱۷۹۳ء میں اور اس کی ملکہ ماری انٹوینیٹ . . . . (marie Antoinette) کو اکتوبر ۱۷۹۳ء میں بجلی کی کرسی پر بٹھا کر سوئے عدم روانہ کیا گیا اور اس طرح فرانس ہمیشہ کے لئے ملوکیت کی لعنت سے پاک ہوگیا۔

آشنا نہیں ہوئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصول سہ گانہ عقیدۂ توحید کا منطقی نتیجہ ہیں۔ اس لئے جب تک کوئی قوم خالص توحید کے عقیدہ پر حامل نہ ہو وہ ان الفاظ کے مفہوم سے کیسے آگاہ ہو سکتی ہے جب تک کوئی قوم توحید کو ایک عنصر فعّال کی حیثیت سے اپنی اجتماعی زندگی میں داخل نہ کرے اس وقت تک یہ پاکیزہ اصول عملی جامہ نہیں پہن سکتے۔

جب مسلمان زندہ تھے تو یہ اصول بھی ان کی زندگی سے مترشح ہوتے تھے چنانچہ اقبالؔ نے رموز بیخودی میں ان کے تاریخی شواہد پیش کئے ہیں لیکن اب عرصۂ دراز سے مسلمانان در گور مسلمانی در کتاب،، والا مضمون ہے اس لئے آج ۱۹۵۱ء میں حریت۔ اخوت اور مساوات یہ تین لفظ ایسے ہیں کہ ان کا مفہوم تو مسلمانوں کے ذہن میں موجود ہے لیکن ان کا مصداق خارج میں کہیں موجود نہیں ہے اقبالؔ نے اسی تلخ حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

اسی طرح اطالوی قوم بھی جو عرصہ دراز سے قدامت پرستی میں مبتلا تھی تجدید و اصطلاح حال کی بدولت از سر نو طاقتور ہو گئی ہے۔

اندریں حالات اگر عربوں یا مسلمانوں میں بھی کوئی ایسا انقلاب رونما ہو جائے جس کی بنا پر ان میں زندگی پیدا ہو جائے تو بعید از قیاس نہیں ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم میں جو ایک عام اضطرابی کیفیت پائی جاتی ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جلد یا بدیر ان میں بھی انقلاب برپا ہو گا اس لئے اقبالؔ منتظر ہیں کہ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے اور آسمان آئندہ کیا رنگ بدلتا ہے۔

آٹھواں بند

اس آخری بند کا پہلا شعر فنی اعتبار سے بے نظیر ہے ساری نظم میں اس کا جواب نہیں ہے دوسرے مصرع میں استعارہ بالکنایہ نے شعر کو آسمان پر پہونچا دیا ہے شاعر نے پہلے آفتاب کو ایک تاجر قرار دیا پھر اس کے لئے لعل بدخشاں کے "ڈھیر" ثابت کئے۔

اسی طرح دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں دل کو کشتی تصور کرکے پھر عہد شباب کو کشتیٔ دل کے لئے بمنزلہ سیلاب قرار دیا یہ کتنا دلکش انداز بیان ہے اس حقیقت کے اظہار کے لئے کہ جوانی میں دل پر قابو نہیں رہ سکتا یہ ظالم کسی نہ کسی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو ہی جاتا ہے۔

شام کا وقت ہے آفتاب ابھی غروب ہوا ہے دہقان کی لڑکی گیت گاتی ہوئی گھر واپس جا رہی ہے شاعر عالم خیال میں دریا کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اے دریا! تجھے کیا خبر کہ کوئی شخص تیرے کنارے آئندہ زمانہ کا خواب دیکھ رہا ہے میں جس آنے والے زمانہ کا تصور کر رہا ہوں وہ اگرچہ ابھی دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے لیکن میں اس کے آغاز کو دیکھ رہا ہوں اگر میں آنے والے انقلاب کی تفصیل بیان کروں تو یورپین اقوام اس پر یقین نہیں کریں گی اس لئے میں خاموش رہنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔

اس کے بعد شاعر مسلمان سے خطاب کرتا ہے کہ زندگی انقلاب کا دوسرا نام ہے جس قوم کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کی آرزو نہ ہو اس کا شمار زندہ اقوام میں نہیں کیا جا سکتا قوموں کی زندگی صرف انقلاب پیدا

کرسکنے پر منحصر ہے جو قوم ہر وقت اپنے اعمال کا جائزہ لیتی رہتی ہے اور انقلاب برپا کرنے کی تیاری کرتی رہتی ہے وہی قوم دست قضا میں شمشیر بنتی ہے یعنی خدا اسی قوم کو اقوام عالم کی سرداری عطا فرماتا ہے۔

اس بند کا آخری شعر پوری نظم کی جان ہے کیونکہ اس میں اقبال نے اپنا فلسفہ جسے ان کے پیغام کی روح سے تعبیر کرسکتے ہیں، بیان کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ قوموں کی ترقی دو باتوں پر موقوف ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی نہ کوئی نصب العین ضرور ہونا چاہیئے جو قوم اپنا مقصدِ حیات متعین نہیں کرتی اس کی زندگی بالکل بے معنی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نصب العین کے حصول کا جذبہ عشق کے درجہ پر پہونچ جائے۔ کیونکہ عشق کے بغیر سب ارادے ناتمام رہتے ہیں اس کے بغیر کوئی قوم اپنی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے انہیں اس حقیقت کو ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ انقلاب آئین حیات ہے جس کو قرآن حکیم بدیں الفاظ بیان فرماتا ہے۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ یعنی عروج و زوال کے دنوں کو ہم یونہی لوگوں میں نوبت بہ نوبت لاتے رہتے ہیں آج ایک قوم برسر عروج ہے کل دوسری قوم پس مسلمانوں کو انقلاب برپا کرنے کی تیاری کرنی چاہیئے اور اس کی صورت ایک ہی ہے یعنی وہ اپنے اندر عشق کا جذبہ پیدا کریں نصب العین کا حصول اسی جذبۂ عشق پر موقوف ہے۔

قید خانہ میں معتمد کی فریاد

معتمد اشبیلیہ کا بادشاہ اور عربی شاعر تھا ہسپانیہ کے ایک حکمران نے اس کو شکست دے کر قید میں ڈال دیا تھا معتمد کی نظمیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" میں شائع ہو چکی ہے۔

اک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا جاتی رہی تاثیر بھی
مردِ حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
میں پشیماں ہوں پشیماں ہے مری تدبیر بھی
خود بخود زنجیر کی جانب کھنچا جاتا ہے دل
تھی اسی فولاد سے شاید مری شمشیر بھی
جو مری تیغ دو دم تھی اب مری زنجیر ہے
شوخ و بے پروا ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی

●

چونکہ اس نظم کا مطلب سمجھنے کے لئے معتمد کے سوانح حیات سے واقفیت ضروری ہے اس لئے ذیل میں اس بہادر مگر کوتاہ میں اور بدنصیب بادشاہ کے مختصر حالات درج کرتا ہوں۔

واضح ہو کہ جس طرح محمد شاہ کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ خود مختار صوبوں میں منقسم ہو گئی تھی اسی طرح ہشام کی معزولی کے بعد سلطنت اندلس چھوٹی چھوٹی

خود مختار ریاستوں میں منقسم ہو گئی چنانچہ بنی عباد نے اشبیلیہ میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی۔ المعتمد باللہ سنہ ۴۶۱ھ (۱۰۷۱ء) میں تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ بہت بہادر تھا لیکن اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مسلمان حکمران آپس میں برسرپیکار رہتے تھے اور عیسائی حکمرانوں سے طالب امداد ہوتے تھے چنانچہ معتمد نے بھی ایک عیسائی سردار الفانسو سے دوستی کی اور اسے خراج دینا بھی منظور کیا تاکہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے معتمد کی فوجی امداد کر سکے مسلمان حکمرانوں کے اسی طرزِ عمل نے ان کو تباہ کر دیا۔

۴۷۵ھ میں معتمد نے الفانسو کے سفیر کو جو خراج لینے آیا تھا اس بات پر قتل کرا دیا تاکہ وہ خراج کی رقم سونے کی شکل میں وصول کرنا چاہتا تھا اس پر الفانسو نے اشبیلیہ پر حملہ کیا تو معتمد نے یوسف ابن تاشقین والی مغرب الاقصیٰ سے امداد طلب کی چنانچہ یہ حکمران اس کی امداد کیلئے آیا اور الفانسو کو شکست دے کر واپس چلا گیا لیکن چونکہ وہ معتمد کی کمزوری سے آگاہ ہو چکا تھا اس لئے دوسرے سال اس نے اشبیلیہ پر چڑھائی کر دی اور معتمد کو قید کر کے افریقہ لے گیا اور اس کی ریاست اپنی مملکت میں شامل کر لی۔ یوسف نے معتمد کو قید خانہ میں زندگی کی جملہ ضروریات مہیا کر دی تھیں یہ بدنصیب بادشاہ چونکہ شاعر بھی تھا اس لئے اشعار کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتا تھا لیکن ۴۸۷ھ میں اس کے بیٹے عبدالجبار نے جو اس کے ساتھ تھا قید خانے سے راہِ فرار اختیار کی اور مالقہ کے باغیوں کی جماعت جو یوسف کو معزول کرنا چاہتے تھے قیادت قبول کر لی جب یوسف کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے حالتِ غضب میں بیٹے کے جرم کا انتقام باپ سے لیا اس طرح کہ معتمد کو سر سے پاؤں تک فولادی زنجیروں میں جکڑ دیا دل شکستہ بادشاہ سے یہ تکلیف برداشت نہ ہو سکی اور حالتِ رنج و غم میں چند شعر اس کی زبان سے

نکلے جن میں سے پہلے دو شعر یہ ہیں۔

قیدی ! اما تعلمنی مسلمًا ｜ ابیت ان تشفق او ترحما
یبصرنی فیلک ابو ہاشم ｜ فیخشنی القلب وقد ہشما

علامہ مرحوم نے انہیں اشعار کے مطالب کو اردو کا جامہ پہنایا ہے جو بالِ جبریل کے صفحات کی زینت بھی ہیں اور مسلمانوں کے لئے درسِ عبرت بھی۔

عبدالرحمٰن اوّل کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت سرزمین اُندلُس میں

یہ اشعار جو عبدالرحمٰن اوّل کی تصنیف سے ہیں۔ تاریخ المقری میں درج ہیں مندرجہ ذیل اردو نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے۔ (درخت مذکورہ مدینۃ الزہرا میں بویا گیا تھا۔)

میری آنکھوں کا نور ہے تو ｜ میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں ｜ میرے لئے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا ｜ صحرائے عرب کی حور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں ｜ پردیس میں ناصبور ہے تو

غربت کی ہوا میں بارور ہو
ساقی تیرا نمِ سحر ہو

عالم کا عجیب ہے نظارہ — دامانِ نگہ ہے پارہ پارہ
ہمت کو شناوری مبارک — پیدا نہیں بحر کا کنارہ
ہے سوزِ دروں سے زندگانی — اٹھتا نہیں خاک سے شرارہ
صبحِ غربت میں اور چمکا — ٹوٹا ہوا شام کا ستارہ

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

■

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

اس نظم کا سببِ تصنیف یہ ہے کہ عبدالرحمٰن اوّل نے جو اندلس کا پہلا مسلمان فرمانروا تھا مسجد قرطبہ کے ساتھ اپنے لئے ایک عالیشان قصر تعمیر کیا تھا۔ چونکہ اسے میوہ دار درختوں سے بہت اُنس تھا اس لئے اس نے اس قصر کے پائیں باغ میں کھجور کا درخت بھی بویا تھا جس کی گٹھلی ملک شام کے درخت کی تھی۔

ایک دن شام کے وقت سلطان حسبِ معمول باغ میں آیا اس وقت وہ اپنے رشتہ داروں اور ہم نشینوں کی غداری اور بے وفائی سے بہت آزردہ خاطر تھا۔ اسی حال میں اس کی نظر کھجور کے اس دلپذیر درخت پر پڑی۔ چونکہ اس کو دیکھ کر اس کے دل میں اپنے وطن کی یاد تازہ ہو گئی اس لئے اس کا دل بھر آیا اور بے اختیار یہ اشعار اس کی زبان پر جاری ہو گئے۔

تبدت لنا وسط الرصافة نخلة ۔۔۔ تنأت بارض العرب من بلد النخل

فقلت شبیھی بالتغرب والنوی ۔۔۔ وطول التنائی من بنیّ ومن اہلی

تنأت بارض انت فیھا غریبۃ ۔۔۔ فمثلک فی الاقصاء والمنتای مثلی

سقتک عوادی المزن فی المنتای الذی

یُصحّ ویستمری المساکین بالویل

علامہ نے انہی اشعار کا آزاد ترجمہ اردو میں کیا ہے اور معتمد کی نظم کے ترجمہ کی طرح اس ترجمہ میں بھی بعض خیالات کا اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔

رباعی

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے ۔۔۔ وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے

نماز و روزہ و قربانی و حج ۔۔۔ یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

یہ رباعی یوں تو بہت سلیس ہے لیکن چوتھے مصرع میں اقبال نے تو باقی نہیں ہے، کہہ کر قوم کی دینی حالت کا نقشہ ایسے مؤثر طریق سے کھینچا ہے کہ پڑھنے والے پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ مسلمان بظاہر نماز۔ روزہ۔ قربانی اور حج سارے مذہبی رسوم بجا لاتے ہیں یعنی ارکان اسلام تو سب باقی ہیں لیکن مقام افسوس ہے کہ خود مسلمان باقی نہیں ہیں اور وہ کیوں باقی نہیں ہیں اس کی وجہ انہوں نے پہلے شعر میں بیان کر دی ہے کہ وہ دل اور اس میں وہ آرزو باقی نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان کی زندگی تو عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر موقوف ہے لیکن افسوس کہ ان کا دل جذبہ عشق رسول سے خالی ہو چکا ہے یعنی وہ دل باقی نہیں ہے اس لئے ارکان اسلام ادا کرنے کے باوجود مسلمان باقی

نہیں ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر تمام مذہبی رسوم اور شرعی ارکان غیر مؤثر ہو جاتے ہیں یعنی ان سے وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے جو مقصود و مطلوب ہیں۔

مثلاً نماز کی غایت قرآن مجید میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ بیشک نماز انسان کو بے حیائی اور برائی سے روک دیتی ہے اور روزہ کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۰ اے مسلمانو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔

اب مسلمان خود فیصلہ کرلیں کہ کیا ہماری نمازوں اور ہمارے روزوں سے یہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر اس کی وجہ کیا ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ "وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے"! بیشک ہمارے سینوں میں دل ہیں لیکن چونکہ عشق رسول سے خالی ہیں اس لئے ان میں "وہ آرزو" باقی نہیں ہے۔

وہ آرزو کیا ہے؟ یہ کہ دنیا میں اسلام سربلند ہو یعنی سرکار دو عالم کا پیغام دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچایا جائے اور ساری دنیا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلقہ بگوش بنایا جائے اسی لئے اقبال نے تبلیغ اسلام کو شرطِ مسلمانی قرار دیا ہے۔

تا نخیزد بانگ حق از عالمے
گر مسلمانی نیا سائی دمے

نوٹ:۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج سارے پاکستان میں تبلیغ و اشاعت اسلام کا ایک ادارہ بھی قائم نہیں ہے اور جب میں اس بات پر غور

کرتا ہوں تو کسی دل جلے کا یہ شعر بے اختیار میری زبان پر آجاتا ہے۔

لکّر زنی بھی ہے نمائش بھی ہے گلفام[۱] بھی ہے
یاں سبھی کچھ ہے بتاؤ کہیں اسلام بھی ہے

ہسپانیہ

(ہسپانیہ کی سرزمین پر لکھے گئے)
(واپس آتے ہوئے)

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرمِ پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں

روشن تھیں ستاروں کی طرح ان کی سنانیں
خیمے تھے کبھی جن کے ترے کوہ و کمر میں

پھر تیرے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا وہ تب و تاب نہیں اس کے شرر میں

غرناطہ بھی دیکھا مری آنکھوں نے ولیکن
تسکینِ مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں

دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

•

کھلے جاتے ہیں اسرارِ نہانی
گیا دورِ حدیثِ لن ترانی

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی

---

۱ اس لفظ کے دو معنی ہیں ایک لغوی یعنی عیش و عشرت۔ دوسرے مجازی یعنی کراچی کا ایک ہوٹل جس میں صرف خوش نصیب انسان داخل ہو سکتے ہیں اور بدنصیب افراد دور سے ہوٹل کی عمارت دیکھ کر آہ سرد بھرتے رہتے ہیں۔

یہ نظم ان جذبات کی آئینہ دار ہے جو سیاحت ہسپانیہ کے بعد حضرت اقبالؔ کے دل میں موجزن ہوئے اس کے اشعار اس محبت کے مظہر ہیں جو ان کو مسلمانان اندلس کے ساتھ تھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ہر تصنیف میں قرطبہ اور غرناطہ کے زوال پر آنسو بہائے ہیں وہ آنسو جو ملت اسلامیہ کی نظر میں ستاروں سے بھی زیادہ تابناک ہیں۔

کہتے ہیں کہ اے ہسپانیہ چونکہ تیری سرزمین پر عربوں کا خون بہا ہے اور وہ تیری مٹی میں جذب ہو گیا ہے اس لئے تو اس خون کی بدولت میری نظروں میں حرم کی روح مقدس ہو گیا ہے۔

میں جب تیری مٹی کو دل کی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو مجھے اس میں سجدوں کے نشان نظر آتے ہیں اور مجھے ابھی تک تیری ہواؤں میں اذان کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

یہ سجدے اور یہ اذانیں ان عربوں کی یاد تازہ کرتی ہیں جو کسی زمانہ میں تجھ پر حکمراں تھے اور جن کے نیزوں کی انی ستاروں کی طرح چمکتی تھی۔

اگر تجھے اپنی زیبائش کے لئے "سرخی" کی ضرورت ہے تو مسلمان قوم دوبارہ تیری زمین کو اپنے خون سے لالہ زار کر سکتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمان کے خون میں وہ اگلی سی حرارت باقی نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ باطل سے کسی طرح نہیں دب سکتا۔

آخری دو شعروں میں اقبالؔ نے زوال غرناطہ پر اپنے درد دل کا اظہار کیا ہے۔

غرناطہ کا ذکر صراحت کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ ریاست غرناطہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی عظمت ماضیہ کی آخری نشانی تھی اس کے سقوط کے بعد مسلمان

اس ملک سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئے۔

دولت غرناطہ کا آخری فرمانروا۔ ابو عبداللہ۔ نہایت بزدل۔ بے دین بے غیرت اور پست ہمت تھا۔ جب وہ قصر الحمراء کی کنجیاں ملکہ ازابیلا۔۔۔ (Isabella ...) کے سپرد کرکے اپنی مہمل زندگی کے آخری ایام ذلت اور بیکسی کی حالت میں بسر کرنے کے لئے غرناطہ سے روانہ ہوا تو بیس میل چل کر آرام کرنے کے لئے ایک گاؤں میں قیام کیا۔ یہ گاؤں ایک پہاڑی پر واقع تھا اس لئے جب اس کی نظر قصر مذکور پر پڑی تو بچوں کی طرح رونے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر اس کی غیرت مند ماں نے اس سے کہا کہ "اے بزدل! جب تو مردوں کی طرح اس محل کی حفاظت نہ کر سکا تو اب عورتوں کی طرح رونے سے کیا حاصل؟

اس واقعہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد ان آخری شعروں کا مطلب بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔

رباعی

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی　　گیا دور حدیث لن ترانی

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار　　وہی مہدی۔ وہی آخر زمانی

اگر اس رباعی کا مطالعہ ضرب کلیم کی تصریحات متعلق مہدی کی روشنی میں کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام یا ان کی شریعت کا دور نہیں ہے جس میں اللہ نے اسرار حیات کو بمصلحت خاص واضح نہیں کیا تھا۔ بلکہ اب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانروائی ہے اور آپ کے فیضان کی بدولت اسرار کائنات اور رموز حیات روز بروز کھلتے جاتے ہیں اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی

اختیار کر کے اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہونچا دیں اور جو شخص سب سے پہلے اپنی خودی کی قوتوں کو اہل عالم پر آشکار کر دے گا (اور یہ بات خودی کی تکمیل پر موقوف ہے) اللہ اسی کو مہدی برحق، یا امام برحق، کے مرتبۂ عالیہ پر فائز کر دے گا، اور وہ عالم افکار میں انقلاب عظیم پیدا کر دے گا یعنی انسانوں کو حاضر اور موجود سے بیزار کر دے گا چنانچہ ضرب کلیم میں لکھتے ہیں۔

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

لیکن اس رباعی کا ایک اور مطلب بھی ہے جو میرے مذاق کے مطابق ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ رباعی اقبال نے نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں لکھی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دیدار کی درخواست کی تھی مگر اللہ نے اس کے جواب میں "لَنْ تَرَانِی" فرمایا کیونکہ اللہ کو اس بات کا علم تھا کہ موسیٰ علیہ اسلام باوجود اشتیاق۔ تاب دیدار نہیں لا سکتے۔ اقبال کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی مگر قبول نہ ہوئی۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ بغیر درخواست دولت دیدار سے مالا مال فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔ پاک ہے وہ اللہ جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا جس کے گرد و نواح کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اسے

اپنی نشانیوں سے کچھ نشانیاں دکھا دیں۔

پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس حد تک شرف قربت عطا فرمایا کہ الفاظ اس کی وضاحت سے قاصر ہیں۔

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ پھر وہ نزدیک ہوا اور لٹک آیا پھر رہ گیا فرق دو کمان کے برابر یا اس سے بھی نزدیک ہو گیا۔ اسی لئے ایک شاعر نے اللہ سے یہ سوال کیا ہے جس میں تجاہل عارفانہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

وہ تو موسیٰ ہوا جو طالب دیدار ہوا
پھر وہ کیا ہو گا کہ جس نے تجھے دیکھا ہو گا

کسی دوسرے شاعر نے اس "قاب قوسین" کی تصویر یوں کھینچی ہے

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسّمی

تیسرے مصرع کا مضمون اس موضوع حدیث سے ماخوذ ہے۔ کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَ الطِّیْنِ۔ یعنی میں اس وقت مرتبۂ نبوت سے سرفراز ہو چکا تھا جب آدمؑ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے یعنی مجد و شرف کے لحاظ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمود ہی سب سے پہلے مقام نبوت پر فائز ہوئی تھی لیکن زمانہ کے لحاظ سے آپ سب انبیاء کے بعد آئے۔

یہاں مہدی سے ذات مہدی مراد نہیں ہے بلکہ ان کا وصف مشہور یعنی آخر الزمان ہونا مراد ہے۔ اور چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک لقب العاقب بھی ہے جس کے معنی ہیں۔ آخر میں آنے والا اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، ہادی آخر الزماں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح آفتاب۔ روزِ آفرینش سے ساری کائنات کے لئے مرکزِ نور ہے اسی طرح آپؐ ابتدائے عالم سے ساری کائنات کے لئے مرکزِ ہدایت ہیں۔ اول میں بھی آپ ہی ہیں اور آخر میں بھی آپ ہی ہیں اور میری نگاہ میں تو بس آپ ہی آپ ہادیٔ برحق اور امامِ برحق ہیں۔

طارق کی دُعا

(اندلس کے میدانِ جنگ میں)

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظرِ لالہ کب سے
قبا چاہئے اس کو خونِ عرب سے

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں۔ نظر میں۔ اذانِ سحر میں

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اقبال نے اس دلکش اور بغایت مؤثر نظم میں بطلِ اسلام طارق بن زیاد فاتح اندلس کے ان جذبات کی عکاسی اپنے الفاظ میں کی ہے جو آغازِ جنگ سے پہلے اس مردِ مومن کے دل میں موجزن ہوئے ہوں گے اور پھر دعا کی صورت میں اس زبان تک آئے ہوں گے۔ یہ اشعار بلاشبہ اقبال کی قوتِ متخیلہ کے کمال کی دلیل ہیں کیونکہ اگرچہ دعا کے الفاظ بجنسہٖ ان تک نہیں پہونچے لیکن جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کو پڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غالباً طارق نے اللہ سے اسی نوعیت کی دعا کی ہو گی۔

چونکہ اقبال نے عنوان کے نیچے بریکٹ میں یہ لکھا ہے کہ طارق ابن زیاد نے یہ دعا اندلس کے میدان جنگ میں کی تھی اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ کا مختصر حال بھی درج کر دیا جائے۔

رجب ۹۲ھ (اپریل ۷۱۱ء) میں موسیٰ بن نصیر والی افریقہ نے اکاؤنٹ جولین کے ایما سے اپنے نامور سردار طارق بن زیاد کو سات ہزار فوج کے ساتھ اسپین پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ چنانچہ طارق نے ابنائے کو عبور کر کے ایک پہاڑی پر قیام کیا جو آج جبل طارق یا جبرالٹر کے نام سے مشہور ہے اور گرد و نواح کے علاقہ کو زیر کرنا شروع کیا۔ چند ماہ کے بعد موسیٰ نے پانچ ہزار مزید فوج بھیجی چنانچہ طارق رمضان ۹۲ھ میں دریائے لکہ کے کنارے راڈرک شاہ اسپین کی ایک لاکھ فوج سے معرکہ آزما ہوئے۔

جنگ شروع ہونے سے پہلے طارق نے اپنی مختصر فوج کے سامنے حسب ذیل تقریر کی: بہادرو! میدان جنگ سے سفر کی اب کوئی صورت نہیں ہے اس لئے صرف پامردی میں نجات ہے اے لوگو! میری تقلید کرو اور سب ایک جسم اور ایک جان ہو جاؤ۔ میں خود راڈرک کا دست بدست مقابلہ کروں گا۔ اور اگر میں

مارا جاؤں تو تم ہمت نہ ہارنا میری جگہ کسی اور کو امیر مقرر کر کے جنگ جاری رکھنا اگر تم نے بزدلی دکھائی تو برباد ہو جاؤ گے۔

خبردار! ذلت پر راضی نہ ہونا اور اپنے آپ کو کسی قیمت پر بھی دشمن کے حوالہ نہ کرنا امیرالمؤمنین نے تمہیں اس ملک میں اعلائے کلمۃ الحق اور غلبۂ دین اسلام کے لئے بھیجا ہے۔

چونکہ اقبالؔ کو اس بات کا یقین تھا کہ طارق نے اس تقریر سے پہلے ضرور اللہ سے فتح و نصرت کی دعا کی ہوگی اس لئے انہوں نے طارق کے جذبات کو جو اس وقت اس کے دل میں موجزن ہوئے ہوں گے اس نظم کی صورت میں بیان کیا ہے۔

اور اقبالؔ کی اس نظم کو پڑھنے کے بعد میرا خیال ہے کہ ہر شخص مجھ سے اتفاق کرے گا کہ خواہ اس کی دعا کے الفاظ مختلف ہوں لیکن مفہوم کم و بیش یہی ہوگا جو اقبالؔ نے بیان کیا ہے۔

اقبالؔ نے طارق کے ہمراہیوں کو پر اسرار بندوں سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ جب طارق اپنی فوج لے کر اندرون ملک کی طرف بڑھا تو اتفاق سے اس وقت راڈرک کا ایک صوبہ دار اس نواح میں موجود تھا اور جب اس نے دیکھا کہ ایک اجنبی جماعت بڑھی چلی آرہی ہے تو وہ فوراً مقابلہ کے لئے سامنے آیا لیکن طارق نے اسے شکست فاش دیدی اور وہ اس شکست سے اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے راڈرک کو ان الفاظ میں اس واقعہ کی اطلاع دی کہ "ہمارے ملک پر ایسے آدمیوں نے حملہ کیا ہے کہ نہ ان کا وطن معلوم نہ اصلیت۔ کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ زمین سے نکلے ہیں یا آسمان سے اترے ہیں!" اطلاع کے اس آخری فقرے سے اقبالؔ نے "اسرار بندوں" کی ترکیب

اخذ کی ہے۔

نظم کا مطلب :۔ طارق اللہ سے دعا کرتا ہے کہ اے مولیٰ کریم! یہ تیرے عاجز بندے جن کو تو نے سرفروشی اور کفر پر غالب آنے کے جذباتِ عالیہ سے نوازا ہے۔ جن کے گھوڑوں کی ٹھوکر سے صحرا اور دریا کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں اور جن کے نعرۂ تکبیر سے پہاڑوں میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے اس وقت اپنے وطن سے دور سر سے کفن باندھ کر تیرے نام کو بلند کرنے کے لئے اس اجنبی شہر اور اجنبی ملک میں آئے ہیں۔ جہاں تیرے سوا ان کا کوئی دوست رفیق یا مددگار نہیں ہے پس تو اپنے فضل و کرم سے ان کو فتح عطا فرما۔

اے خدا! یہ مٹھی بھر مسلمان چونکہ تیری محبت میں سرشار ہیں اس لئے ان کے قلوب دو عالم سے بیگانہ ہیں۔ ان کا مقصود و مطلوب نہ مالِ غنیمت ہے نہ کشور کشائی نہ عیش و عشرت نہ فرماں روائی۔ بلکہ تیری راہ میں شہادت[1]۔

اے خدا! تو نے اپنے فضل و کرم سے عربوں کو جو تیرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے محض صحرا نشین تھے۔ ایمان، عشق اور جہاد ان تینوں نعمتوں کے لحاظ سے دنیا کی ساری اقوام میں شانِ یکتائی عطا فرمائی ہے[2]

---

[1] شہادت اتنی بڑی دولت ہے کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نعمت کبریٰ کی آرزو فرمائی ہے۔

[2] انسانی شخصیت تین قوتوں سے مرکب ہے شعور، جذبات اور ارادہ اقبال نے ان کو خبر و نظر اور اذان سحر سے تعبیر کیا ہے اور میں نے ان کا مفہوم ایمان و عشق اور جہاد سے واضح کیا ہے۔

حیات انسانی جس سوز و گداز کی طالب تھی وہ انہی عربوں کی بدولت اسے نصیب ہوا یعنی اے خدا! اس قوم کے دل میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت سوز و گداز کا رنگ پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر یہ زندگی اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچ گئی ہے اور اسی جذبہ کا نتیجہ ہے کہ یہ قوم موت کو ہلاکت کے بجائے حصول مقصد کا ذریعہ یقین کرتی ہے۔

اے خدا! ان غازیوں کے دل میں دینِ اسلام کو کفر پر غالب کرنے کا وہی جذبہ پیدا کر دے جو حضرت نوح علیہ السلام اور حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کے دلوں میں موجزن تھا۔ نعرۂ لَا تَذَرْ سے اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ وَ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑیو۔

اس آیت کی طرف اشارہ کرنے سے اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ دنیا سے کفر کا خاتمہ ہو جائے اور اسلام سارے ادیان پر غالب آ جائے چنانچہ وہ اسی مقصد کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کرتا ہے۔

آخر میں طارق اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ اے خدا! مسلمان کے اندر ساری دنیا میں اسلام کی اشاعت کا عزم پیدا کر دے اور اس مقصد کے لئے اس کی نگاہ کو تلوار بنا دے یعنی اس کی شخصیت میں یہ شان پیدا کر دے کہ کفر اس کے سامنے فروغ نہ پا سکے یا کفار اس کے مقابلہ میں ٹھہر نہ سکیں۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے اس نظم میں طارقؔ کی زبان سے مردِ مومن کی صفات بیان کی ہیں اور آخری دو شعروں میں جو دعا مانگی ہے وہ اپنے اندر شان عمومیت رکھتی ہے یعنی ہر زمانہ میں مسلمان اللہ سے یہ دعا کر سکتے ہیں جو طارقؔ نے ۹۲ھ میں مانگی تھی۔

رباعی

زمانے کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تو باقی فسانہ
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

اس رباعی کا مطلب یہ ہے کہ زمانہ ہر آن منقلب ہے اور اس تغیر کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر شئے پیدا ہو کر فنا ہوتی رہتی ہے لیکن انسان کے اندر یہ قدرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ کر سکتا ہے یعنی اگر وہ اپنی خودی کو پختہ کرے تو وہ لازوال ہو سکتی ہے اور اس کی بدولت انسان ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔

ع خودی چوں پختہ گردد لازوال است

زمانہ ماضی تو واپس نہیں آ سکتا یعنی اگر زمانہ ماضی میں کسی شخص نے حیات ابدی حاصل کی تو اس کی جدوجہد کے ثمرات سے ہم مستفید نہیں ہو سکتے کیونکہ اس کا عمل اس کے لئے ہے اور آئندہ کیا ہوگا یہ ہمیں معلوم نہیں ہے یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم آئندہ پچاس سال تک زندہ رہ سکیں گے اس لئے ابھی عمل کی ضرورت نہیں ہے کچھ عرصہ کے بعد جدوجہد کا آغاز کریں گے پس ہمارے لئے حیات ابدی حاصل کرنے کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم "امروز" پر اپنی توجہ مرکوز کر دیں یعنی جو فرصت ہمیں اس وقت حاصل ہے اس کا صحیح استعمال کریں آج ہی جدوجہد شروع کر دیں۔

جو شخص ماضی کی یاد میں مست رہتا ہے یا آئندہ زمانہ کا خواب دیکھتا

رہتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کامیابی کے لئے آج ہی سے کوشش کرنا لازمی ہے

لینن

(خدا کے حضور میں)

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے کہ نہیں ہے
ہر دم متغیّر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالق اعصار و نگارندۂ آنات
اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات
مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزّات

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جُوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیّت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حداس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

■

چونکہ اس نظم کا عنوان لینن ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس شخص کی مختصر سوانح حیات درج کر دئے جائیں۔

عصر حاضر کا یہ مشہور روسی انقلاب پسند اور مادہ پرست کارل مارکس کے فلسفہ کا شارح اور وکیل بالشیوزم (Bolshevism) کا بانی یو ایس ایس. آر (U.S.S.R) کا پہلا صدر یعنی ڈکٹیٹر اور ہندوستان و پاکستان کے کمیونسٹوں کا مذہبی پیشوا۔ جس کے اقوال و افکار پر ہر "ترقی پسند" آنکھ بند کر کے ایمان لاتا ہے اور معیارِ حق و صداقت سمجھتا ہے ۱۸۷۰ء میں بمقام سمبرسک (Simbersk) واقع صوبہ قازان پیدا ہوا تھا اس کا اصلی نام ولیڈیمر ایلیک یولیانات تھا اور اس کا باپ اس ضلع کے اسکولوں کا انسپکٹر تھا اس لئے بچپن ہی سے اس میں مطالعہ کتب کا ذوق پیدا ہو گیا۔

۱۸۸۷ء میں اس کے بڑے بھائی کو سکندر ثالث زارِ روس کے خلاف سازش کے جرم میں پھانسی دی گئی اس واقعہ کا نوجوان یولیانات

کے ذہن پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لئے انقلابی بن گیا اور چونکہ وہ زبردست قوت ارادی کا مالک تھا اس لئے اس نے تیس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد عصر حاضر کا سب سے بڑا انقلاب برپا کر کے دنیا کو متحیر کر دیا۔

قازان یونیورسٹی سے قانون میں ڈگری لینے کے بعد اس نے کئی سال تک کارل مارکس کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور ۱۸۹۷ء سے اس نے اشتراکیت کی اشاعت کو اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ ۱۸۹۵ء میں اسے ۳ رسال کے لئے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے روس کو خیرباد کہا اور ٹراٹسکی[1] کے ساتھ مل کر سوئزرلینڈ سے اشتراکیت کی اشاعت کے لئے ایک میگزین جاری کیا جس کا نام چنگاری تھا۔

قصہ مختصر لینن ۱۹۰۲ء سے لے کر ۱۹۱۷ء تک روس سے باہر رہ کر انقلاب روس کے لئے سرگرم عمل رہا اور جب ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب رونما ہوا تو اس شخص نے زار روس کے محل کو اپنے آفس میں تبدیل کر دیا اور اشتراکیت کے پردہ میں زار روس سے بڑھ کر مطلق العنانی کی زندگی بسر کی ۱۹۲۴ء میں وفات پائی اور مرنے کے بعد اس کی قوم نے اس کو اس ہستی کا ہم پلہ قرار دے دیا جس کے خلاف وہ ساری عمر مصروف پیکار رہا۔ بات یہ ہے کہ فطرت انسانی کا تقاضا

---

[1] یہ وہی ٹراٹسکی ہے جسے جمہوریت کے علمبردار اور مزدوروں کے خالص ہمدرد جوزف اسٹالین نے ۱۹۲۷ء میں جلاوطن کر دیا کیونکہ اس کی شخصیت روس کے موجودہ مطلق العنان فرمانروا کو اپنی راحت میں مخل نظر آتی تھی اور کانٹے کو اپنی راہ سے دور کر دینا ہر عقلمند آدمی کا پہلا فرض ہے چنانچہ اکبر لکھتے ہیں۔

اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا

ہے کہ اپنے سے بالاتر کسی ہستی کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔ خدا نہ سہی لینن سہی۔

سماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

واضح ہو کہ اقبال نے لینن فرشتوں کا گیت اور فرمان خدا یہ تینوں نظمیں مسلسل لکھی ہیں اس لئے اقبال کا مفہوم اسی وقت واضح ہو سکتا ہے جب ان تینوں نظموں کو مجموعی طور سے پڑھا جائے۔

پہلی نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ لینن خدا کے حضور میں حاضر ہو کر سرمایہ پرستی کے مفاسد بیان کر کے یہ سوال کرتا ہے کہ اے خدا!

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

لینن کی عرض داشت یا فریاد سن کر فرشتے جناب باری میں یہ عرض کرتے ہیں کہ اے خدا لینن نے جو کچھ کہا ہے بالکل ٹھیک ہے۔ سرمایہ داروں نے تیرے

۱؎ اگر روسیوں نے لینن کو "خدا" بنا لیا۔ اور آج ہزاروں روسی اشتراکی ملاحدہ روزانہ لینن کے مردہ جسم کے "درشن" کر کے اپنے دبائے ہوئے مذہبی جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ مہاویر سوامی اور گوتم بدھ دونوں نے ساری عمر خدا کے خلاف "داکھیان" دیئے لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے پیروؤں نے انہیں کو اپنا "خدا" بنا لیا اسی لئے اقبال نے یہ کہا ہے۔

در مقام لا نیا ساید حیات
سوئے الّا می خرامد کائنات

بندوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے چنانچہ

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

لینن کی فریاد اور فرشتوں کی تائید کے بعد خدا کارکنان قضا وقدر کو حکم دیتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو صفحۂ ہستی سے نابود کردو۔ اور

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ان تینوں نظموں کو پڑھنے کے بعد جو حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبالؔ بھی سرمایہ داری کے اسی قدر مخالف ہیں جس قدر دنیا کا بڑے سے بڑا اشتراکی ہو سکتا ہے۔

ان تینوں نظموں میں اقبالؔ کی مضمون آفرینی یعنی قوت اختراع (ــــــــــ) اور حقیقت نگاری یعنی کمال فن (نگراں) کا نہایت خوش آئند امتزاج پایا جاتا ہے۔ اقبالؔ نے اسی قوت اختراع کو تازہ کاری سے تعبیر کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں۔

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

ناظرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ نہ تو لینن نے خدا سے خطاب کیا۔ فرشتوں نے گیت گایا اور نہ خدا نے ان کو کوئی حکم دیا۔ یہ ساری باتیں اقبالؔ کی قوت تخیل کا کرشمہ ہیں لیکن کمال فن یہ ہے جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ سب حقیقت پر مبنی ہے کوئی بات غلط نہیں ہے۔

چونکہ لینن کی طرح اقبالؔ خود بھی سرمایہ پرستی کے خلاف ہیں اس لئے

انہوں نے اس کی زبان سے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے تاکہ نظم میں ڈرامائی اسلوب پیدا ہو سکے جو اثر آفرینی کے لحاظ سے تمام اسالیب بیان پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب ہم اس نظم کی تشریح کرتے ہیں۔

پہلا شعر:۔ انفس۔ نفس کی جمع ہے مراد ہے بنی آدم۔ آفاق افق کی جمع ہے۔ مراد ہے کائنات۔ آیات۔ آیت کی جمع ہے۔ معنی ہے نشان مراد ہے دلائل۔

اس مصرع کا مضمون قرآن حکیم کی تعلیم سے ماخوذ ہے یعنی اللہ کی ہستی کے دلائل کائنات میں بھی موجود ہیں اور خود انسانوں کے اندر بھی بشرطیکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ اور یقین کرنے والوں کے لئے کائنات میں (بھی ہماری ہستی کے) دلائل موجود ہیں اور خود تمہارے نفسوں میں بھی۔ پس کیا تم غور نہیں کرتے؟

لینن کہتا ہے کہ اے خدا! تیری ہستی کے دلائل۔ نفس اور آفاق دونوں میں موجود ہیں اور حق بات یہ ہے کہ تو حی اور قیوم ہے۔

دوسرا۔ تیسرا۔ اور چوتھا شعر:۔ خرد کے نظریات سے عقلی دلائل مراد ہیں۔ جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مدار یقین نہیں بن سکتے۔ کیونکہ اگر ایک فلسفی آج ہستی باری تعالیٰ پر ایک دلیل قائم کرتا ہے تو کل دوسرا فلسفی اس میں غلطی کا احتمال پیدا کر دیتا ہے اور منطق کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ اِذَا جَآءَ الْاِحْتِمَالُ بَطَلَ الْاِسْتِدْلَالُ یعنی اگر قضایا میں غلطی کا احتمال پیدا ہو جائے تو استدلال باطل ہو جاتا ہے۔

فطرت کے سرود ازلی سے وہ حقائق و معارف مراد ہیں جو صرف

وحی والہام (وجدان) کی بدولت منکشف ہو سکتے ہیں۔

بلیائے کواکب اور دانائے نباتات سے سائنسداں مراد ہے۔

کلیسا کے خرافات سے عالم آخرت مراد ہے چونکہ لینن مادہ پرست تھا اس لئے وہ اس عقیدہ کو "خرافات" سمجھتا تھا۔

کہتا ہے کہ اے خدا! میں چونکہ مادہ پرست تھا اور صرف عقلی دلائل پر اعتماد کرتا تھا اور عقلی دلائل کا کوئی اعتبار نہیں آج ایک بات عقل کی رو سے صحیح ثابت ہوتی ہے کل وہی بات اسی عقل کی رو سے غلط ثابت ہوتی ہے اس لئے میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ تو ہے یا نہیں۔ میں تو ایک سائنسداں تھا اور سائنسداں وحی والہام پر یقین نہیں رکھتے اس لئے میں کسی نبی یا رسول پر بھی ایمان نہ لا سکا لیکن اب جبکہ میں تیرے حضور میں حاضر ہوں اور تجھے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں تو کس طرح تیرا انکار کر سکتا ہوں میں تو مادہ پرست تھا اس لئے مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا قائل ہی نہ تھا اور عالم آخرت کو خرافات سے تعبیر کیا کرتا تھا لیکن اب جبکہ میں نے اس عالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو اس کا کیسے انکار کر سکتا ہوں۔

پانچواں۔ چھٹا۔ ساتواں اور آٹھواں شعر:۔ اے خدا آج معلوم ہوا کہ ہم تو زمان و مکان کی قید میں ہیں اور تو زمان و مکان کا خالق ہے۔

اے خدا! جب تک میں دنیا میں زندہ رہا ایک بات کانٹے کی طرح میرے دل میں کھٹکتی رہی اور کسی فلسفہ کی کتاب میں بھی اس کا حل نظر سے نہیں گذرا۔ چونکہ میرے دل میں خیالات اور جذبات کا ہجوم ہے اور ایسی حالت میں تو خود جانتا ہے کہ آدمی گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رکھ سکتا یعنی اس کی گفتگو میں

کہیں کہیں گستاخی یا بیباکی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اس لئے اگر میری گفتگو بھی حدِ ادب سے متجاوز ہو جائے تو مجھے معاف کر دینا۔

اے خدا! میں بڑے ادب سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تو کسی آدم کا خدا یا معبود ہے۔؟ اس سوال کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے علاوہ بنی آدم اور کسی کرہ میں ہیں نہیں اور دنیا میں جو لوگ بستے ہیں وہ تجھے اپنا معبود سمجھتے نہیں تو پھر قدرتی طور پر میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ "وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود۔؟

میں نے خوب غور کر کے دیکھا دنیا میں کوئی شخص تیری پرستش نہیں کرتا کیونکہ مشرقی اقوام، تو مغربی اقوام کو اپنا خدا سمجھتی ہیں اور مغربی اقوام سونے اور چاندی (ڈالر) کو اپنا معبود یقین کرتی ہیں۔

اے خدا! اس میں تو شک نہیں کہ یورپ میں سائنس اور فلسفہ بہت ترقی پذیر ہے اور اپنے علوم و فنون کی بدولت اس خطے کے لوگ ساری دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بحرِ ظلمات چشمۂ حیواں سے محروم ہے یعنی یہ قومیں روحانیت سے عاری ہیں کیونکہ حیات بعد الموت پر ایمان نہیں رکھتیں بلکہ سب کی سب مادہ پرستی میں غرق ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بنکوں کی عمارات ہر لحاظ سے گرجوں کی عمارات سے بڑھ کر ہیں جو رونق بنکوں میں نظر آتی ہے اس کا عشرِ عشیر بھی گرجوں میں نہیں ان بنکوں کا سارا کاروبار سود پر چل رہا ہے اور یہ نظام چند افراد کے لئے تو واقعی مفید ہے لیکن لاکھوں انسانوں کے لئے مرگِ ناگہاں کا پیغام ہے۔

یہ سرمایہ دار اقوام (امریکن۔ انگریز۔ فرنچ۔ ڈچ وغیرہ) بظاہر تو مساوات کی تعلیم دیتی ہیں لیکن اپنے تدبر اور اپنی حکومت کے بل بوتے پر محکوم اقوام کا خون

جو ستی رہتی ہیں اور جس تہذیب پر انہیں ناز ہے اس کے نتائج اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلے کہ دنیا میں شراب نوشی. عریانی. بیکاری اور مفلسی عام ہو گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ جو قوم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان نہیں رکھتی اخلاق حسنہ اور نیکی سے محروم ہو جاتی ہے وہ مادیات میں تو ترقی کر سکتی ہے لیکن روحانیت میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

مشینوں کی ایجاد سے سرمایہ داروں کی دولت میں تو اضافہ ہو جاتا ہے لیکن مروت اور شرافت کے جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ مزدوروں کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ سرمایہ داران کا لہو پی رہے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام بھی ایک حد تک متزلزل ہو گیا ہے چنانچہ سرمایہ دار اس انقلاب سے بہت پریشان ہیں ان کے چہروں پر جو سرخی نظر آتی ہے یہ اصل نہیں ہے بلکہ بناوٹی ہے۔

لیکن اے خدا! اس میں شک نہیں کہ ابھی تک مزدوروں کی زندگی بڑی مصیبتوں میں گذر رہی ہے جب سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا تو مزدور اپنی محنت کا پھل خود کھا سکتے ہیں۔

فرشتوں کا گیت

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گر ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی
خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
ترے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

ترے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہر زندگی ہے عشق. جوہر عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیٔ نیام ابھی

●

لینن کی عرضداشت سن کر فرشتوں کے دل میں بھی مزدور طبقہ کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے اور انہوں نے متفق اللسان ہو کر جناب باریتعالیٰ یہ عرض کی کہ اے خدا! تیری دنیا میں ابھی تک انسان اپنی عقل کو ذاتی نفع کے لئے استعمال کر رہا ہے اور محنت کا جذبہ ابھی تک عام نہیں ہو سکا ہے بالفاظ دگر ابھی دنیا کے معاملات میں بہت کچھ اصلاح کی ضرورت ہے۔

موجودہ حالت یہ ہے کہ سرمایہ دار۔ دنیا پرست مذہبی پیشوا۔ ارباب اقتدار اور نقلی صوفی یہ چاروں گروہ تیرے سادہ لوح بندوں کو اپنی اغراض کے لئے استعمال کر رہے ہیں ان سے ناجائز طور پر فوائد حاصل کر رہے ہیں یعنی انہیں بیوقوف بنا رہے ہیں۔

دولت مند طبقہ جس کے لئے اس کائنات میں کہیں بھی دکھ کا نام نہیں ہے عیش و عشرت میں منہمک ہے اور مفلس طبقہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی بسر کر رہا ہے محکوم تباہ حال ہیں اور حکمراں اونچے اونچے محلوں میں داد عیش دے رہے ہیں ارباب دانش۔ دیندار علماء اور اصحاب فن سب ان سرمایہ دار دنیا اور دولت مندوں کی غلامی میں مبتلا ہیں علم دین عقل و حکمت اور تقویٰ کی کہیں قدر و منزلت نہیں ہے مختصر یہ کہ تیرے مخلص بندے بڑی بیکسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نہیں پروا کسی کو الفت اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

اے خدا! اگرچہ تیرے قانون تخلیق کی رو سے انسانی زندگی کا جوہر عشق ہے اور عشق کا جوہر خودی ہے یعنی تو نے انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عشق کے ذریعہ سے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہونچائے تاکہ اس دنیا میں تیرا نائب بن سکے لیکن افسوس ہے کہ خودی کی تلوار ابھی تک نیام ہی میں ہے یعنی بنی آدم ہنوز عشق کے بجائے اپنی عقل کی پیروی کر رہے ہیں اور خودی کی تربیت کی طرف سے غافل ہیں۔ (الا ماشاء اللہ)

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

○

لینن کی عرضداشت اور فرشتوں کا تائیدی بیان سننے کے بعد خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ دنیا میں جا کر غریبوں کو بیدار کر دو اور ان کے اندر ظلم وستم کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا کر دو۔

غلام قوموں کے دل میں یقین کی آگ بھڑکا دو تاکہ وہ ظالم اور جابر حکمرانوں کا تختہ الٹ دیں۔ دنیا میں عوام کی حکومت کا نقشہ جما دو اور سرمایہ داری اور ملوکیت کے نقوش کہنہ کو بالکل مٹا دو۔

جس کھیت سے کاشتکار فائدہ حاصل نہیں کر سکتا اسے جلا کر خاک کر دو تاکہ سرمایہ دار بھی اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے

اب رہے وہ مذہبی پیشوا جو میرے بندوں کے درمیان حائل ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے میرے بندے میری اطاعت نہیں کر سکتے اس قسم کے تمام مذہبی پیشواؤں کو ختم کر دو۔

پہلا شعر:۔ اس شعر کے پہلے مصرع کا صدر اس فارسی شعر سے ماخوذ ہے۔

زنہار! ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ دنیا پرست مذہبی پیشوا لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے مسجدوں میں مجھے سجدہ کرتے ہیں اور مندروں میں بتوں کا طواف کرتے ہیں اس لئے ان تمام معابد کو مٹا دو۔ جہاں ملاؤں اور پنڈتوں نے ریاکاری کا جال بچھا رکھا ہے۔

میں ان سنگ مرمر کے خوبصورت معابد سے بھی ناخوش ہوں جہاں یہ مذہبی پیشوا میرے نام کو فروخت کرتے ہیں اور لوگوں کو دھوکہ دے کر ان سے

نذرانہ وصول کرتے ہیں ان بیش قیمت معابد کے مقابلہ میں جہاں ریاکاری کا چرچا ہے مجھے وہ کچی اینٹوں سے بنے ہوئے معابد زیادہ پسند ہیں جہاں خلوص کارفرما ہو۔

اور چونکہ یہ تہذیب مغرب جس کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے دھوکہ کی ٹٹی ہے یعنی بظاہر بہت خوشنما اور دلفریب ہے لیکن بباطن نہایت بدنما اور مذموم ہے بالفاظ دگر کانچ کے برتنوں کی دکان ہے۔ اس لئے شاعر مشرق (اقبال) کے اندر دیوانگی کا رنگ پیدا کر دو۔ تاکہ وہ اس دکان میں داخل ہو کر شیشے کے ان سب برتنوں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دے۔

بالفاظ دگر شاعر مشرق کے دل میں ہماری محبت کا جذبہ پیدا کر دتا کہ وہ اس ناپاک تہذیب کی مفاسد سے اہل دنیا کو آگاہ کر سکے اور ان اصولوں کی کمزوری کو واضح کر سکے جن پر اس تہذیب کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

نوٹ:۔ ان تینوں نظموں میں اقبال نے اپنے جذبات کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے۔

"چراغ حرم و دیر" کے بجھانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقبالؔ نفس مذہب کے مخالف ہیں جیسا کہ اقبال کے ایک فاضل نقاد نے سمجھ لیا ہے بلکہ ان کی مراد اس سے یہ ہے کہ عبادت میں خلوص شرط ہے یعنی جو عبادت ریاکاری پر مبنی ہو۔ اللہ اس کو قبول نہیں کرتا چنانچہ آئندہ شعر سے میری تاویل کی تصدیق ہو سکتی ہے جس میں اقبالؔ نے "مٹی کے حرم" کا اثبات کیا ہے۔

رباعی

حکیمی نامسلمانی خودی کی
کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گُر فقر و شاہی کا بتادوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

اس رباعی کا مضمون تو نیا نہیں ہے لیکن اسلوب بیان بیشک نیا ہے۔ کہتے ہیں کہ فلسفہ اور منطق کے مطالعہ یا ان فنون میں مہارت حاصل کرنے سے خودی کے اندر اسلام کا رنگ پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ بسا اوقات یہ علوم و فنون اللہ اور بندہ کے درمیان پردہ بن جاتے ہیں چنانچہ بزرگوں سے منقول ہے کہ العلم حجاب الاکبر۔ یعنی علم سب سے بڑا حجاب ہے۔

"رمزِ پنہانی" سے مراد ہے حقیقت یا ماہیت شے جو عموماً نگاہ سے پوشیدہ ہوتی ہے اس کو اقبال نے سرِ نہانی سے بھی تعبیر کیا ہے۔ مثلاً

ع خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال نے اپنے کلام میں لفظ "رمز" کو حقیقت یا جوہر کے مفہوم کے لئے استعمال کیا ہے چنانچہ رموزِ بیخودی میں لکھتے ہیں۔

رمزِ قرآں از حسینؓ آموختیم

یعنی امام حسینؓ کے طرزِ عمل سے مجھ کو تعلیمات قرآنی کی حقیقت یا روح سے آگاہی حاصل ہو گئی مطلب یہ ہے کہ خودی کا حقیقی مقام یہ ہے کہ انسان مکالمہ و مخاطبہ الٰہیہ سے مشرف ہو جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یعنی انبیاء کی سنت پر عامل ہو کر اپنے اندر شانِ فقر

پیدا کرلے۔

"گر" سے مراد ہے کسی شئے کے حصول کا طریقہ۔ فقر و شاہی یہ انسان کامل کی خودی کی دو شانیں ہیں۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں۔

فقر و شاہی واردات مصطفےٰ است
ایں تجلی ہائے ذات مصطفےٰ است

اور ارباب نظر سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں بیک وقت جمع ہو گئی تھیں چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں بعض بوریا نشیں ہوئے ہیں جیسے سیدی خواجہ اجمیری اور خواجہ قطب دہلوی اور بعض تخت نشین ہوئے ہیں جیسے سلطان محمود بیگڑہ اور حضرت عالمگیرؒ۔

اقبال کہتے ہیں کہ فقر و شاہی کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ مومن خواہ کتنا ہی غریب اور بے نوا کیوں نہ ہو لیکن غیر اللہ کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے کیونکہ سوال سے خودی مردہ ہو جاتی ہے اور مردہ کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا۔ اسی حقیقت کو اقبال نے شان استغناء سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ع کہ یائی میں نے استغنار میں معراج مسلمانی

پہلے شعر میں حکیمی اور کلیمی کا تقابل ہے جسے انہوں نے اس شعر میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

ذوق و شوق

(ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے)

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

قلب و نظر کی زندگی دست میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن و ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہ صنم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگ نخیل دھل گئے
ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں
آگ بجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیشِ دوام ہے یہی
کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مۓ حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات
کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
آیۂ کائنات کا معنیٔ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو
میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو
بادِ صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو
خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو
فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را

لوح بھی تو۔ قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقلِ غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب
تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے
تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب
گاہ بحیلہ می برد گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب
عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب
گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہُو فراق
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق

●

چونکہ یہ نظم دراصل نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس کا ہر شعر عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبا ہوا ہے اس لئے اقبالؔ نے اس کا عنوان بھی "ذوق و شوق" قرار دیا ہے جو عجیب تو ہے لیکن غیر مناسب ہرگز نہیں ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت فلسطین کے دوران میں اقبالؔ کے دل میں زیارت گنبد خضرا کا ارمان چٹکیاں لے رہا ہوگا اس لئے ہر شعر میں محبت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا رنگ جھلک رہا ہے۔

اقبالؔ نے شیخ سعدیؒ کا جو شعر تحت العنوان لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے یہ نظم اس مبارک خطّہ سے بطور سوغات لائے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ملت اسلامیہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور تحفہ کیا ہو سکتا ہے۔

ذَوق کے لغوی معنی ہیں چکھنا۔ امتحان کرنا۔ آزمائش کرنا اور لذت یا مسرت حاصل کرنا۔ لیکن تصوف کی اصطلاح میں ذوق کہتے ہیں اس روحانی ملکہ کو جس کی بدولت سالک حق و باطل میں امتیاز کرتا ہے۔

شَوق کے لغوی معنی ہیں عشق و محبت۔ ان دو لفظوں کے اجتماع سے شدت محبّت کا اظہار مقصود ہے۔ ذکر اللہ کرتے کرتے جب سالک پر محویت

کا خلاصہ یا بنیادی خیال درج کرتا ہوں۔

پہلے بند میں اقبالؔ نے یثرب (مدینۃ النبیؐ) کے گرد و نواح کی ایک دلکش صبح کا سماں باندھا ہے۔

دوسرے بند میں انہوں نے عالم اسلامی کی بیکسی پر نوحہ خوانی کی ہے اور آخری دو شعر بطور گریز عشق کی تعریف میں لکھ کر۔

تیسرے، چوتھے اور پانچویں بند میں اپنے دلبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خطاب کیا ہے۔

نوٹ: میں نے آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دلبر کا لفظ استعمال کرنے کی جرأت اس لئے کی ہے کہ خود اقبالؔ نے یہ لفظ حضور کے لئے استعمال کیا ہے۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

یثرب کی مٹی میری نظر میں دونوں جہان سے زیادہ قیمتی ہے کیونکہ یہ وہ مقدس شہر ہے جہاں میرا دلبر رہتا ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

پہلا بند

حوالیٔ یثرب میں صبح کا سماں اس قدر دلکش ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے اس کے دیکھنے سے دل میں نور اور آنکھوں میں سرور پیدا ہوتا ہے قلب و نظر دونوں کو روحانی زندگی نصیب ہوتی ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس نظم کو پڑھتے وقت یہ تصور کرو کہ تم مدینۃ النبیؐ کے گرد و نواح میں ہو۔ شہر سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر کسی میدان میں کھڑے

ہو۔ آفتاب طلوع ہو چکا ہے اور اس سے نور یاں نکل کر مدینہ کی عمارتوں خصوصاً مسجد نبوی کے میناروں کو منور کر رہی ہیں۔

آفتاب کی بدولت جو حسن ازل کا نمائندہ ہے دنیا کی ہر شئے پردۂ خفا سے باہر نکل آئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایک نگاہ کا زیاں دل کے لئے بہت سے فوائد کا موجب ہوتا ہے۔

اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جب تک نگاہ مصروف نظارہ رہتی ہے بصیرت (دل کی قوت) معطل رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں تو بہتر طریق پر غور و فکر کر سکتے ہیں اور اسی لئے تصوف میں خلوت گزینی اعتکاف اور مراقبہ کی تلقین کی جاتی ہے اور ارباب علم جانتے ہیں کہ یہ جملہ امور سنت انبیاء میں سے ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس راتیں ایک پہاڑ پر خلوت میں بسر کی تھیں۔ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲ سال غار حرا میں خلوت اور مراقبہ میں بسر مائے نیز آپ ہر سال ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں مسجد نبوی میں اعتکاف فرماتے تھے یہیں سے چلّہ۔ خلوت۔ اعتکاف اور مراقبہ کی مشروعیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

علم ناسوت میں ترقی کرنے کے لئے نگاہ (مشاہدہ) سے کام لینا ضروری ہے تاکہ علم میں اضافہ ہو۔ لیکن عالم لاہوت میں بلند مقام حاصل کرنے کے لئے ظاہری آنکھوں کو بند کر لیتے ہیں تاکہ باطنی آنکھیں کام کر سکیں۔

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

نماز چونکہ اپنے اندر برزخی شان رکھتی ہے یعنی عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے درمیان واسطہ ہے اس لئے اس میں ظاہری نگاہ کھلی رہتی ہے

اور بند بھی رہتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ

نماز میں حکم یہ ہے کہ ایک جہت میں نگاہ کھلی رہے یعنی نمازی اپنی نگاہ سجدہ گاہ پر مرکوز رکھے دوسری جہات میں بند رہے یعنی اسے اِدھر اُدھر نہیں دیکھنا چاہیئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دل کی ترقی کے لئے نگاہ کو نظارہ سے محروم کرنا بہت ضروری ہے یعنی روحانی ترقی کے لیے خلوت اختیار کرنا لازمی ہے چنانچہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

گرچہ داری جان روشن چوں کلیم | ہست افکار تو بے خلوت عقیم
از کم آمیزی تخیل زندہ تر | زندہ تر جوئندہ تر یابندہ تر

مطلب یہ ہے کہ اگر انسان حسین اور دلکش مناظر سے قطع نظر کر کے خلوت کی زندگی اختیار کرے تو نگاہ بے شک لطف نظارہ سے محروم ہو جائیگی لیکن دل زندہ ہو جائے گا یعنی فکر میں قوت تخلیق پیدا ہو جائے گی۔

تیسرا اور چوتھا شعر:۔ ان دو شعروں میں اقبال نے یہ بیان کیا ہے کہ رات کے وقت نواح مدینہ میں بارش ہوئی اور صبح کے وقت جب آفتاب نکلا تو اس کی شعاعوں سے باقی ماندہ بادلوں کے ٹکڑے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کسی نے کوہ اضم کو سرخ اور نیلی چادریں پہنا دی ہوں بارش کی وجہ سے ہوا بالکل صاف ہوگئی اور درختوں کے پتے بھی ڈھل گئے اور نواح کاظمہ کا ریت ریشم کی طرح چمکتا ہو گیا۔

ان شعروں میں اقبال نے کوہ اِضم اور نواح کاظمہ کا ذکر کیا ہے اِضم مدینہ منورہ کے نواح میں ایک پہاڑی ہے اور کاظمہ۔ مدینہ منورہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے علامہ مرحوم نے یہ دونوں لفظ عربی کے

مشہور قصیدہ بردہ کے دوسرے شعر سے مستعار لئے ہیں جس کو میں بطور تبرک اپنی ناچیز شرح میں درج کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

اَمْ هَبَّتِ الرِّيحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ
وَاَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ اِضَمِ

یا مقام کاظمہ کی طرف سے محبت کی ہوا چل پڑی یا موضع اضم کی سمت سے رات کی تاریکی میں بجلی کوندی۔

پانچواں شعر:۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں کوہ اضم کی وادیوں میں بادیہ پیمائی کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ان میں قافلوں کے قیام کے آثار ہنوز باقی ہیں مثلاً کسی طرف راکھ اور چولھے کے نشان ہیں کسی طرف خیموں کی رسیاں ٹوٹی پڑی ہیں ان آثار کو دیکھ کر میرا دل کہتا ہے کہ خدا جانے مجھ سے پہلے کتنے کارواں یہاں تلاش محبوب میں قیام کر چکے ہیں۔

یہ شعر اقبال نے شعرائے جاہلیت کے تتبع میں لکھا ہے ان کا دستور تھا کہ اپنے قصیدہ کو معشوقہ کی قیام گاہ کے تذکرہ سے شروع کرتے تھے اس طرح کہ محبوبہ کے چلے جانے کے بعد اس کی محبت عاشق کو پھر اس مقام پر کھینچ لاتی تھی جہاں اس کی محبوبہ نے کبھی قیام کیا تھا۔ اور وہاں کھڑے ہو کر وہ چولھے کے نشانات اور ٹوٹی ہوئی طنابوں کو دیکھ کر اس زمانہ کی یاد تازہ کرتا تھا جب پہلی مرتبہ اس سے آنکھیں چار ہوئی تھیں مثلاً زہیر بن ابی سلمیٰ اپنی محبوبہ کے بارے میں لکھتا ہے۔

وَقَفْتُ بِهَا مِنْ بَعْدِ عِشْرِيْنَ حِجَّةً ۔۔۔ فَلَاْيًا عَرَفْتُ الدَّارَ بَعْدَ تَوَهُّمِ

اَثَافِيَ سُفْعًا فِي مُعَرَّسِ مِرْجَلٍ
وَنُؤْيًا كَجِذْمِ الْحَوْضِ لَمْ يَتَثَلَّمِ

میں بیس سال کے بعد اس مقام پر دوبارہ آیا جہاں میری محبوبہ نے
قیام کیا تھا تو اس قیام گاہ کو میں نے بڑی دشواری اور غور وفکر کے بعد پہچانا
چنانچہ میں نے ان سیاہ پتھروں کو بھی بمشکل پہچانا جن پر میری محبوبہ نے اپنی
ہانڈی پکائی تھی اور جو آگ سے سیاہ ہوگئے تھے اور اس نالی کو بھی جو کہ اصل
حوض کی طرح تھی اور ابھی تک نہیں ٹوٹی تھی بمشکل پہچانا۔

چونکہ اقبال نے یہ نظم سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھی
ہے اس لئے تمہید میں قصیدہ بردہ اور سبعہ معلقہ کا انداز بیان اختیار کیا ہے

چھٹا شعر: یہ حال دیکھ کر ہاتف غیبی نے مجھ سے کہا کہ یہیں
قیام کر کیونکہ عاشقوں کو اسی مقدس سرزمین میں راحت نصیب ہوسکتی ہے

واضح ہو کہ اقبال کو مدینہ طیبہ جانے کی تمام عمر آرزو رہی۔ ارمغان
حجاز میں انہوں نے کئی شعروں میں اس آرزو کا اظہار کیا ہے۔ ایک شعر
لکھتا ہوں۔

تو باش اینجا و خاصاں بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

دوسرا بند

اس بند میں شاعر اپنی قلبی واردات کا بیان کرتا ہے گویا در پردہ
اپنے محبوب سے یہ کہتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی بربادی سے میرا دل خون ہوگیا
ہے اور زندگی تلخ ہوگئی ہے دنیا بیشک پرانی ہوگئی ہے لیکن میرے احساسات
بالکل تازہ ہیں یعنی میں گذشتہ اقوام کی بربادیوں کا تذکرہ نہیں کرتا میری

قوم پر نت نئی آفات کا نزول ہو رہا ہے اور اس کی بیکسی کے گوناگوں شواہد میرے سامنے موجود ہیں۔

مثلاً دنیا کے صنم خانوں کے بت مدتوں سے اس بات کے منتظر بیٹھے ہیں کہ کوئی غزنوی دوبارہ پیدا ہو لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں اب کوئی بت شکن باقی نہیں رہا۔

نہ تو ذکر عرب کے سوز میں عربی مشاہدات باقی ہیں اور نہ فکر عجم کے ساز میں عجمی تخیلات نظر آتے ہیں یعنی نہ تو عربی ممالک کے مسلمانوں میں ذکر (محبت رسولؐ) کا رنگ باقی ہے نہ عجمی ممالک کے مسلمانوں میں فکر (علم) کا انداز نظر آتا ہے۔ قصہ مختصر ذکر اور فکر دونوں قوتوں کے اعتبار سے مسلمان مردہ ہو چکے ہیں۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ کفر اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے لیکن اس کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں میں کوئی شخص امام حسینؓ کے نقش قدم پر چلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اس بند کے آخری دو شعروں میں اقبالؔ نے مسلمانوں کے زوال کا سبب بیان کیا ہے۔

ع وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی

سبب یہ ہے کہ مسلمان قوم بحیثیت مجموعی عشق رسولؐ کے جذبہ سے بیگانہ ہو گئی ہے پس اقبالؔ قوم کو آگاہ کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں سربلندی کی آرزو ہے تو عشق اختیار کرو کیونکہ عقل دل اور نگاہ ان تینوں قوتوں کی صحیح تربیت (اسلامیہ زاویۂ نگاہ سے) عشق ہی کی بدولت ہو سکتی ہے اگر ایک مسلمان کے اندر عشق رسولؐ کا جذبہ کارفرما نہ ہو تو پھر شریعت اور دین دونوں کی

حقیقت بتکدۂ تصورات سے زیادہ نہیں ہے۔

واضح ہو کہ اس شعر میں شریعت سے ارکانِ اسلام اور دین سے ضوابط وعقائد اسلام کی بجا آوری اور عقائد اسلام پر ایمان محکم رکھنے کی طرف راغب اور مائل کرسکتی ہے وہ عشق رسولؐ ہے عشق کے بغیر نہ تو مسلمان جہاد کرسکتا ہے اور نہ اس کے اندر یقین کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے اگر مسلمان کے اندر عشق رسولؐ نہ ہو تو شریعت اور دین دونوں کی حیثیت چند تصورات کے مجموعہ سے زیادہ نہیں رہ جائے گی اور سب جانتے ہیں کہ تصورات انسان کو عمل پر راغب نہیں کر سکتے۔

چنانچہ ہماری موجودہ بے عملی کا باعث یہی ہے کہ ہماری نظر میں شریعت اور دین اس وقت تصورات سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے ہم ارکان اور عقائد اسلام کی بحثوں میں عمریں تمام کر دیتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے اندر عشق رسول کا جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ اس لئے ہم نہ ارکان کے اقتضا پر عمل کرتے ہیں نہ عقائد کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

اس نکتہ بلیغ کی صراحت کے بعد اقبالؔ بعض تاریخی شواہد اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ دیکھو تو! اسی عشق کی بدولت حضرت ابراہیم علیہ السلام ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہہ سکے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کربلا کے میدان میں صبر و استقلال کا بے نظیر نمونہ دکھا سکے اور صحابہ کرامؓ جنگ بدر اور جنگ حنین میں اس شان کے ساتھ باطل کا مقابلہ کر سکے۔

واضح ہو کہ اس مصرع میں بدر و حنین سے وہ مخصوص غزوات مراد نہیں ہیں جو ۲ھ اور ۸ھ میں واقع ہوئے بلکہ معرکۂ دہر میں کامیابی

مراد ہے اور معرکۂ وجود سے حق و باطل میں وہ آویزش مراد ہے جو ابتدائے آفرینش سے چلی آرہی ہے چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

نوٹ:۔ وجود منطق اور فلسفہ کی اصطلاح بھی ہے لیکن یہاں اقبالؔ نے اس لفظ کو کائنات کے معنی میں استعمال کیا ہے یعنی معرکۂ حق و باطل جو اس کائنات میں ہمیشہ سے سرگرم رہا ہے اور رہے گا۔

تیسرا بند

اب شاعر نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم شروع کرتا ہے اور حضورؐ سے براہ راست خطاب کرتا ہے کہ آپ اس کائنات کا معنی دیریاب ہیں۔

واضح ہو کہ کلام اقبالؔ کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اقبالؔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بمصداق حدیث قدسی لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ باعثِ ایجاد عالم۔ وجہ قیام کائنات اور مرکز و محور جملہ موجودات یقین کرتے ہیں چنانچہ اس مصرع میں انہوں نے اسی حقیقت کو باندازِ دگر بیان کیا ہے یعنی اگر کائنات کو ایک لفظ قرار دیا جائے تو حضورؐ اس لفظ کا معنی یا مفہوم ہیں پس اگر حضور کا وجود مسعود نہ ہو تو یہ ساری کائنات بے معنی اور بے مقصد ہو کر رہ جائے اگر وہ لما نہ ہو تو ساری برات کا وجود بے کار محض ہے۔

"معنی دیریاب" اس لئے کہا کہ اس میں تو شک نہیں کہ آپ معنی کائنات لیکن آپ کی حقیقت کا سمجھنا آسان نہیں ہے چنانچہ اقبالؔ جاوید نامہ میں

خود لکھتے ہیں کہ۔

عبدہٗ از فہم تو بالاتر است
زانکہ اُو ہم آدم و ہم جوہر است

یعنی عبدہٗ کی حقیقت کا سمجھنا تیری عقل سے بالاتر ہے کیونکہ حضور آدم بھی ہیں اور جوہر بھی ہیں یعنی آپ میں برزخیت کی شان پائی جاتی ہے اور ارباب بینش سے یہ نکتہ مخفی نہیں ہے کہ ان تمام اشیاء کی حقیقت کا سمجھنا بہت مشکل ہے جن میں برزخیت کی شان پائی جاتی ہے اور حضورؐ تو بالاتفاق "برزخ کبریٰ" ہیں پس حقیقت محمدیہ جو حقیقۃ الحقائق ہے اس کا سمجھنا بلاشبہ نہایت مشکل ہے کائنات کے مختلف مراتب ہیں اللہ نے برزخ کا سلسلہ قائم فرمایا ہے۔ چنانچہ۔

جمادات اور نباتات کے درمیان مرجان برزخ ہے۔
نباتات اور حیوانات کے درمیان چھوئی موئی کا پودا برزخ ہے۔
حیوانات اور انسان کے درمیان بن مانس برزخ ہے
انسان اور خدا کے درمیان حقیقت محمدی برزخ ہے
اسی بات کو ایک عاشق رسول نے یوں بیان کیا ہے۔

"ادھر مخلوق میں شامل ادھر اللہ سے واصل
خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرف مشدد کا"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کائنات کی ساری قدر و قیمت اور خوبی آپ کے دم سے ہے یعنی جس شئے میں آپ کا نور نسبتاً زیادہ ہے وہ شئے دوسری اشیاء سے نسبتاً زیادہ قیمتی ہے اسی لئے ساری دنیا آپ کے نور سے فیضیاب ہونے کے لئے بے تاب اور بیقرار ہے اسی لئے ساری دنیا آپ کی تلاش میں سرگرداں ہے،

اسی صداقت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو   آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست   یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

اسی جہانِ رنگ و بو کو اقبال نے بالِ جبریل کے اس مصرع میں "قافلہ ہائے رنگ و بو" سے تعبیر کیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ کہتے ہیں کہ آج کل کے اکثر و بیشتر علماء کم سواد تنگ نظر اور ظاہر بیں ہیں۔ اب رہے صوفیا تو نہ ان میں روحانی ترقی کا جذبہ ہے اور نہ روحانیت کا رنگ ہے اور ان دونوں گروہوں کے قلوب جذبۂ عشقِ رسول صلعم سے خالی ہیں۔

تیسرا شعر:۔ میرے کلام کی غرض و غایت یہ ہے کہ عاشقانِ رسول کا ذکر کر کے مسلمانوں کے اندر ان بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کا جذبہ پیدا کر دوں میں یہ چاہتا ہوں کہ میری قوم میں از سرِ نو خالدؓ اور طارق نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی۔ غزنوی اور غوری۔ محمود بیگڑہ اور عالمگیر پیدا ہوں اس لئے میں اپنی قوم کو ان سچے مسلمانوں کے کارنامے سناتا رہتا ہوں۔

جس طرح بادِ صبا سے گلشن میں غنچے شگفتہ ہو جاتے ہیں اسی طرح میری شاعری کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں "آرزو" نشو و نما پا سکے۔ یہ لفظ بہت جامع ہے۔ بہت وسیع المعانی ہے اس سے مراد ہے۔

۱۔ دنیا میں اسلام کو سربلند کرنے کی آرزو۔
۲۔ دنیا کو قرآن حکیم کے پیغام سے آگاہ کرنے کی آرزو۔
۳۔ دنیا سے باطل کو مٹا دینے کی آرزو۔

۴ - دنیا کو سرکارِ دو عالم کا حلقہ بگوش بنانے کی آرزو۔
۵ - دنیا میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی آرزو۔
۶ - دنیا کو بندگان خدا کے رہنے کے لائق بنانے کی آرزو۔
جہاں سچ بولنا ممکن ہو سکے۔

اقبالؒ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے کہ ان کی شاعری کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں میں یہ آرزو چٹکیاں لینے لگے کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

پانچواں شعر: کہتے ہیں کہ میری شاعری اوہام باطلہ یا خیالات رکیکہ یا خمار گندم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خون دل و جگر کا یعنی اس محبت کا نتیجہ ہے جو مجھے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات سے ہے چنانچہ محبت رسول کا یہ رنگ میرے ہر شعر سے ہویدا ہے۔

اپنے جذبات قلبی کا دبی زبان سے اظہار کرنے کے بعد اقبال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خطاب کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی محبوب تصنیف زبور عجم سے نہایت برمحل شعر کا انتخاب

لہ علامہ اقبال نے نومبر ۱۹۳۷ء میں مجھ سے فرمایا تھا کہ تمہاری قوم کے ضعف کا سبب یہ ہے کہ اس کا خون جم گیا ہے پس تم اپنی تحریر اور تقریر سے اس کے خون کو گرما دو۔

اقبالؒ کے کلام کو غور سے پڑھو تو معلوم ہوگا کہ وہ خود بھی ساری عمر یہی کام کرتے رہے جو ان کی شاعری کا مقصد مسلمانوں کی رگوں میں خون دوڑانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

کیا۔ یہ مطلع ہے اس غزل کا جو انہوں نے نعت میں لکھی ہے اور بلا شبہ تغزل کے لحاظ سے سارے دیوان میں اس کا جواب نہیں ہے۔

چوتھا بند

تیسرے بند میں شاعر نے اپنی اور اپنی قوم کی حالت بیان کی۔ اب اس بند میں محبوب کی شان بیان کرتا ہے میری رائے میں حقیقی معنی میں نعت رسولؐ اسی بند میں مرقوم ہے کہتا ہے کہ:۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب[1]

---

[1] یہ شعر میں نے دانستہ اپنی شرح میں نقل کیا ہے تاکہ میری یہ کوشش ناتمام اس شعر کی بدولت بارگاہ رسالت میں شرف قبولیت حاصل کر سکے۔

ع شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

اس شعر کا دوسرا مطلب جو میرے مسلک کے مطابق ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد آپؐ ہی سب کچھ ہیں۔ اور سب کچھ آپ ہی ہیں یعنی آپ ہی آپ ہیں۔

ھو الاول ھو الآخر ھو الظاھر ھو الباطن
ھو العبد الذی اوحی الیہ اللہ ما اوحیٰ

یہ شعر حضرت سیدی عارف باللہ شیخ محمد یعقوب صرفی کشمیری کا ہے عارف جامی کے شاگرد اور عارف سرہندی احضرت مجدد الف ثانیؒ ہیں۔ خوشا نصیب اس شاگرد کے جسے ایسا استاد ملا۔

دل تو نہیں چاہتا کہ اس شعر کا مطلب بیان کر کے اس کی معنوی خوبیوں کا خون کیا جائے لیکن ہوں گا کے شہیدوں میں نام لکھانے کی غرض سے اس قدر صراحت کافی سمجھتا ہوں کہ اقبال نے یہ نعتیہ شعر نہیں لکھا ہے بلکہ اپنا نام نظامی۔ خسرو اور جامی کی فہرست میں لکھا لیا ہے بات تو نئی نہیں ہے چنانچہ وہ اس سے پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ۔

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

لیکن اسلوب بیان بیشک نیا ہے کہ اے میرے محبوب! آپ بظاہر سب کچھ ہیں یعنی سب کچھ آپ ہی کے وجود مسعود کی بدولت عالم وجود میں آیا اگر آپ نہ ہوتے تو نہ لوح ہوتی نہ قلم ہوتا۔ اور نہ کتاب ہوتی اور آپ کی شان کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ یہ آسمان جس کے طول و عرض کا کچھ پتہ نہیں ہے آپ کے محیط وجود کے سامنے اس کی حقیقت ایسی ہے جیسے سمندر کے مقابلہ میں ایک بلبلا۔

اس کائنات کو آپ ہی کے ظہور سے فروغ حاصل ہوا ہے۔ آپ ہی کے قدموں کی برکت سے ذرہ ریگ (بلال حبشی) دنیا میں آفتاب (سیدنا بلالؓ) بن کر چمکا۔ آپ ہی کی کفش برداری کا یہ نتیجہ تھا کہ امیر المومنین فاروق اعظمؓ حضرت بلال کو "سیدنا بلال" کہتے تھے آپ ہی کی نگاہ کیمیا اثر کا فیض تھا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ اسلامی فوج کے سپہ سالار مقرر ہوئے جو ایک غلام کے بیٹے تھے۔

سلطان سنجر اور سلطان سلیم آپ کی شانِ جلال اور حضرت جنیدؒ اور حضرت بایزیدؒ آپ کی شانِ جمال کے مظہر ہیں۔ سلطان سنجر اور حضرت جنیدؒ اور

اور حضرت بایزید کا حال غزل ۱۳ کی شرح میں لکھ چکا ہوں سلطان سلیم کا حال ذیل میں درج کرتا ہوں۔

سلطان سلیم اول سلطنت عثمانیہ کے نامور ترین سلاطین میں سے گذرا ہے ۹۱۸ھ (۱۵۲۰ء) میں تخت نشین ہوا۔ اور ۹۲۶ھ (۱۵۲۸ء) میں صرف آٹھ سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی لیکن اس قلیل مدت میں اس نے سلطنت کی وسعت کو دو چند کر دیا۔ یعنی دیار بکر۔ آرمینیہ۔ کردستان، شام و مصر اور حجاز کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔ حجاز کی فتح کے بعد اس کو "خادم الحرمین الشریفین" کا لقب حاصل ہو گیا اور آخری عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ نے جو قاہرہ میں مملوک سلاطین کے زیر سایہ اپنی زندگی گذار رہا تھا خلافت کے تمام حقوق اسے تفویض کر دیے چنانچہ سلطان سلیم پہلا عثمانی سلطان ہے جو خلیفۃ المسلمین اور خادم الحرمین الشریفین کے لقب سے ملقب ہوا۔

اگر آپ کی محبت یعنی آپ کی اتباع کا جذبہ ارکان شریعت کی بجا آوری کا محرک نہ ہو تو کوئی عبادت اللہ کی بارگاہ میں مقبول نہیں ہو سکتی۔

یہ آپ ہی کی توفیق ہے کہ عقل اور عشق دونوں اپنی اپنی مراد پا گئے عقل غیاب و جستجو کی طالب تھی یہ دولت اسے مل گئی اور عشق حضور و اضطراب کا آرزومند تھا یہ نعمت اُسے عطا ہو گئی۔

واضح ہو کہ ذات عقل کا یہ تقاضا ہے کہ اس میں غیاب اور جستجو (مقصد سے دور رہنا اور تلاش کرنا) کا رنگ پایا جائے اور ذات عشق اس کی مقتضی ہے کہ اس میں حضور اور اضطراب کی کیفیت پائی جائے یعنی آپ ہی کی بدولت ہر شے کو اس کی صورت نوعیہ نصیب ہوئی۔

حضور و اضطراب۔ غیاب و جستجو کی ضد ہے اسی لئے عقل عشق کی ضد ہے اور اسی لئے دونوں کی تقدیر جداگانہ ہے چنانچہ اقبالؔ خود کہتے ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

عقل۔ غیاب یعنی دور رہنے کی حالت سے مطمئن ہو سکتی ہے لیکن عشق مطمئن نہیں ہو سکتا وہ حضور کا طالب ہے وہ تو محبوب کو بے پردہ آمنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے۔

اے میرے آقا! جلوۂ آفتاب سے مادّی اشیاء منور ہو سکتی ہیں لیکن انسانی قلوب منور نہیں ہو سکتے۔ بالفاظ دگر مادہ پرستی کی وجہ سے یہ دنیا روحانیت سے محروم ہو گئی ہے اس لئے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنے روحانی فیض سے اس دور میں بھی دنیا کو منور کر دیجئے۔

واضح ہو کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اس لئے آپ کا فیض قیامت تک جاری رہے گا اور ساری کائنات پر آپ ہی کی حکومت رہے گی اس لئے امت میں بعثت مجدّدین کا سلسلہ جاری رہے گا اور اس مصرع میں اسی طرف اشارہ ہے جگرؔ مرادآبادی نے بھی ایک شعر اسی سے ملتا جلتا کہا ہے۔

ہنسی بھر اڑنے لگی عشق کے فسانہ کی
نقاب الٹ دو۔ بدل دو فضا زمانہ کی

پانچواں بند

اس بند میں اقبالؔ نے عشق رسولؐ کی فضیلت اور قدر و قیمت

بیان کرنے کے بعد اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ عاشق کے حق میں ہجر وصل سے بہتر ہے۔

پہلا شعر:۔ اے میرے آقا! آپ میری سابقہ زندگی کے حالات سے بخوبی واقف ہیں اگر میں اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں مسلک عشق پر گامزن نہ تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں علم کو حصول مقصدِ حیات کے لئے کافی سمجھتا تھا تو بالفاظ دگر اس زمانہ میں مجھ کو اس حقیقت سے آگاہی نہ تھی کہ عشق رسولؐ کے بغیر کوئی شخص خدا تک نہیں پہونچ سکتا یعنی علم ایسا درخت ہے جہاں پر پھل نہیں آتا۔

دوسرا شعر:۔ لیکن کچھ عرصہ تک عقل کی پیروی کرنے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ میں اتباع عقل کی بدولت انسان کامل کے مرتبہ پر نہیں پہونچ سکتا بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ آپ کی غلامی اختیار کی جائے یعنی عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب ۔ اس مصرع میں عقل سے وہ عقل مراد ہے جسے نقل یعنی شریعت سے کوئی رابطہ یا سروکار نہ ہو۔ اسی لئے اقبالؔ نے ہمیں یہ مشورہ دیا ہے۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

عشق تمام مصطفےٰ ہے۔ یعنی عشق رسولؐ کی بدولت انسان کے اندر صفات رسولؐ کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے بلکہ اتباع اگر کامل ہو تو انسان محمد کامل ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

بمصطفےٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است (ارمغان حجاز)

تیسرا شعر:۔ اس شعر میں حیلہ سے مراد سلوک ہے اور زور سے مراد جذب ہے۔ جذب اور سلوک تصوّف کی اصطلاحیں ہیں۔ چنانچہ اقبالؔ نے اس شعر میں ان دونوں کو استعمال کیا ہے۔

قلب او را قوت از جذب و سلوک
پیشِ سلطاں نعرہ او ، لاملوک

واضح ہو کہ ان سے وصول الی اللہ کے دو طریقے مراد ہیں یعنی خدا تک پہونچنے کی دو صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ خود ادھر سے کشش ہو اسے جذب کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مرشد رہنمائی کرے۔ اسے سلوک کہتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے قرآن مجید کی اس آیت سے مستنبط ہیں۔

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ۔

۱۰ اللہ کھینچ لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہتا ہے اور راہ دکھاتا ہے اپنی طرف ہر اس شخص کو جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

نوٹ:۔ اس آیت کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اسلامی تصوف کے اصول اور طریقے سب قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں۔

اقبالؔ نے دوسرے مصرع میں یہ کہا ہے کہ عشق کی ابتدا اور انتہا دونوں فہم سے بالاتر ہیں ابتدا تو یوں وراء العقل ہے کہ بعض آدمیوں کو خدا تک پہونچنے کے لئے برسوں کوشش کرنی پڑتی ہے اور بعض ایسے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ اللہ خود انہیں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے یعنی مرشد کی ذرا سی توجہ سے برسوں کا راستہ دنوں میں طے ہو جاتا ہے۔

چنانچہ اقبالؔ نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است دے

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے (زبورِ عجم)

اور یا نتہا اس لئے ورا ء الفہم ہے کہ جب بندۂ واصل ہو جاتا ہے تو اس کی شخصیت میں فوق العادۃ خواص پیدا ہو جاتے ہیں یعنی وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

آخری تین اشعار میں اقبالؔ یہ نکتہ واضح کرتے ہیں کہ فراق کو وصل پر فضیلت حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ عاشقی کی دنیا میں فراق وصل سے بڑھ کر ہے کیونکہ وصل تو مرگِ آرزو کا نام ہے اور جب آرزو باقی نہ رہے تو عشق کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو انہوں نے اس شعر میں بیان کیا ہے

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام (پیامِ مشرق)

شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ میری نگاہ دیدار کی مشتاق تھی لیکن میں نے وصل کی حالت میں بھی محبوب کی طرف نہیں دیکھا تاکہ "لذت طلب" برقرار رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عشق کا سارا نظام فراق ہی پر مبنی ہے اگر وصال ہو جائے تو عشق ختم ہو جائے گا۔ جس طرح بوند یا قطرہ اگر دریا سے واصل ہو جائے تو دونوں کی ہستی فنا ہو جائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ عاشق کی ہستی فراق ہی پر منحصر ہے۔

پروانہ اور جگنو

پروانہ

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتشِ بے سوز پہ مغرور ہے جگنو

جگنو

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

•

یہ دو شعروں کی مختصر سی نظم ہے جس میں اقبال نے اپنے فلسفہ کے ایک پہلو کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے یعنی دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنا خودی کے حق میں موت ہے اسرار خودی میں اقبال نے اس موضوع پر ایک مستقل باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے۔ دربیان اینکہ خودی از سوال ضعیف می گردد۔ اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی خودی کے استحکام کا آرزومند ہو تو اسے دریوزہ گری سے کلی اجتناب لازم ہے بالفاظ دگر شریعت خودی میں سوال کرنا دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنا دوسروں سے توقع رکھنا دوسروں کا احسان لینا دوسروں کی طرف دیکھنا یہ سب باتیں بمنزلۂ کفر ہیں۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اسی نکتہ کو انہوں نے پروانہ اور جگنو کے مکالمہ سے واضح کیا ہے
پروانہ نے جگنو سے کہا کہ تیری آتش میں "سوز" یا حرارت نہیں ہے اس لئے تو پروانوں کا محبوب نہیں بن سکتا۔

یہ بات سن کر جگنو نے پروانہ کو یہ جواب دیا کہ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے پروانہ نہیں بنایا ورنہ میں بھی تیری طرح "آتش بیگانہ کے لئے دوسروں کا طواف کرتا یعنی میری "آتش بے سوز" بہرحال آتش بیگانہ" سے بہتر ہے۔

اسی نکتہ کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

تا کجا طواف چراغ محفلے
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

●

جاوید کے نام

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ
ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

•

اس نظم میں اقبال نے اپنے فرزند دلبند جاوید (سلمہ الرحمٰن) کو حقائق و معارف سے بھی آگاہ کیا ہے اور نصائح بھی کی ہیں اور دعائیں بھی دی ہیں چونکہ مرحوم کو اپنے چھوٹے بیٹے سے نسبتاً زیادہ محبت تھی اس لئے اس کی ولادت کے بعد جس قدر کتابیں ان کے قلم سے نکلیں یعنی جاوید نامہ۔ بالِ جبریل ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز۔ ان چاروں کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔

زبورِ عجم۔ جاوید کی ولادت سے ایک سال پہلے شائع ہوئی تھی اس

لئے وہ اس کے نام یا ذکر سے خالی ہے۔ جاوید نامہ۔ پہلی تصنیف ہے جو جاوید کی زندگی میں شائع ہوئی۔ جاوید نامہ کے بعد بال جبریل شائع ہوئی اور اس میں اقبال نے دو نظمیں اپنے بیٹے کے نام لکھی ہیں۔

ضرب کلیم میں جاوید سے خطاب کر کے تین نظمیں لکھی ہیں ان نظموں میں بھی جاوید کے پردہ میں قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے۔

ارمغان حجاز میں دو رباعیوں میں جاوید کا تذکرہ ہے اور ایک رباعی میں جو صـ۲۳ پر ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے لئے دعا کی ہے اس کا دوسرا شعر اس جگہ درج کرتا ہوں۔

ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید
زعشق تو بگیرد رنگ و بوئے

اس رباعی سے ناظرین کو یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال اپنے پیارے بیٹے کو عشق رسولؐ میں سرشار دیکھنا چاہتے تھے اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن جاوید پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کرم ضرور ہوگی (ان شاء اللہ) اس تمہید کے بعد اب میں اس نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔

پہلا شعر۔ اس شعر میں سازِ خودی اور سوزِ خودی یہ دو ترکیبیں بہت غور کے لائق ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اقبال نے ان دو لفظوں کو اپنی تصانیف میں بکثرت استعمال کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ لفظ کثیر المعانی ہیں۔

ساز کے معنی ہیں۔ ساز و سامان۔ اسباب خانگی۔ اسلحہ، سامانِ جنگ آلات موسیقی مطابقت موافقت ہم آہنگی۔ ضیافت۔ زادِ راہ۔ عقل وخرد۔ سوز کے معنی ہیں۔ جلن۔ آگ۔ حرارت۔ گرمی۔ محبت عشق۔ جوش وخروش

ولولہ۔ سوز و گداز۔ تاثیر یا کیفیات۔ مرثیہ۔ سوز و ساز کے معنی ہیں عشق و محبت کی کیفیات۔

یہاں خودی کے ساز سے مراد ہے خودی کی ایسی تربیت کہ وہ مرتبہ کمال تک پہونچ جائے۔ کہتے ہیں کہ اے جاوید! اگر تو حیات ابدی کا آرزومند ہے تو خودی کی صحیح (اسلامی طریق پر) تربیت کر اقبالؔ کا مسلک یہ ہے کہ خودی اگر پختہ ہو جائے تو ابدی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔

ع خودی چوں پختہ گردد لازوال است

خلاصہ کلام یہ ہے کہ خودی کے ساز سے خودی کی پختگی مراد ہے۔ اور خودی کے سوز سے اس کی وہ کیفیت مراد ہے جو عشق کے بعد اس پر طاری ہوتی ہے جب تک خودی میں رنگ عشق پیدا نہ ہو کوئی فرد دنیا میں ترقی نہیں کر سکتا اور امت افراد کے مجموعہ ہی کا دوسرا نام ہے یعنی اگر کوئی قوم ترقی کی آرزومند ہو تو لازمی ہے کہ امت کے افراد میں عشق کا جذبہ کار فرما ہو یعنی ہر فرد کفن بردوش میدان عمل میں آجائے۔

دوسرا شعر:۔ خواہ انسان کتنی ہی غربت یا مفلسی یا گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کردے نہ اس کے پاس کوٹھی ہو نہ موٹر ہو۔ نہ ٹیلیفون ہو۔ نہ عہدہ ہو۔ نہ جاگیر ہو لیکن اگر وہ اس حقیقت کبریٰ کو مدنظر رکھے کہ میں، صاحب مقصود، ہوں یعنی مجھ کو اللہ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ میں اپنی خودی کی تربیت کر کے خلافت الٰہیہ کا مستحق بن جاؤں تو یہ تصور اس کو فروغ (ترقی) بھی عطا کر سکتا ہے اور فراغ (طمانیت) بھی۔

تیسرا شعر:۔ اے جاوید! بدکاروں اور کمینہ خصلت لوگوں کی صحبت سے ہمیشہ اجتناب کرنا کیونکہ جن لوگوں کی سرشت میں خباثت ہوتی

ہے وہ کبھی نیکی اور پاکیزگی اختیار نہیں کر سکتے چنانچہ اس کی مثال درکار ہو تو زاغ اور شاہین بچہ کی صحبت پر غور کر سکتے ہو اگر کسی شاہین بچہ کو زاغوں کی صحبت میں رکھا جائے تو کبھی زاغ میں شاہین کی سی بلند پروازی پیدا نہیں ہو سکتی ہاں یہ ضرور ہو گا کہ اس شاہین بچہ میں کوّے کی دو ایک بری عادتیں ضرور پیدا ہو جائیں گی۔

چوتھا شعر:۔ اے فرزند! مغربی طرزِ تعلیم اور عریانی پسند ادب کی عام اشاعت اور مغربی تہذیب کے فروغ کی بدولت دنیا والوں کی آنکھ میں حیا باقی نہیں رہی ہے بے حیائی اور عریانی عام ہو گئی ہے اس لئے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تجھے ان "کجکلا ہوں" اور "کافر نگاہوں" کی دستبرد سے محفوظ رکھے۔

نوٹ:۔ میں نے یہ دونوں لفظ علامہ اقبال کی اس رباعی سے مستعار لئے ہیں جس میں انہوں نے نوجوان قوم کے حق میں دعا کی ہے۔

یکے بنگر فرنگی کج کلاہاں   تو گوئی آفتاب مانندِ ماہاں
جوانِ سادۂ من گرم خون است   نگہدارش ازیں کافر نگاہاں

پانچواں شعر:۔ آج کل خودی کی تربیت خانقاہوں میں نہیں ہو سکتی کیونکہ ان میں ذہنی قوتوں کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے اور ذہنی تربیت تکمیل خودی کے لئے شرطِ اولیں ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں چونکہ بفضلِ خدا ظریفت و زیرک ذہین و طباع اور دولتِ فکر کا مالک ہوں اس لئے خانقاہی رنگ سے محفوظ رہا۔

گدائی

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا
ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

(ماخوذ از انوری)

■

: اس نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ ملوکیت بھی گدائی کی ایک قسم ہے اس لئے مذموم ہے۔ گدائے بے حیا سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان جب تک بے غیرتی اختیار نہ کرے گدائی نہیں کر سکتا اور چونکہ اسلام اور بے غیرتی ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے اسلام میں گدائی کی یہ دونوں قسمیں ممنوع ہیں۔

میخانہ میں ایک دن ایک رندِ دانشمند یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے شہر

کا والی بھی گدائے بے حیاسے کسی طرح کم نہیں ہے اور اس دعوی کے ثبوت میں اس نے حسب ذیل شواہد میخواروں کے سامنے پیش کئے۔

ا ۔ دہقان۔ کاشتکار۔ مزدور اور عوام سب سر سے ننگے ہو گئے تو یہ شاندار پگڑی نصیب ہوئی جس میں بیش قیمت جواہراتسے مزین کلغی اور سر پیچ اور طرہ اور مکٹ لگا ہوا ہے۔

ب ۔ دہقان نے اپنے خون جگر سے کھیتوں کو سینچا تو اسے پرنگالی شراب (جو عموماً لالہ گوں ہوتی ہے) نصیب ہوئی اور انہی کھیتوں کی بدولت اس کا خزانہ معمور ہوا۔

ج ۔ اس کے توشہ خانہ میں جس قدر انواع و اقسام کی نعمتیں موجود ہیں وہ سب مانگی ہوئی ہیں۔ اور ان کے دینے والے دولت مند لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ غریب اور بے نوا ہیں جن کو دو وقت پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر مانگنے والا گدا ہے خواہ وہ بھیک مانگے یا صدقہ مانگے یا خراج مانگے اس کی تفصیل یہ ہے کہ فرض کرو ایک شخص سڑک پر۔ یا

لہ جہاں تک کشمیر جنت نظیر کا تعلق ہے اس رند زیرک کا یہ قول سو فیصدی صحیح ہے کیونکہ کشمیری عوام کی بے کلاہی اور عریانی ساری دنیا میں مشہور ہے اور انہی لوگوں کو عریاں کرکے والی سرینگر نے ۱۹۳۲ء میں انگلستان کے ایک باشندہ کو ۳۰ لاکھ روپیہ بطور ہرجانہ دیا تھا۔ ورنہ اس کی بیوی کی بے عزتی کے جرم میں جیل خانہ کی ہوا کھانی پڑتی اگرچہ عدالت کو مہاراجہ نے اپنا نام مسٹر اے بتایا تھا لیکن۔ ؎

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

دروازوں پر جا کر لوگوں سے بھیک مانگتا ہے اور اس طرح اسے شام تک پانچ روپے مل گئے تو یہ رقم اس لئے ناجائز ہے کہ اس نے اپنی قوت بازو سے حاصل نہیں کی ہے۔

اسی طرح ایک نواب یا بادشاہ جب سال بھر تک کاشتکاروں سے زبردستی مانگ مانگ کر ایک کروڑ روپیہ جمع کرتا ہے تو یہ رقم بھی ناجائز ہے کیونکہ اس نے اپنی قوت بازو سے حاصل نہیں کی ہے۔

نوٹ:۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان نورالدین زنگیؒ، سلطان ناصرالدین محمودؒ اور سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ اپنی ضروریات زندگی خزانہ شاہی سے پوری نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی قوت لایموت اپنی قوت بازو سے پیدا کرتے تھے۔

•

مُلّا اور بہشت

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرت مُلّا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بدآموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

•

اس نظم میں اقبال نے "ملا" کی ذہنیت پر تبصرہ کیا ہے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں "ملا" سے ان کی مراد وہ علمائے سو ہیں جو اسلام کی روح سے ناآشنا ہیں چنانچہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں۔

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
مکتب و ملا ز اسرارِ کتاب — کور مادر زاد و نور آفتاب

آج کل یہ لفظ "ملا"، ہمارے ادب (لٹریچر) میں کلمۂ تحقیر بن گیا ہے یعنی اس کا مفہوم یکسر بدل گیا ہے۔ پہلے زمانہ میں بلکہ سلطنت مغلیہ کے زوال تک یہ لفظ بہت دقیع تھا چنانچہ تاریخ میں سعد الدین تفتازانی جلال الدین دوانی۔ محب اللہ بہاری۔ نظام الدین سہالوی۔ عبد العلی بحر العلوم صدر الدین شیرازی وغیرہم یہ سب حضرات ملا کے لقب سے مشہور ہیں اور دنیا جانتی ہے کہ یہ علماء معقولات میں اپنے اپنے زمانہ کے امام گذرے ہیں اگر میں ان کے علمی کارناموں کی تفصیل بیان کروں تو یہ شرح تاریخ الحکماء بن جائے گی بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ حضرات منطق اور فلسفہ میں کانٹ اور ہیگل کے ہمپایہ ہیں۔

جب انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں علم اور علماء کو ختم کرنے کی مہم شروع کی تو کچھ عرصہ کے بعد ملا تو مٹ گئے اور انگریزوں نے یہ معزز لقب ان لوگوں کو دینا شروع کر دیا۔ جو چھاؤنیوں میں مسلمان سپاہیوں کو پنج وقت کی نماز پڑھانے پر متعین تھے۔ اپنے آقاؤں کی تقلید میں رفتہ رفتہ ہم بھی جہلا کو ملا کے نام سے یاد کرنے لگے جس طرح ایک خاص لطیفہ کی مہربانی سے نائی اور حجام "خلیفہ" بن گئے اسی طرح انگریزوں کی علم دشمنی کی بدولت نیم خواندہ اشخاص ملا کے لقب سے مشہور ہو گئے قصور اس لفظ کا نہیں ہے بلکہ ان نااہلوں

کا ہے جن کو یہ لقب مفت میں مل گیا چنانچہ اس زمانہ میں ملّا اسے کہتے ہیں جسے کسی علم یا فن میں دستگاہ حاصل نہ ہو ایسا شخص لامحالہ کم علمی کے باعث اپنا وقت لایعنی بحث وتکرار میں صرف کرے گا اور بدآموزی اقوام وملل کا مرتکب ہوگا۔

قال واقول۔ دراصل یہ عربی زبان کے دو لفظ ہیں قال کے معنی ہیں اس نے کہا" اور اقول کے معنی ہیں " میں کہتا ہوں" منطق اور فلسفہ کی کتابوں پر جو حواشی لکھے گئے ہیں ان کا طریق یہ ہے کہ پہلے قال کے تحت مصنف کی عبارت لکھتے ہیں پھر اقول لکھ کر اس کی شرح کرتے ہیں چونکہ اس طرح تحریر میں بحث وجدال کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اس لئے مباحثہ اور مناظرہ کو " قال واقول " کہنے لگے۔

منطق میں ایک ابتدائی کتاب کا نام بھی قال واقول ہے جو اسلامی مدارس میں صغریٰ۔ کبریٰ۔ ایساغوجی اور میزان کے بعد پڑھائی جاتی ہے کنشت۔ یہودی اور مجوسی کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ نظم میں کوئی اشکال نہیں ہے اس لئے مطلب لکھنا چنداں ضروری نہیں ہے۔

دین و سیاست

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطان و راہب میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

•

کلیسا یونانی زبان کے مشہور لفظ ایکلیزیا (ECCLESIA) کا معرب ہے یہی وجہ ہے کہ کلیسا بھی مستعمل ہے چنانچہ ضرب کلیم میں اقبال نے لکھا ہے۔

ع توہیں ہراول لشکر کلیسا کے سفیر

کلیسا کے لغوی معنی ہیں مجلسِ عوام۔ مسیحی ادبیات میں اس سے مراد ہے۔ عبادت گاہ یا مذہبی تنظیم یا ادارہ برائے تبلیغ واشاعتِ مذہب عیسوی۔ نیز پادریوں کی وہ جماعت جو اس ادارہ کا انتظام کرے اور مذہب کے اصولوں کی حفاظت کرے۔ اور مذہبی رسوم وروایات کو زندہ رکھے اقبالؔ نے اس نظم میں کلیسا کو نصاریٰ کی مذہبی تعلیم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ واضح ہو کہ پوپوں۔ پادریوں اور مذہبی پیشواؤں نے مذہب عیسوی کی بنیاد رہبانیت پر رکھی تھی۔

"پیر کلیسا" سے پوپ یا پاپائے روم مراد ہے جو رومن کیتھولک فرقہ کے عیسائیوں کا مذہبی پیشوا اور ان کے عقیدہ کے مطابق یسوع مسیح کا سچا جانشین ہے جو دوسروں کے گناہ معاف کر سکتا ہے اور خود گناہ سے محفوظ ہے۔

لفظ دوئی کو اقبالؔ نے اس شعر میں اس کے فلسفیانہ مفہوم کے لحاظ سے استعمال کیا ہے اور اس سے ثنویت مانی مراد لی جاتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں ایران میں ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام مانی تھا اس نے مسیحیت اور بعض قدیم مذاہب کے امتزاج سے ایک نیا مذہب جاری کیا جس کی بنیادی تعلیم یہ تھی کہ کائنات میں دو متضاد طاقتیں کارفرما ہیں۔ خیر و شر یا نور و ظلمت۔

چونکہ مانی نے بھی مسیحیت کی طرح ترک دنیا زہد اور تجرد کی تعلیم دی تھی اس لئے ایران۔ عراق۔ شام۔ فلسطین اور ایشیائے کوچک کے بہت سے عیسائی اس کے پیرو ہو گئے اور ان کی وساطت سے دوئی کا یہ

عقیدہ کلیسا کے بنیادی عقائد میں داخل ہو گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں زندگی کے ہر شعبہ میں تفریق پیدا ہو گئی۔ مثلاً روح جدا ہے مادہ جدا ہے۔ اسی طرح دین جدا ہے۔ دنیا جدا ہے نیز مذہب جدا ہے سیاست جدا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ آدمیوں کے بھی دو طبقے ہو گئے دنیادار (The Laity) اور دیندار (The Clergy) اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

صحر التیین" سے اشارہ ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بشیری" سے مراد ہے دین۔ اور "نذیری" سے مراد ہے سیاست یعنی آپ دین اور سیاست دونوں کے جامع ہیں۔

جنیدی: منسوب بحضرت جنید بغدادیؒ یہاں اس سے مراد ہے طبقۂ زہاد یا صوفیہ یا علمائے دین۔

اردشیری: منسوب بہ اردشیر۔ اردشیر نام ہے بہمن بن اسفندیار کا اور ساسان کا جو بانی خاندان ہے اور شیرویہ بن پرویز کے بیٹے کا یہاں اس سے مراد ہے ارباب سیاست۔

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ نظام کلیسائی کی بنیاد ترکِ دنیا پر ہے اسی لئے رومی کلیسا نے پوپ سے لے کر چھوٹے پادری تک سب کے لئے تجرد کو لازمی قرار دیا ہے اگر کوئی آدمی خادم دین عیسوی بننا چاہے تو وہ شادی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ کام دنیاداروں کا ہے نہ کہ دینداروں کا پادریوں کے علاوہ راہبوں اور راہبات کے لئے بھی تجرد لازمی ہے راہب کے معنی ہیں تارک الدنیا اور تارک الذات دنیوی۔

نوٹ:۔ قرآن مجید کی رو سے جناب مسیح علیہ السلام نے اپنی امت

کو رہبانیت کی تعلیم نہیں دی تھی۔ یہ طریقہ انہوں نے خود داخل مذہب کر دیا ہے۔

میری تحقیق کے مطابق نصاریٰ نے یہ طریقہ بودھ دھرم کے پیروؤں سے اخذ کیا تھا اسی لئے لوتھر نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی چنانچہ پراٹسٹنٹ کلیسا کے پادری شادی کر سکتے ہیں۔

چونکہ کلیسا کی بنیاد ہی ترک دنیا پر تھی اس لئے اس میں حکومت (سیاست) کی جو سراسر دنیاداری ہے کس طرح گنجائش نکل سکتی تھی؟ یوں بھی سلطانی اور راہبی دونوں میں بنیادی اختلاف ہے۔ بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں سلطانی حکومت کا نام ہے اور راہبی۔ عاجزی اور مسکینی بلکہ غلامی کی دوسری شکل ہے۔

اس لئے پندرہویں صدی میں میکیاولی نے سیاست کو مذہب کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اگرچہ پوپ نے اس نظریہ کی بہت مخالفت کی لیکن رفتہ رفتہ تمام یورپین حکومتیں اس کے اثر سے آزاد ہو گئیں چنانچہ انگلستان میں شاہ ہنری ہشتم نے پوپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔

نوٹ: میکیاولی ([illegible]) (۱۴۶۹ء تا ۱۵۲۷ء) مشہور اطالوی سیاست داں جس نے کتاب الملوک لکھ کر یورپ میں وطن کو بنی آدم کا معبود بنا دیا۔ نظریہ وطنیت جس کی رو سے قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اسی "باطل پرست اور مرسل شیطان" کا ایجاد کردہ ہے جو سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے کیونکہ قرآن مجید کی رو سے مسلمان قوم کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ دین اسلام ہے یعنی عقیدۂ توحید و رسالت۔

غرض جب مذہب اور سیاست میں تفریق ہو گئی تو ارباب حکومت

خدا کے بجائے نفس امارہ کے پیرو ہو گئے اسی بات کو اقبال نے "ہوس کی امیری" سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال کی رائے میں "دوئی" یعنی دین اور سیاست میں تفریق پیدا کرنا دونوں کے لئے مضر ہے چنانچہ اس مضرت کو انہوں نے اس اثر آفریں طریق پر بیان کیا ہے۔ ع جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اور سیاست کی تفریق کو مٹایا۔ اسلام دین اور حکومت دونوں کا جامع ہے چنانچہ آپ بشیر بھی ہیں نذیر بھی ہیں یعنی رسول بھی ہیں اور صاحب امر بھی۔

کہتے ہیں کہ بنی آدم کی فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے کہ دیندار اور دنیادار، صوفی اور سیاست داں۔ درویش اور بادشاہ کے امتیاز کو مٹا دیا جائے اور جو ہمارا بادشاہ ہو وہی ہمارا دینی پیشوا بھی ہو مثلاً فاروق اعظمؓ کہ وہ بیک وقت فرماں روا بھی تھے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین بھی تھے۔

الارض للہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟
خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟
دِہ خدایا ! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں ؟
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں ؟

•

اس نظم میں اقبالؔ نے اپنا مسلک واضح کیا ہے کہ الارض للہ یعنی زمین اللہ کی ملکیت ہے اس لئے زمیندار کو۔ کاشتکار سے غلہ یا روپیہ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اگر یہ سوال پیدا ہوا کہ پھر "زمیندار کیا کرے ؟ تو اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ وہ بھی عیاشی کرنے اور کتے پالنے کے بجائے کاشتکار کی طرح اللہ کی زمین میں کاشت کرکے اپنی قوت بازو سے روزی پیدا کرے بالفاظ دگر اقبالؔ زمیندار اور زمینداری دونوں کو تسلیم نہیں کرتے اسی لئے تو انہوں نے یہ انقلاب آفریں شعر کہا ہے جس کا جواب سارے اردو ادب میں نہیں مل سکتا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اقبالؔ کہتے ہیں کہ زرعی پیداوار کے لئے تین چیزیں شرط ہیں۔

۱ ۔ زمین۔ جس میں زراعت کی جائے اور یہ اللہ کی ملک ہے اس لئے جو شخص کاشت کرے اس کی ملک ہے چنانچہ انہوں نے جاوید نامہ میں اس نکتہ کو واضح کر دیا ہے۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر — رزق دگو را زوے بگیر او را مگیر

۲ ۔ کاشتکار۔ جو زمین میں کاشت کرے۔

۳ ۔ حکومت۔ جو کاشتکار کی محنت کی حفاظت کرے اور اس خدمت کا معاوضہ مطابق شرع وصول کر سکتی ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ زمیندار یا جاگیردار اس مرقع میں کہیں نظر نہیں آتا لہٰذا اسے کاشتکار سے کوئی رقم وصول کرنے کا حق حاصل نہیں ہے اسی لئے اقبالؔ پوچھتے ہیں۔

ع کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اقبالؔ نے اس نظم کا مطلب آخری شعر میں خود بیان کر دیا ہے یعنی اے "زمیندار" یہ زمین نہ تیری ہے نہ تیرے باپ دادا کی ہے اور نہ میری ہے بلکہ اللہ کی ہے اور جو شخص کسی قطعۂ زمین میں ہل چلاتا ہے اور اپنی قوت بازو سے دانہ اگاتا وہی اس پیداوار کا مالک ہے۔

ایک نوجوان کے نام

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانیؓ
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

•

ممکن ہے اس نظم میں علامہ مرحوم نے کسی خاص نوجوان کو مخاطب کیا ہو لیکن جس حکیمانہ نکتہ کی انہوں نے تبلیغ کی ہے اس سے پوری قوم مستفید ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ مسلمان نوجوان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ

ع پائی میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

کہتے ہیں کہ جب میں مسلمان نوجوان کی تن آسانی اور عیش پسندی کا مشاہدہ کرتا ہوں تو میرا دل خون ہو جاتا ہے۔

اگر قوم کے افراد میں زورِ حیدری اور استغنائے سلیمانی موجود نہ ہو تو بادشاہت بھی کوئی قابلِ فخر چیز نہیں کیونکہ وہ بہت جلد زائل ہو جائے گی۔

اے مسلمان! تو اگر اسلامی زندگی کے نقطۂ کمال تک پہونچنا چاہتا ہے تو مغربی علوم اور مغربی تہذیب دونوں سے یکسر قطع تعلق کر نے مسلمانوں کی عروج تہذیب مغرب اختیار کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی اس کے لئے تجھ کو اپنے اندر استغنار کا رنگ پیدا کرنا لازم ہے۔

واضح ہو کہ صفتِ استغنار، اقبال کے نظام افکار میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کو اپنی ہر کتاب میں بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے چنانچہ اس سے پہلے وہ لکھ چکے ہیں۔

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنار

ضرب کلیم میں لکھتے ہیں۔

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی

اس شعر میں دولت سلمانی سے شانِ استغنار ہی مراد ہے۔ استغنا سے اقبال کی مراد ہے بے نیازی کا رنگ یعنی مسلمان اللہ کے سوا کسی سے کوئی توقع نہیں رکھتا یہی مومن کی پہچان ہے چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں۔

گ ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

واضح ہو کہ بے نیازی خود اللہ کی ایک صفت ہے چنانچہ رموزِ بیخودی

میں لکھتے ہیں۔

بے نیازی رنگِ حق پوشیدن است
رنگ غیر از پیرہن شوئیدن است

چونکہ استغنا، یا بے نیازی کا رنگ صرف شان فقر سے پیدا ہو سکتا ہے اسی سے اقبال نے اس کو اپنے فلسفہ کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے غور سے دیکھئے تو رنگ استغنا، شان فقر ہی کا دوسرا رُخ ہے اب اقبال کے فلسفہ کا خلاصہ چار سطروں میں لکھے دیتا ہوں۔

ا۔ معراج مسلمانی۔ شانِ استغنا سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ب۔ شانِ استغنا، فقر سے پیدا ہوتی ہے۔

ج۔ فقر۔ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر منحصر ہے۔

د۔ اتباع۔ عشق کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

اس لئے ہر مسلمان کو عشق رسول ؐ اختیار کرنا چاہئے یہی ہے حکیم اقبال کا وہ پیغام جو انہوں نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۸ء تک اپنی تصانیف کے ذریعہ سے قوم کو دیا اور اسی پیغام کو عرف عام میں اقبال کا فلسفہ کہتے ہیں۔

اس نکتہ کو واضح کرنے کے بعد کہ استغنا معراج مسلمانی ہے۔ اقبال قوم کو یقین پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں یعنی اللہ کی رحمت سے نا امید نہیں ہونا چاہئے کیونکہ نا امیدی تو انسان کو انجام کار کافر بنا دیتی ہے چنانچہ قرآن مجید فرماتا ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید مت ہو۔

یہ شعر جس میں اقبال نے قوم کو امید (یقین) کا پیغام دیا ہے اسلامی زاویۂ نگاہ سے بال جبریل کے چند بہترین اشعار میں سے ہے جس کے ہر لفظ سے

خود اقبالؔ مرحوم کی اسلام دوستی عیاں ہوتی ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ اسی ایمان وایقان کا یہ کرشمہ ہے کہ جس طرح زندگی میں ان کے یہاں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ مرنے کے بعد بھی ان کی تربیت جو جامع عالمگیری کے سایہ میں ہے۔ زیارت گاہ خاص و عام بنی ہوئی ہے شاید اسی بنا پر انہوں نے خود یہ پیشگوئی کی تھی۔

زیارت گاہ اہل عزم وہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

وہ رازِ الوندی اس کے سوا کیا ہے کہ اے مسلمان سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کر کے دنیا پر حکمراں ہوجا۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو رحمت ایزدی سے ناامید ہوجائیگا تو تجھ کو علم قرآن اور معرفت الٰہی یہ دو نعمتیں کبھی حاصل نہیں ہوسکیں گی اور ارباب بینش اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کے بغیر کوئی انسان حیوانیت کی سرحد کو عبور نہیں کرسکتا جو شئے حضرت انسان کو فرس وحمار سے ممتیز کرتی ہے وہ علم وعرفان ہی تو ہے نہ کہ خواب وخورش یا تنزیج وتولید۔

آخر میں اقبالؔ مسلمان نوجوانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اگر تو اپنے اندر شانِ استغنا پیدا کرنی چاہتا ہے تو بادشاہوں کی غلامی اختیار کرنے کے بجائے اپنا رزق اپنی قوت بازو سے حاصل کر۔

میں نے بچپن میں ایک شعر پڑھا تھا جو مجھے اب تک یاد ہے چونکہ اس کا مضمون اقبالؔ کے اس شعر سے ملتا جلتا ہے اس لئے اس جگہ نقل کئے دیتا ہوں

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف وذلت کے حلوے سے بہتر

نصیحت

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخوردہ
اے ترے شہپر پہ آساں رفعت چرخ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

•

اس نظم میں اقبالؔ نے قوم کے نوجوانوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اللہ نے تمہیں جوانی کا زمانہ اس لئے عطا کیا ہے کہ تم اپنی خداداد طاقتوں سے کام لے کر اپنی دنیا آپ پیدا کرو۔

اگر تم سخت کوشی کو شعار زندگی بنالوگے تو دنیا کی ساری مشکلات آسان ہوجائیں گی قانون فطرت یہی ہے کہ جدوجہد سے سب مصیبتیں راحت میں بدل جاتی ہیں۔

اقبال کی رائے میں لطف زندگی عیش و عشرت میں نہیں ہے بلکہ اس جدوجہد میں ہے جو انسان، حصول راحت کے لئے کرتا ہے چنانچہ شکاری اس بات کی تصدیق کرسکتا ہے کہ مثلاً ہرن کے شکار کا حقیقی لطف جدوجہد میں ہے نہ کہ اس کے کباب کھانے میں۔

لالۂ صحرا

یہ گنبدِ مینائی! یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی!

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی!

تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی، اک لذّتِ یکتائی!

غوّاصِ محبّت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

اے بادِ بیابانی! مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی!

●

یہ نظم، اقبال کی ایمائی شاعری کی بہترین مثال ہے کیونکہ اس کا ہر مصرع استعارہ، کنایہ اور مجاز سے لبریز ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ساری نظم میں کوئی لفظ یا ترکیب مشکل نہیں ہے اس کے باوجود اشعار کا مطلب سمجھنے میں وقت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نظم بہت غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔

جس طرح پرندوں میں شاہین اقبال کا محبوب ہے اسی طرح پھولوں میں گل لالہ انہیں بہت مرغوب ہے یوں تو ہر تصنیف میں اس کا تذکرہ آیا ہے لیکن پیام مشرق میں اسے طرح طرح سے سجایا ہے مثلاً۔

ا۔ انہوں نے مجموعۂ رباعیات کو "لالۂ طور" سے موسوم کیا ہے۔

ب۔ اس کی تعریف میں ایک مستقل نظم لکھی ہے جس کا عنوان بھی "لالہ" ہے اس کا ایک شعر ذیل میں درج کرتا ہوں تاکہ ناظرین کو اس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اقبال کی نگاہ میں (لالہ) کی قدر و قیمت کیا ہے۔ گل لالہ کہتا ہے۔

افزوں ترم ز مہر و بہر ذرہ تن زنم
گردوں شرارِ خویش ز تاب من آفرید (پیام مشرق)

ج۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ۔

چوں بمیرم از غبار من چراغ لالہ ساز
تازہ کن داغ مرا سوزاں بصحرائے مرا

د۔ پیام مشرق صا۲۵ پر انہوں نے حکما کی جو مجلس آراستہ کی ہے اس میں آدم کے لئے (لالہ) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ساغرش را سحر از بادۂ خورشید افروخت
ورنہ در محفلِ گِل لالہ تہی جام آمد

(یہاں "لالہ" سے مراد انسان ہے۔)

گل لالہ سے اقبال کی دلچسپی کا سبب یہ ہے کہ جس طرح ان کو شاہین میں مردِ مومن کی صفات نظر آتی ہیں اسی طرح وہ اس پھول میں عاشق کی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں! اقبال اور گل لالہ دونوں کسی "پردہ نشین" کے فراق میں جل رہے ہیں اسی لئے دونوں کے جگر میں داغ ہے اور جب وہ لالہ کے داغ کو دیکھتے ہیں تو انہیں اپنا داغ نظر آجاتا ہے گویا گل لالہ، ان کی عاشقانہ زندگی کا آئینہ ہے۔

اس تمہید کے بعد نظم کا مطلب بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

شاعر (عاشق) عالمِ بیخودی میں کسی صحرائے لق و دق میں جا نکلتا ہے وہاں اُسے ایک لالۂ خودرو (صحرائی) نظر آتا ہے اور جب اس کے داغِ جگر کو دیکھتا ہے تو اسے اپنا ہم مشرب سمجھ کر یوں گویا ہوتا ہے۔

اے گل لالہ! مجھے تعجب ہے تو کس طرح یہاں تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہے یہ لامحدود آسمان یہ خاموشی اور تنہائی کا عالم! تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو مردہ خوفزدہ ہو جاتا۔

اے گل لالہ! تو اور میں ہم دونوں یہاں راستہ بھول کر آگئے ہیں یہ جگہ نہ تیرے لئے موزوں ہے نہ میرے لئے کیونکہ عاشق کا مقصدِ حیات یہ نہیں کہ وہ ساری زندگی گمنامی کی حالت میں بسر کر دے عشق تو ہنگامہ چاہتا ہے نہ کہ سکوں۔

اے لالۂ صحرائی! کبھی تو نے یہ بھی سوچا کہ تیری منزل کہاں ہے؟ یہ صحرا تو یقیناً تیری منزل نہیں ہے تجھے باغ کی زینت میں اضافہ کرنا چاہئے یہاں تو تیرے داغِ جگر کو دیکھنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

اس استفہام سے مراد یہ ہے کہ صحرا میں گمنامی کی زندگی بسر کرتا مؤمن

کا مقصد حیات نہیں ہے۔

اس کے بعد شاعر فلسفیانہ انداز اختیار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں حقیقت میں اصحاب ذوق اور ارباب نظر بہت کم ہیں ورنہ تو ہر مظہر ذاتِ باری ہے اور مجھ میں بھی اسی کا عکس نظر آتا ہے۔

اب شاعر پر عارفانہ حالت طاری ہوتی ہے اور وہ اسرارِ حیات فاش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ سوال کرتا ہے کہ پھول شاخ سے کیوں پھوٹتا ہے؟ اور انسان رحم مادر سے نکل کر مستقل وجود کیوں اختیار کرتا ہے؟ پھر خود جواب دیتا ہے کہ اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ظہور ہر شئے کی فطرت ہے ظہور تقاضائے ذات ہے۔ ہر شئے میں لذت یکتائی پوشیدہ طور پر کارفرما ہے ہر شئے انفرادیت کی طالب ہے۔

ہر چیز ہے محو خود ستائی
ہر ذرّہ شہید کبریائی

لیکن انسان دنیا میں اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ خودی کو مرتبہ کمال تک نہیں پہونچا سکتا اور شان یکتائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک اُسے اپنے نصب العین سے عشق نہ ہو۔ اور یہ عشق یہ دریائے محبت بہت عمیق ہے اس کو عبور کرنا بہت دشوار ہے قدم قدم پر جان کا خطرہ ہے اس لئے شاعر کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلتی ہے۔

غوّاصِ محبّت کا اللہ نگہباں ہو[1]

---

[1] اقبال نے پہلے محبت کو دریا سے تشبیہ دی ہے پھر اس کی مناسبت سے عاشق کو غواص قرار دیا۔ یہ استعارہ بالکنایہ کی بہت دلکش مثال ہے۔

اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ جب تک توفیق الٰہی شامل نہ ہو سالک منزل مقصود کو نہیں پہونچ سکتا۔ کیوں اس لئے کہ۔

ع ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

یہ مصرع بلا شبہ اس نظم کا حاصل ہے اور میری تحسین سے بالاتر ہے اقبالؔ نے دو لفظوں میں عاشقانہ زندگی کی ایسی صحیح تصویر کھینچی ہے کہ شاعری پر مصوری کا دھوکہ ہوتے لگتا ہے۔

کمال رمزیت و بلاغت کے باوجود اقبالؔ نے حقائق نگاری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور انہی معنوی خوبیوں کی بنا پر شعر میں وجد آوری کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

واقعی محبت وہ دریا ہے کہ اس کے ہر ہر قطرہ میں پورے دریا کی گہرائی مخفی ہے یعنی یہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے جسے شک ہو وہ غواصی کرکے تجربہ کرلے۔

نوٹ: جس طرح پانی کے عناصر معلوم کرنے کا طریقہ منطق نہیں ہے بلکہ اطاق تجربیات (laboratory) میں آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ملاکر بذریعہ تجربہ متشکک کی تسلی کر دیتے ہیں بس اسی طرح رموز محبت کی صداقت تجربہ کرنے سے عیاں ہو جاتی ہے منطقی بحثوں سے ثابت نہیں ہو سکتی۔

اس مصرع میں دریا سے عشق اور قطرہ سے حال مراد ہے اس لئے ہر قطرۂ دریا میں دریا کی گہرائی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ احوال عاشقی میں ہر حال جو عاشق پر طاری ہوتا ہے اور اپنے اندر عشق کی پوری شدت رکھتا ہے بالفاظ دگر منازل عشق میں سے ہر منزل اپنی جگہ اتنی ہی دشوار ہوتی ہے جتنی کہ مجموعی طور پر تمام منازل وجہ کیا ہے۔؟

وجہ یہ ہے کہ دنیا کے دوسرے معاملات میں ہر بات کی ابتدا آسان ہوتی ہے۔ دشواریاں تبدریج پیدا ہوتی ہیں لیکن عشق کا عالم دنیاوی معاملات سے بالکل جداگانہ ہے یہاں پہلے ہی قدم پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے یعنی عشق کا دریا کنارے پر بھی اتنا ہی گہرا ہے جتنا درمیان میں۔

چھٹا شعر:۔ موج سے مراد ہے انسان۔ بھنور کی آنکھ سے مراد ہے کارخانۂ ہستی یا وجود۔ ساحل سے مراد ہے وہ قیود و حدود جو قدرت نے عائد کردی ہیں مثلاً قید زمان و مکان ٹکرانے سے مراد ہے مقابلہ کرنا یا دشواریوں پر غالب آنا جو مقصد حیات انسانی ہے۔

ناظرین اس شعر کو غور سے پڑھیں تاکہ انہیں یہ معلوم ہوسکے کہ ایمانی شاعری میں اقبالؔ کا مقام کیا ہے۔

ساتواں شعر:۔ کہتے ہیں کہ اس دنیا کی ساری رونق بنی آدم کی جدوجہد پر موقوف ہے آفتاب اور ماہتاب بلکہ تمام اجرام سماوی اور عناصر ارضی یہ سب انسان کے خادم ہیں یعنی انسان اشرف المخلوقات اور زبدۂ کائنات ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

اٹھواں شعر:۔ آخری شعر میں شاعر فطرت سے دعا کرتا ہے کہ مجھے بھی دولت عشق سے مالا مال کردے تاکہ میرے اندر بھی بعض صفات حسنہ مثلاً خاموشی و دلسوزی سرمستی و رعنائی کا رنگ پیدا ہوجائے۔

بادِ بیابانی۔ سے خطاب کرنے میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ یہ صفاتِ حسنہ خلوت کی زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوسکتی ہیں۔

اقبالؔ نے یہ چار صفات بالتخصیص اس لئے بیان کی ہیں کہ عاشقانہ زندگی انہی سے عبارت ہے سچا عاشق اپنا زیادہ وقت خلوت اور خاموشی میں بسر کرتا ہے دوسر دل کے ساتھ ہمدردی کرنا اس کا شیوۂ زندگی ہوتا ہے ہر وقت کسی کی یاد میں مست رہتا ہے اور اس کی شخصیت میں غیر معمولی دلکشی اور رعنائی ہوتی ہے۔

قطعہ

اقبالؔ نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا
یہ شعرِ نشاط آور و پُر سوز و طربناک
میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج
کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

اس قطعہ کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں جو چیزیں شعورِ ذات کی نعمت عظمیٰ سے محروم ہیں فطرت ان کے مقصدِ حیات کی تکمیل کا خود سامان کرتی ہے مثلاً غنچہ کے وجود کی غایت یہ ہے کہ وہ شگفتہ ہو جائے لیکن غنچہ شعور (عقل) سے عاری ہونے کی وجہ سے اپنے مقصدِ زندگی کے حصول کے لئے خود جدوجہد نہیں کرسکتا اس لئے فطرت اس کی امداد کرتی ہے یعنی بادِ صبا (نسیمِ سحر) اسے شگفتہ کر دیتی ہے لیکن انسان کو فطرت (اللہ) نے شعورِ ذات کی نعمت عطا فرمائی ہے اس لئے وہ خارجی عوامل کا محتاج نہیں ہے اس شعور کی بدولت اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ خود اپنی خودی کی بذاتِ خود تکمیل کرسکتا ہے اقبالؔ کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں صرف انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی کوشش سے اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لاسکتا ہے یعنی اپنی قبا خود چاک کرسکتا ہے۔

ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار — ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن — شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
رکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات — وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات
وہ مے جس میں ہے سوز و سازِ ازل — وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ نئے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم — تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیمؑ
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش
تمدّن تصوّف شریعت کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ اُمّت روایات میں کھو گئی
لُبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سُلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخِ ملّت ترے نم سے ہے — نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر — تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر — یہ ثابت ہے تو اس کو سیّار کر
بتا مجھ سے اسرارِ مرگِ حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مری دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز

امنگیں مری۔ آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری

مری فطرت آئینۂ روزگار — غزالانِ افکار کا مرغزار

مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

دمادم رواں ہے یم زندگی — ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل — خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات — اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عین محفل میں خلوت نشیں

چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

اسی کے بیاباں اسی کے ببول — اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور — کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور

کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لئے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
اُلجھ کر سلجھنے میں لذت اُسے — تڑپنے پھڑکنے میں راحت اُسے
ہوا جب اُسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس — ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے؟ بیداریِ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک — من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی — دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں — یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے — نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

فرِو فالِ محمود سے درگذر — خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت — تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ　　　حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس　　　مگر تاب گفتار کہتی ہے بس
اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

●

تمام نقادانِ فن کا فیصلہ ہے کہ محاسن صوری و معنوی دونوں کے کے اعتبار سے ساقی نامہ اقبالؔ کی بہترین اردو نظموں میں سے ہے اس طویل نظم میں سات بند ہیں۔

پہلے بند میں شاعر نے بطور تمہید موسم بہار کے مناظر کی تصویر کھینچی ہے۔

دوسرے بند میں حالاتِ حاضرہ اور مسلمانانِ عالم کی موجودہ حالت پر تبصرہ کیا ہے۔

تیسرے بند میں شاعر نے نوجوانانِ ملت کے حق میں ساقی (اللہ) سے دعائیں کی ہیں۔

چوتھے بند میں زندگی کی ماہیت بیان کی ہے۔

پانچویں بند میں زندگی کی خصوصیات واضح کی ہیں۔

چھٹے بند میں خودی کی ماہیت بیان کی ہے۔

ساتویں بند میں خودی کی صفات واضح کی ہیں۔

اور آخر میں انسان سے خطاب کیا ہے اور میری رائے میں یہی حصہ اس نظم کی جان ہے کیونکہ انہوں نے اپنا فلسفہ اور پیغام دونوں باتوں کو ان چند اشعار میں قلم بند کر دیا ہے۔

اب ہم ساقی نامہ کی خصوصیات درج کرتے ہیں۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر معمولی سلاست اور روانی پائی جاتی ہے ساری نظم میں کہیں آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ اول سے آخر تک آمد ہی آمد ہے اس کو تنہائی میں غور سے پڑھا جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ نظم لکھتے وقت اقبالؔ پر فیضان سماوی کا نزول ہو رہا تھا اس نظم کو پڑھ کر اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰنِ یعنی شعراء اللہ کے شاگرد ہوتے ہیں۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ نظم گوناگوں محاسن شاعری کی حامل ہے مثلاً پہلے بند میں منظر کشی کا کمال دکھایا ہے تو دوسرے بند میں انتہائی بلاغت کی شان پائی جاتی ہے تیسرے بند میں جذبات نگاری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں چوتھے بند میں فلسفہ اور حکمت کے دریا بہا دیئے ہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ساری نظم اول سے آخر تک شاعری کے خلوص اور سوز جگر کی آئینہ دار ہے۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص توجہ کی ساتھ تیسرے بند کو پڑھے اور اس خصوصیت کا اعتراف نہ کرے۔ بلاشبہ اقبالؔ نے جو دعا کی ہے اس کا ہر لفظ ان کی دل کی گہرائی سے نکلا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ نوجوانوں پر اس کا اثر کیوں مرتب نہیں ہوتا؟ تو اس کا جواب اگرچہ میرے ذمہ نہیں ہے۔ لیکن لکھے دیتا ہوں کہ جس دن سے قوم نے نوجوان اقبالؔ کو شاعر کے بجائے پیغام گو۔ تصوّر کرنے لگیں گے۔ اسی دن سے ان کے قلوب بھی متاثر ہونے لگیں گے۔

میرے طویل مشاہدہ کے بموجب اکبرؔ اور اقبالؔ دونوں کی ٹریجڈی (المناک داستان یا بدقسمتی) یہ ہے کہ قوم ابھی تک دونوں کو شاعر سے

زیادہ کوئی درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہے اور یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے
کہ دنیا کے لوگ (نوجوان اور بوڑھے عورت اور مرد) کسی شاعر کے کلام کا
مطالعہ تفریح طبع کے لئے کرتے ہیں۔ نہ کہ اس پر عمل کرنے کے لئے شعر پڑھا
کچھ لطف آیا۔ زبان سے واہ نکلی۔ اور قصہ ختم ہو گیا یعنی اس کے بعد
آدمی (عورت ہو یا مرد) دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

یہی برتاؤ اکبر اور اقبال کے ساتھ ہو رہا ہے جب ہم دفتری فائلوں
کی خشکی یا خانگی مسائل کی تلخی سے تنگ آجاتے ہیں تو اکبر یا اقبال کی کوئی
کتاب لے کر چارپائی یا صوفہ پر دراز ہو جاتے ہیں اور جب اکبر کے دیوان میں
اس قسم کے اشعار نظر آتے ہیں۔

وہ مس بولی میں کرتی آپ کا ذکر اپنے فادر سے
مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کا مافک ہے

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

تو بے اختیار مرحوم کی روح پر تحسین و آفرین کے پھول برسانے لگتے
ہیں اس کے بعد رفیقہ حیات (اور اگر انسان خوش قسمت ہے تو خادمہ) سے پھر
کی چائے کا مژدہ سناتی ہے اور یہ دفتر بے معنی فوراً چائے کی پیالی میں غرق
ہو جاتا ہے۔ ع پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس نظم میں اقبال نے حیات اور خودی کے
مسائل کو آسان ترین واضح ترین اور دلکش ترین انداز میں بیان کیا ہے۔

واضح ہو کہ یہ دونوں مسئلے دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں

کیونکہ اصل نظامِ عالم حیات ہے اور حیات کی اعلیٰ ترین شکل خودی ہے یا بالفاظ دگر اصل نظامِ عالم خودی ہے جو حیات کی ترقی یافتہ شکل ہے غرض مسئلہ دراصل ایک ہی ہے یعنی خودی کیا ہے اور جن لوگوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اقبال نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک اسی بنیادی نکتہ کی وضاحت کی ہے کیونکہ غایت انسانی فقر ہے لیکن شان فقر خودی میں پیدا ہوگی اس لئے جب تک خودی کی ماہیت واضح نہ ہو آدمی اس کی تربیت اور تکمیل کیسے کر سکتا ہے۔

اقبال نے خودی کی وضاحت فلسفیانہ انداز سے اپنی کتاب تشکیل جدید (Reconstruction) میں کی ہے لیکن اس کا انداز بیان مشکل ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ اگر فلسفہ کو آسان طریق پر بیان کیا جائے تو اس کی وقعت جاتی رہتی ہے۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بال جبریل لکھتے وقت ان کو خود یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مسئلہ کو آسان طریق پر اردو زبان میں بھی بیان کر دیا جائے چنانچہ جو بات انہوں نے اسرار خودی، گلشن راز جدید اور خطبات مدراس[1] میں مشکل انداز میں کہی تھی اسی کو انہوں نے اس نظم میں بہت آسان لفظوں میں واضح کر دیا ہے اور چونکہ سمجھانا مقصود ہے اس لئے حقیقت یا ماہیت کی بحث کرنے کے بجائے ایک تشبیہ کے ذریعہ سے اپنا مفہوم عیاں کر دیا ہے۔

---

[1] میں نے ۱۹۳۱ء میں علامہ مرحوم سے یہ بات کہی تھی کہ اگر آپ اپنے خطبات مدراس کو آسان زبان میں لکھتے تو مجھ جیسے جاہل کم سواد بھی استفادہ

(بقیہ صفحہ ۶۷۱ پر)

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ نظم مسجد قرطبہ کی طرح اس میں بھی بلاغت کا رنگ نمایاں ہے۔ مثلاً

تمدّن۔ تصوّف۔ شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

دوسرے مصرع میں ایسا بلیغ اسلوب بیان اختیار کیا ہے کہ ایک ہزار سال کی تاریخ دو لفظوں میں بیان کردی۔ یعنی دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخری بند میں اقبال نے شاعرانہ زور بیان کے علاوہ اپنے پیغام کی جھلک بھی دکھائی ہے ان کا پیغام اس قدر حوصلہ افزا اور امید افزا ہے کہ اگر اسے نثر میں بیان کیا جائے تو بھی

(بقیہ صؔ۶۷ کا)
کر سکتے تھے۔ یہ سن کر مجھے غور سے دیکھا اور کہا، تم نے کانٹ اور ہیگل کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا انہوں نے اپنی تصانیف آسان زبان میں پیش کی ہیں؟ میں نے قصداً مغلق اور پیچیدہ انداز اختیار کیا ہے تاکہ پڑھنے والے غور و فکر پر مجبور ہوں، گر طرز بیان آسان ہوتا تو تم خود کیوں بار بار پڑھتے؟

بعد ازاں جب میبذی صدرا اور شمس بازغہ پڑھ معلوم ہوا کہ

ایں خانہ تمام آفتاب است

مشرقی ہوں۔ یا مغربی۔ اور ہندو ہوں یا مسلمان۔ فلاسفر اور حکماء عموماً مشکل پسند ہوتے ہیں تاکہ نا اہل نفس مضمون سے آگاہ نہ ہوسکیں۔

رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے لیکن یہاں اس نظم میں تو جوشِ بیان کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے پر بیخودی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

فی الجملہ محاسنِ شعری اور نفسِ مضامین دونوں کے لحاظ سے ساقی نامہ کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں کیا جاسکتا ہے اس مختصر سی تمہید کے بعد اب میں اس کے مطالب ومعانی کی قدرے وضاحت کرتا ہوں۔

پہلا بند

اِرم ۔ ملک یمن کے نزدیک قدیم زمانہ میں ایک شہر تھا جس میں شداد بن عاد نے بہشتِ ارضی بنائی تھی۔ اس پہ باغِ ارم ادبیات میں مشہور ہوگیا۔ کثرتِ استعمال سے صرف ارم رہ گیا۔ جس کے معنی خوبصورت باغ کے ہوگئے۔

مےٗ پردہ سوز ۔ ایسی شراب جو پردوں کو جلادے۔ مراد ہے شرابِ عرفان یا شرابِ معرفت پردوں سے مراد ہیں وہ حجابات جو انسانی عقل اور حقیقت کے درمیان حائل ہیں۔

اقبال نے اس بند میں پہلے تو بہار کا منظر پیش کیا ہے اس کے بعد خدا سے یہ دعا کی ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنی محبت عطا فرما کیونکہ اسی کی بدولت انسان حقائقِ کائنات سے آگاہ ہو سکتا ہے اور اس پر اسرارِ حیات عیاں ہو سکتے ہیں۔ عشقِ الٰہی سے انسان ضعیف البنیان (ممولا) میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ عناصرِ کائنات اور زمان ومکان (شہباز) کو مسخر کرسکتا ہے۔

دوسرا بند

اس بند میں اقبالؔ نے حالاتِ حاضرہ اور مسلمانوں کی موجودہ حالت پر تبصرہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں ہر جگہ انقلاب کارفرما نظر آتا ہے بنی آدم کی طرزِ حیات میں عظیم الشان تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں نئی نئی تحریکیں پیدا ہو رہی ہیں نئے راگ سے عصرِ حاضر کی جدید سیاسی اور عمرانی تحریکات مراد ہیں مثلاً اشتمالیت۔ اشتراکیت۔ نازیت۔ فسطائیت وغیرہ رازِ فرنگ کے فاش ہونے سے یہ مراد ہے کہ یورپ کے ملوکانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں چنانچہ اگلے اشعار میں خود اس کی تشریح کرتے ہیں کہ اب دنیا کے باشندے ملوکیت (امپیریلزم) سے سخت بیزار ہو چکے ہیں اور سرمایہ داری کا دور ختم ہو چکا ہے یہی وجہ ہے کہ ایشیائی قومیں اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔

اہلِ چین جو صدیوں سے ملوک پرستی کی لعنت میں گرفتار تھے۔ اپنی آزادی کے لئے میدان میں آ چکے ہیں اور ہندوستان کے باشندے بھی غلامی کی زنجیریں توڑ رہے ہیں۔

عرب اقوام بھی فلسطین اور عراق شام اور حجاز میں مغربی استعمال کے خلاف صف آرا ہو چکی ہیں اور تائید غیبی کی منتظر ہیں۔

ایشیا کے سیاسی حالات کا مجمل تذکرہ کرنے کے بعد اقبالؔ مسلمانوں کی حالت بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ مسلمان زبان سے توحید کا اقرار کرتے ہیں لیکن بعض غیر اسلامی عقائد ابھی تک ان کے اندر موجود ہیں مثلاً ابھی تک

غیراللہ کی اطاعت کر رہے ہیں۔

ان کے تمدن۔ تصوف۔ علم کلام اور شریعت غرضکہ ان کی اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں عجمی (غیر اسلامی) افکار کی آمیزش ہوگئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

تمدن کے لغوی معنی ہیں شہروں میں اجتماعی زندگی بسر کرنا۔ مراد ہے طرز معاشرت۔ اقبال کہتے ہیں کہ اجتماعی زندگی میں بہت سی غیر اسلامی رسوم داخل ہوگئی ہیں چونکہ ہر مسلمان ان سے واقف ہے اس لئے شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے میری رائے میں تو پوری زندگی غیر اسلامی ہو چکی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں نام نہاد ہندو مسلم اتحاد کے دور میں ایک ہندو نے مجھ سے کہا تھا کہ اجمیر کے عرس میں شریک ہونے کے بعد یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ عقائد اور اعمال کے لحاظ سے ہندو مسلمانوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ ہندو جو کام مندروں میں کرتا ہے۔ مسلمان وہی کام درگاہوں میں کرتا ہے۔ دونوں مشرک ہیں۔

تصوف۔ بمعنی اصلاح باطن یا تزکیہ نفس یہ اگرچہ بہت ضروری چیز ہے لیکن اس میں بعض ویدانتی خیالات شامل ہوگئے ہیں اور ان کا نتیجہ بے عملی اور ترک دنیا کی شکل میں ظاہر ہوا جس نے مسلمانوں کے قوائے عملی کو مفلوج کر دیا۔

شریعت۔ عقائد۔ عبادات اور معاملات کے مجموعہ کا نام ہے اس میں بھی علمائے سوء نے بعض غیر اسلامی باتیں داخل کر دیں۔ مثلاً اسلام میں ملوکیت رہبانیت۔ احباریت۔ رضائیت اور سرمایہ داری بلکہ جاگیرداری کا جواز۔

کلام سے وہ فن مراد ہے جس کی مدد سے سائنس اور فلسفہ کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت ثابت کی جاتی ہے اس فن میں بھی رفتہ رفتہ بعض

غیر قرآنی عقائد اور اکثر غیر اسلامی مسائل راہ پا گئے اور مسلمانوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں کو بلا وجہ اور بے سود ان مسائل میں ضائع کر دیا مثلاً جبر و قدر کا عقیدہ اور اس کے متعلق مسائل خلق قرآن کا مسئلہ ذات و صفات کا مسئلہ اور رویت باری تعالیٰ کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے یہی چار نمایاں پہلو ہیں اور افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ علماء سوء نے ان چاروں سر چشموں کو اپنی غفلت یا کوتاہ بینی کی بدولت کثیف اور مکدر کر دیا۔

نوٹ:۔ چونکہ میری قوم سچی باتیں سننے کے لئے تیار نہیں ہے اس لئے میں نے بھی اقبال کی تقلید میں ان چند اشارات پر اکتفا کیا ہے لیکن اگر میری زندگی میں قوم کے اندر اپنے مزعومات کے خلاف سننے کی "سکت" پیدا ہو گئی تو پھر اپنا درد دل بے کم و کاست بیان کر دوں گا۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی حقانیت اور صداقت خرافات کے پردوں میں چھپ گئی اور قوم — جاہل قوم۔ کشتۂ ملا و پیر۔ قرآن و حدیث کے بجائے اسرائیلی اور غیر اسلامی روایات کی پیرو بن گئی۔

روایات۔ سے احادیث مراد نہیں ہیں بلکہ اسرائیلیات یعنی وہ قصے اور کہانیاں مراد ہیں جو علماء کی سہل نگاری یا غفلت شعاری کی بنا پر کتب تفاسیر۔ سیر و مغازی و اخلاق میں اور صوفیاء کی کمزوری کی بدولت کتب تصوف و حلقہ ذکر میں راہ پا گئیں۔ وہ کہانیاں جن کی کوئی حقیقت یا تاریخی سند نہیں ہے وہ کہانیاں جو سراسر اسلامی تعلیمات کی روح کے خلاف ہیں۔ قرآن مجید صاف لفظوں میں حکم دیتا ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ

عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ اور جس چیز کا تجھے علم نہ ہو اس کی پیروی مت کر۔ (کیونکہ) بلاشک قیامت کے دن کان، آنکھ اور دل ان سب سے باز پرس ہوگی۔ (۱۷-۳۶)

لیکن مسلمانوں کا طریق عمل اس آیت کے بالکل برعکس ہے ان کے عقائد کا دار و مدار زیادہ تر انہی روایات پر ہے جن کی کوئی سند نہیں ہے یعنی جن کی صحت کا انہیں علم نہیں ہے۔

مسلمانوں کے علماء کا حال یہ ہے کہ ان کی تقریریں تو بہت دلپذیر ہوتی ہیں لیکن ان کے سینے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل خالی ہیں۔

اب رہے صوفیا تو ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ زیادہ تر عجمی خیالات کی پیروی کرتے ہیں جن کو قرآن حکیم اور حدیث نبوی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

سالک اور مقامات تصوف کی مشہور اصطلاحیں ہیں۔ سالک کہتے ہیں، طالب یا مرید یا جویائے حقیقت کو جو خدا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ مقامات وہ روحانی مراتب یا منازل ہیں جو اس راہ میں پیش آتی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ان غیر اسلامی عقائد و افکار کی بنا پر مسلمان قوم اسلام کی روح یعنی عشق رسول سے بیگانہ ہوگئی۔

اقبال نے موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو "راکھ کے ڈھیر" سے تشبیہ دی ہے یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے کیونکہ دنیا میں ترقی اور سربلندی کے لئے کسی نہ کسی نصب العین کا ہونا لازمی ہے آج کل مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں جتنی قومیں ہیں سب کی سب عشق وطن میں سرشار ہیں ہر قوم کا نعرہ یہی ہے ۱- میرا وطن میری وفاداری کا مرکز ہے۔ ۲- میرا وطن اگر غلطی پر گامزن ہوگا تو بھی میں اسی کا ساتھ دوں گا۔ ۳- میں اپنے وطن کے لئے جیونگا

اور اسی کے لئے مروں گا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان وطن پرستی تو کر نہیں سکتا کیونکہ اس کی بنیادی تعلیم اس کے دین کے خلاف ہے قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان اللہ کے لئے جیتا ہے اور اسی کے لئے مرتا ہے تو وہ وطن کے لئے کس طرح جی سکتا ہے اور کس طرح مر سکتا ہے۔

اب رہی ترقی کی دوسری اور آخری صورت یعنی خدا پرستی تو اس کے لئے مسلمان تیار نہیں ہے کیونکہ اس طریق حیات میں بلیک مارکیٹ ذخیرہ اندوزی اجارہ داری۔ سرمایہ داری۔ رشوت ستانی اور اقربا نوازی کا کوئی امکان نہیں ہے اور مسلمان ان "برکات عالیہ" سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا تو دنیا میں اس کی سربلندی کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اس لئے اقبال نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے"۔

تیسرا بند

اس بند میں اقبال نے اللہ سے یہ دعا کی ہے کہ مجھ کو اپنے محبوب (صلے اللہ علیہ وسلم) کی محبت عطا فرما۔ تاکہ میرے اندر بھی صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰ کا رنگ پیدا ہو سکے۔

اپنے حق میں دعا کرنے کے بعد انہوں نے ملت کے نوجوانوں کے لئے دعا کی ہے کہ میرے کلام کے ذریعہ سے ان کے اندر بھی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ پیدا کر دے۔

اس کے بعد قوم کے لئے دعا کرتے ہیں کہ میری قوم کی کشتی بھنور میں پھنس گئی ہے اس کو صحیح وسلامت ساحلِ مقصود تک پہونچادے نیز میری

قوم عمل سے بیگانہ ہوگئی ہے اس کے اندر حرکت (عمل) پیدا کردے۔

اے خدا! میری قوم کے افراد میں عشق و محبت کا وہی رنگ پیدا کردے جو میرے اندر موجود ہے۔ وہی بے خوابیاں۔ وہی اختر شماریاں۔ وہی بے تابیاں وہی آہ و زاریاں۔ وہی طرزِ نیاز۔ وہی کیفیتِ سوز و گداز۔ وہی آرزوئیں وہی جستجوئیں۔ وہی خیالات وہی افکار۔

چوتھا بند

اس بند اور آئندہ بند میں اقبال نے زندگی سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں انسان اس کائنات میں اپنی عقل کی مدد سے کسی شئے کی ماہیت[1] معلوم نہیں کرسکتا۔ (یہی وجہ ہے کہ حقیقت عقل کی دسترس سے بالاتر ہے) زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہے کہ اشیاء کے آثار۔ خواص اور افعال بیان کردے چنانچہ اقبال نے چوتھے اور پانچویں بند میں یہی فرض انجام دیا ہے۔

واضح ہو کہ آج تک کوئی سائنسداں یا فلسفی یہ نہیں بتا سکا کہ کائنات میں حیات کیسے کیونکر کس طرح اور کب نمودار ہوئی۔

ع راز ایں پردہ نہاں ست و نہاں خواہد بود

عقل انسانی حیات کی لِمؔ تو کیا بتا سکتی ہے وہ تو اس بات پر حیران ہے کہ اس کرۂ ارضی پر حیات نمودار ہی کیونکر ہوسکی؟ کیونکہ حالات تو اس کے

---

[1] حقیقت شئے اور ماہیت شئے میں منطقی فرق یہ ہے کہ ایک شئے جب تک متحقق نہ ہو یعنی خارج میں موجود نہ ہو اس وقت تک اس کی ماہیت میں گفتگو ہوتی ہے اور جب وہ موجود ہوجاتی ہے تو حقیقت بن جاتی ہے۔

متقاضی تھے کہ حیات نمودار نہ ہوتی۔ میں اس شرح میں ان مسائل کو تفصیل کے ساتھ نہیں لکھ سکتا۔ ناظرین خود سر جیمس جینز کی مشہور تصنیف ہے "پراسرار کائنات" کا مطالعہ کریں۔

فی الجملہ حیات نمودار ہو گئی اور قائلین ارتقاء کا نظریہ یہ ہے کہ ابتداء میں یہ بیچاری شعور اور ادراک دونوں سے عاری تھی رفتہ رفتہ اس کے اندر شعور پیدا ہوا پھر ایک مدت (غالباً ۲۵۰۰ لاکھ سال) کے بعد ادراک یا ذہن نمودار ہوا یعنی جب حیات ارتقائی منازل طے کر کے حضرت انسان تک پہونچی تو حیات میں یہ صفت بھی پیدا ہو گئی۔[1]

جب زندگی انسان میں نمودار ہوئی تو اس کی حالت میں انقلاب عظیم آچکا تھا اب وہ عناصر فطرت سے قدم قدم پر مفاہمت کرنے والے فریق کے بجائے اس پر حکومت کرنے کا اعلان کر رہی تھی۔ اِنِّی جَاعِلٌ فِی

---

[1] مرشد رومی نے بھی یہی خیال ظاہر فرمایا ہے کہ حیات نے ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ عزت کا مقام حاصل کیا ہے۔

آمده اوّل باقلیم جماد	وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد	وز جمادی یاد نادر دہاز نبرد
وز نباتی چوں بحیواں اوفتاد	نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں	خاصہ در وقت بہار ضمیر آں
ہمچو میلِ کودکاں با مادراں	سرِ میل خود نداند در لباں

ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت
تا شد اکنوں عاقل و دانا درفت

الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ۔)

انسان میں اگر زندگی مجہول ہستیوں کے قافلہ سے نکل کر فعّال ہستی بن گئی اور چونکہ انسان میں شعور ذہن اور ادراک ساری قوتیں پائی جاتی ہیں اس لئے زندگی کائنات کا مرکزی نقطہ قرار پاگئی یعنی انسان میں آ کر زندگی مرتبۂ کمال کو پہونچ گئی اسلئے انسان اشرف المخلوقات بن گیا۔

حیوانات اور انسان میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ حیوانات تقدیر کے پابند ہیں لیکن انسان صرف احکام الٰہی کا پابند ہے۔

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات

مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

(ضرب کلیم)

حیوانات اپنی تقدیر خود نہیں بنا سکتے وہ مجبور محض ہیں لیکن انسان اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہے اور اگر اسے ایک تقدیر راس نہ آئے تو وہ خدا سے دوسری تقدیر طلب کر سکتا ہے۔

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر

خواہ از حق حکم تقدیر دگر

(جاوید نامہ)

بقول اقبال "انفرادیت" زندگی کی خصوصیت ہے یعنی زندگی افراد کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ حیات مطلق یا عالمگیر زندگی جو مشخص نہ ہو ہمیں نظر نہیں آتی یہ کائنات افراد کے مجموعہ سے عبارت ہے۔

حیات کیا ہے؟ یہ فرد ہی کا دوسرا نام ہے اور فرد کی اعلیٰ ترین صورت جو اس وقت تک متحقق ہو سکی ہے خودی ہے جسے انگریزی میں (EGO) کہتے ہیں۔ مادہ حیات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن وہ کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ حیات کے حق میں مفید ہے کیونکہ اس کی بدولت

حیات کو اپنی مخفی قوتوں کے بروئے کار لانے کا موقع ملتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اس بند کا مطلب بیان کرتا ہوں۔
اقبالؔ کہتے ہیں کہ زندگی ہر وقت متحرک[1] ہے کیوں؟ اس لئے کہ ہر شئے میں ارتقائی عمل جاری ہے اور ارتقاء حرکت ہی کا دوسرا نام ہے اللہ نے زندگی اور کائنات دونوں کو ترقی پذیر بنایا ہے۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

جس طرح شعلہ میں دھواں پوشیدہ ہوتا ہے اسی طرح جسم زندگی کے اندر مخفی ہے اور اسی کی بدولت اُسے خارجی وجود حاصل ہوتا ہے۔

زندگی کی ماہیت چونکہ عناصر کائنات سے مختلف النوع ہے اس لئے اسے ان کی قید میں رہنا تو پسند نہیں ہے لیکن وہ ان کی جدوجہد کو اپنے حق میں مفید سمجھتی ہے کیونکہ جسم کے بغیر زندگی کسی قسم کی ترقی نہیں کرسکتی۔

زندگی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عناصر میں گرفتار بھی ہے اور ان سے بیزار بھی ہے اقبالؔ نے زندگی کو ثابت اور سیارہ دونوں قرار دیا ہے۔ چنانچہ گلشن راز جدید میں کہتے ہیں۔

---

[1] زمانہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ مقدار حرکت کا نام ہے اور زندگی ہر وقت متحرک ہے یعنی زمانہ اسی زندگی کی مقدارِ حرکت کا نام ہے اور اسی لئے زندگی اور زمانہ میں ایسا رابطہ پایا جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو کر سمجھ میں نہیں آسکتے اسی لئے اقبالؔ نے کہا ہے کہ "زندگی زمانہ سے ہے اور زمانہ زندگی ہے۔

زندگی دہر است و دہر از زندگی است

من اورا ثابتِ سیّار دیدم
من اورا نور دیدم نار دیدم

یعنی زندگی خواص متضاد کی حامل ہے وہ ثابت ہے بایں معنی کہ مشخص ہے اور سیّار ہے بایں طور کہ اس میں ارتقائی حرکت پائی جاتی ہے۔

حیات اپنے مظاہر کی بوقلمونی کے باوجود ازاول تاآخر ایک ہی دریا ہے جس میں دوئی یا کثرت نہیں ہے۔

لیکن یہ وحدتِ حیات کثرت مظاہر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

یہ کائنات جسے بت خانۂ شش جہات سے تعبیر کرسکتے ہیں حیات ہی کی بدولت وجود میں آئی ہے۔

عالم کو "سومنات" یعنی بت سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ انسان کی نگاہ عموماً مظاہر کائنات ہی میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔

نگہ الجھی ہوئی ہے رنگ و بو میں
خرد کھوئی گئی ہے چار سو میں

نوٹ :- سومناتھ۔ دراصل اس بت کا نام تھا جو کاٹھیاوار کے ایک مشہور تیرتھ موسومہ پٹن کے مندر میں نصب تھا یہ مندر سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا۔

زندگی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ تکرار کو پسند نہیں کرتی یعنی کوئی فرد دوسرے فرد سے مماثل نہیں ہے ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں سے جدا اور مغائر الوجود یقین کرتا ہے۔

زندگی مختلف افراد میں جلوہ گر ہے اس لئے اس میں انجمن کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے لیکن اس کے باوجود مادی نگاہ سے مخفی ہے یعنی خلوت نشیں

ہے۔

کائنات میں جس قدر اشیاء نظر آتی ہیں مثلاً اجرام فلکی معدنیات بیاباں گلستاں وحوش وطیور سب اسی زندگی کے مختلف مظاہر ہیں، وہ اسی کے کرشمے ہیں۔

پانچواں بند

اس بند میں بھی زندگی ہی کی صفات واضح کی ہیں کہتے ہیں کہ کائنات میں کوئی شئے ساکن یا جامد نہیں ہے۔ ہر شئے میں حرکت ہے خواہ محسوس ہو یا نہ ہو۔

وجود ہر آن نئی نئی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے اور ہر لحظہ نئی صورتوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

جو لوگ حقیقت سے آشنا نہیں ہیں وہ زندگی کو ایک راز سمجھتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے راز ہی ہے لیکن ارباب نظر جانتے ہیں کہ زندگی ذوق پرواز کا دوسرا نام ہے یعنی زندگی کی غایت یہ ہے کہ وہ ہر وقت ارتقائی منازل طے کرتی رہے۔

اقبال نے زندگی کی اسی حقیقت کو اپنے کلام میں مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

زندگی جز لذت پرواز نیست

آشیاں با فطرت او ساز نیست

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

زندگی جز قوتِ اعجاز نیست
ہر کسے دانندۂ ایں راز نیست

تیسری جگہ لکھتے ہیں۔

بر مقامِ خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

چوتھی جگہ لکھتے ہیں۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

ان اشعار میں اقبال نے زندگی کی شئونِ مختلفہ کو واضح کیا ہے۔

زندگی نے بہت سی پستیاں اور بلندیاں دیکھی ہیں یعنی زندگی بہت سی ادنیٰ منزلوں سے ترقی کر کے موجودہ درجہ تک پہونچتی ہے اور اس کی بقا کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ ہر وقت سفر میں رہتی ہے اور اگر ہم یہ کسی موقع پر کہہ دیتے ہیں کہ زندگی ساکن یا قائم ہے تو یہ الفاظ حقیقت کے بجائے مجاز پر دلالت کرتے ہیں۔

جیسے ہم مجازی طور پر کسی بہادر آدمی کو شیر کہہ دیتے ہیں اسی طرح کبھی کبھی زندگی کو بھی مجازاً ساکن کہہ دیتے ہیں جو حقیقت کے خلاف ہے۔

حضر، سفر کی ضد ہے اس کے معنی ہیں اپنے گھر یا شہر میں قیام کرنا۔

زندگی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ تصادم۔ ستیز۔ ہنگامہ اور آویزش میں لذت محسوس کرتی ہے۔ کیونکہ اس کا ارتقاء انہی باتوں پر موقوف ہے اگر وہ اپنے ماحول سے جنگ نہ کرتی اگر وہ غیر مناسب حالات سے متصادم نہ ہوتی اگر وہ مشکلات کا مقابلہ نہ کرتی تو ابھی تک حشرات الارض ہی کی شکل میں ہوتی

حضرت انسان میں اس کا جلوہ نظر نہ آتا۔

کائنات میں زندگی کی سب سے بڑی دشمن یا مخالف موت یا فنا تھی لیکن وہ اپنی مخفی طاقتوں کی بدولت اس پر غالب آگئی اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب زندگی پہلی مرتبہ ظاہر ہوئی تو پروٹوپلازم (protoplasm) کی شکل میں ظاہر ہوئی اس ابتدائی یا اولین جوہر حیات میں نہ حواس خمسہ ہیں نہ شعور ہے نہ ادراک ہے نہ نظام عصبی ہیں نہ استخوان ہیں نہ دوسرے اعضا ہیں اگر زندگی کے اندر طاقت مخفی نہ ہوتی تو وہ اپنے مخالفوں[1] پر غالب نہیں آسکتی تھی رفتہ رفتہ وہ ماحول پر غالب آئی اور چونکہ اس کے اندر مذاق دوئی یعنی نر اور مادہ کا امتیاز بھی موجود تھا اس لئے بذریعہ توالد و تناسل زوج سے فوج بن گئی۔

جو لوگ علم الحیات سے ناواقف ہیں وہ اسے بے ثبات تصور کرتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے اگر زندگی کی ادنیٰ صورت مٹ جاتی ہے تو اسی سے اعلیٰ صورت نمودار ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ زمانہ اسی زندگی کی حرکت کا دوسرا نام ہے۔

زندگی دہر است و دہر از زندگی است
لَاتَسُبُّوا الدَّهْرَ فرمانِ نبی است

---

[1] مخالفوں سے ناموافق حالات سردی گرمی۔ امراض۔ سیلاب اور درندے وغیرہ مراد ہیں۔

چھٹا بند

اس بند میں اقبال نے خودی کی حقیقت بیان کی ہے کہتے ہیں کہ انسانی خودی زندگی کی سب اعلیٰ صورت یا انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے اس بات کو انہوں نے بڑی عمدہ مثال سے سمجھایا ہے یعنی اگر زندگی کو تلوار فرض کیا جائے تو خودی اس کی دھار ہے اور جس طرح دھار کے بغیر تلوار بیکار ہے اسی طرح خودی نہ ہو تو زندگی بے معنیٰ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ خودی زندگی کی مخفی قوتوں کا نام ہے اگر کائنات کو انسان فرض کیا جائے تو خودی کو اس کے شعور سے تشبیہ دے سکتے ہیں انسان میں اگر شعور نہ ہو تو اس کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں اسی طرح اگر کائنات میں خودی کا وجود نہ ہو تو ساری کائنات بے مقصد ہو کر رہ جائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب خودی کے لئے ہے یعنی خودی اشرف المخلوقات ہے۔

انسانی خودی کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ۔ خودی کو ذات باری کا وجدانی طور پر یقین حاصل ہے اور اس یقین کی بدولت اس میں یہ خواہش موجزن ہے کہ وہ اس ذات غیر محدود کو اپنے اندر جذب کرے اسی لئے اس میں مستی کا رنگ پایا جاتا ہے۔

چونکہ اس مقصد عظمیٰ کے حصول کا ایک ہی طریقہ ہے جسے اصطلاح میں مراقبہ (گیان۔ دھیان) کہتے ہیں اور اس کے لئے تنہائی لازمی ہے اس لئے خودی قدرتی طور پر خلوت پسند ہے۔

عالم ناسوت کی تسخیر کے لئے انجمن (جلوت) بہت مفید ہے لیکن عالم لاہوت میں مقام حاصل کرنے کے لئے جلوت کے بجائے خلوت درکار ہے کیونکہ خودی مظاہر کائنات سے قطع تعلق کر کے اپنی توجہ صرف اپنی ذات پر مرکوز کرتی ہے اور یہ بات جلوت (انجمن) میں ممکن ہی نہیں ہے۔ عالم لاہوت کی سیر میں خودی (سالک) اگر اپنے سوا غیر کو بھی دیکھے تو وہاں نہیں پہونچ سکتی۔

ع ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

یعنی اپنے کو دیکھنا چاہتے ہو تو غیر کو مت دیکھو خودی چونکہ بذات خود ایک نقطۂ نوری ہے اس لئے اس کی نظر میں تاریکی اور روشنی دونوں برابر ہیں یعنی خودی اگر اپنے مرتبۂ کمال کو پہونچ جائے تو تاریکی میں بھی دیکھ سکتی ہے غیر مادی اس کے حق میں پردہ یا حجاب نہیں بن سکتے[1]

اگرچہ وہ عناصر کی قید میں ہے اور اس کا ظہور بھی انسانی اجسام میں ہوتا ہے لیکن وہ عناصر مادی سے پاک اور ورار الورا ہے اسی لئے اگر وہ مرتبۂ کمال کو پہونچ جائے (اور اس کی صورت جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں عشق رسولؐ ہے) تو پھر غیر محدود ہو جاتی ہے۔

خودی زمانہ کے ساتھ ہم آغوش ہے زمانہ کا تصوّر خودی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ خودی نہ ہوتی تو زمانہ کا تحقق کون کرتا؟ اور خودی کا تصور زمانہ

---

[1] اشارہ ہے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کہ "میں پس پشت بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح تم سامنے دیکھتے ہو" اسی مقام کو حاصل کرنے کے لئے سالک اتباع رسول کرتا ہے۔

سے علیحدہ نہیں دونوں لازم و ملزوم۔ خودی اگرچہ مکان و زمان کی قید میں رہ کر ترقی کرتی ہے اور جب نقطۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے تو زمان و مکان پر حکمران ہو جاتی ہے کیونکہ خالق خودی نے اس کے اندر یہ صلاحیت ودیعت کر دی ہے۔

جب خودی مرتبۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے اور اس کے لئے اسے بڑے مجاہدے کرنے پڑتے ہیں تو پھر اس میں یہ قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی ضرب سے پتھر کو ریگ رواں بنا سکتی ہے اس کی استقامت اور استحکام کا راز اس کے مسلسل سفر کی حالت میں مضمر ہے اگر وہ ساکن ہو جائے تو وہ فنا ہو جائے گی۔

ع   ہستم اگر می روم گر نروم نیستم

خودی شئون مختلفہ کی حامل ہے کہیں چاند کی کرن کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ کہیں شرار سنگ کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور لطف یہ ہے کہ اشکال گوناگوں اور صور بوقلموں کے باوجود بذات خود صورت سے پاک اور معرّا ہے کیوں؟ اس لئے کہ غیر مادی ہے۔

تشریح:۔ صورت تو مادہ کا خاصہ ہے جیسے ضحک انسان کا خاصہ ہے اس لئے دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ مادہ صورت کے بغیر موجود نہیں ہو سکتا اور صورت مادہ کے بغیر نہیں پائی جا سکتی۔ خودی چونکہ غیر مادی ہے اس لئے بذات خود صورت سے پاک ہے۔

ابتدائے آفرینش سے خودی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے اور انجام کار خاک آدم میں جلوہ گر ہوتی ہے لیکن خاک سے پیوند نہیں رکھتی خاک (جسم) میں ہے ضرور۔ لیکن خاکی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اسے نہ ناپ سکتے ہیں

نہ تول سکتے ہیں اور نہ حواس خمسہ سے محسوس کر سکتے ہیں۔

جس طرح اس بند کا پہلا شعر بے مثل ہے اسی طرح آخری شعر بھی بے نظیر ہے اس شعر میں اقبال نے خودی کا سب سے بڑا راز آشکار کیا ہے یعنی خودی کا نشیمن (مقام) انسان کے دل میں ہے چونکہ یہ بات عقل میں نہیں آسکتی کہ خودی جو اس قدر غیر محدود طاقتوں کی مالک ہے وہ دل میں کس طرح سما سکتی ہے اس لئے اقبال نے بڑی دلکش تشبیہ سے سمجھایا ہے کہ اپنی آنکھ کے تل پر غور کرو! اتنا بڑا آسمان اس ننھے سے تل میں کس طرح نظر آجاتا ہے

واضح ہو کہ عالم مادی میں آنکھ سب سے زیادہ عجیب و غریب بلکہ محیّر العقول آلہ یا کرشمۂ قدرت ہے کوئی انسان آج تک اس راز کو نہیں سمجھ سکا کہ آنکھ کے تل میں تصویر اتر آتی ہے اسے دماغ کس طرح سمجھتا ہے کہ یہ فلاں چیز ہے اتنا تو معلوم ہے کہ دماغ تصاویر کو سمجھتا ہے — جسے (Interpretation) کہتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کس طرح سمجھتا ہے، اس کا جواب کوئی نہیں دے سکتا۔

اسی طرح خودی کا نشیمن دل میں ہے دل سے مراد مضغۂ گوشت نہیں ہے بلکہ وہ لطیفۂ نورانی جو دل سے تعلق ہے اب اگر کسی کو اس کے سمجھنے کی آرزو ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ

ع اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

•

ساتواں بند

اس بند میں اقبالؔ نے پہلے چار شعروں میں خودی کی نگہبانی کی تلقین کی ہے اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ جب خودی عشق رسول کی بدولت مرتبہ کمال کو پہونچ جاتی ہے تو اس میں محیر العقول صفات پیدا ہو جاتی ہے اور وہ زمان و مکان پر حکمراں ہو جاتی ہے ۔

واضح ہو کہ غایت تخلیق خودی یہ ہے کہ وہ خلافت الہیہ کے مرتبہ پر فائز ہو جائے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ بادشاہ کے نائب میں بادشاہ کے اختیارات اور اقتدار کا کچھ نہ کچھ رنگ لازمی طور پر موجود ہونا چاہئے نائب اگر مسلوب الاختیار یا دوسروں کی طرح عاجز اور درماندہ ہوگا تو وہ نیابت کیا کرے گا ۔

چونکہ اللہ کی صفات میں سے ایک نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے بلکہ ان پر حکمراں ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے بار بار مسلمانوں کو یہ تلقین کی ہے کہ اگر تم خلافت الہیہ کے مرتبہ پر فائز ہونا چاہتے ہو تو پہلے اپنے اندر خلافت کی اہلیت پیدا کرو یعنی کسی مرشد کامل کی صحبت میں رہ کر اپنی خودی کو زمان و مکان کی قیود سے بالاتر کر لو اس کے بغیر خلافت الہیہ کا حصول عقلاً اور شرعاً دونوں طرح محال ہے ۔

نوٹ :۔ یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف نے ہمیشہ اپنی قوم کے افراد کو اقبالؔ کے اس اہم پیغام کی طرف متوجہ کیا ہے ۔

زندگی جہد است و استحقاق نیست
جز بعلم أنفس و آفاق نیست

یعنی اگر مسلمان دنیا میں سربلندی کے آرزومند ہیں تو انہیں اس کے حصول کی اولین اور لازمی شرط کو پورا کرنا چاہیئے اور وہ شرط یہ ہے کہ وہ علم النفس وآفاق میں ید طولیٰ حاصل کریں محض خوش آئند نعروں اور خوشنما جلوسوں اور دل خوش کن جلسوں سے کوئی قوم اس عالم اسباب میں سربلندی یعنی حکمرانی کی دولت حاصل نہیں کر سکتی۔

دوسری بات جس کی طرف میں نے ہمیشہ قوم کو متوجہ کیا ہے۔ یہ ہے کہ اگر وہ دنیا کے کسی خطے میں اسلامی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں تو اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ پہلے خود مسلمان بنیں کیونکہ اسلامی حکومت جب ۲ھ میں قائم ہوئی تھی تو اس کے قائم کرنے والے پہلے مسلمان بن چکے تھے بلکہ انہوں نے تو اپنے ماحول کو بھی مشرف باسلام کر دیا تھا اس لئے حکومت الٰہیہ جب کبھی جہاں کہیں قائم ہوگی اس کے قائم کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو پہلے مسلمان بن چکے ہوں گے۔ غیر مسلم۔ نیم مسلم یا منافق مسلم اسلامی حکومت ہرگز قائم نہیں کر سکتے اگر مسلمانوں کو اس بات میں شک ہو تو تجربہ کر کے دیکھ لیں۔

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیان
تا سیہ روئے شود ہر کہ در وغش باشد

اقبالؔ کہتے ہیں کہ جو شخص اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہونچانا چاہتا ہے اس کے لئے پہلی شرط اکل حلال۔ یعنی ناجائز کمائی کا ایک لقمہ بھی اگر حلق کے نیچے اتر گیا تو خودی پر موت طاری ہو جائے گی اور جب ایک چیز مردہ ہوگئی تو اس کی ترقی کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ جس طرح زہر کھانے سے آدمی مر جاتا ہے اسی طرح لقمۂ حرام کھانے سے خودی کی موت واقع ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ

کے فلسفہ میں اور اقبال کا فلسفہ اسلام سے علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے اکل حلال اور صدق مقال کی اہمیت اور ضرورت کو بڑی شد و مد کے ساتھ واضح کیا گیا ہے صرف ایک شعر لکھتا ہوں۔

سرّ دیں۔ صدقِ مقال۔ اکلِ حلال
جلوت و خلوت تماشائے جمال

اس شعر کی وضاحت تو شرح جاوید نامہ میں پیش کروں گا یہاں صرف اتنا لکھتا ہوں کہ صدق مقال اور اکل حلال یہ وہ خوبیاں ہیں جن میں دین اسلام کی حقیقت پوشیدہ ہے یعنی جب تک ایک انسان ان دونوں باتوں پر عامل نہ ہو وہ مسلمان نہیں بن سکتا وہ بوعلی سینا بن سکتا ہے۔ لارڈ بیکن بن سکتا ہے تیمور بن سکتا ہے شیکسپیئر بن سکتا ہے لیکن مسلمان نہیں بن سکتا ہے۔

آج بفضل خدا سب کچھ موجود ہے لیکن مسلمانوں میں اسلام کی روح نظر نہیں آتی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ صدق مقال اور اکل حلال یہ دونوں باتیں مفقود ہیں اور منطق میں یہ اصول مسلم ہے کہ اذا فات الشرط فات المشروط۔ اسلام مشروط ہے اکل حلال شرط ہے جب شرط فوت ہوگئی تو مشروط کیسے موجود ہو سکتا ہے۔

خودی کے استحکام کی دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمان غیر اللہ کی غلامی نہ کرے ایازی (غلامی) بھی خودی کے حق میں پیام موت ہے مسلمان کو لازم ہے کہ صرف اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے تاکہ دوسروں کے سامنے سجدہ کرنے سے نجات مل جائے۔ بزرگان دین کی قبروں پر سجدہ ریز ہونا اور ان سے مدد طلب کرنا ہے شرک ہے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ان دو شعروں کی وضاحت کے بعد اب اقبال یہ بتاتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک پہونچادے تو کیا انقلاب پیدا ہو جائیگا کہتے ہیں کہ اے مخاطب! یہ کائنات تیری خودی کی پہلی منزل ہے اسے اپنی مستقل اقامت گاہ مت سمجھ۔ یہ دنیا تیری خادم ہے اسے مقصود مت قرار دے۔ تیری اصل مادی نہیں ہے تو اس دنیا سے نہیں ہے ہاں یہ دنیا ضرور تجھ سے ہے یعنی تیرے لئے پیدا کی گئی ہے۔

اسلام کی رو سے حقائق سہ گانہ یعنی خدا۔ انسان اور کائنات میں یہ ربط ہے کہ:۔

۱۔ خدا۔ خالق انسان و کائنات ہے۔
۲۔ انسان خدا کے لئے ہے یعنی اس کا خادم ہے۔
۳۔ کائنات۔ انسان کے لئے ہے یعنی اس کی خادم ہے۔

اسی لئے اقبال نے انسان کو مطلع کیا ہے کہ۔

ع جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ کائنات (زن۔ زر یا زمین) انسان کا مقصد حیات نہیں ہے تو لامحالہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر اس کا مقصد کیا ہے عام طور سے تو لوگ یہی سمجھتے ہیں اور اس زمانہ میں اشتراکی ادبا اسی بات کی تبلیغ کر رہے ہیں کہ مقصد حیات انسانی یا شکم (زر و زمین) ہے یا جنس (زن)

اقبال کہتے ہیں کہ انسان کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ زمان و مکان

کے طلسم کو باطل کرکے کائنات کو مسخر کرے۔

لیکن جو شخص اپنے پیٹ کو اپنا مقصد حیات سمجھتا ہے وہ اس طلسم کو کیسے باطل کرسکتا ہے کہیں بتوں کے پجاری بھی بت شکنی کرسکتے ہیں؟ یا کہیں اور لین تو شکم کو اپنا "معبود" سمجھتے ہیں وہ بھلا کب اس کے احکام سے سرتابی کرسکتے ہیں؟ جن لوگوں کا مقصود حیات شکم پری اور شکم پروری ہے انہیں صدق مقال اور اکل حلال اور دیگر صفات حسنہ سے کیا تعلق؟

ع جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا نسبت۔

اے مخاطب! یہ کائنات اس لئے بنائی گئی ہے کہ تو اسے مسخر کرے اور اس کی تسخیر کے بعد دوسرے جہان بھی تیری یلغار کے منتظر ہیں۔

ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس کائنات میں "گردش روزگار" یعنی اختلاف لیل و نہار اور تغیرات موسمی عنصری اور تمام مظاہر کونی مثلاً تصریف ریاح ابر و باد و باراں، موسم گل فصل خزاں و طلوع و غروب۔ اجرام فلکی غرض کہ اس نظام شمسی کی غایت یہ ہے کہ تیری خودی کی مخفی قوتیں بروئے کار آسکیں اور تو اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہوکر اپنا مقام حاصل کرسکے۔

اے مخاطب! تو خلیفۃ اللہ علی الارض ہے۔ تو نائب خدا ہے تو عناصر کائنات پر حکمراں ہے تو فاتح عالم خواب و زشت ہے۔ تو اشرف المخلوقات ہے۔

اے مخاطب! میں لفظوں کے ذریعہ سے تجھ پر تیری حقیقت واضح نہیں کرسکتا کیونکہ تیری حقیقت الفاظ کی متحمل نہیں ہوسکتی اور یہ بات بھی ہے کہ تیری حقیقت غیر مادی ہے اور میرے الفاظ بہرحال مادی ہیں لیں

وہ تیری حقیقت کی صراحت نہیں کر سکتے۔[1]

نوٹ:۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو عشق رسول میں فنا ہو کر (اسی کو اپنے من میں ڈوبنا کہتے ہیں) خود اپنی حقیقت کا مشاہدہ کر لے عیاں راچہ بیاں "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"؟ اسی حقیقت کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے۔

بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است

لیکن "ذات" کو بے پردہ دیکھنے کے لئے پہلے اپنے آپ کو دیکھنا لازمی ہے اور جب انسان اپنے آپ کو دیکھے گا تو اس وقت اسے یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ میں تو اسی کو دیکھ رہا ہوں۔ ع او درمن و من در وے چوں بو بگلاب اند
عاشق جب تک اپنی خودی سے آگاہ نہیں ہوتا اس وقت تک تلاش محبوب میں سرگرداں رہتا ہے لیکن جب وہ اپنی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جسے میں صحرا اور بیابان میں ڈھونڈ رہا تھا وہ تو خود میرے ہی اندر پوشیدہ[2]

---

[1] اقبال نے سعدیؒ کے اس شہرۂ آفاق شعر کے پردہ میں اپنا مطلب بڑی عمدگی کے ساتھ واضح کر دیا ہے میں اس شعر کا مطلب بیان کر کے ناظرین کے لطف میں کمی پیدا کرنا نہیں چاہتا اس لئے مرشد رومی کے اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

سرّ پنہاں ست اندر زیر و بم
فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

[2] نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۔ ہم انسان سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

تھا اس وقت سالک بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ۔

ع   بفضلِ مرشد کھلا یہ عقدہ کہ یار مجھ میں میں یار میں ہوں۔

یہی مطلب ہے اس مقولہ کا کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ. میری رائے میں اس سے بلند تر کوئی فلسفہ نہیں ہے اور یہی وہ صداقت جس سے بالاتر کوئی صداقت نہیں ہے۔ اسی صداقت کو اقبال نے ارمغان حجاز میں یوں بیان کیا ہے۔

چناں مومن کند ایں راز را فاش
ز لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ دریاب

اس راز سے مراد یہ ہے کہ خدا اور خودی میں کیا علاقہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ دوسرے کا وجود ہی کہاں پہلے جو علاقہ کا سوال پیدا ہو؟ اسی لئے تو غالب عالم بے خودی میں خدا سے سوال کرتے ہیں۔

جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

حضرت علامہ نے اس جگہ پڑھنے والے کے اندر اشتیاق اور تجسس کا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے وضاحت سے اعتراض کیا ہے ورنہ ارمغان حجاز میں جوان کی حیات ارضی کے آخری چند ماہ کا سرمایۂ افکار ہے انہوں نے اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیا ہے تین رباعیات درج ذیل کرتا ہوں۔

خودی را از وجودِ حق وجودے   خودی را از نمودِ حق نمودے
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر   کجا بودے اگر دریا نبودے

یعنی جس طرح موتی کا وجود دریا سے علیحدہ ہو کر متحقق نہیں ہو سکتا

اسی طرح خودی بھی خدا ہی کی بدولت موجود ہے اگر دریا نہ ہوتا تو موتی کیسے وجود میں آتا۔؟

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز   بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی   خودی را فاش تر دیدن بیاموز

اگر خدا کو دیکھنا چاہتے ہو اور مقصد حیات دیدار کے علاوہ کچھ نہیں ہے تو خودی کو دیکھ لو۔

چونکہ اس ایمائی طرز بیان سے شاعر کی تشفی نہیں ہوئی اس لئے وہ صاف لفظوں میں کہتا ہے۔

کرا جوئی! چرا در پیچ و تابی   کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی   تلاش خود کنی جز او نیابی

یعنی اے انسان! تو کسے ڈھونڈ رہا ہے؟ اور کس لئے اس قدر پریشان ہے؟ جسے تو ڈھونڈ رہا ہے وہ تو ہر جگہ عیاں ہے اس لئے اگر تجھے ڈھونڈنا ہی ہے تو اپنے کو ڈھونڈ کیونکہ تو یعنی تیری خودی تجھ سے پوشیدہ ہے۔

اگر تو اس کی تلاش کرے گا تو انجام کار اپنے کو پا جائے گا اور اگر اپنی جستجو کریگا تو آخر کار وہ تجھے مل جائے گا یہ بات کیا ہے؟ صرف اتنی کہ دوسرا موجود ہی کہاں ہے جو دوئی متحقق ہو۔

میں نے اس مسئلہ کو قدرے وضاحت سے اس لئے بیان کیا ہے کہ اقبال کے بہت کم نقاد اور مداح اور شیدائی اس بات سے واقف ہیں کہ دراصل ان کا مسلک کیا تھا شاید اسی لئے مرنے سے کچھ دنوں پہلے انہوں نے یہ شعر کہا تھا

دبیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

زمانہ

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہو گا یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا جدا رسم و راہ میری
کسی کا راکب کسی کا مرکب کسی کو عبرت کا تازیانہ
نہ تھا اگر تو شریکِ محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں کسی کی خاطر مئے شبانہ
مرے خم و پیچ کو نجومی کی آنکھ پہچانتی نہیں ہے
ہدف سے بیگانہ تیر اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ
شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ
ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر؟ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ
جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دئے ہیں اندازِ خسروانہ

●

اس نظم میں پہلے تو اقبالؔ نے "زمانہ" کی صفات خود اسی کی زبان سے بیان کی ہیں۔ اس کے بعد عصرِ حاضر پر سیاسی زاویۂ نگاہ سے تبصرہ کیا ہے اور اس ضمن میں بعض پیشین گوئیاں بھی کی ہیں۔

واضح ہو کہ اقبالؔ کے فلسفہ میں زمان کے دو تصور پائے جاتے ہیں ایک تو زمان کا باطنی پہلو ہے جو انسان کی جان میں پوشیدہ ہے اور اسی لئے اس کو صرف عارف ہی کی نظر دیکھ سکتی ہے اس کا اصطلاحی نام زمان حقیقی یا مرورِ محض (Pure Duration) ہے۔ اقبالؔ نے اس بند میں جو پیامِ مشرق سے نقل کرتا ہوں زمان کے اسی رخ کو واضح کیا ہے۔

چوں روحِ رواں پاکم از چند و چگونِ تو — تو رازِ درونِ من من رازِ درونِ تو
از جانِ تو پیدائم در جانِ تو پنہانم

زمان حقیقی انسان سے کہتا ہے کہ میں بھی روح کی طرح مجرد عن المادہ ہوں یعنی نہ مقولۂ کیف سے ہوں نہ مقولۂ کم سے۔ میں دراصل تیرے باطن کی حقیقت ہوں اور تو میرے باطن کی حقیقت ہے یعنی تو اور میں دونوں متحد الحقیقت ہیں۔ میں تیری جان ہی سے پیدا ہوا ہوں (اگر تو نہ ہوتا تو میں (زمان) بھی نہ ہوتا۔ اس لئے تیری جان ہی میں پوشیدہ ہوں جس طرح موتی صدف میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں پنہاں ہوتا ہے پس اگر تو مجھے سمجھنا چاہتا ہے میری حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنی حقیقت پر غور کر اپنے نفس کی معرفت حاصل کر

ع   غوطہ در دلِ زن زن کہ بینی رازِ وقت

زمان کا دوسرا پہلو خارجی ہے جس کا تصور ہر شخص کر سکتا ہے یعنی سلسلۂ روز و شب جو نقاشِ حادث اور مصورِ واقعات ہے اسے اصطلاح میں زمانِ مسلسل یا تسلسلی وقت (serial time) کہتے ہیں اس کو سمجھنے کے لئے غوطہ زنی یا غواصی کی ضرورت نہیں ہے دہقان کی جاہل لڑکی بھی جانتی ہے کہ شام ہو گئی اب مجھے اپنی بکریوں کو لے کر گھر واپس جانا چاہئے اقبال نے اس شعر میں زمان کے اسی پہلو کو واضح کیا ہے۔

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دنوں کے الٹ پھیر کا نام ہے

اقبال نے زمان و مکان پر اس قدر لکھا ہے کہ اگر اس کا استقصا کیا جائے تو بجائے خود ایک مبسوط کتاب مرتب ہو سکتی ہے اسی لئے میں اس مختصر تمہید پر اکتفا کرتا ہوں۔

زمانہ انسان سے خطاب کرتا ہے کہ ماضی کا اعادہ ممکن نہیں ہے جو زمانہ کل موجود تھا وہ آج موجود نہیں ہے اور جو زمانہ اس وقت موجود ہے وہ کل موجود نہ ہوگا یہی وہ نکتہ ہے جسے ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے تسلسلی زمان کی حیثیت یہی ہے کہ وہ دریا کے پانی کی طرح مسلسل بہتا رہتا ہے اسی کی حقیقت کو کسی مثال سے سمجھنا مقصود ہو تو کسی پل پر کھڑے ہو جاؤ اور اس پانی پر غور کرو جو اس کے نیچے سے مسلسل گذرتا چلا جا رہا ہے بس یہی کیفیت سلسلۂ روز و شب کی ہے دونوں کو ایک آن یا ایک لمحہ کے لئے بھی قرار نہیں ہے کیونکہ اگر زمانہ کو قرار آ جائے تو یہ ساری کائنات فنا ہو جائے۔

پس جب حقیقت حال یہ ہے کہ دوش ماضی یعنی افسانہ کی شکل میں مبدل

ہوتا جاتا ہے اس لئے اہل زمانہ جو عقلمند ہیں وہ ماضی پرستی کے بجائے اس زمانہ کے مشتاق و منتظر رہتے ہیں جس کا ظہور عنقریب ہوا چاہتا ہے یعنی زمانہ حال سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرتے رہتے ہیں کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو مطابق حال کے مطابق نہیں بنائیں گے تو زمانہ اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے آپ کو مطابق بنالیں وہ انہیں سوتا ہوا چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا اور وہ بدبخت پیچھے رہ جائیں گے اسی حقیقت کبریٰ کو کسی شاعر نے کیسے دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔

رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

نوٹ:۔ میں اپنے ناظرین کے اوقات عزیز کو تلخ کرنا نہیں چاہتا لیکن اس جگہ قلم پر قابو نہیں رہا اس لئے یہ لکھتا ہوں کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کوتاہی میری رائے میں یہی ہے کہ وہ یا تو ماضی کی یاد میں محو رہتے ہیں یا مستقبل کا خوش آئندہ سپنا دیکھتے رہتے ہیں بہرحال زمانہ حال کے اقتضاء سے بکلی غافل رہتے ہیں۔ سچ کہا ہے شیخ سعدی نے۔

آنچہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از ہزار رسوائی

زمانہ کہتا ہے کہ سلسلۂ روز و شب جس میں حوادث و واقعات عالم رونما ہوتے رہتے ہیں میری ذات کا خارجی پہلو ہے یہ روز و شب جن کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنی طویل تسبیح کے دانوں کا شمار کر رہا ہو تم میری رات کو صراحی سے تشبیہ دے سکتے ہو اور یہ حادثات و واقعات وہ بوندیں ہیں جو اس صراحی سے ٹپک رہی ہیں۔

کائنات میں ہر فرد مجھ سے آشنا ہے اور میں ہر فرد سے آشنا ہوں کون ہے جو ہر وقت میرا تذکرہ نہیں کرتا؟ کون ہے جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز نہیں رکھتا؟ کون ہے جو طولِ عمر کا آرزومند نہیں ہے؟ لیکن میرا طرزِ عمل ہر شخص کے ساتھ مختلف ہے کسی کو عزت دیتا ہوں کسی کو ذلیل کرتا ہوں کسی کو مشہور کرتا ہوں کسی کو گمنام کرتا ہوں کسی کو بڑھاتا ہوں کسی کو گھٹاتا ہوں کسی کو ہاتھی پر چڑھاتا ہوں کسی کو گدھے پر بٹھاتا ہوں کسی پر حکومت کرتا ہوں کسی کی غلامی کرتا ہوں۔

اگر کوئی شخص میری محفل میں شریک نہ ہو تو وہ میرے فیوضات کی شرح سے یقیناً محروم رہے گا کیونکہ میرا دستور یہ ہے کہ جو حاضرِ محفل ہوتا ہے اسی کو جام تے عطا کرتا ہوں میری محفل میں۔ غائب کا کوئی حصہ نہیں ہے اقبال نے اس شعر میں اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کیا ہے کہ زمانہ کسی کی رعایت نہیں کرتا جو قوم مستقبل میں سربلندی کے لئے آج تیاری نہیں (۲ ال ۵۵) کرتی خواہ وہ کتنی ہی طویل تسبیح کیوں نہ ہو کبھی مستقبل میں سربلندی حاصل نہیں کرسکتی اسی لئے تو اقبال نے اپنے نظامِ افکار میں امروز کو اس قدر اہمیت دی ہے۔ ایک شعر لکھتا ہوں۔

کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

ناممکن ہے کہ مستقبل کے لئے تیاری کئے بغیر کوئی قوم دنیا میں سربلندی حاصل کر سکے مثلاً امریکہ آج ۱۹۵۱ء میں ساری دنیا پر حکمراں ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس گھڑی کے لئے نصف صدی سے تیاری کرتا رہا ہے یعنی اس نے ۱۹۵۱ء کے لئے ۱۹۰۱ء میں تیاری شروع کردی تھی۔

جو قومیں روبہ زوال ہوتی ہیں وہ وقت کے وقت بھی تیاری نہیں کرتیں مثلاً جب بعض لوگوں نے محمد شاہ کو مطلع کیا کہ نادر شاہ اب کرنال پہونچ چکا ہے تو اس وقت بھی اس عقل مند بادشاہ نے یہی جواب دیا کہ ابھی تو بہت دور ہے آج کی رات نواب بائی سے ایک خیال اور سن لوں تو بہتر ہے کل تیاری کر لیں گے تاریخ شاہد ہے کہ وہ کل آج تک نہیں آئی بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ محمد شاہ آج بھی اپنی لحد میں بے کل ہوگا سچ ہے اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو لال قلعہ پر نصاریٰ کا علم کیسے لہراتا۔

زمانہ کہتا ہے کہ میرا خارجی پہلو تو ہر شخص کے سامنے ہے اس لئے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے لیکن میری حقیقت سے عوام تو کیا نجومی (علمائے طبیعات) بھی واقف نہیں ہوسکتے اس کے سمجھنے کے لئے "معرفت" درکار ہے یعنی میری اصلیت سے وہی شخص آگاہ ہوسکتا ہے جو اپنی خودی سے آگاہ ہو۔

یہاں زمانہ کے دونوں پہلوؤں کی وضاحت ختم ہوجاتی ہے آئندہ اشعار میں اقبال نے زمانہ کی زبان سے دنیا کو انقلاب کا پیغام دیا ہے یعنی اقبال کی طبع وقار نے اس نظم میں زمانہ کے فلسفیانہ مفہوم کو انقلابی پیغام سے بڑی خوبی کے ساتھ مربوط کر دیا ہے جس میں ان کے شاعرانہ آرٹ کا کمال نظر آتا ہے۔

زمانہ اپنی گفتگو کا پہلو بدل کر کہتا ہے کہ مغربی افق پر جو یہ سرخی نظر آتی ہے یہ شفق نہیں ہے بلکہ خون ناحق کی ندیاں ہیں جو تیزی کے ساتھ بہہ رہی ہیں یعنی دنیا میں عنقریب لادین اور سرمایہ دارانہ تہذیب کی بدولت بڑی مہیب جنگ ہونے والی ہے اور اس کے لئے طلوع فردا کا انتظار کرو۔ دوش اور امروز تو دونوں فسانہ ہیں دوش تو گذر چکا ہے اور امروز گذرنے والا ہے فردا یعنی مستقبل قریب میں یہ حادثہ رونما ہونے والا ہے۔

دوسرے شعر میں زمانہ اس کی وجہ بیان کرتا ہے یعنی ایسا کیوں ہوگا اس لئے کہ فطرت کی مخفی طاقتوں کو آشکارا کر دیا ہے لیکن یہی طاقتیں انسان کے حق میں وبالِ جان بھی بن گئی ہیں کیوں؟ اس لئے کہ انسان (یورپ کی اقوام) نے خدا کے بجائے مادہ کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور جب کسی فرد یا قوم کا مطمحِ نظر مادّی یا مادہ پرستانہ ہو جاتا ہے تو وہ قوم بنی آدم کے حق میں ایک خونخوار درندہ بن جاتی ہے جب دنیا ہی مقصدِ حیات ہو جائے تو خیر و شر کا امتیاز بقول لینن[1] افیون کا مرادف بن جاتا ہے اور جب یہ امتیاز ایک دفعہ کسی قوم کے دل سے مٹ جائے تو پھر دنیا کی کونسی طاقت اس کو ہمدردی غمگساری، نکوکاری یا عدل و انصاف کی طرف راغب کر سکتی ہے؟

زمانہ متنبہ کرتا ہے کہ اگرچہ اقوامِ مغرب نے عناصرِ فطرت کو مسخر کر لیا ہے یعنی آج ہوائیں بھی انہی کے قبضہ میں ہیں اور فضاؤں پر بھی انہی کا اقتدار ہے سمندروں پر بھی انہی کی حکومت ہے اور جہاز بھی انہیں کے تابع فرمان ہیں اس کے باوجود ان کی زندگی کے دریا میں ایک "بھنور" پڑ گیا ہے اور وہ گرداب ایسا عقدۂ لاینحل ہے جس نے ان کے سکونِ قلب کو زائل کر دیا ہے

---

[1] ہند و پاک کے ترقی پسندوں اور اشتراکیوں کے مذہبی پیشوا اور سیاسی امام جناب لینن علیہ ما علیہ نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے کہ میری رائے میں مذہب بنی آدم کے حق میں بمنزلۂ افیون ہے یہی وجہ ہے کہ ہر ترقی پسند مذہب کی تحقیر و تذلیل کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے بلکہ اشتراکیوں کے نزدیک ترقی پسندی کا معیار ہی یہ ہے کہ آرٹ اور ادب کے ذریعہ سے انسانوں کو مذہب سے متنفر کیا جائے۔

(ہر قوم سامان جنگ کی فراہمی میں مستغرق ہے)

یہ بھنور کیا ہے؟ یہ مادہ پرست مغربی اقوام کا جذبۂ مسابقت ہے اور ہر قوم دوسری قوم کو نیچا دکھانے کی فکر میں دبلی ہو رہی ہے زمانہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ۔

گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر
بھنور ہے تقدیر کا بہانہ

یعنی بھنور نہیں ہے بلکہ تقدیر یا مشیت ایزدی نے ان قوموں کو عاد و ثمود کی طرح تباہ کرنے کا ایک سبب بنا دیا ہے پس کسی انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اللہ کے عائد کردہ عذاب کو دور کر سکے۔

عنقریب یہ باطل پرست قومیں صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں گی۔ اور جو شخص صاحب نظر ہے وہ بآسانی دیکھ سکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام (عالم پیر) پر حالت نزع طاری ہو چکی ہے اور اس کی خاکستر سے ایک نئی دنیا پیدا ہو گی جس میں نہ زمیندار ہوں گے نہ جاگیردارانہ نواب ہوں گے نہ سرمایہ دار بلکہ سب انسان ہوں گے اور یکساں فارغ البال اور شادمان۔

یہ "عالم پیر" اسی لائق ہے کہ دنیا سے مٹ جائے کیونکہ اسے فرنگی قمار بازوں نے قمار خانہ بنا دیا ہے اور کوئی شریف آدمی قمار خانہ میں یا قمار بازوں کی صحبت میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔

نوٹ:۔ قمار بازی میں اس کے سوا اور کیا خرابی ہے کہ

ا ۔ بغیر محنت کئے روزی مل جاتی ہے۔ اور

ب ۔ انسان کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔

کیا انگریزوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوستان جنت نشان کو

ایک عظیم الشان قمار خانہ نہیں بنا دیا؟ کیا انہوں نے چھ سو سے زیادہ ایسی ریاستیں قائم نہیں کر دیں جن کے رئیسوں کو بغیر محنت عیاشی کے لئے زن۔ زر۔ زمین۔ تینوں بافراط فراوانی کے ساتھ حاصل تھیں۔؟

کیا انہوں نے خطاب اور جاگیروں کے ذریعہ سے غلاموں کا جم غفیر نہیں خریدا؟ کیا انہوں نے علمائے دین اور حامیان شرع متین کو ذلیل و خوار کرنے کی ہر ممکن کوشش نہیں کی؟ اور ان کے مقابلہ میں جہلا کو آفتاب اور ماہتاب کا ہم پلہ نہیں بنا دیا۔

اقبال نے یہ ساری نظم زمانہ کی زبان سے ادا کی ہے لیکن وفور جذبات سے مجبور ہو کر آخری شعر میں بے نقاب ہو گئے ہیں اور اعتراف کر لیا کہ زمانہ کے پردہ میں۔ میں خود بول رہا ہوں چنانچہ کہتے ہیں کہ اگرچہ عصر حاضر کے سرمایہ دار (ان کی بہت سی قسمیں ہیں جن کی تفصیل ناظرین کو مری کے ہوٹلوں سے معلوم ہو سکتی ہے) میری مخالفت پر کمر بستہ ہیں بلکہ سب نے میرے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے لیکن "میری آستین میں چونکہ ید بیضا ہے" اس لئے میں ان سے بالکل مرعوب نہیں ہو سکتا میں ان کی مخالفت کے باوجود سرمایہ داری کے خلاف اپنا زور قلم صرف کرتا رہوں گا۔ میری حالت درویشانہ ہے تو کیا ہوا میرے انداز تو خسروانہ ہیں۔

نوٹ:۔ میں نے اس نظم کا مطلب دانستہ مختصر لکھا ہے کیونکہ اگر میں ہر نظم کی تشریح میں وضاحت سے کام لوں تو اس کتاب کی ضخامت دو چند ہو جائے گی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ بہت کم طلبا اس کو خرید سکیں گے لہٰذا میں ناظرین سے درخواست کروں گا کہ وہ اس نظم کو بہت غور سے پڑھیں اس میں فلسفہ بھی ہے اور سیاست بھی اسرار حیات بھی ہیں اور پیغام انقلاب بھی۔

فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخل کہن کی شادابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

●

اس نظم میں اقبال نے آدم کی فطری صلاحیتوں کو فرشتوں کی زبان سے بیان کیا ہے چونکہ اقبال کے فلسفہ کا بنیادی تصور آرزوئے کمال[1] ہے اس

---

[1] شوپن ہاور کے فلسفہ کا بنیادی تصور "آرزوئے زیست" اور نیٹشے کے فلسفہ کا بنیادی تصور آرزوئے اقتدار، ہے۔

لئے انہوں نے اپنی تصانیف میں آدم کی پیدائش اور اس کے ہبوط کی داستان کے ضمن میں اسی حقیقت کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے کہ اللہ نے انسان کو دنیا میں اسی لئے بھیجا کہ وہ اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکے مثلاً پیام مشرق میں انہوں نے تسخیر فطرت کے عنوان سے آفرینش واغواء ہبوط آدم کی داستان پانچ مسلسل نظموں میں لکھی ہے جن میں سے ہر نظم شاعری اور فلسفہ دونوں کے اعتبار سے ایک گوہر تراشیدہ معلوم ہوتی ہے تیسری نظم میں ابلیس آدم سے کہتا ہے۔

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام؟ سوختن ناتمام

معنویت کے لحاظ سے ساری کتاب میں اس شعر کا جواب نہیں ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے خطبات مدراس میں بھی اس مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

یہاں اس نظم میں انہوں نے یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے چونکہ آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اس لئے اسے وہ تمام صفات عطا فرمائی ہیں جو اس منصب رفیع کے لئے ضروری ہیں آدم جب اس دنیا میں ظاہر ہوا تو اس وقت وہ شعور اور ادراک کی ابتدائی منزلوں میں تھا لیکن اس کے اندر ترقی کے لامحدود امکانات پوشیدہ تھے اقبال نے اس نظم میں انہی کی وضاحت کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ

۱ ۔ اللہ نے انسان کے اندر جذبۂ عشق ودیعت فرما دیا ہے جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق کو ہر لحظہ بیتاب اور بیقرار رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان ہر وقت محبوب کی تلاش میں مصروف رہتا ہے۔

۲ ۔ اللہ نے انسان کو مٹی سے بنایا ہے لیکن اس کا جوہر حیات (روح)

خاکی نہیں ہے بلکہ روحانی یا نورانی ہے اسی لئے اس میں تابندگی اور درخشندگی کی صفت پائی جاتی ہے۔

۳ ۔ اللہ نے انسان کو منبع حسن و جمال بنایا ہے یعنی اس کی ذات میں ہر قسم کی خوبیاں پوشیدہ ہیں اب یہ اس کا فرض ہے کہ اتباع شریعت کی بدولت ان کو بروئے کار لاکر مرتبہ کمال پر فائز ہو جائے۔

واضح ہو کہ اس شعر کا مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۞ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین صورت (انداز) پر پیدا کیا ہے۔

چونکہ اللہ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مرتبۂ کمال حاصل کرے اس لئے اس نے اس مشتِ خاک کے اندر ہر قسم کی ترقی کی استعداد یا صلاحیت ودیعت فرمادی اس استعداد کو قرآن مجید نے تقویم احسن سے اور اقبال نے جمال سے تعبیر کیا ہے۔

نوٹ : چونکہ حصولِ کمال اخلاق حسنہ کی تکمیل پر موقوف ہے اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ ۔ میری بعثت کی غرض و غایت یہ ہے کہ میں انسانوں کے اخلاق حسنہ کی تکمیل کردوں۔

قرآن مجید نے اس کو تزکیۂ نفس سے تعبیر کیا ہے اور اس کے لئے صحبت شرط ہے مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ صحبت کی بدولت مقام ولایت کبریٰ پر فائز ہوئے اسی لئے حضرت صوفیائے کرام نے صحبت مرشد کو اصلاح حال (تزکیہ نفس) کے لئے شرط قرار دیا ہے۔

کیا زمانہ کا انقلاب ہے کہ آج کل ہند و پاک میں ایسے ایسے مدعیان

اصلاح پیدا ہو گئے ہیں جو خود محتاج اصلاح ہیں جب میں ان مدعیانِ اصلاح کے بلند بانگ دعاوی پر غور کرتا ہوں تو بے اختیار یہ مصرع زبان پر آجاتا ہے۔

ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

۴ ۔ اللہ نے انسان کو عشق کی دولت عطا فرمائی ہے کیونکہ اسی جوہر کی بدولت اس کی شخصیت (نخل کہن) کی تربیت اور تکمیل ہو سکتی ہے۔

چونکہ فطرت نے انسان میں تحقیق واجتہاد کا مادہ بھی رکھا ہے اس لئے وہ اسرار حیات اور رموز حیات کا علم حاصل کر سکتا ہے اور علم کی بدولت عناصر کو اپنا مطیع بنا سکتا ہے۔

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ۔ فلک دیکھ۔ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایام جدائی کے ستم دیکھ۔ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ۔ یہ صحرا۔ یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تک تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحر تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہِ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکرِ گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنس محبت کا خریدار ازل سے
تو پیر صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے
ہے راکب تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ

یہ نظم دراصل سابقہ نظم کا تتمہ ہے مقصد اس سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان اور کائنات میں ایک حیرت انگیز مطابقت اور موافقت پائی جاتی ہے مثلاً اگر انسان میں دیکھنے کی صلاحیت ہے تو کائنات

میں روشنی بھی موجود ہے اگر انسان بیمار ہو سکتا ہے تو کائنات میں امراض بھی موجود ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔

اقبال نے روح ارضی کی زبان سے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ دنیا میں حضرت انسان کی مخفی استعدادوں کے بروئے کار آنے کے لئے وسیع ترین میدان موجود ہے چنانچہ روح ارضی انسان سے کہتی ہے کہ

اے انسان! تو زبدۂ کائنات اور اشرف المخلوقات ہے تیرا فریضہ حیات یہ ہے کہ زمین و آسمان فضائے محیط، طلوع و غروب آفتاب غرضیکہ جملہ مظاہر فطرت کا مشاہدہ کرے۔

جب تو مظاہر فطرت کا مطالعہ کرے گا تو تجھے ضرور اللہ کی ہستی کا یقین حاصل ہو جائے گا۔

"ایام جدائی کے ستم" سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ انسان کا اصلی وطن عالم لاہوت ہے اس عالم میں وہ بطور مسافر ایک مدت معینہ کے لئے آیا ہے اور آنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں جدوجہد اور سعی پیہم کے ستم برداشت کرکے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہونچا دے۔

اے انسان! یہ ساری کائنات بادل ہوائیں فضائیں گھٹائیں پہاڑ، سمندر، دریا، چاند سورج، ستارے تیرے خادم اور فرمانبردار ہیں اللہ نے ان کو تیری خدمت کے لئے پیدا کیا ہے پس تیرا فرض یہ ہے کہ تو اس کی پوشیدہ طاقتوں پر وقوف حاصل کرکے اس کو مسخر کرے اور اس پر حکمراں ہو جا۔

اے انسان! اللہ نے تجھ میں وہ طاقت ودیعت فرمادی ہے کہ زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے سمجھ سکتا ہے یعنی تو اس کائنات پر اپنی خواہش کے

مطابق حکومت کر سکتا ہے اس مقصد کے لئے اللہ نے تجھے دو زبردست قوتیں عطا فرمادی ہیں۔

غیر محدود تخیل (فکر) اور آہ فلک رس (ذکر) اگر انسان فکر اور ذکر کی تربیت کرے اور اسی کو اقبال تعمیر خودی سے تعبیر کرتے ہیں تو ساری کائنات اس کے زیر نگیں ہو سکتی ہے۔

اے انسان! تیرے اندر اللہ نے محبت کی جو آگ روشن فرمائی ہے اس کی ایک چنگاری خورشید جہاں تاب سے زیادہ منور اور درخشاں ہے نیز تجھ کو ایجاد و اختراع کی ایسی صلاحیت عطا فرمائی ہے تو اگر چاہے یعنی کوشش کرے تو نئی دنیا[1] پیدا کر سکتا ہے۔

اے انسان! اللہ نے تجھ میں وہ قوتیں ودیعت کر دی ہیں کہ تو اپنی سعی پیہم سے اس دنیا کو رشک فردوس بنا سکتا ہے۔

"خونِ جگر" اقبال کی پسندیدہ اصطلاح ہے اور اس سے مراد ہے جدوجہد یا حسن عمل یا جذبۂ جہاد چنانچہ ٹیپ کے مصرع میں انہوں نے خود تشریح کر دی ہے۔

اے پیکرِ گل ؟ کوششِ پیہم کی جزا دیکھ ؎

اے انسان! اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کر تاکہ تو اپنے مقام کو حاصل کر سکے بس! خدا نے تیرا خمیر محبت کے جوہر پاکیزہ سے تیار کیا ہے محبت ریشہ ریشہ میں سمائی ہوئی ہے جس طرح شاخِ گل میں بادِ سحر گاہی کا نم چونکہ تو خود

---

[1] اے مرزا کامراں کسی دن اپنی بارہ دری سے نکل کر، مال روڈ پر سیر کرنے جاتے تو بلا شبہ وہ اپنے آپ کو ایک نئی دنیا میں محسوس کرے گا۔

عاشق ہے اس لئے جنس محبت کا خریدار بھی ہے تجھ کو اللہ نے یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے تو اسرار عشق سے آگاہ ہو سکتا ہے یعنی صحبت مرشد کی بدولت پیر صنم خانہ، اسرار محبت کے مقام پر فائز ہو سکتا ہے اور اس محبت رسول کی بدولت تو اللہ کا محبوب بن سکتا ہے اور اس مقام پر پہونچنے کے بعد تیری مرضی اس کائنات پر حکمراں ہو سکتی ہے اقبال نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

نوٹ :۔ اقبال نے اسی نظم کے آخری مصرع میں اپنا سارا فلسفہ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے یعنی جب خودی بذریعہ عشق رسول مرتبۂ کمال کو پہونچ جاتی ہے تو کائنات پر حکمراں ہو جاتی ہے اس حقیقت کے اظہار کیلئے انہوں نے شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا ہے کہ۔

ہے راکب تقدیر یہاں تیری رضا دیکھ

اس مصرع میں دو لفظ قابل غور ہیں تقدیر اور رضا اور اقبال کا فلسفہ انہی دو لفظوں میں مضمر ہے یعنی عشق رسول کی بدولت مومن کی مرضی کائنات کی تقدیر پر حکمراں ہو جاتی ہے یہ مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

اے نفس مطمئنہ ! واپس آجا اپنے رب کی طرف در ینحالیکہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔

بخوف طوالت اس آیت کی تشریح سے قطع نظر کر کے صرف اتنا لکھتا ہوں کہ جب تراضی طرفین متحقق ہو جائے تو پھر بندہ اور خدا کی رضا میں مغائرت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہتا اور اگر رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دونوں ایک دوسرے سے راضی نہیں ہوئے۔ فافہم و تدبر۔

قطعہ

فطرت مری مانند نسیمِ سحری ہے
رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو
کرتا ہوں سرِ خار کو سوزن کی طرح تیز

•

اس دلکش قطعہ کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی شاعر کی افتاد طبع قوانین فطرت کے مطابق ہوتی ہے وہ کائنات کو فطرت کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کے مقاصد عالیہ میں اس کا ممد و معاون بنتا ہے یعنی "سوز جگر" سے اس کے کاموں کی تکمیل کرتا ہے اور اس طرح کائنات کے حسن و جمال میں اضافہ کرتا ہے۔

اس حقیقت کو اقبال نے نسیم سحری کی مثال سے واضح کیا ہے کہتے ہیں کہ میری فطرت نسیم کی مانند ہے اسی لئے میرے بعض افعال میں نرمی اور آہستگی ہے اور افعال میں درشتی اور تیزی ہے مثلاً میں جب گل و لالہ کا ذکر کرتا ہوں تو اپنے زورِ کلام یا اپنی قوت تخیل کی بنا پر ان کو نہایت حسین بنا دیتا ہوں یعنی ان کے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہوں۔

اور جب کانٹوں کا تذکرہ کرتا ہوں تو اس کی نوک میں سوئی کی سی تیزی پیدا کر دیتا ہوں اور یہی شاعری کا کمال ہے کہ پھولوں کی داستان سے خوشبو آئے اور کانٹوں کے ذکر سے خلش پیدا ہو جائے۔

ع نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

پیر و مرید

مریدِ ہندی

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں　　علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیرِ رومی

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مریدِ ہندی

اے امامِ عاشقانِ دردمند　　یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند
خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست
دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سرور　　بے ثبات و بے یقین و بے حضور
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا　　دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا
آہ یورپ! با فروغ و تابناک
نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

پیرِ رومی

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست
طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

مریدِ ہندی

پڑھ لیے میں نے علومِ شرق و غرب　　روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیرِ رومی

دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

مریدِ ہندی

اے نگہ تیری مرے دل کی کشاد — کھول مجھ پر نکتۂ حکمِ جہاد

پیرِ رومی

نقشِ حق را ہم بہ امرِ حق شکن
بر زجاجِ دوست سنگِ دوست زن

مریدِ ہندی

ہے نگاہِ خاوراں مسحورِ غرب — حورِ جنت سے ہے خوشتر حورِ غرب

پیرِ رومی

ظاہرِ نقرہ گر اسپید است و نو
دست و جامہ ہم سیہ گردد ازو

مریدِ ہندی

آہ مکتب کا جوانِ گرم خوں — ساحرِ افرنگ کا صیدِ زبوں

پیرِ رومی

مرغِ پر نارستہ چوں پرّاں شود
طعمۂ ہر گربۂ درّاں شود

مریدِ ہندی

تا کجا آویزشِ دین و وطن — جوہرِ جاں پر مقدم ہے بدن

پیر رومی

قلب پہلوی زند بار در لشب
انتظار روزمی دارد ذہب

مرید ہندی

سرِّ آدم سے مجھے آگاہ کر خاک کے ذرّے کو مہر و ماہ کر

پیر رومی

ظاہرش را پشۂ آرد بہ چرخ
باطنش آمد محیطِ ہفت چرخ

مرید ہندی

خاک تیرے نور سے روشن بصر غایت آدم خبر ہے یا نظر

پیر رومی

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

مرید ہندی

زندہ ہے مشرق تری گفتار سے اُمتیں مرتی ہیں کس آزار سے

پیر رومی

ہر ہلاکِ امت پیشیں کہ بود
زانکہ بر جندل گماں بردند عود

مرید ہندی

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو

پیر رومی

تا دلِ صاحب دلے نامد بدرد
ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد

مریدِ ہندی

گرچہ بے رونق ہے بازارِ وجود کون سے سودے میں ہے مردوں کا سود

پیر رومی

زیرکی بفروش و حیرانی بخر
زیرکی زن است و حیرانی نظر

مریدِ ہندی

ہم نفس میرے سلاطیں کے ندیم میں فقیرِ بے کلاہ و بے گلیم

پیر رومی

بندۂ یک مردِ روشن دل شوی
بہ کہ بر فرقِ سرِ شاہاں روی

مریدِ ہندی

اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر

پیر رومی

بال بازاں را سوے سلطاں برد
بال زاغاں را بگورستاں برد

مریدِ ہندی

کاروبارِ خسروی یا راہبی کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبی؟

پیرِ رومی

مصلحت در دینِ ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دینِ عیسیٰؑ غار و کوہ

مریدِ ہندی

کس طرح قابو میں آئے آب و گِل   کس طرح بیدار ہو سینے میں دل

پیرِ رومی

بندہ باش و بر زمیں رَو چوں سمند
چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند

مریدِ ہندی

سِرِّ دیں ادراک میں آتا نہیں   کس طرح آئے قیامت کا یقین

پیرِ رومی

پس قیامت شو قیامت را بہ بیں
دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

مریدِ ہندی

آسماں میں راہ کرتی ہے خودی   صیدِ مہر و ماہ کرتی ہے خودی
بے حضور و با فروغ و بے فروغ   اپنے نخچیروں کے ہاتھوں داغ داغ

پیرِ رومی

آں کہ ارزد صید را عشق است و بس
لیکن او کے گنجد اندر دامِ کس

مریدِ ہندی

تجھ پہ روشن ہے ضمیرِ کائنات   کس طرح محکم ہو مِلّت کی حیات

پیر رومی

دانہ باشی مرغکانت برچنند
غنچہ باشی کودکانت برکنند
دانہ پنہاں کن سراپا دام شو
غنچہ پنہاں کن گیاہِ بام شو

مرید ہندی

تو یہ کہتا ہے کہ دل کی کر تلاش — طالبِ دل باش و در پیکار باش
جو مرا دل ہے مرے سینے میں ہے — میرا جوہر میرے آئینے میں ہے

پیر رومی

تو ہمی گوئی مرا دل نیز ہست
دل فرازِ عرش باشد نے بہ پست
تو دلِ خود را دلے پنداشتی
جستجوے اہلِ دل بگذاشتی

مرید ہندی

آسمانوں پر مرا فکرِ بلند — میں زمیں پر خوار و زار و دردمند
کارِ دنیا میں رہا جاتا ہوں میں — ٹھوکریں اس راہ میں کھاتا ہوں میں
کیوں مرے بس کا نہیں کارِ زمیں
ابلہ دنیا ہے کیوں دانائے دیں

پیر رومی

آں کہ بر افلاک رفتارش بود
بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

مرید ہندی

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ — کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ

پیر رومی

علم و حکمت زاید از نانِ حلال
عشق و رقت آید از نانِ حلال

مرید ہندی

ہے زمانے کا تقاضا انجمن — اور بے خلوت نہیں سوزِ سخن

پیر رومی

خلوت از اغیار باید نے ز یار
پوستیں بہرِ دے آمد نے بہار

مرید ہندی

ہند میں اب نور ہے باقی نہ سوز — اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

پیر رومی

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

●

اس مکالمہ کے پردہ میں اقبالؔ نے

ا ۔ اس عقیدت کا اظہار کیا ہے جو انہیں مرشد رومی کے ساتھ تھی
ب ۔ مثنوی کے بعض حقائق و معارف سے دورِ حاضر کے مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے تاکہ ان کے دل میں اس کتاب لاجواب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو

ج - مسلمانوں کی حیات ملی کے بعض مسائل کا حل پیش کیا ہے۔

د - ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ میرے کلام کو سمجھنے کے لئے مثنوی کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔

پہلا سوال :- مرید ہندی کہتا ہے کہ مسلمان مغربی علوم پڑھ کر دین سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں اور اس صورت حال کو دیکھ کر ہر سچے مسلمان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔

پیر رومی جواب دیتے ہیں کہ علم حاضر تو بذات خود مضر نہیں ہے مسلمان اگر اسے حاصل کر کے دین سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا زاویۂ نگاہ غلط ہے حصول علم سے ان کا مقصد صحیح نہیں ہے وہ چونکہ علم پروری اور حصول آسائش دنیوی اور جلب منفعت مادی کے لئے حاصل کرتے ہیں اس لئے علم ان کے حق میں سانپ بن گیا ہے یعنی اس کے اثر سے ان کی روحانی موت واقع ہو گئی ہے اگر وہ علوم و فنون جدیدہ کو اس غرض سے حاصل کرتے کہ ان کو دین کا خادم بنائیں گے اور انہیں پڑھ کر دین و ملت کی خدمت کریں گے تو یہ علوم ان کے حق میں مفید یعنی یار غمگسار بن جاتے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ تلوار بذات خود اچھی ہے نہ بری۔ اس کا مقصد حصول یا استعمال اسے محمود یا مذموم بنا دیتا ہے مثلاً اگر ایک شخص کسی مظلوم کی حمایت میں تلوار اٹھائے تو وہ بہت اچھی ہے لیکن اگر کسی بے گناہ کا خون کر دے تو وہی تلوار بہت بری ہے۔

امام رازی اور امام غزالی نے بھی فلسفہ اور سائنس پڑھا تھا لیکن انہوں نے ان علوم کو دین کی حمایت میں استعمال کیا اور ان کی مدد سے مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جوابات دیئے اس لئے یہ علوم ان کے حق میں یار بن گئے

ہم چونکہ ان علوم کو دنیا حاصل کرنے کے لئے پڑھتے ہیں اس لئے ہمارے حق میں مار بن گئے۔

علم کو اگر شکم پروری کی غرض سے حاصل کروگے تو وبالِ جان اور حجابِ اکبر بن جائے گا اور اگر اسی علم کو معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کی نیت سے پڑھوگے تو رہنما اور رفیقِ زندگی بن جائے گا۔

نوٹ:۔ اکبر الٰہ آبادی نے بھی اسی مضمون کو اپنے مخصوص رنگ میں بیان کیا ہے۔

فلسفہ ان کا انہی کی چال کا ہمدوش ہے
ان میں دولت خیز ہے اور ہم میں مذہب نوش ہے

دوسرا سوال:۔ مریدِ ہندی عرض کرتا ہے کہ اے مرشد چونکہ آپ نے اس شعر میں بیان کیا ہے وہ میرے دل پر نقش ہوگیا ہے۔

خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست

یعنی بظاہر ستار یا رُباب میں چند تار ہوتے ہیں جو بالکل خشک ہوتے ہیں اور خشک لکڑی یا خشک تونبے پر خشک کھال منڈھی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس ساز سے نہایت دلکش نغمے نکلتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیقی میں دوست (خدا) نے اپنی طرف سے یہ جاذبیت پیدا کر دی ہے ورنہ تار اور لکڑی میں یہ دلکشی کہاں سے پیدا ہوسکتی ہے؟ اس لئے جب ایک صوفی یا خدا کا عاشق موسیقی سنتا ہے تو اس کا دل دوست کی آواز سن کر بیقرار ہو جاتا ہے اور اس پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ یہی نغمہ جب یورپ سنتا ہے تو مادیات کی طرف مائل ہو جاتا ہے یعنی مغربی اقوام کے اندر اسی نغمہ کو نفسانی خواہشات برانگیختہ

ہو جاتی ہے۔

پیر رومی جواب دیتے ہیں کہ ہر شخص نغمہ سے صحیح معنی میں فائدہ حاصل نہیں کر سکتا اس کے لئے قلب میں صلاحیت کا پایا جانا شرط اولین ہے مثلاً اس بات پر غور کرو کہ انجیر کس قدر مفید میوہ ہے لیکن ہر پرندہ انجیر ہضم نہیں کر سکتا۔

تیسرا سوال :۔ مرید کہتا ہے کہ اگرچہ میں نے تمام مشرقی اور مغربی علوم مثلاً ادب۔ تاریخ۔ معاشیات۔ منطق۔ فلسفہ۔ عقائد اور کلام وغیرہ پڑھ لئے لیکن اطمینان قلب حاصل نہیں ہوا اس کی کیا وجہ ہے۔؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ اگر تو نا اہل اطبا کے پاس جائے گا تو وہ تیرے مرض کا ازالہ کرنے کے بجائے اس میں اضافہ ہی کر دیں گے اس لئے تجھے اپنی مہربان ماں کی خدمت میں آنا چاہئے تاکہ وہ تیرا معالجہ صحیح طریق پر کر سکے۔

مطلب یہ ہے کہ اطمینان قلب نہ تاریخ سے پیدا ہو سکتا ہے نہ فلسفہ سے نہ اقتصادیات و اخلاقیات سے یہ نعمت تو صرف ذکر الٰہی سے حاصل ہو سکتی ہے کما قال القرآن۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ آگاہ ہو جاؤ کہ صرف اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے اور ذکر الٰہی کا طریقہ مرشد سے حاصل ہو سکتا ہے جو مرید پر ماں کی طرح شفیق ہوتا ہے۔

چوتھا سوال :۔ مرید دریافت کرتا ہے کہ جہاد کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ حق کے پیدا کردہ نقوش کو اسی کے حکم سے مٹانا یعنی محبوب حقیقی کے بنائے ہوئے کانچ کے برتنوں کو اسی کے بنائے ہوئے پتھر سے توڑنا۔

مطلب یہ ہے کہ کفار (نقش حق) بھی خدا ہی کے پیدا کردہ ہیں لیکن

قرآن مجید بھی اسی کا نازل کردہ ہے اور اس میں خود اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر کفار اعلائے کلمۃ الحق میں تمہارے مزاحم ہوں تو ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دو۔

زجاج دوست کنایہ ہے کفار سے (جو دنیا میں موجود ہیں۔

سنگِ دوست کنایہ ہے احکام جہاد سے (جو قرآن میں مذکور ہیں)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مسلمان کو کفار سے کسی قسم کی ذاتی پرخاش نہیں ہے ان کو قتل کرنے میں اس کی کوئی ذاتی غرض مخفی نہیں ہے جس خدانے کافروں کو پیدا کیا ہے اسی خدانے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ اگر کافر تم سے برسرپیکار ہوں تو ان کو بلا تامل تہ تیغ کر دو اس لئے اگر مسلمان جہاد کرتا ہے تو وہ خدا کی نافرمان مخلوق کو خدا ہی کے حکم سے قتل کرتا ہے مومن کا مقصود مال غنیمت یا دولت۔ زمین یا عورت نہیں ہے بلکہ خوشنودی باری تعالیٰ ہے۔

پانچواں سوال :۔ حریف کہتا ہے کہ مشرقی اقوام مغربی اقوام کی شان و شوکت سے اس قدر متاثر ہو چکی ہیں کہ اب ان کو یورپ کی نیم عریاں عورتیں جنت کی حوروں سے بھی زیادہ دلکش نظر آتی ہیں۔

پیر جواب دیتے ہیں کہ چاندی بظاہر اجلی اور سفید ہوتی ہے لیکن اس کے مس کرنے سے ہاتھ اور لباس دونوں کالے ہو جاتے ہیں یہی حال ان مغربی عورتوں کا ہے ان کا ظاہر تو بہت دلکش ہے لیکن باطن (قلب) سیاہ ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص ان کی صحبت میں رہے گا اس کے اندر بھی کثافت باطنی پیدا ہو جائے گی اس لئے مسلمان نوجوانوں کو ان عورتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

چھٹا سوال :۔ کالجوں کے مسلمان نوجوان علی العموم مغربی افکار و خیالات سے متاثر ہو کر اسلام سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ اگر وہ چوزہ جس کے پر نہیں نکلے، اڑنا شروع کردے تو یقیناً بلی کا لقمہ بن جائے گا یعنی اگر مسلمان نوجوان اسلامی تعلیمات سے آگاہی حاصل کئے بغیر مارکس اور فرائڈ کے غیر اسلامی نظریات اور آسکر وائلڈ اور میکسیم گورکی کے مخرب اخلاق افسانوں کا مطالعہ شروع کردے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسلام سے بیگانہ ہو جائے گا اور جب ولایت سے واپس آئے گا تو الحاد اور بیدینی کے لئے باعثِ افتخار بن جائے گا۔

ساتواں سوال:۔ دین اور وطن میں یہ آویزش (تنازع) کب تک جاری رہے گی کیا واقعی بدن (مادہ) کے تقاضے جان (روح) کے تقاضوں پر مقدم ہیں۔؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ رات کے وقت چونکہ روشنی بہت کم ہوتی ہے اس لئے کھوٹا سکہ بھی سونے کی برابری کرنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں سونا اس کھوٹے سکہ سے کچھ نہیں کہتا بلکہ خاموشی کے ساتھ طلوع آفتاب کا انتظار کرتا ہے کیونکہ دن کے وقت کھرے اور کھوٹے میں فوراً امتیاز ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس وقت یورپ میں الحاد اور بیدینی کا بازار گرم ہے اس لئے وطنیت کا نظریہ لوگوں میں مقبول ہو رہا ہے لیکن وقت دور نہیں ہے جب اسلام کی صداقت کا آفتاب دنیا میں طلوع ہوگا اور اس کی روشنی سے قلوب منور ہو جائیں گے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ وطنیت کے مفاسد سے خود بخود آگاہ ہو جائیں گے۔

نوٹ:۔ مرشد رومی نے اس شعر میں فطرت انسانی کے ایک اہم پہلو کو واضح کیا ہے جن لوگوں نے ابتدا سے اس وقت تک اقوام عالم کے ذہنی رجحانات کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ انسانی ذہن خدا

پرستی اور مادہ پرستی کے درمیان حرکت ارتجاجی (Escillation) کرتا رہتا ہے۔

جب ایک قوم مادہ پرستی میں غرق ہو کر تباہ ہو جاتی ہے (مثلاً عاد ثمود بابلی بمصری۔ رومی) تو جو قوم اس کی جگہ لیتی ہے وہ اس برباد شدہ قوم کے انجام کو دیکھ کر پہلے خدا پرستی کی طرف مائل ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ فراوانیٔ دولت سے عیش و عشرت یعنی طاؤس و رباب میں منہمک ہو جاتی ہے اور عیش و عشرت یعنی مادہ پرستی کا لازمی نتیجہ تباہی ہوتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے آج کل یورپ مادہ پرستی کے انتہائی نقطہ پر پہونچا ہوا ہے لیکن جب خدا کے مخفی ہاتھ کی گرفت (لطش) کو محسوس کرے گا تو ان اقوام کے اندر یقیناً خدا پرستی کی طرف میلان شروع ہو جائے گا اور اس وقت ان کو قرآن مجید کی اس تعلیم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا کہ انسان کی وفاداریوں کا آخری مرجع وطن نہیں بلکہ اللہ ہے۔

اٹھواں سوال:۔ مرید کہتا ہے کہ مجھے آدم (انسان) کی حقیقت سے آگاہ کیجئے۔

پیر اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آدم کی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ یک ظاہری (مادی) دوسرا باطنی (روحانی) ظاہری پہلو کے لحاظ سے انسان اس قدر کمزور۔ عاجز اور ناتواں ہے کہ مچھر جیسی ضعیف اور حقیر شے بھی اسے ہلاک کر دینے کے لئے کافی ہے اس میں تلمیح ہے۔ نمرود کے واقعہ کی طرف کہ جب اس کی سرکشی حد سے متجاوز ہو گئی تو اللہ نے اس کو اسی دنیا میں سزا دیدی بایں طور کہ ایک چھوٹا سا مچھر اس کی ناک کی رہ سے اس کے دماغ میں داخل ہو گیا اور اس نے اس باجبروت بادشاہ کی زندگی اجیرن کر دی۔

یہ داستان تفصیل کے ساتھ توریت کی تفسیر موسومہ تالمود میں مندرج ہے یہیں سے مسلمانوں کے ادبیات میں داخل ہو گئی قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں اس کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔

یہ تو ہوا انسان کا ظاہری پہلو۔ اب رہا اس کا باطنی پہلو تو وہ اس قدر عظیم بالشان ہے کہ ساری کائنات اس میں سما سکتی ہے یعنی مجھ کو تو حقیقت ہی کیا ہے انسان ساری کائنات کو مسخر کر سکتا ہے چونکہ اس کی تفصیل قبل ازیں بیان کر چکا ہوں اس لئے اس جگہ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

نواں سوال:۔ مرید دریافت کرتا ہے کہ آدم (انسان) کا مقصد حیات کیا ہے (تجر سے مراد عقل و خرد ہے اور نظر سے مراد عشق و محبت ہے) یعنی انسان کو اللہ نے کس لئے پیدا کیا ہے؟ عقل میں ترقی کر کے فلسفی بننے کے لئے یا عشق میں ترقی کر کے عارف بننے کے لئے۔

پیر جواب دیتے ہیں کہ آدمی کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایسی قوت پیدا کرے کہ محبوب حقیقی کا دیدار کر سکے دیدار الٰہی کا طریقہ بھی قبل ازیں بیان کر چکا ہوں اس لئے یہاں دوبارہ لکھنے کی حاجت نہیں ہے۔

دسواں سوال۔ مرید دریافت کرتا ہے کہ دنیا میں قوموں کی ہلاکت کا سبب کیا ہے۔

پیر جواب دیتے ہیں کہ جب کوئی قوم جَنْدل (لغوی معنی پتھر۔ مراد باطل) کو عود خوشبودار لکڑی۔ مراد حق) سمجھنے لگتی ہے یعنی اللہ کے قانون کو چھوڑ کر نفس امارہ کی پیروی کرنے لگتی ہے تو انجام کار فنا ہو جاتی ہے۔

گیارھواں سوال:۔ مرید دریافت کرتا ہے کہ مسلمانوں کا خون کیونکر سرد ہو گیا یعنی وہ دنیا میں اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہیں۔؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ جب کوئی قوم اللہ کے محبوب بندوں کو دکھ پہونچاتی ہے تو اللہ اس کو ذلیل و رسوا کر دیتا ہے۔
واضح ہو کہ ملت اسلامیہ میں حادثۂ کربلا سنہ ۶۱ھ سے خاصان خدا کی توہین اور ایذا رسانی کا سلسلہ شروع ہوا اور ابھی تک جاری ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی رسوائی کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا اور اس زمانہ میں تو ہمارا حال یہودیوں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔

بارھواں سوال: مرید کہتا ہے کہ اگرچہ دنیا کا بازار بے رونق ہے یعنی دنیا کی پونجی بہت حقیر اور بے ثبات ہے لیکن انسانوں کو بہرحال اس دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے اس لئے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس فانی دنیا میں کون سی چیز ایسی ہے جس کا حصول انسان کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔
پیر جواب دیتے ہیں کہ اگر تم اس بازار میں خرید و فروخت کے آرزومند ہو تو میری نصیحت یہ ہے کہ زیرکی (عقل) فروخت کر دو اور حیرانی (عشق) خرید لو۔ کیونکہ عقل کی بدولت صرف گمان (ظن) حاصل ہو سکتا ہے لیکن عشق تمہیں یقین (معرفت الٰہی) عطا کرتا ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ یقین گمان سے بہتر اور برتر ہے۔

تیرھواں سوال: مرید کہتا ہے کہ میرے ہم صفیر (ساتھی) تو بادشاہوں کے وزیر ہیں اور مناصب عالیہ پر سرفراز ہیں لیکن میں مفلسی اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں آخر اس کی وجہ کیا ہے۔؟
پیر جواب دیتے ہیں کہ بادشاہوں کی ہم نشینی اور دنیاوی جاہ و منزلت سے یہ بات بدرجہا بہتر ہے کہ انسان کسی عادت کامل کی غلامی اختیار کرے کیونکہ بادشاہوں کی قربت بسا اوقات ذلت کا باعث ہوتی ہے لیکن خاصان

خدا کی صحبت ہمیشہ موجب سعادت ہوتی ہے۔

تاریخ عالم میں وزرا، کی تذلیل کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں[1] لیکن اللہ نے اپنے بندوں کو کبھی ذلیل و رسوا نہیں کرتا یہ بات تو اس کی سنت کے خلاف ہے چنانچہ وہ ارشاد فرماتا ہے۔ کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی مومنوں کی نصرت اور حمایت ہم نے خود اپنی مرضی سے اپنے لئے لازمی قرار دے لی ہے۔

چودھواں سوال : مرید اپنے پیر سے درخواست کرتا ہے کہ آپ مجھے حدیث جبر و قدر سمجھا دیجئے یعنی انسان مجبور ہے یا مختار؟

واضح ہو کہ اقبال نے اپنے سوال کے پہلے مصرع میں رومی کو شریک مستی خاصان بدر، قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی ان صحابہ کرامؓ کی طرح جو جنگ بدر میں شریک ہوئے تھے عشق رسولؐ میں سرشار ہیں۔

پیر رومی جواب دیتے ہیں کہ باز اور زاغ کی زندگی پر غور کرنے سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

باز اور زاغ دونوں کو اللہ نے یکساں پرواز کی طاقت عطا فرمائی ہے یعنی پاز وہ عطیۂ الٰہی ہے جس میں یہ دونوں یکساں شریک ہیں اور دونوں

---

[1] مثلاً سلطان سلیم عثمانی نے اپنے آٹھ سالہ عہد حکومت میں آٹھ وزیروں کو قتل کرایا اور نویں وزیر کے قتل کا بہانہ تلاش کر رہا تھا کہ ملک الموت نے آن دبایا اور یہ رحم دل بادشاہ اس نیک آرزو کو اپنے ساتھ قبر میں لے گیا۔ واضح ہو کہ یہ پہلا عثمانی سلطان تھا جس نے ڈاڑھی بھی منڈائی اور افیون بھی کھائی۔

کی فطرت انہیں اڑنے پر مجبور کرتی ہے یعنی اس لحاظ سے دونوں مجبور ہیں۔
لیکن باز عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہے اس لئے وہ اپنے پروں سے اڑ کر بادشاہ کے ہاتھ پر جا بیٹھتا ہے اور زاغ چونکہ پست ہمت اور کم حوصلہ ہے اس لئے گورستان کی طرف جاتا ہے یعنی مردار کھاتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اپنی اپنی طرز حیات کے انتخاب میں دونوں مختار ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ انسان بعض معاملات میں مجبور ہے اور بعض معاملات میں مختار ہے مثلاً ہر شخص اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے لیکن کسب افعال کے اعتبار سے مختار ہے اور مدح و قدح یا جزا و سزا۔ اسی کسب پر مرتب ہوتی ہے۔
چنانچہ تلوار حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ابوجہل دونوں کے پاس ایک ہی سی تھی اور عطیہ الٰہی یعنی جسمانی طاقت بھی دونوں کو یکساں طور پر حاصل تھی لیکن اس طاقت کے استعمال میں دونوں مختار تھے ایک نے اس فطری طاقت کو (جس میں وہ مجبور تھا) باطل کی حمایت میں استعمال کیا دوسرے نے اسی طاقت کو حق کی اشاعت کے لئے وقف کر دیا اور اسی کسب و اکتساب کی بناء پر پہلا شخص سزا کا اور دوسرا جزاء کا مستحق ہوا۔
اقبالؔ نے اپنے سوال کے پہلے مصرع میں پیر رومی کو ہستی خاصانِ بدر" میں شریک کرکے نہایت بلیغ انداز میں جبر و قدر کی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جنگ بدر میں حضرت علیؓ اور ابوجہل دونوں بغرض قتال آئے تھے لیکن اول الذکر کا فعل محمود ہے آخر الذکر کا فعل مذموم ہے محض اس لئے کہ اللہ نے ہر شخص کو تلوار کے استعمال میں مختار بنایا ہے خواہ اسے اسلام کی حمایت میں اٹھائے خواہ کفر کی تائید میں علم کرے۔ آیت قرآنی دال ہے

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸: ۲۹) پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے اسی قوت اختیار پر دلالت کرتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ انسان اپنی پیدائش یا عطیات الٰہی میں مجبور ہے مثلاً زید میں موسیقی کی صلاحیت نہیں ہے بکر میں شاعری کا ملکہ نہیں ہے۔ خالد خفیف الجثہ ہے طارق کا باپ دولت مند ہے۔ اشرف کا والد مفلس ہے۔ زاہد عہد عالمگیری میں پیدا ہوا اور شوکت اس صدی میں ان تمام معاملات میں یہ سب افراد مجبور ہیں لیکن ہر شخص عطیہ الٰہی کے استعمال میں آزاد اور خود مختار ہے اور قیامت کے دن صرف ان امور کے بارے میں باز پرس ہوگی جن میں ہر شخص مختار ہے۔

مرشد رومی فرماتے ہیں کہ اگر انسان کسب میں مختار نہ ہوتا تو اسے گناہ کرنے کے بعد شرمندگی کا احساس نہ ہوتا یہ احساس اس بات کی دلیل ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو کسب افعال میں مختار سمجھتا ہے۔

ع خجلتِ ما شد دلیل اختیار

پندرھواں سوال:۔ مرید دریافت کرتا ہے دین اسلام کی غایت یا مقصد کیا ہے؟ اسلام انسانوں کو تارکِ دنیا بنانا چاہتا ہے یا مالک دنیا۔؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ ہمارے دین کا مقصد یہ ہے کہ انسان جہاد فی سبیل اللہ کرکے دنیا میں سربلندی اور شکوہ حاصل کرے ترک دنیا یا رہبانیت کی تعلیم تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں پائی جاتی ہے اسلام اس کا حامی نہیں ہے۔

سولھواں سوال: مرید دریافت کرتا ہے کہ انسان نفس امّارہ کو کس طرح مغلوب کر سکتا ہے؟ یعنی اپنے دل کو کس طریقہ سے زندہ کر سکتا ہے؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ "بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمندر" یعنی اولاً کسی مرشد کامل کی غلامی اختیار کرو۔ ثانیاً محنت و مشقت کی زندگی بسر کرو۔ اپنی روزی اپنی قوت بازو سے حاصل کرو دوسروں کے بھروسہ یا سہارے مت جیو۔ گھوڑے سے سبق لو وہ خود بھی چلتا ہے اور دوسروں کو بھی منزل مقصود تک پہونچا دیتا ہے مُردوں کی طرح اپنے وجود کو دوسروں کے لئے بارِ گراں مت بناؤ یعنی دوسروں کے سہارے زندگی مت گذارو۔

سترھواں سوال: مرید کہتا ہے کہ دین کے اسرار و رموز عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں اندریں حالات لوگوں کے اندر قیامت کا یقین کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔

پیر جواب دیتے ہیں کہ تمہارا یہ قول بالکل درست ہے کہ عقل کی بدولت دینی حقائق پر یقین پیدا نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل صرف محسوسات میں کار آمد ہے اور اصول دین مثلاً اللہ۔ ملائکہ۔ وحی۔ بقائے روح۔ حشر بعد الموت۔ یعنی قیامت یہ سب وراء العقل ہیں عقل ان میں سے کسی کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتی۔

اندریں حالات حقائق اشیاء سے آگاہ ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان جس چیز کا یقین اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے اسے دیکھ لے اور دیکھنے کی صورت یہ ہے کہ خود وہی چیز بن جائے۔ مثلاً ایک شخص قیامت کو سمجھنا۔ یا اس پر یقین پیدا کرنا چاہتا ہے تو۔

۱ - قیامت کائنات میں سب سے بڑا انقلاب ہے۔
۲ - انقلاب کو سمجھنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے اندر انقلاب پیدا کرو۔
۳ - اس کی صورت یہ ہے کہ مرشد کی صحبت اختیار کرو۔
۴ - اس کے فیضان باطنی کی بدولت تمہارے اندر اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ تم مر کر دوبارہ زندہ ہو جاؤ گے۔
۵ - چونکہ قیامت بھی اسی کا نام ہے اس لئے خود بخود اس کے وقوع کا یقین تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گا یعنی قیامت کو آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد پھر کسی منطقی دلیل کی حاجت نہیں رہے گی۔

اب صرف یہ بتانا باقی ہے کہ صحبت مرشد کی بدولت آدمی مر کر دوبارہ زندہ کیسے ہو جاتا ہے؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر انسان میں نفس امارہ (جسے عرف عام میں "من" کہتے ہیں) موجود ہے جو منبع اور مصدر ہے تمام برائیوں کا مرشد کا کام اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ مرید کے اندر یہ طاقت پیدا کر دے کہ وہ اس نفس امارہ (اور قبل تزکیۂ نفس ہر انسان نفس امارہ ہی تو ہوتا ہے) پر موت وارد کر دے یعنی اپنے آپ کو عشق الٰہی کی آگ میں فنا کر دے۔

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد
او ز حرص و عیب کلی پاک شد

جب سالک اپنی تمام خواہشات نفسانی کو اپنے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے فنا کر دیتا ہے تو اللہ اسے دوبارہ نئی اور پاکیزہ زندگی عطا فرماتا ہے جب تک کوئی شخص اپنے باطن میں قیامت کا تجربہ نہ کرلے خارج میں قیامت کا یقین پیدا نہیں ہو سکتا۔

اقبالؔ نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

یعنی قرآن کا مطلب دوسروں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آسکتا طالب حقیقت کا فرض ہے کہ اپنے قلب میں یہ صلاحیت پیدا کرے کہ اس پر مطالب قرآنی کا نزول ہونے لگے۔

نوٹ:۔ یوحنّا کی انجیل میں جناب مسیح کا جو یہ قول درج کیا گیا ہے کہ جب تک ایک شخص مر کر دوبارہ پیدا نہ ہو وہ خدا کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ پہلے اپنی نفسانی خواہشات پر موت وارد کرو پھر روحانی طور پر دوبارہ زندگی حاصل کرو۔

اپنشد کی تعلیم بھی یہی ہے کہ جب تک کوئی شخص اپنے پانچ دشمنوں کو جو اس کے اندر موجود ہیں یعنی کام کرودھ۔ موہ۔ لوبھ اور اہنکار[1] فنا نہیں کرے گا اس وقت تک "جیون مکتی" حاصل نہیں ہو سکتی۔

اٹھارھواں سوال: مرید عرض کرتا ہے کہ اگرچہ خودی اس قدر طاقتور ہے کہ اتنا بڑا آسمان بھی اس کی زد میں ہے اور سورج اور چاند کو بھی شکار کر سکتی ہے۔ عناصر کائنات کو بھی مسخر کر سکتی ہے لیکن اس کے باوجود انہیں نخچیروں کے ہاتھوں نالاں رہتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ بیشک خودی عناصر کائنات کو مسخر کر سکتی ہے لیکن اس فعل سے جیسا کہ تم نے خود کہا ہے اس کو صرف فروغ حاصل ہو سکتا ہے حضور اور قرار حاصل نہیں ہو سکتا اس کی وضاحت یہ ہے کہ تسخیر کائنات کی بدولت

---

[1] شہوت۔ غصہ۔ فریفتگی۔ حرص اور غرور۔

خودی دنیا میں مادی اقتدار حاصل کرسکتی ہے۔ اسے فروغ کہتے ہیں لیکن مادیات کا قاعدہ یہ ہے کہ ان کے حصول سے اطمینان قلب (فراغ) حاصل نہیں ہو سکتا ایک ملک فتح کرنے کے بعد دوسرے کو فتح کرنے کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے اور ایک شئے ایجاد کرنے کے بعد دوسری شئے ایجاد کرنے کا جذبہ رونما ہو جاتا ہے اس انہماک کی وجہ سے خودی کو ذکر الٰہی (حضور) کا موقع نہیں ملتا۔ گویا اس طرز زندگی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی مادی کامیابیاں (نخچیر) خودی کے حق میں موجب کلفت (حجاب) بن جاتی ہیں۔

بالفاظ دگر خودی۔ غلط چیزوں کا شکار کھیلتی ہے یہ چیزیں اس لائق نہیں کہ خودی اپنی قوتوں کو ان کی تسخیر میں صرف کرے۔

" آں کہ آرزو صید را عشق است دلیس "، یعنی خودی کو صرف عشق کا شکار کھیلنا چاہیئے یہ سچ ہے کہ عشق (ذات باری تعالیٰ) کسی مخلوق کے قابو میں آنے والی چیز نہیں ہے لیکن خودی کو کوشش بہرحال یہی کرنا چاہیئے کہ غیر محدود۔ محدود میں سما جائے۔

اقبالؔ نے پیام مشرق میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

یعنی سالک کو لازم ہے کہ اپنا مطمح نظر اس قدر بلند کرے کہ وہ بقول ہیگل ہمیشہ قریب الحصول معلوم ہو لیکن حاصل کبھی نہ ہو سکے کیونکہ حصول کے بعد جدوجہد ختم ہو جائے گی اور سکون موت کا دوسرا نام ہے لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۔ میں اسی تسلسل جدوجہد کی طرف لطیف اشارہ پایا جاتا ہے۔

انیسواں سوال: مرید دریافت کرتا ہے کہ ملت (قوم) کی زندگی کس طرح مستحکم ہو سکتی ہے۔؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ اگر تو دانہ بن جائے گا تو چڑیاں تجھ کو چگ لیں گی اور اگر تو غنچہ کی حیثیت اختیار کرے گا تو نادان بچے تجھے نوچ کر پھینک دیں گے دونوں صورتوں میں تیری تباہی یقینی ہے اس لئے دانہ کو پوشیدہ کرلے اور سراسر دام (جال) بن جا۔ اسی طرح غنچہ کو بھی چھپالے اور گیاہ بام بن جا تاکہ کسی کا ہاتھ نہ پہونچ سکے۔

دانہ سے مراد ہے افتادگی۔ عاجزی مسکینی اور بیکسی۔ غنچہ سے مراد ہے ضعف نزاکت۔ نرمی اور ناتوانی ان دونوں لفظوں سے مجموعی طور پر مراد ہے تاب مقاومت کا فقدان مطلب ان شعروں کا یہ ہے کہ اگر کوئی قوم اپنے اندر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرے گی یعنی عدم تشدد کی تعلیم پر عمل کرے گی تو بہت جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی اس لئے قوم کے افراد کو لازم ہے کہ اپنے اندر ایسی طاقت پیدا کریں کہ جو انہیں گرفتار کرنے آئے وہ خود گرفتار ہو جائے مرشد رومی کا یہ جواب قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ۔ اے مسلمانو! کافروں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاری کرو جس قدر تم کر سکتے ہو اپنے اندر قوت پیدا کرتے سے اور سرحدوں پر گھوڑے باندھنے سے تاکہ تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کے دلوں پر دھاک بٹھا دو اور ان کے علاوہ دوسری قوموں پر بھی (جن کو تم نہیں جانتے۔

نوٹ: میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اس سنہری بلکہ موتیوں جڑی آیت

کو ہر وقت پیش نظر رکھیں۔

واضح ہو کہ رباط کہتے ہی ہیں سرحدوں کی نگرانی اور ان پر گھوڑے باندھنے کو اور یہ وہ بات ہے جس کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔

بیسواں سوال: مرید عرض کرتا ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ طالب دل باش و در پیکار باش یعنی دل کی تلاش کر اور اس تلاش کے سلسلے میں اگر کوئی مزاحمت کرے تو اس کا مقابلہ کر لیکن میرا دل تو میرے سینہ میں موجود ہے۔ پھر تلاش کا کیا مطلب ہے۔

پیر جواب دیتے ہیں کہ میری مراد اس دل سے نہیں جو مضغۂ گوشت ہے یہ دل جو دوران خون کا باعث ہے یہ تو حیوانات کے سینہ میں بھی ہوتا ہے بلکہ میری مراد اس لطیفۂ ربانی سے ہے جس کی بدولت انسان کا رابطہ عالم لاہوت سے پیدا ہو جاتا ہے یعنی دل کی حقیقت مادی نہیں ہے بلکہ وہ ایک لطیفۂ نورانی یا قوت روحانی ہے۔ لہٰذا میں اگر تجھ سے یہ کہتا ہوں کہ دل کی تلاش کر تو اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اہل دل کی تلاش کر کیونکہ انہی کی صحبت کی بدولت یہ نعمت یعنی یہ قوت تجھے حاصل ہو سکتی ہے۔

اکیسواں سوال: مرید سوال کرتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ جو لوگ دین کے معاملات میں عقلمند ہوتے ہیں وہ دنیاوی معاملات میں اکثر غلطی کرتے ہیں۔

پیر جواب دیتے ہیں کہ جو شخص روحانیت میں بلند مقام حاصل کر سکتا ہے اس کے لئے دنیاوی معاملات میں کامیابی چنداں دشوار نہیں ہے۔ اگر دانائے رموز دین سے دنیاوی معاملات میں غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حصول دنیا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

بائیسواں سوال: مرید سوال کرتا ہے کہ علم و حکمت، و عشق و محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے۔

پیر جواب دیتے ہیں کہ یہ دونوں نعمتیں اکل حلال سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ آج کل اللہ کی محبت اور دین کی حکمت ان دو چیزوں کا فقدان اسی لئے ہے کہ نان حلال کا حصول بہت دشوار ہے۔

تیئسواں سوال: مرید سوال کرتا ہے کہ خلوت کے بغیر کلام میں سوز و گداز نہیں پیدا ہو سکتا۔ لیکن زمانہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان جلوت اختیار کرے اندریں حالات مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

پیر جواب دیتے ہیں کہ اغیار کی صحبت سے اجتناب کرنا بیشک ضروری ہے لیکن اگر تجھے ہم خیال نصیب ہو جائیں تو ان کی صحبت میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ پوستین موسم شرما میں پہنتے ہیں نہ کہ گرما میں یعنی جسم کو سردی سے بچاتے ہیں کیونکہ وہ جسم کو نقصان پہنچا سکتی ہے اسی طرح تجھے لازم ہے کہ اپنی روح کو نا اہلوں کی صحبت سے محفوظ رکھ۔

چوبیسواں سوال: مرید کہتا ہے کہ ہندوستان میں اب نہ نور ہے نہ سوز اس لئے اہل دل اس ملک میں بہت مایوسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا مداوا کیسے ہو؟

پیر جواب دیتے ہیں کہ اگر دنیا پرست مکاری اور بے غیرتی کو عام کر رہے ہیں تو خدا پرستوں کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے یعنی انہیں دین کی روشنی اور عشق کی گرمی دنیا میں پھیلانی چاہیئے۔

لہ دے شمسی سال کا دسواں مہینہ جس میں سردی شباب پر ہوتی ہے مطابق ماہ دسمبر۔ جنوری۔ سودا لکھتا ہے۔

الٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل   تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل

رُباعی

ترا تن روح سے ناآشنا ہے
عجب کیا آہ تیری نارسا ہے
تنِ بے روح سے بیزار ہے حق
خدائے زندہ زندوں کا خدا ہے

●

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! چونکہ تو نفسیاتی خواہشات اور مادی لذات کے حصول میں منہمک ہے یعنی تزکیۂ نفس کی طرف سے بالکل غافل ہے اس لئے اللہ سے تیرا رابطہ استوار نہیں ہو سکتا۔ یعنی تیری کوئی دعا قبول نہیں ہو سکتی۔
اگر تو مرشد کی صحبت میں رہ کر اپنے نفس (امارہ) کو خباثتوں سے پاک نہیں کرے گا (اسی کو تزکیۂ نفس کہتے ہیں) تو تیرے اندر روحانیت پیدا نہیں ہوگی یعنی تو زندہ نہیں ہو سکے گا اور اللہ چونکہ خود زندہ ہے اس لئے وہ صرف زندوں ہی کو شرف باریابی عطا فرماتا ہے بالفاظ دیگر جب تک تیرا دل زندہ نہیں ہوگا تو اللہ سے تعلق پیدا نہیں کر سکتا یعنی تجھے سربلندی حاصل نہیں ہو سکتی۔

جبریل و ابلیس

جبریل

ہمدمِ دیرینہ؟ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے آرزو !

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو

ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گذر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تَقنَطُوا اچھا ہے یا لَاتَقنَطُوا!

جبریل

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم۔ دریا بہ دریا۔ جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھُو۔ اللہ ھُو۔ اللہ ھُو

●

چونکہ ابلیس کائنات میں شر کا سب سے بڑا مظہر ہے اور انسان کا روحانی ارتقا اسی قوت کو مغلوب کرنے پر موقوف ہے جیسا کہ اقبال خود کہتے ہیں۔

خوش تر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

اس لئے انہوں نے اپنی اکثر تصانیف مثلاً پیام مشرق۔ جاوید نامہ بال جبریل۔ ضرب کلیم۔ اور ارمغان حجاز میں ابلیس کی سیرت کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

نظم زیر نظر میں انہوں نے فلسفیانہ غور و فکر کے ساتھ ساتھ جذبات

نگاری حقیقت بیانی اور رمز و ایما، غرض کہ تمام ادبی خوبیوں کو جمع کر دیا ہے جس کی وجہ سے یہ نظم بالِ جبریل ہی نہیں بلکہ اردو ادب کی بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے!

جبریل۔ ابلیس سے دوستانہ لہجہ میں دریافت کرتے ہیں کہ تو نے جہانِ رنگ و بو کو کیسا پایا؟ کچھ وہاں کی سرگذشت مجھے بھی سناؤ اس مصرع میں جبریل نے ابلیس کو "ہمدمِ دیرینہ" کہہ کر مخاطب کیا ہے یہ اقبال کے رمزیہ اندازِ بیان کی بہت عمدہ مثال ہے یعنی انھوں نے لفظ دیرینہ سے اس طرف اشارہ کر دیا کہ ابلیس مدتوں تک فرشتوں کے ساتھ رہ چکا تھا۔

ابلیس کا جواب حقیقت پژوہی (کلاسکیت) کی بڑی دلکش مثال ہے کیونکہ دنیا دراصل انہی چیزوں کا نام ہے یعنی وہ کونسا انسان ہے جو "سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے و آرزو" ان کیفیات میں سے کسی ایک کیفیت سے آشنا نہیں ہے؟ بلکہ میرے ذاتی مسلک کے مطابق ان آفات و بلیات ستہ میں سے کسی نہ کسی آفت میں مبتلا نہیں ہے؟

بالفاظِ دگر اقبال نے چھ لفظوں میں دنیا کی کوشش ہزار سالہ تاریخ کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ ہیسی باڈ (Hesiod) متوفی سنہ ۱۹۳ ق م سے لے کر ہٹلر متوفی سنہ ۱۹۴۹ء تک ہر شخص شراب کی آرزو ہی سے مست و بیخود نظر آتا ہے۔

یہ سن کر جبریل کہتے ہیں کہ ساکنانِ عرشِ اعظم ابھی تک تجھے یاد کرتے رہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ تو واپس آ جائے اس لئے کیا یہ ممکن نہیں کہ تو اپنی گستاخی پر اظہارِ پشیمانی کرے اور جنابِ باری میں توبہ کر کے دوبارہ اسی مقامِ تقرب و اختصاص کو حاصل کرے۔

اقبالؔ نے ان باتوں کو "چاک دامن کے رفو" سے تعبیر کیا ہے اور یہ کنایہ کی بہترین مثال ہے۔

یہ سن کر ابلیس نے جواب دیا کہ اے جبرئیل! مجھے افسوس ہے کہ تو اس راز سے آگاہ نہیں کہ اگرچہ میرا سبو خود ٹوٹ گیا لیکن مجھے دائمی سرمستی عطا کر گیا یعنی انکار اور نافرمانی کی بنا پر میں تو بیشک مردود ہو گیا لیکن اس کی بدولت مجھے اپنی خودی کا ایسا شدید احساس حاصل ہو گیا کہ وہ اب قیامت تک زائل نہیں ہو سکتا۔

یہ مصرع بھی کنایات اور استعارات سے لبریز ہے جس کی وجہ سے اس ساری نظم میں غضب کی دلکشی پیدا ہو گئی ہے اور اکثر نقادان فن اس چھوٹی سی نظم کو اقبال کی شاعری کا بہترین نمونہ تسلیم کرتے ہیں۔

علاوہ بریں میں ایک عرصے سے عالم رنگ و بو کے ہنگامہ ہائے نو بنو کا خوگر ہو چکا ہوں اور تیرا عالم بے کاخ و کو۔ انتہائی خاموش اور پُرسکون ہے وہاں نہ کسی قلوپطرہ (ملکۂ مصر متوفیہ ۳۰ ق م) کی حسن فروشی کے جلوے ہیں نہ کسی ایلزبیتھ (ملکۂ انگلستان متوفیہ ۱۶۰۳ء) کی داد دہش کے مناظر ہیں اندریں حالات میرا دل وہاں کیسے لگے گا۔

---

[1] یہ عورتیں نفس پرستی اور بدکاری کے لحاظ سے دختران ابلیس کی سرتاج گذری ہیں اول الذکر نے تو چالیس سال ہی کی عمر میں ایک سانپ کی وساطت سے اپنی ناپاک زندگی کا خاتمہ کر دیا لیکن آخر الذکر تو ساٹھ سال کی عمر تک شوہر کے انتخاب میں مشغول رہی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو چیمبری سائیکلو پیڈیا۔ جلد چہارم ص ۱۴۳۔ مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء۔

آخری بات یہ ہے کہ میں نے اللہ کی جناب میں کوئی معمولی گستاخی نہیں کی ہے اس لئے مجھے ہرگز امید نہیں کہ وہ میرا قصور معاف کر دے گا۔
واضح ہو کہ ابلیس کائنات میں نا امیدی و مایوسی کا سب سے بڑا مظہر ہے اس لئے اقبال نے اس کی زبان سے بہت بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اگر ابلیس اللہ کی رحمت سے بکلی مایوس نہ ہو جاتا تو اس دنیا میں آکر کیوں مستقل طور سے سکونت اختیار کرتا؟ اور جب وہ یہاں نہ آتا تو اس عالم رنگ و بو کے باشندوں کے دلوں میں سوز و گداز کا رنگ کیسے پیدا ہوتا؟ اور جب یہ رنگ پیدا نہ ہوتا تو زندگی کے یہ گوناگوں ہنگامے کیسے برپا ہوتے؟ از ان جملہ زن۔ زر اور زمین کی آرزو اور جستجو کرتا نہ رشک و حسد۔ رقابت اور مسابقت کا بازار گرم ہوتا نہ کوئی خسرو ہوتا نہ فرہاد۔
لہٰذا ایسی ہستی کے حق میں اقنطوا ہی بہتر ہے نہ کہ لَا تَقْنَطُوا یعنی ابلیس کہتا ہے کہ مجھے رحمت الٰہی سے نا امید رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔
لَا تَقْنَطُوا قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔
قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (۳۹ - ۵۷)
آپ کہہ دیجئے کہ اے وہ لوگو! جنہوں نے گناہ کئے ہیں اللہ کی رحمت

لہ اقبال نے اپنے مصرع میں اقنطوا کے بجائے تقنطوا لکھا ہے اگرچہ صرفی اعتبار سے تقنطوا صحیح نہیں ہے لیکن انہوں نے اگر صرف و نحو کو محاسن شعری کو حسن صرفی پر قربان کر دیا ورنہ وہ بھی جانتے تھے کہ امر کا صیغہ اقنطوا ہے نہ کہ تقنطوا۔

سے ناامید مت ہو تحقیق اللہ سب گناہ بخش دے گا۔

یہ سن کر جبرئیل نے کہا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نافرمانی کا مادہ تیری گھٹی میں پڑا ہوا ہے ورنہ تو ضرور اس بات پر غور کرتا کہ تیری اس نافرمانی اور انکار سے صرف تو ہی ذلیل و خوار نہیں ہوا بلکہ سارے فرشتوں کی بے عزتی ہو گئی۔

ابلیس نے جواب دیا کہ اے جبریل! تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ یہ انکار میرے حق میں مہجوری کا باعث تو بیشک بن گیا[1]۔ لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ میرے اندر اس قدر اخلاقی جرأت موجود ہے کہ میں نے جس بات کو صحیح سمجھا اسے بے خوف و خطر بیان کر دیا۔

اے جبریل! انسان میں جو یہ (ذوق نمو) پایا جاتا ہے یہ میری اسی جرأت رندانہ کا نتیجہ ہے۔ اگر میں انسان کے سامنے جرأت کا یہ نمونہ قائم نہ کرتا تو کسی کے اندر اپنی شخصیت کو (ASSERT) کرنے کی جرأت پیدا نہ ہوتی۔

میرا انکار بلا وجہ یعنی غیر مدلل تو نہ تھا میں نے جو کہا اس کی صحت پر عقلی دلیل[2] بھی پیش کر دی چنانچہ میرے ہی انکار کو دیکھ کر انسان کے اندر

---

[1] اسی لئے اقبال نے ابلیس کو "خواجہ اہل فراق" کا بے نظیر لقب دیا ہے۔

[2] قیاس ابلیس کی منطقی شکل یہ ہے۔

صغریٰ۔ آدم خاکی ہے۔ میں ناری ہوں

کبریٰ۔ نار خاک سے افضل ہے۔

نتیجہ۔ اس لئے میں آدم سے افضل ہوں۔

عقل و خرد سے کام لینے کا مادّہ پیدا ہوا[1]۔

اے جبرئیل! تو خیر و شر کی جنگ جو اس کائنات میں شروع سے جاری ہے ساحل پر کھڑا دیکھ رہا ہے لیکن میری ہمت پر غور کر! میں ایک فریق کی حیثیت سے اس طوفان کے طمانچے کھا رہا ہوں ساری دنیا کی لعنت کا بارگراں اپنے سر پر اٹھا رہا ہوں اس کے باوجود میرے پائے ثبات میں لغزش نہیں ہوتی۔

میں نے بحر ہستی میں وہ طوفان برپا کر رکھا ہے کہ عوام کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ حضرت خضرؑ اور حضرت الیاسؑ جیسے صاحب ہمت انسان بھی میرے سامنے بے دست و پا نظر آتے ہیں۔

حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کی زندگی میں جو کچھ دلکشی اور جاذبیت نظر آتی ہے (یعنی بدکاری کا مقابلہ کرنا اور اس پر غلبہ حاصل کر کے ارتقائی منازل طے کرنا) یہ سب میری ہی (نافرمانی کی) بدولت ہے اگر میں انکار کر کے اپنی عزت کا دیدہ و دانستہ خون نہ کرتا تو آدم کے قصہ میں یہ رنگینی کیسے پیدا ہوتی؟

اے جبرئیل! تو میرے مقام سے کیسے آگاہ ہو سکتا ہے؟ کجا میں کجا تو بیشک میں نے بارگاہ ایزدی میں اس عزت کو جو مجھے حاصل تھی ہمیشہ کے لئے

---

[1] اسی حقیقت کو مرشد رومی نے یوں بیان کیا ہے۔

ع زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

یعنی عقلیت کا رنگ ابلیس کی خصوصیت ذاتی ہے اور عشق کا جذبہ آدم کا طغرائے امتیاز ہے۔

کھو دیا لیکن اس انکار کی بدولت میں نے خدا کی نظر میں اپنی انفرادیت کا اثبات ضرور کر دیا۔

اب میرے مقابلہ میں تو اپنی حیثیت پر غور کر۔ کیا تو خدا سے دوبدو مساویانہ رنگ میں مدمقابل کی حیثیت سے گفتگو کر سکتا ہے؟ کیا تو اس کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہے؟ کیا تو اپنے کسی دعویٰ پر دلیل پیش کر سکتا ہے؟ کیا تو اپنی خودی کا اثبات کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! تیرے اندر یہ جرأت یہ حوصلہ اور یہ ہمت سرے سے موجود نہیں ہے تو کیا اور تیری بساط کیا؟ تیری کل زندگی صرف ایک لفظ سے عبارت ہے۔ یعنی اطاعت بلاچون وچرا۔

نوٹ (۱) اقبال نے اسی رنگ اطاعت کو "اللہ ھو" سے تعبیر کیا ہے (۲) آخری شعر کا پہلا مصرع محض شاعرانہ انداز بیان ہے اسے منطق کے پیمانہ سے ناپنا مناسب نہیں ہے (۳) میں نے صرف نظم کا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بخوف طوالت محاسن شعری کی وضاحت سے اغماض کیا ہے۔

قطعہ

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے دُرِ ناب دوچند
زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

●

اس قطعہ میں اقبال نے "پیر مغاں" کی زبان سے یہ نکتہ بیان کیا ہے جو بلحاظ مفہوم سچے موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے کہ جس قوم کے نوجوان خوددار

اور ہنرمند نہ ہوں اس کے حق میں مغربی تعلیم زہر کا حکم رکھتی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان نوجوان اسلامی تعلیمات حاصل کرنے سے پہلے مغربی تعلیم حاصل کریں گے تو یقیناً ان کے اندر الحاد اور بیدینی کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔

خودداری۔ سے مراد ہے اپنے دین کے اصولوں کی حفاظت اور حمایت کا جذبہ اور ہنرمندی سے مراد ہے۔ غیر اسلامی تصورات کی تردید کا سلیقہ۔

اس قطعہ میں اقبالؔ نے قوم کو یہ مشورہ دیا ہے کہ پہلے اپنے بچوں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرو۔ اس کے بعد مغربی علوم سکھاؤ۔ تاکہ وہ بیدینی اور الحاد سے محفوظ رہ سکیں اسی حقیقت کو انہوں نے ضرب کلیم میں یوں بیان کیا ہے۔

جوہر میں ہو لَا اِلٰہَ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

●

اذان

اک رات ستاروں سے کہا نجمِ سحر نے
آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار
کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر
ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار
زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا
اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار
بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی
تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار
واقف ہو اگر لذتِ بیداریِ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پراسرار
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں
کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار
ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز
وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار

○

اس نظم میں اقبال نے تمثیل (ALLEGORY) کے پردہ میں بیداریِ شب (قیام اللیل) کی لذت اور اہمیت کو ذہن نشین کیا ہے واضح ہو کہ تمثیل دراصل استعارہ کی ایک قسم ہے جس میں کسی خاص موضوع

کو دوسرے موضوع کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ بیان میں دلکشی اور تاثیر پیدا ہو جائے اور ہر شخص اس کو بآسانی سمجھ سکے۔

نجم سحر۔ سے وہ ستارہ مراد ہے جو پچھلی رات کو طلوع ہوتا ہے اور بہت روشن ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے (JUPITER) کہتے ہیں۔

مریخ۔ یا منگل (MARS) ایک سیارہ ہے اسے جلاد فلک بھی کہتے ہیں۔

زہرہ یا شکر (VENUS) بھی ایک سیارہ ہے جسے رقاصہ فلک بھی کہتے ہیں۔

کرمک شب کور۔ لغوی معنی وہ کیڑا جسے رات میں کچھ نظر نہیں آتا شب کور یعنی اندھا یا چندھا۔ کنایہ ہے انسان سے۔

ثریا۔ (PLEIADES) جسے پروین بھی کہتے ہیں یہ سات ستاروں کا مجموعہ ہے اسی لئے ہندی میں اسے سپت رشی کہتے ہیں۔

خاک پراسرار۔ کنایہ ہے انسان سے پراسرار اس لئے کہا کہ انسان کے اندر بہت سی طاقتیں پوشیدہ ہیں چنانچہ اشراق۔ یوگ اور تصوف انہی طاقتوں کو بروئے کار لانے کے مختلف طریقے ہیں۔

اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ ستارہ صبح نے ایک رات ستاروں سے یہ دریافت کیا کہ کیا تم میں سے کسی نے آدم (بنی آدم) کو آخر شب میں بیدار (سر بسجدہ) دیکھا ہے۔

یہ سوال نجم سحر نے اس لئے کیا کہ اس نے آدم کو آخر شب میں کبھی بیدار نہیں دیکھا اس سوال کے پردہ میں اقبال اس تلخ حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ آخر شب بیدار ہو کر سربسجود ہوں لیکن افسوس کہ وہ اس وقت جبکہ رحمت باری کا نزول ہوتا ہے خواب غفلت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے بھی اس بات کو اپنے مخصوص رنگ میں

یوں ادا کیا ہے۔

موذن سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے
اسی پر شیخ بیچارے نے چھاتی اپنی پیٹی ہے
کہاں باقی رہے ہیں ہم میں وہ انداز سحر گاہی
وظیفہ کی جگہ اب پائونیر یا آئی ڈی ٹی ہے

نوٹ پائونیر (PIANEER) سے وہ نیم سرکاری انگریزی روزنامہ مراد ہے جو الہ آباد سے شائع ہوتا تھا۔

آئی ڈی ٹی (انڈین ڈیلی ٹیلیگراف یا وہ انگریزی روزنامہ جو لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔

یہ سن کر مریخ نے جواب دیا کہ ارکنان قضا و قدر بڑے حقیقت شناس ہیں۔ وہ بہت اچھا کرتے ہیں جو اس چھوٹے سے فتنہ کو سونے دیتے ہیں کیونکہ اگر انسان اس وقت بیدار ہو کر خدا کے سامنے سر بسجود ہو جائے تو دنیا سے قتل و غارت اور فتنہ و فساد کا سلسلہ ہی مفقود ہو جائے۔

مریخ نے یہ بات اس لئے کہی کہ اگر بنی آدم خدا پرست ہو جائیں تو اس کا وجود بیکار ہو جائے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ از روئے علم نجوم (جیوتش) دنیا میں جس قدر خونریزی ہوتی ہے وہ سب مریخ کے اثر سے ہوتی ہے اسی لئے مریخ نے غفلت آدم پر اظہار اطمینان کیا

یہ سن کر زہرہ نے نجم السحر سے کہا کہ تمہارے پاس گفتگو کا کوئی اور موضوع نہیں ہے۔ ہمیں اس سے کیا واسطہ کہ انسان جاگتا ہے یا سو رہا ہے؟

مریخ اور زہرہ دونوں کے جواب سے یہ بات عیاں ہے کہ انہیں انسان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے لیکن چاند کا طرز عمل ہمدردانہ نظر آتا ہے چنانچہ وہ

کہتا ہے کہ انسان کو اکب ارتقی ہے جس طرح تم رات میں نمودار ہوتے ہو وہ دن میں ظاہر ہوتا ہے۔

اگر انسان اس بات سے آگاہ ہو جائے کہ پچھلی رات کو اٹھنے سے کس قدر روحانی فیوض حاصل ہوتے ہیں تو وہ روحانیت کے لحاظ سے عقد ثریا سے بھی بلند ہو جائے اس کے سینے میں اللہ کی وہ تجلیات پوشیدہ ہیں کہ ان کے سامنے آسمان کے سیاروں اور ستاروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اسی اثنا میں جبکہ چاند اجرام فلکی کو حضرت انسان کی حقیقت سے آگاہ کر رہا تھا موذن کی آواز نے عالم کو تکبیر سے معمور کر دیا۔ یہ تکبیر کیا ہے؟ اقبال کی رائے میں یہ وہ نعرہ ہے جس کی ہیبت سے انسان تو کیا چیز ہے۔ پتھر بھی پانی ہو جاتا ہے اسی حقیقت کو انہوں نے ضرب کلیم میں یوں بیان کیا ہے۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اقبال نے اس نظم کو اذان پر ختم کیا ہے مقصد یہ ہے کہ اگر مسلمان ثریا سے بھی اونچا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو موذن کی اذان پر لبیک کہنے کی عادت پیدا کریں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ سحر خیزی کو شعار زندگی بنا لیں۔

نوٹ:۔ اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں (سحر خیزی) کی اہمیت کو واضح کیا ہے کیونکہ مقصد حیاتِ مسلم تزکیۂ نفس ہے اور اس کے لئے سحر خیزی پہلی شرط ہے بقول حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب نقشبندی بھوپالی مدظلہ العالی سحر خیزی بیداری قلب انسانی کے حق میں وہی حکم رکھتی ہے جو شبنم نشو ونمائے نباتات کے حق میں۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ

رات کو ۳ بجے بیدار ہو کر یاد الٰہی میں مصروف ہو جاتے تھے۔ دیکھئے ہم کب تک لذت بیداری شب سے آگاہ ہو سکیں گے۔

میرا تجربہ یہ ہے کہ انسان جس قدر نفسانی خواہشات کا غلام اور مادیات میں گرفتار ہو گا اسی قدر سحر خیزی سے متنفر ہو گا اور اس کے زاویہ نگاہ سے جو شخص دوسروں کو آخر شب میں بیدار کرتا ہے سوسائٹی کا سب سے بڑا مجرم ہے چنانچہ یہ شعر اسی ذہنیت کا مظہر ہے۔

دی مؤذن نے شب وصل اذان پچھلے پہر
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

قطعہ

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

•

اس نظم میں اقبالؔ نے ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ دنیا میں مذہب کی دو بنیادی قسمیں ہیں۔ ایک ذی شعور ہستیوں کا مذہب دوسرا غیر ذی شعور ہستیوں کا۔ اگرچہ اقبالؔ نے یہ لکھا ہے کہ اس قطعہ کا انداز

بیان چنداں شوخ نہیں ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اس نظم کی ساری دلکشی انداز بیان کی شوخی ہی پر موقوف ہے۔

واضح ہو کہ اس نظم میں مذہب سے اقبال کی مراد زندگی بسر کرنے کا طریقہ ہے۔ جسے قرآن حکیم نے "دین" سے تعبیر کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ دنیا میں دو مذہب پائے جاتے ہیں اب یہ مسلمانوں کی مرضی ہے جس کو چاہیں اختیار کر لیں ایک مذہب انسان کو دن رات نعرۂ تکبیر بلند کرتے رہنے یعنی جہاد میں مصروف رہنے کی تلقین کرتا ہے یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جو اپنی خودی سے آگاہ ہیں اور اس لئے عشق الٰہی میں سرشار ہیں۔

دوسرا مذہب انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہر وقت حجرہ (خانقاہ) میں بیٹھے ہوئے اور وظائف میں مشغول رہو یہ مذہب جمادات و نباتات کا اور ان انسانوں کا ہے جو اپنی خودی سے ناواقف ہیں۔

"ملّا" سے مراد ہے وہ مسلمان جو عوام کو صرف ارکان ظاہری کی تعمیل میں منحصر کرتا ہے اور اس کی روح کے تقاضوں سے یا تو بے خبر ہے یا دانستہ تغافل کرتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ دو مذہب دراصل ایک ہی مذہب یعنی دین اسلام کی دو مختلف تعبیریں ہیں اور ایک بات کو دو کہنا۔ بلکہ ثابت کر دینا یہی تو انداز بیان کی شوخی ہے۔

جو مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام صرف ارکان ظاہری کی پابندی کا نام ہے وہ اقبال کی نظر میں نباتات کے خانہ (category) میں ہے کیونکہ تسبیح اور مناجات تو جمادات اور نباتات کا فریضہ اگر انسان بھی اپنی زندگی حمد و ثنا اور مناجات ہی میں بسر کر دے تو پھر اس میں نباتات میں کیا فرق ہے۔

اسلام تو "تکبیر مسلسل" یعنی جہادِ پیہم کا دوسرا نام ہے اور جو مسلمان اسلام کے اس تصور سے بیگانہ ہے وہ "ملّا" ہے اور اسی لئے اقبال نے اس کا شمار جمادات اور نباتات میں کیا ہے جیسا کہ آخری مصرع سے واضح ہے خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس میں اور نباتات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

محبّت

شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی
محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی
وہ کچھ اور شئے ہے محبت نہیں ہے
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی
یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی
نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوبِ سلطاں
محبت ہے آزادی و بے نیازی
مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

○

اس مختصر مگر بغایت دلکش نظم میں اقبال نے محبت (Love) کی خصوصیات بہت سلیس انداز میں بیان کی ہیں۔
پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی محبت میں فنا ہو جاتا ہے

وہ ہر قسم کے مذہبی تعصبات سے بالاتر ہو جاتا ہے اس لئے وہ کافر اور مسلم دونوں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔

محبت کسی ملک یا قوم سے مختص نہیں ہے یہ ایک عالمگیر یا آفاقی جذبہ ہے جو ہر قسم کی نسلی قومی لسانی وطنی اور جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ محبت مادیات یا فانی اشیاء سے متعلق نہیں ہوتی اگر کوئی انسان کسی فانی انسان سے محبت کرے تو وہ محبت نہیں ہے بلکہ نفس پرستی ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں کہ محبت صرف اس ہستی سے کرنا چاہئے جسے کبھی موت نہ آئے اور وہ ذات صرف اللہ کی ہے۔

غزنوی سے سلطان محمود غزنوی مراد ہے جو اپنے غلام ایاز سے بہت محبت کرتا تھا۔ چنانچہ سعدی لکھتے ہیں۔

محمود غزنوی کہ ہزاروں غلام داشت
عشق چناں گرفت غلام ایاز شد

محبت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسی کی بدولت فلسفہ اور سائنس بنی آدم کے حق میں مفید ہو سکتے ہیں چنانچہ جو قوم اس نعمت کبریٰ سے محروم ہے وہ اپنے علوم و فنون سے بنی آدم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتی بلکہ ان کو سراسر عیاری اور فریب کاری کے لئے استعمال کرے گی جیسا کہ اقوام مغرب کا موجودہ طرز عمل اس بات پر شاہد ہے۔

محبت کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ عاشق، نہ کسی دنیاوی بادشاہ کا دست نگر ہوتا ہے اور نہ اس سے ڈرتا ہے یعنی محبت انسان کو آزادی (حریت نفس) اور بے نیازی کی دولت سے مالا مال کر دیتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ دو خوبیاں انسان کے اندر صرف محبت الٰہی کی بدولت

پیدا ہو سکتی ہیں اور کوئی صورت نہیں ہے چنانچہ دیکھ لیجئے دنیاوی بادشاہ اور حکمراں دونوں پابند غیر بھی ہیں اور محتاج غیر بھی۔ مثلاً اگر ایڈورڈ ہشتم سابق شاہ انگلستان آزاد ہوتا تو وہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کر سکتا تھا لیکن دنیا جانتی ہے کہ جب تک وہ تخت و تاج سے بکلی دست بردار نہیں ہوا مسز سمپسن ایک مطلقہ خاتون سے نکاح نہ کر سکا۔ اقبالؔ نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی تھی جو ارمغانِ حجاز میں "معزول شہنشاہ" کے عنوان سے اسرار ملوکیت کو واضح کر رہی ہے صرف ایک شعر اس جگہ درج کرتا ہوں۔

شاہ ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بت
جس کو کر سکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش

اب رہی احتیاج۔ تو ہر عقلمند آدمی جانتا ہے کہ ہر بادشاہ مجلس وزراء اور مجلس عوام کی خوشنودی کا ہر لحظہ محتاج ہے اگر عوام اپنے بادشاہ سے بدظن ہو جائیں تو انجام کار اسے تخت و تاج سے دست بردار ہو کر اپنی بے کیف زندگی کے باقی ماندہ ایام روم کے کسی ہوٹل میں بسر کرنے پڑیں گے[1]

ان خصوصیات کی تفصیل کے بعد اقبالؔ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مومن کی شان فقر (بوریا نشینی) دبدبۂ اسکندری (ملوکیت) سے بدرجہا بہتر ہے کیونکہ بادشاہ کا منتہائے مقصود مادی عروج یا ظاہری شان و شوکت ہے لیکن فقر (مومن) تو اپنی نگاہ کی بدولت آدمیوں کو انسان بنا دیتا ہے[2] یعنی

---

[1] اشارہ ایست بجانب سابق شاہ افغانستان امیر امان اللہ خاں۔ کہ روز نگارش عبارت است از مہجوری و رنجوری۔

[2] بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا (غالبؔ)

خدا سے ملا دیتا ہے۔

"آئینہ سازی" میں صنعتِ ایہام ہے۔ اس کے دو معنی ہیں۔

۱ ۔ آدم گری کے مقابلہ میں اس کا معنی ہے۔ آئینہ گری یعنی ادنیٰ درجہ کی فتوحات یا مادی کامیابی۔

۲ ۔ اسکندری کی نسبت سے۔ اس لفظ سے مراد ہے وہ آئینہ جو ارسطو نے سکندر رومی کے لئے بنایا تھا اور اس کو سکندریہ کے ایک بلند مینار کی چوٹی پر نصب کر دیا تھا۔ تاکہ وہ دشمنوں کے جہازوں کو دور سے آتا ہوا دیکھ سکے خلاصۂ کلام اینکہ شانِ فقر، شانِ ملوکیت سے برتر ہے۔

قطعہ

ستارہ کا پیغام

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

•

یہ دو شعر، اقبال کی پروازِ فکر اور مضمون آفرینی پر شاہد ہیں وہ صرف یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ اے مخاطب! تو خود اپنا چراغ بن۔ دوسروں کے سہارے زندگی مت بسر کر لیکن اس بات کے کہنے کا جو اسلوب بیان انہوں

نے اختیار کیا ہے اس نے ان شعروں کو آسمان پہ پہونچا دیا ہے۔

ستارہ انسان سے کہتا ہے کہ میری ذات میں پاکی اور تابندگی ہے اس لئے میں فضا کی تاریکی سے متعلق خوف زدہ نہیں ہوں۔ لہٰذا میں تجھے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تو بھی اپنے اندر یہ دونوں صفات پیدا کرلے تاکہ تو بھی اپنا راستہ بے خوف و خطر طے کر سکے۔

مطلب یہ ہے کہ ستارہ تاریکی میں طلوع ہوتا ہے لیکن وہ اپنا راستہ اپنی ذاتی روشنی کی بدولت بے کھٹکے طے کرتا ہے اسی طرح انسان بھی مسافر شب ہے۔ ان دو لفظوں میں بڑی بلاغت پائی جاتی ہے۔ مسافر سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ یہ دنیا انسان کی مستقل قیام گاہ نہیں ہے "اور شب" کنایہ ہے ان دشواریوں سے جو انسان کو اس دنیا میں پیش آتی ہیں یعنی قدم قدم پر صراط مستقیم سے بھٹک جانے کا امکان ہے۔

اندریں حالات انسان کو لازم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر تقوی کی بدولت پاکی اور اعمال صالحہ کی بدولت درخشانی کا رنگ پیدا کرے تاکہ اپنا راستہ اپنی ذاتی خوبیوں کی بنا پر کامیابی کے ساتھ طے کر سکے۔

"داغ جگر" سے وہی پاکی اور درخشانی مراد ہے جو تقوی اور اعمال صالحہ کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے اور یہ دونوں عشق سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں عشق کا دوسرا نام "داغ جگر" بھی ہے۔

ان تمام تفصیل کا خلاصہ وہی ہے جو میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو دریوزہ گری سے اجتناب لازمی ہے کیونکہ سوال سے خودی ضعیف ہو جاتی ہے اسی حقیقت کو انہوں نے اپنی تمام کتابوں میں مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ مثلاً

تا کجا طوفِ چراغِ محفلے
ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ
الحذر از منتِ غیر الحذر

جاوید کے نام

(لندن میں اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آنے پر)

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

●

یہ انتہائی بلیغ نظم اقبال نے اپنے فرزند دلبند جاوید سلمہٗ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط پڑھنے کے بعد سپرد قلم کی تھی چنانچہ اس میں از اول تا آخر پدرانہ شفقت کا رنگ نظر آتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ مرحوم اپنے لخت جگر میں کون کون سی خوبیاں دیکھنی چاہتے تھے۔

بظاہر اس نظم میں انہوں نے اپنے بیٹے سے خطاب کیا ہے۔ لیکن بباطن اس کا اطلاق تمام فرزندانِ ملت پر ہو سکتا ہے کیونکہ میری نظر میں حضرت اقبال ملت اسلامیہ کے باپ تھے انہوں نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کی خدمت میں بسر کی۔ میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ساری عمر ملت کے غم میں تڑپتے رہے اور اسی تڑپ کا یہ نتیجہ تھا کہ جس شخص کو بھی ان کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع نصیب ہوا۔ اس کے اندر بھی یہی رنگ پیدا ہو گیا کسی میں کم کسی میں زیادہ اور انہیں اس بات کا اس قدر شدید احساس تھا کہ وہ اس کو حاصل زندگی سمجھتے تھے چنانچہ اپنے آقا اور مولیٰ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں۔

حضور ملّتِ بیضا تپیدم
نوائے دل گدازے آفریدم

ادب گوید سخن را مختصر گو
تپیدم آفریدم آرمیدم

پہلا شعر:- کہتے ہیں کہ اے جاوید! اگر خدا تجھے توفیق عطا

فرمائے تو اس کی محبت میں اپنے کو فنا کر کے حیات جاوید حاصل کرے اگر تو نے یہ راستہ اختیار کر لیا تو یقیناً تجھ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ تو دنیا میں انقلاب پیدا کر دے گا۔

واضح ہو کہ اقبالؔ کے نظام افکار میں تخلیق عالم نو کو بہت اہمیت حاصل ہے ان کے فلسفہ اور پیغام کی غایت ہی یہ ہے کہ مسلمان میں قوت پیدا ہو جائے کہ وہ نیا زمانہ یا نئی دنیا پیدا کر سکے۔ یہ نئی دنیا کیا ہے؟ یا اس سے ان کی مراد کیا ہے۔ اس کا جواب تو بہت تفصیل طلب ہے میں اجمالاً اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ اقبالؔ کا مطلب اس سے یہ ہے کہ جس طرح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نئی دنیا پیدا کر دی۔ دنیا میں سب سے بڑا انقلاب برپا کر دیا اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بھی حضور کے نقش قدم پر چل کر دنیا میں انقلاب برپا کریں اور وہ انقلاب اس کے سوا اور کیا ہے کہ مسلمان دنیا کو۔ اسی دنیا کو جو اس وقت تاریکی میں غرق ہے قرآن حکیم کی تعلیمات سے روشناس کرائیں چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

واضح ہو کہ اس جہان کو بدل دینا ہی اقبالؔ کے پیغام کا حقیقی مقصد ہے جسے انہوں نے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔

دوسرا شعر:۔ اگر خدا تجھے مطالعۂ فطرت کا ذوق عطا کرے تو تجھے لالۂ و گل سے اس کی ہستی کا ثبوت مل سکتا ہے۔ سکوت لالہ و گل سے کلام میں صنعت تضاد پائی جاتی ہے اور یہ ایک دلکش انداز ہے اس بات کے کہنے کا مقصد یہ کہ اگرچہ لالہ و گل زبان نہیں رکھتے لیکن اگر کوئی فطرت شناس

ان کی بناوٹ پر غور کرے تو وہ زبان حال سے خالق و صانع کائنات کے وجود پر گواہی دیں گے اکبر الٰہ آبادی نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے

صاف آئے گی نظر صانعِ عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھو آئینۂ فطرت کے سوا

تیسرا شعر: شیشہ گرانِ فرنگ سے یورپ کی وہ قومیں مراد ہیں جو عیاری و مکاری میں شہرۂ آفاق ہیں۔

شیشہ گر کے لغوی معنی ہیں۔ کانچ کے برتن بنانے والا اقبال نے اس لفظ کو اقوام مغرب کے لئے استعمال کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان قوموں کے اصول زندگی پائیدار نہیں ہیں نیز ان کے معاہدے کانچ کے برتنوں کی طرح کمزور اور ناقابل اعتماد ہیں ان کے علوم و فنون اور خیالات میں بھی پختگی اور افادیت نہیں پائی جاتی غرضکہ اقبال کی یہ اصطلاح مغربی اقوام کی پوری زندگی پر صادق آسکتی ہے احسان نہ اٹھانے سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ ان کی تہذیب اور ان کی معاشرت مت اختیار کرو ان کے افکار اور خیالات کو مت قبول کرو۔ جو علوم و فنون انہوں نے ایجاد کئے ہیں ان کو بیشک حاصل کر سکتے ہو لیکن ان اقوام کی تقلید مت کرو۔

دوسرے مصرع کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر شراب پینا چاہتے ہو تو ان پیالیوں میں پیو جو ہندوستان کی مٹی سے بنے ہوئے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے وطن سے اور اپنی تہذیب سے محبت کرو۔

سفال پاک سے مینا و جام پیدا کر

واضح ہو کہ اقبال وطن دوستی میں کسی بڑے سے بڑے نیشنلسٹ سے کم نہیں تھے انہوں نے ساری عمر ہند کے مسلمانوں کو وطن دوستی کا پیغام دیا

اگر میں اس جگہ ان اشعار کو نقل کردوں تو یہ شرح ان کی متحمل ہو سکتی اس لئے آخری تصنیف ۔ ارمغان حجازہ سے صرف ایک شعر نقل کرتا ہوں ۔

پیامے دہ ز من ہندوستان را
غلام آزاد از بیداری دل

چوتھا شعر: اقبال نے اپنے آپ کو انگور کی بیل سے اور اپنے کلام کو خوشۂ انگور سے تشبیہ دی ہے اور اپنے فرزند جگر پیوند کی وساطت سے نوجوانانِ ملت کو یہ پیغام دیا ہے کہ اس خوشہ سے دو مئے لالہ فام، پیدا کر، کا مطلب یہ ہے کہ میرے کلام کے مطالعہ سے اپنے اندر مذہبی ملی اور سیاسی شعور پیدا کرو۔

پانچواں شعر: یہ شعر اس نظم ہی کی جان نہیں ہے بلکہ اقبال کے تمام کلام کی جان اور ان کے سارے فلسفہ کی روح ہے۔ غور سے دیکھو تو ان کا پیغام اس کے سوا اور کیا ہے کہ اپنی خودی کو کسی قیمت پر فروخت مت کرو چنانچہ انہوں نے اسی حقیقت کو اس شعر میں واضح کیا ہے ۔

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

اگر انسان حرص دنیوی سے قطع نظر کرکے غور و فکر سے کام لے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح اس پر واضح ہو سکتی ہے کہ غریبی میں بھی نام پیدا کیا جا سکتا ہے. میرا مطلب یہ ہے کہ انسان عزت اور شہرت ہی حاصل کرنے کے لئے اپنی خودی کو بیچتا ہے اور اس کے عوض دولت حاصل کرتا ہے اور دولت کے ذریعہ سے اپنا مقصود یعنی شہرت حاصل کرتا ہے اقبال کہتے ہیں کہ اگر انسان ہمت اور استقلال سے کام لے تو غریبی میں ہی نام پیدا کر سکتا ہے لہٰذا نام پیدا کرنے

کے لئے ضمیر فروشی کی ضرورت نہیں ہے۔

اقبالؔ کے زمانہ میں یعنی ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان اس "انتخاب ہفت کشور" کے بعض مسلمانوں نے (جن کا نام ظاہر کرنا خلاف مصلحت ہے۔ انگریز کے بازار سیاست میں اپنی خودی کو بیچ کر سہ حرفی اور چہار حرفی خطابات مثلاً کے۔بی۔ای اور کے۔سی۔ایس۔آئی۔بھی حاصل کئے اور نام بھی پیدا کیا لیکن نہ انہیں حسینؓ کا لقب نصیب ہو سکا اور نہ سکندر کی حیات حاصل ہو سکی ان لوگوں کے مقابلہ میں اقبالؔ نے اپنی زندگی کے دن موٹر۔ ٹیلیفون اور اردلی کے بغیر محض اللہ کی بندہ پروری کی بدولت گذار دیئے۔ مگر آج ۱۹۵۱ء میں کوئی شخص ان خطاب یافتہ حضرات کا تذکرہ بھی نہیں کرتا لیکن غریب اور گوشہ نشین اقبال کا نام سارے ملک کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اور ہر شخص خواہ وہ گورنر جنرل ہو اور چاہے ایک مدرسہ کا طالب علم اس کے کلام سے تسکین قلب کا سامان مہیا کرتا ہے اور اس کا مزار بلا مبالغہ زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ملک کا ہر جوان اس مصرع کو لوح دل پر کندہ کرے۔

ع خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

سچ تو یہ ہے کہ اقبال نے یہ مصرع نہیں لکھا ہے دو لفظوں میں قوموں کے عروج کا فلسفہ بیان کر دیا ہے میرے محدود مطالعہ کے مطابق وہ قوم دنیا میں کبھی سر بلند نہیں ہو سکتی جس کے افراد خود فروشی کے مرض میں مبتلا ہوں خود فروشی تو غلامی کی تمہید ہے اسی لئے اقبالؔ نے ہمیں متنبہ کر دیا ہے۔

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

فلسفہ و مذہب

یہ آفتاب کیا یہ سپہر بریں ہے کیا
سمجھا نہیں تسلسلِ شام و سحر کو میں

اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں
ڈرتا ہوں دیکھ دیکھ کے اس دشت و در کو میں

کھلتا نہیں مرے سفرِ زندگی کا راز
لاؤں کہاں سے بندۂ صاحب نظر کو میں

حیراں ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

●

اگر پڑھنے والے کا مقصد صرف ذہنی مسرّت حاصل کرنا ہو تو یہ نظم بہت آسان ہے شرح کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر اقبالؔ کے مفہوم سے آگاہی مدنظر ہو تو یہ نظم بہت مشکل ہے اور اس کی شرح میں ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے

واضح ہو کہ کائنات میں حقیقت کی اب تک چار صورتیں دریافت ہو سکی ہیں یعنی تصوّف۔ سائنس۔ فلسفہ اور مذہب۔ تلاش اور تحقیق ہر انسان کی سرشت میں داخل ہے ہر شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ حقیقت کیا

ہے؟ اور میں اس تک کیسے پہونچ سکتا ہوں؟ انسانی دماغ نے اب تک اس کے چار طریقے دریافت کئے ہیں؟ مقصد ان چاروں کا ایک ہی ہے یعنی یہ معلوم کرنا کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟

(تصوف) ایک گروہ سمجھتا ہے کہ واقعی جلوہ گری تو ذات واحد کی ہے جس کے سوا اور کوئی موجود نہیں ہے اور اس کا نام خدا ہے۔

(سائنس) دوسرا گروہ کہتا ہے کہ واقعی جلوہ گری تو ذات واحد ہی کی ہے لیکن اس کا نام خدا نہیں ہے بلکہ مادہ ہے۔

(فلسفہ) تیسرا گروہ کہتا ہے کہ عقل انسانی اس باب میں حیران اور سرگرداں ہے۔ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ کیونکہ

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

(مذہب) چوتھے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کا فرض منصبی یہ نہیں کہ وہ اسرارِ کائنات کا حل دریافت کرے یہ اپنی ناقص اور محدود عقل کی مدد سے راز دہر کے چہرے سے نقاب اٹھانے کی کوشش کرے بلکہ یہ معلوم کرے کہ میرا مقصد حیات کیا ہے؟ بالفاظ واضح تر خدا جو میرا خالق ہے وہ مجھ سے کیونکر راضی ہو سکتا ہے یا فلاح اخروی کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

اقبال چونکہ نہ صوفی تھے نہ سائنسداں اس لئے انہوں نے تصوف اور سائنس سے قطع نظر کر کے فلسفہ اور مذہب کا باہمی رشتہ واضح کیا ہے۔

واضح ہو کہ فلسفہ اور مذہب کے باہمی رشتہ پر یورپ اور امریکہ میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں نیز "تعارف فلسفہ" کے موضوع پر جس قدر کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب میں اس اہم مبحث پر اظہار خیال کیا گیا ہے مثال کے طور پر مشہور مصنف پروفیسر پالسن (POLSPM) نے اس موضوع پر قابل

قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ فلسفہ کے طلبہ کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

اقبالؔ نے اپنی اس نظم کے پہلے تین شعروں میں دو بنیادی سوال پیش کئے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق فلسفہ سے ہے دوسرے کا مذہب سے۔

۱ ۔ یہ اجرام فلکی۔ آفتاب۔ ماہتاب اور خود فلک کہاں سے آئے؟ کیونکر پیدا ہوئے۔ دن اور رات کا تسلسل کیسے قائم ہوا؟ یعنی زمان ومکان کی حقیقت کیا ہے؟ ع اپنے وطن میں ہوں کہ غریب الدیار ہوں ۔ یعنی میری اصل مادی ہے یا روحانی؟

یہ سب سوالات فلسفہ سے متعلق ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں فلسفہ آج تک کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا۔ کیونکہ اکبرؔ الٰہ آبادی نے کہا ہے۔

انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے

افلاطون نے کیسی پتہ کی بات کہی ہے کہ فلسفہ کی ابتدا بھی حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی حیرت ہی پر ہوتی ہے۔

۲ ۔ یہ مسلم ہے کہ میں اس کائنات میں موجود ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ
ع میرے ہنگامہ ہائے نو بنو کی انتہا کیا ہے (ارمغان)

یعنی میری اس حیات ارضی کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو معلوم نہیں ہو سکتا۔ کہ میں کہاں سے آیا ہوں؟ اور کب آیا ہوں؟ لیکن کیا یہ بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ میں کیوں آیا ہوں یعنی سفر زندگی کا راز کیا ہے۔؟

فلسفہ اور مذہب کے ان دو بنیادی سوالوں کو اقبالؔ نے ابن سینا

اور مرشد رومیؒ کی زبان سے یوں ادا کیا ہے۔؟

بو علی حیران ہے کہ میں کہاں سے آیا ہوں لیکن رومی حیران نہیں بلکہ یہ سوچتا ہے کہ میری منزل مقصود کیا ہے ؟

اقبالؒ کے اس معرکۃ الآرا شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ بو علی حیران کھڑا ہے لیکن رومیؒ حیران نہیں ہیں بلکہ سوچ رہے ہیں یہ امتیاز صرف اقبال ہی پیدا کر سکتے تھے ارباب علم کی لذت اندوزی کے لئے اسی قدر اشارہ کافی ہے۔

سوال یہ ہے کہ رومی کیوں حیران نہیں ہیں؟ اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہیں کہ عقل انسانی انکشافِ حقائق کی اہلیت نہیں رکھتی اس لئے وہ اس کو تکلیف مالا یطاق میں مبتلا کر کے دردِ سر مول نہیں لیتے وہ جانتے ہیں کہ عقل کا سرمایہ ظن و تخمین کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور

ع — راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

وہ بخوبی واقف ہیں کہ عقل حریم ناز میں بار نہیں پا سکتی اس لئے انہوں نے عقل کے بجائے عشق کو اپنا راہنما بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دست رومی پردۂ محمل گرفت

واضح ہو کہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو اس شعر میں پیش کیا ہے۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

مطلب یہ ہے کہ مذہب انسان کی توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے کہ مقصدِ حیات کیا ہے؟ انسانی جدوجہد کی انتہا کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ

رازِ حیات معلوم کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے لیکن مقصدِ حیات معلوم ہو سکتا ہے۔ اور یہ علم مفید بھی ہے۔

آخر میں اقبالؔ نے غالبؔ کے شعر کو بڑی عمدگی کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے بلکہ اصطلاحی انداز میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اقبالؔ نے غالبؔ کے اس شعر پر تضمین کی ہے۔

بالِ جبریل میں پہلا مصرع یوں ہے۔

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رَو کے ساتھ

لیکن دیوانِ غالب میں یہ مصرع یوں ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ

—(۵)—

یورپ سے ایک خط

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحرِ پُر آشوب و پُر اسرار ہے رومی

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبالؔ
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام
کہتے ہیں چراغِ رہِ احرار ہے رومی

جواب

کہ نباید خورد و جَو ہم چوں خراں
آہوانہ در ختن چر ارغواں

ہر کہ کاہ و جَو خورد قربان شود
ہر کہ نورِ حق خورد قرآں شود

●

یہ ایک فرضی عنوان ہے جس کی وساطت سے اقبالؔ نے اپنے مرشد رومیؔ کے دو شعروں کو پیغام کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اہلِ مغرب کی مادہ پرستانہ ذہنیت کو مدِنظر رکھئے تو آپ خود تسلیم کریں گے کہ اس دور کے لوگوں کے لئے اس سے بہتر اور کوئی پیغام نہیں ہو سکتا صرف امریکہ کے باشندے بارہ ارب روپیہ سالانہ تفریح پر اور آٹھ ارب روپیہ سالانہ سینما پر خرچ کر دیتے ہیں۔

" خوگرِ محسوس سے وہ قوم مراد ہے جس کا زاویۂ نگاہ مادّہ پرستانہ ہو۔

" ساحل کے خریدار سے وہ قوم مراد ہے جس کی رسائی صرف مادی علوم تک ہو۔

" بحرِ پُرآشوب و پُراسرار سے روحانی حقائق و معارف مراد ہیں جن کے سمجھنے کے لئے بصیرت درکار ہے۔

" قافلۂ شوق سے اصحابِ معرفت یا روحانیت کے علمبرداروں کی جماعت مراد ہے۔"

" احرار سے وہ لوگ مراد ہیں جو علائق مادّی اور خواہشات نفسانی سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔

اہلِ یورپ نے اقبالؔ کو ایک خط میں یہ لکھا کہ ہم لوگ چونکہ مادہ پرستی کو شعارِ زندگی بنا چکے ہیں اس لئے ہماری رسائی صرف مادی علوم تک ہے چونکہ رومیؔ کا کلام روحانی حقائق و معارف سے لبریز ہے اس لئے ہم اس سے استفادہ نہیں کر سکتے لیکن آپ (اقبال) بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا پیشوا

رومی ہے اس لئے ہم آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ انھوں نے موجودہ زمانہ کے لوگوں کو بھی کوئی پیغام دیا ہے؟ یہ سوال ہم نے آپ سے اس لئے کیا ہے کہ ہم نے معتبر ذرائع سے یہ سنا ہے کہ رومی کا کلام (مثنوی) ان لوگوں کے لئے چراغ راہ کا حکم رکھتا ہے جو روحانیت اور معرفت کے دلدادہ ہیں۔

اقبال نے اس خط کے جواب میں یہ لکھا کہ بیشک رومی کی مثنوی جواہرات کی کان ہے۔ میں آپ کے فائدہ کی غرض سے دو شعر ذیل میں درج کرتا ہوں جو عصر حاضر کے حق میں زندگی کا مقام ثابت ہو سکتے ہیں۔

کہ نباید خورد و جو ہمچوں خراں	آہوانہ در ختن چر ارغواں
ہر کہ کاہ و جو خورد قرباں شود	ہر کہ نور حق خورد قرآں شود

"کاہ و جو" سے مراد ہیں وہ مادی علوم و فنون جو روحانیت کو فنا کر دیتے ہیں۔

"خراں" سے مراد ہے بیوقوف لوگ۔

"ختن" چینی ترکستان میں، ایک ضلع ہے جہاں کے ہرنوں کی ناف سے بہترین قسم کا مشک نکلتا ہے۔

"ارغواں" ایک پودا ہے جس کے پھول بہت دلکش سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ چین اور ختن کے علاقوں میں یہ پودا بکثرت اُگتا ہے چونکہ اس کا رنگ بہت دلکش ہوتا ہے اسی لئے سرخ شراب کو شراب ارغوانی کہتے ہیں۔

مرشد رومی فرماتے ہیں کہ گدھوں کی طرح گھاس اور جو مت کھاؤ بلکہ ختن کے ہرنوں کی طرح گل ارغواں کھاؤ۔ یاد رکھو جو شخص گھاس اور جو کھاتا ہے اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ گائے بکریوں کی طرح قربانی کے کام آجائے لیکن جو شخص نور حق کھاتا ہے وہ قرآن بن جاتا ہے۔

مطلب اس کا یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی قدر و قیمت تشکیل سیرت پر

موقوف ہے اور سیرت کی تشکیل صرف دینی علوم کی تحصیل سے ہو سکتی ہے اس لئے انسان کو اپنی تمام تر توجہ قرآن و حدیث کا صحیح علم حاصل کرنے پر مبذول کرنی چاہئے۔

اگر ایک شخص نورِ حق حاصل کرنے کے بجائے مادی علوم کی تحصیل کو اپنا مقصدِ حیات بنائے گا تو دنیاوی اعتبار سے خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ حاصل کرے انسانیت کے دربار میں اسے جگہ نہیں مل سکتی یعنی روحانی اعتبار سے اس پر موت طاری ہو جائے گی لیکن جو شخص کلام الٰہی کا مطالعہ اور دینی علوم کی تحصیل کو اپنا مقصد زندگی قرار دے گا وہ دنیا میں قرآن مجید کی طرح محترم بلکہ مجسم کلام الٰہی بن جائے گا۔

اقوام مغرب جیسا کہ سب جانتے ہیں سائنس اور دیگر علوم و فنون میں مہارت تامہ کے باوجود تباہی کی طرف جا رہی ہیں اور خود مغرب میں جو لوگ حقیقت شناس ہیں وہ ان کی تباہی کی پیش گوئی کر چکے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان قوموں نے انسان کو محض حیوان سمجھ لیا ہے اس لئے حیوانات کی طرح شکم پری میں منہمک ہیں اور مادی آسائش کے علاوہ روحانی تربیت کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان میں اور دیگر حیوانات میں عمل کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

یوں کہنے کو تو یہ قومیں اپنے آپ کو عیسائی کہتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان کی زندگیوں میں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا کوئی اثر یا رنگ کہیں نظر آتا ہے؟ کیا حضرت ممدوح نے صاف لفظوں میں یہ تعلیم نہیں دی تھی کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے گذر جانا ممکن ہے مگر دولتمند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے؟ اس کے باوجود کیا یہ ایک حقیقت ثابتہ نہیں ہے کہ آج اقوام مغرب نے دولت ہی کو اپنا مقصود و مطلوب بلکہ معبود بنا لیا ہے؟ اندریں

حالات رومی کا پیغام ان قوموں کے لئے یہ ہے کہ مادہ پرستی (کاہ جو) کے بجائے خدا پرستی (نورِ حق) کو اپنا مطمحِ نظر بناؤ ورنہ تمہاری تباہی اور بربادی یا لکل یقینی ہے۔

(۵)

نپولینؑ کے مزار پر

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیلِ ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس
عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز
عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

•

اس نظم میں اقبالؒ نے نپولین کی شخصیت پر تبصرہ کیا ہے یعنی اس کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ سبق حاصل ہو سکتا ہے کہ جس کی بدولت تقدیر کے

اسرار فاش ہو جاتے ہیں چونکہ اس کی زندگی از اول تا آخر عمل اور جد وجہد کی تصویر تھی اس لئے اقبال نے اس نظم کے پردہ میں اس کی شخصیت کے سامنے خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

اقبال نے اس نظم کا جو عنوان قائم کیا ہے اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ کتبہ اس کی لوحِ مزار پر کندہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کا مزار زبانِ حال سے دنیا کو یہ درس دے رہا ہے کہ انسانی زندگی جد وجہد ہی کا دوسرا نام ہے۔

واضح ہو کہ ہینی بال سکندر اور تیمور کی طرح نپولین کا شمار بھی دنیا کے نامور فاتحین میں ہے وہ ۱۷۶۹ء میں جزیرہ کارسیکا میں پیدا ہوا تھا جو بحیرہ روم میں واقع ہے ۱۷۸۴ء میں وہ پیرس کے ملٹری اسکول میں داخل ہوا اور ۱۷۸۵ء میں لفٹنٹ کی حیثیت سے اس کی فوجی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۸۰۴ء میں جبکہ اس کی عمر ۳۵ سال کی تھی۔ جنرل کے عہدہ پر فائز ہوا اور ۱۸۰۵ء میں اس نے جوزفین سے شادی کی اور اسی سال وہ فرانس کا فرمانروا تسلیم کر لیا گیا تین سال کی مختصر مدت میں اس نے انگلستان ترکی اور روس کو چھوڑ کر سارے یورپ کو زیرِ نگیں کر لیا لیکن روس پر حملہ کرنا اس کے زوال کا پیش خیمہ بن گیا۔ آخر کار ۱۸۱۴ء میں تخت سے دستبردار ہو کر (۵-۴-۱۴) ایلبا میں گوشہ گیر ہو گیا لیکن ۱۸۱۵ء میں دوبارہ فرانس پر قابض ہو گیا۔ جس پر انگلستان اور جرمنی نے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ چنانچہ واٹرلو کے میدان میں شکست کھا کر اس نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جنہوں نے اس کو افریقہ کے مغرب میں سینٹ ہلینا نامی جزیرہ میں نظر بند کر دیا اور اسی جلاوطنی کی حالت میں اس نے ۱۸۲۱ء میں وفات پائی۔

اس تمہید کے بعد نظم کا مطلب بیان کرتا ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ دنیا کی تقدیر ایک راز ہے جسے عام طور سے لوگ نہیں سمجھ سکتے لیکن جوشِ کردار یعنی عمل کے جذبہ میں وہ طاقت ہے کہ اس کی بدولت تقدیر کے اسرار بھی واضح ہو سکتے ہیں یعنی بظاہر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہوا ہے لیکن اگر وہ جدوجہد کو شعارِ زندگی بنائے تو اس کی بدولت وہ اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہے اسی نکتہ کو واضح کرنے کے لئے اقبال نے نپولین کی زندگی کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ ایک معمولی خاندان میں پیدا ہوا تھا لیکن جوشِ کردار کی بدولت اس نے سارے یورپ بلکہ ساری دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا بجا دیا۔

اور نپولین ہی پر کیا موقوف ہے تاریخ عالم کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اسی جوشِ کردار کی بدولت سکندر اور تیمور نے غیر فانی فتوحات حاصل کی تھیں۔

جوشِ کردار وہ چیز ہے کہ اس کی بدولت انسانوں کے اندر میدانِ جنگ میں خدائی طاقت پیدا ہو جاتی ہے لیکن یاد رکھو کہ انسان کو عمل کے لئے قدرت کی طرف سے طویل مدت نہیں ملتی۔ اس لئے انسان کو لازم ہے کہ موقع سے فائدہ اٹھائے اگر وہ اپنی جدوجہد کو کل پر ٹال دے گا تو وقت نکل جائے گا اور گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ ہر انسان کا انجام موت ہے اور یہ کردار کے سلسلہ کو ختم کر دیتی ہے اس لئے لازم ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ جدوجہد میں صرف کیا جائے فرصتِ کردار بہت تھوڑی ہے زندگی میں آرام اور سکون کی آرزو سراسر خلافِ عقل ہے یہ چیز دلجمعی کے ساتھ قبر میں حاصل ہو سکتی ہے وہاں آرام کرنے کے لئے کافی وقت ملے گا۔ چنانچہ حافظ شیرازی نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

عاقبت منزلِ ما وادیِ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز

مسولینی

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب
رومتہ الکبریٰ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے! کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب

●

اقبال نے اس نظم میں اطالیہ کے آمرِ مطلق مسولینی کے عزم اور حوصلہ کو مدنظر رکھ کر نپولین کی طرح اس کی شخصیت کی خدمت میں بھی خراجِ تحسین ادا کیا ہے ضربِ کلیم میں بھی ص۱۵۱ پر ایک نظم اس کے نام سے لکھی ہے جس میں اس کی

زبان سے ملوکیت پر طنز کی ہے۔

ان نظموں سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ اقبالؔ من کل الوجود مسولینی کے مداح یا اس کی عظمت کے معترف تھے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اقبال کا مسلک یہ ہے۔ ع

کہ سربسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

اس لئے جہاں کہیں اور جس چیز میں انہیں قوت یا اس کے متعلقات و لقمات مثلاً عزم اور حوصلہ کا جلوہ نظر آتا ہے وہ اس کی تحسین پر آمادہ ہوجاتے ہیں اور اس کی تحسین سے ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ اس جوہر کو اپنی قوم کے افراد میں کارفرما دیکھنا چاہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ دنیا میں سربلندی کے لئے طاقت اور قوت اور ہمت شرط اولین ہے۔

مجھے یاد ہے کہ مارچ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں قوم کو یہ مشورہ دیا تھا کہ مسولینی تو اپنی قوم کے نوجوانوں سے کہتا ہے کہ فولاد سے الفت کرو اور جس قدر ممکن ہوسکے فولاد کے ذخائر اپنے ملک میں جمع کرو تاکہ دشمنوں کا مقابلہ کرسکو لیکن میں (اقبال) اپنی قوم کے نوجوانوں کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ تم خود فولاد بن جاؤ۔ یعنی اپنی خودی کو اس قدر مستحکم کرلو کہ وہ فولاد بن جائے۔

اکبر الٰہ آبادی نے بھی اس حقیقت کو اپنے رنگ میں یوں بیان کیا ہے۔

نہ یہ لیکچر سے چلتا ہے نہ یہ دوہے سے چلتا ہے
سمجھ لو خوب، کارِ سلطنت لوہے سے چلتا ہے

نوٹ:۔ اقبال اور اکبر نے اگر قوم کو طاقت حاصل کرنے یا فولاد فراہم کرنے کا مشورہ دیا ہے تو دراصل انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا مفہوم اپنے

لفظوں میں بیان کیا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ

اور ہم نے لوہا (بھی) پیدا کیا جس میں شدید سبب ہے (جس سے لڑائی کا سامان بنتا ہے اور اس میں لوگوں کے طرح طرح کے فائدے ہیں اور اس کے پیدا کرنے سے یہ بھی غرض ہے کہ اللہ جان لے کہ بے دیکھے اس کی اور اس کے رسولوں کی کون مدد کرتا ہے اللہ قوی اور زبردست ہے۔ (۵۷۔۲۵)

مسولینی ۱۸۸۳ء میں ملک اطالیہ کے صوبہ فارلی کے ایک قصبہ میں پیدا ہوا تھا اس کا باپ لوہار تھا ابتدائی تعلیم کے بعد ایک مدرسہ میں ملازم ہوگیا لیکن۔

ع کجا عاشق کجا کالج کی بکواس

چند ماہ کے بعد استعفا دے کر سوئٹزرلینڈ چلا گیا اور اپنی فطرت کے اقتضا پر عمل شروع کیا یعنی اخبار نکالا اور ہنگامہ گرم کر دیا۔ مزدوروں کی حمایت میں جلوس نکالے۔ سوشلزم کا حامی بن گیا۔ چند تقریریں جلا وطنی کے لئے کافی ہوگئیں وہاں سے نکل کر آسٹریلیا پہونچا وہاں سے نکالا گیا پھر ۱۹۱۱ء میں اطالیہ واپس آیا اور حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کیا جس کی پاداش میں قید کیا گیا۔ رہائی کے بعد سوشلزم کو خیر باد کہہ دیا اور وطن پرست بن گیا ۱۹۱۵ء میں فوج میں بھرتی ہو کر ۳ سال میں کارپل (Corporal) کے عہدہ تک پہونچ گیا ۱۹۱۸ء میں پھر اخبار نکالا اور فاشلیٹ (Fascism) کی تبلیغ کا لیڈر بن گیا۔ چنانچہ اس کی بدولت ۱۹۲۲ء میں روم میں فاتحانہ طور پر داخل ہوا۔ اور بادشاہ نے وزیر اعظم بنا دیا۔ ۱۹۲۵ء میں مصطفےٰ کمال پاشا کی برادری میں شامل ہوگیا ۱۹۳۴ء میں ملوکیت کا خواب دیکھنا شروع کیا اور حبشہ پر حملہ

کرکے اس کی پہلی تعبیر دیکھی بسنہ ۱۹۳۹ء میں ہٹلر سے دوستی کی اور سنہ ۱۹۴۰ء میں
انگریزوں کے اعلان جنگ کردیا بسنہ ۱۹۴۲ء میں قوم خلاف ہوگئی اور رفقا باغی
ہوگئے اس لئے بادشاہ نے معزول کرکے قید کردیا۔ جرمن فوج جیل خانہ سے نکال
کرلے گئی اور سنہ ۱۹۴۳ء میں اس نے جرمنوں کی مدد سے شمالی اطالیہ میں فاعلی جمہوریت
کے پردہ میں پھر اپنی دکان آمریت چمکالی لیکن زہرہ اور مشتری دونوں مارِ آستین
ہوچکے تھے لہ اس لئے جب سنہ ۱۹۴۵ء میں جرمنوں کا زور ٹوٹا تو شمالی اطالیہ کے قوم
پرستوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا چنانچہ انھوں نے اس مرد فولاد کو گرفتار کرلیا

لہ قصہ یہ ہے کہ افراد کا عروج و زوال فہم انسانی سے بالکل بالا تر ہے کوئی
فلسفی منطقی یا سائنداں یہ نہیں بتا سکتا کہ بادشاہوں کے لڑکے بھیک کیوں مانگتے
ہیں اور لوہاروں کے لڑکے ایوان کسریٰ میں تزلزل کیوں پیدا کردیتے ہیں تھیوڈورا
میں کیا خوبی تھی جو اسے قیصر روم نے اپنی زوجہ بنا کر سلطنت روم کی ملکہ بنادیا کیا
قسطنطنیہ کے ماہی گیروں کے خاندان میں اس سے زیادہ حسین لڑکیاں موجود
نہیں تھیں؟ مرجینا بیگم میں کیا خوبی تھی جو نواب ابراہیم علی خاں والی ریاست
ٹونک نے اسے بیگم بنادیا؟ کیا سرونج (مالوہ) کے چماروں کے خاندان میں اس
سے زیادہ حسین لڑکیاں موجود نہیں تھیں؟ ان واقعات کو دیکھ کر انسان کو
یہ کہنا پڑتا ہے۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ تھا جفا کاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میرا مطالعہ تو یہ ہے کہ جب وہ کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو اس کی بدھی
زائل کردیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہی آدمی جو اپنی تدبیر سے سارے یورپ پر
لقیہ ص ۷۸۳

اور ۸ اپریل کو اسے اور اس کی محبوبہ دونوں کو قید حیات اور بند غم دونوں سے آزاد کر دیا اور ان دونوں کی لعشیں ملان (میلان) کے شارع عام میں لٹکا دیں۔

اس تمہید کے بعد اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ جس فرد یا قوم میں انقلاب پیدا کرنے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اس کے ہر تصور اور ہر قول اور ہر فعل سے ندرت کا رنگ نمایاں ہوتا ہے یعنی اس قوم کے افراد اپنے آباء و اجداد کی کورانہ تقلید پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ترقی اور سربلندی کی نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں نئے نئے طریقے سوچتے ہیں اور پھر پوری قوت کے ساتھ ان پر گامزن ہوتے ہیں یعنی اپنی

(بقیہ صفحہ ۷۸۲ کا)

چھا جاتا ہے۔ چند ماہ کی مسلسل غلطیوں کی بنا پر گولی کا نشانہ بن جاتا ہے یا زہر پی کر اپنی مہمل زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔ ایک گجراتی شاعر نے اس حقیقت کو نہایت دلکش طریق پر بیان کیا ہے۔

آنند کہے پرمانند ابھیدی کیم بھلنت
سیّاں اروٹھے مت ہرنے اٹے کوپ کونت

یعنی آنند نے پرمانند سے پوچھا کہ عقلمندوں سے غلطیاں کیسے اور کیونکر ہو جاتی ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ جب سیّاں (اللہ میاں) کسی شخص سے ناراض ہو جاتے ہیں تو اس کی مت مار دیتے ہیں (یعنی عقل کو زائل کر دیتے ہیں) جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ہر کام عقل کے خلاف کرتا ہے اور چند روز کے بعد تباہ ہو جاتا ہے۔

جدوجہد کے لئے نئے میدان تلاش کرتے ہیں۔ غرض کہ ہر ممکن طریقہ سے فکر اور عمل وخیال اور فعل کے نت نئے نمونے دنیا کے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں۔

اس ندرت فکر وعمل سے قوم میں شباب (عروج) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کی بدولت افراد قوم دنیا والوں کو معجزے دکھا سکتے ہیں[1] اور اسی ندرت فکر وعمل کی بدولت انسان مٹی کو سونے میں اور پتھر کو جواہرات میں تبدیل کر سکتا ہے[2] یعنی معمولی چیزوں کو سونے اور جواہرات سے زیادہ قیمتی اور کار آمد بنا سکتا ہے۔

اس کے بعد اقبال روحۃ الکبریٰ (اطالیہ) سے خطاب کرتے ہیں کہ:۔

اے اطالیہ! آنکھوں دیکھتے تیرے اندر ایک عظیم الشان انقلاب برپا ہو گیا۔ بوڑھوں میں زندگی کا فروغ پایا جاتا ہے اور نوجوانوں کے سینوں میں ترقی کی آرزوئیں مچل رہی ہیں۔

لہ چنانچہ اسی ذوق انقلاب کی بدولت حضرت خالدؓ۔ طارقؒ اور محمد بن قاسمؒ نے دنیا کو معجزے دکھلائے اور ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو ترکوں نے سات میل تک خشکی میں جہاز چلا کر عزم وہمت کا سب سے بڑا معجزہ یورپ کو دکھا دیا تھا لیکن یہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں آج وہی ترک لاطینی حروف میں قرآن پڑھ رہے ہیں کیونکہ عربی تو اغیار کی زبان ہے اور لاطینی برسر اقتدار اقوام کی عظمت کا نشان ہے۔

؎ مثلاً گھڑیوں کے پرزے فولاد یا تانبے کے ہوتے ہیں لیکن بعض پرزے تین سو سے چھ سو روپے تولہ تک کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔

" محبت کی حرارت سے اپنے نصب العین کے ساتھ شدید محبت مراد ہے۔
" تمنا اور نمود سے ترقی کی تمنا اور سربلندی کی آرزو مراد ہے۔
" کہتے ہیں کہ فصلِ گل یا موسم بہار کا تقاضا یہ ہے کہ کلیاں شگفتہ ہو جائیں
اسی طرح جب کسی قوم کے اندر ترقی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ قوم گمنامی
یا سرپزیری کی حالت میں نہیں رہ سکتی۔ باطنی تقاضا ہر فرد کو سرفروشی کے لئے
ابھارتا ہے اور سرفروشی سے سربلندی حاصل ہوتی ہے۔
نوٹ:۔ جو شخص اپنے سر کو بچانا چاہتا ہے وہ بظاہر بچا لیتا ہے لیکن
بباطن اسے کھو دیتا ہے اس کی ایک مثال ذیل میں درج کرتا ہوں۔
لارڈ ولزلی نے ۱۷۹۵ء میں فتح علی خاں سلطان میسور اور نظام علی
خاں والی حیدرآباد دونوں کو لکھا کہ یا ہماری غلامی اختیار کر دیا میدان جنگ
میں سرفروشی کے لئے تیار ہو جاؤ۔
شیر دکن نے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو میدان جنگ میں سر کٹا کر ابدی زندگی
حاصل کر لی۔

بزدل نظام علی خاں نے بظاہر اپنا سر اپنے شانوں سے مربوط رکھا
لیکن دنیا جانتی ہے کہ یہ اس وقت ممکن ہو سکا جب اس نے اپنے سر کو ولزلی
کے قدموں میں رکھ کر پاؤں سے بھی زیادہ ذلیل و خوار کر دیا اور ابدی لعنت
خرید لی۔ کاش! " کوئی اللہ کا بندہ اس کو اس حقیقت سے آگاہ کر سکتا کہ
شیر کی حیات یک روزہ گیدڑ کی حیات صد سالہ سے بہتر ہوتی ہے۔
چھٹا شعر: کہتے ہیں کہ اے اطالیہ! آج تیرا گوشہ گوشہ حریت
اور ترقی کے نعروں سے معمور ہے ہر متنفس کے دل میں تیری سربلندی کا جذبہ
موجزن ہے۔

زعمہ در لفظی معنی رُباب نواز مراد ہے مسولینی جس نے اطالیہ کو اقوام یورپ میں سربلند کردیا تھا۔

ساتواں شعر:۔ یہ سارا انقلاب اس شخص کا پیدا کردہ ہے جس کی نگاہ شعاعِ آفتاب کی طرح ہے یعنی وہ شخص جس نے یہ انقلاب برپا کیا ہے۔ حالات حاضرہ سے باخبر ہے۔ اور وہ بین الاقوامی سیاست کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔

سوال

اک مفلسِ خود دار یہ کہتا تھا خدا سے
میں کر نہیں سکتا گلۂ دردِ فقیری

لیکن یہ بتا تیری اجازت سے فرشتے
کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری

اقبال نے اس قطعہ میں فطرت انسان کی ترجمانی کی ہے کیونکہ جو شخص غور و فکر کر سکتا ہے اس کے دماغ میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں کم ظرفوں اور نا اہلوں کو سرداری اور حکومت کیوں حاصل ہوجاتی ہے۔

فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ سوال قدیم زمانہ سے حکماء اور عقلاء کے درمیان معرکۃ الآرا رہا ہے اور اس کی بنا پر چار بڑے مذاہب یا مدارس فکر دنیا میں پیدا ہوگئے۔

ایک گروہ نے یہ کہا کہ اگر اس کائنات کا کوئی خالق یا صانع ہوتا تو وہ ناانصافی کو کبھی روا نہ رکھتا اس لئے ثابت ہوا کہ دراصل خدا موجود نہیں ہے اس لئے کوئی قاعدہ یا قانون بھی نہیں ہے یہ کارخانہ محض بخت و

اتفاق پر چل رہا ہے یعنی جس کو ترقی اور حکومت کے مواقع حاصل ہو گئے وہ امیر ہو گیا اور جو ان کے مواقع سے محروم رہا وہ فقیر بن گیا یہ گروہ دہری یا مادہ پرست کہلاتا ہے۔

دوسرے گروہ کا نظریہ۔ یہ ہے کہ خدا موجود ہے اور وہ ہر شخص کو اس دنیا میں اس کی سابقہ زندگی کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دیتا ہے مثلاً زید اگرچہ فرومایہ ہے لیکن وہ اگر برسر اقتدار ہے تو اس لئے ہے کہ اس نے ساری زندگی میں نیکیاں کی تھیں اور جو عالی حوصلہ شخص اس وقت مصائب میں مبتلا ہے وہ اس لئے کہ اس نے سابقہ زندگی میں برائیاں کی تھیں اس نظریہ کو تناسخ کہتے ہیں اور ہندو قوم اس کی حامی ہے۔

تیسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کا حکم یا اس کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان کی عقل ناقص اور محدود ہے اس لئے وہ مشیت ایزدی سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ حافظ شیراز نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نہ کشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا۔

یعنی انسان اپنی عقل کی مدد سے اس معمہ کو حل نہیں کر سکتا لیکن جو لوگ مقرب بارگاہ ہیں وہ اس اختلاف کی نوعیت سے بقدر ظرف آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ اور مسلمان اسی مسلک کے پیرو ہیں۔

چوتھے گروہ کا فیصلہ یہ ہے کہ در حقیقت نہ کوئی امیر ہے نہ فقیر ہے نہ فرومایہ ہے نہ ملک پایہ ہے۔ یہ امتیازات جو نظر آتے ہیں سب فریب نظر ہیں عقل انسان نے اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے یہ تعینات پیدا کر لیے ہیں۔

اگر ان پردوں کو ہٹا دیا جائے تو پھر نہ کوئی امیر ہے نہ فقیر ہے۔ یہ سب اعتبارات ہیں جن کی کوئی اصل نہیں ہے درحقیقت وہی ایک ذات ہے جو مختلف اشکال میں نظر آرہی ہے یہ مسلک ارباب وحدت الوجود کا ہے جن کی نظر میں خدا کے سوا اور کوئی شئے موجود نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اقبال نے اس قطعہ میں جو سوال کیا ہے اس کا مقصد عقل انسانی کی بے مائیگی اور بیچارگی کا اظہار ہے اس سوال کے جواب میں ابتدا سے تا ایں دم حکمائے صدہا کتابیں تصنیف کی ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے اس موضوع پر عقلاء اظہار خیالات کرتے رہیں گے لیکن حقیقت یہی ہے کہ عقل انسانی اس گتھی کو نہ سلجھا سکی ہے اور نہ کبھی سلجھا سکے گی۔

ع
راز ایں پردہ نہانست و نہاں خواہد بود

ہر شخص اپنے نظریہ کو صحیح اور دوسروں کے نظریات کو غلط سمجھتا ہے اور ہر فریق اپنے دعویٰ پر دلائل پیش کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ عقدہ ہی لاینحل ہے۔

معلوم نہ شد کہ یار خورسند ز کیست
ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد

پنجاب کے دہقان سے

بتا کیا تری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز؟
اسی خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذاں ہوگئی اب تو جاگ؟
زمیں میں ہے گو خاکیوں کی برات
نہیں اس اندھیرے میں آبِ حیات؟
زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں؟
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم، یہی فتحِ باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب
بخاکِ بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں

•

اس نظم میں اقبال نے پنجاب کے بلکہ پورے ملک کے دہقان کو بیداری ترقی اور سربلندی کا پیغام دیا ہے۔ اس نظم میں مرکزی تصور یہ ہے کہ۔

(۱) اگرچہ ہر خاکی انسان اپنا حصۂ (رزق) زمین ہی سے حاصل کرتا ہے اور اس لئے زراعت (کاشتکاری) بھی ضروری ہے لیکن انسان جسم کے علاوہ روح بھی تو رکھتا ہے اور روح کی غذا (آبِ حیات) اس زمین (اندھیرے) سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۲) لہٰذا ملک کے دہقان کا فرض ہے کہ وہ اپنی روحانی تربیت (خودی) کی تکمیل کا بھی انتظام کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ذاتوں۔ مثلاً کھرل۔ کھوکھر۔ بھٹی اور قبیلوں مثلاً راجپوت۔ مغل۔ جاٹ کے بتوں کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دے نیز تمام لایعنی رسوم کو اپنی زندگی سے خارج کر دے۔

(۳) ان دو زبردست غیر اسلامی لعنتوں سے پاک ہونے کے بعد توحید پر عامل ہو جائے یعنی توحید کو اپنے عمل سے دنیا میں نمایاں کر دے قول۔ فعل رفتار۔ گفتار اور معاملات غرض کہ زندگی کے ہر پہلو سے اسلام کا اظہار ہو جب کوئی غیر مسلم اس کو دیکھے تو بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ شخص مسلمان ہے۔

(۴) غایت اسلام اور طریق کامیابی یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں توحید الٰہی کے عقیدہ کا اثبات کرے اور اس طرح کہ اہل دنیا توحید کے شیدائی اور اسلام کے تمنائی بن جائیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب مسلمان پہلے خود موحد نظر آئیں۔

آخری نصیحت یہ کرتے ہیں کہ اے مسلمانو! تو جس طرح زمین کی خاک میں گیہوں کا دانہ بوتا ہے اسی طرح تجھے بدن کی مٹی میں دل کا دانہ بونا چاہئے کیونکہ یہ وہ دانہ ہے جس کی بدولت تجھے خیر کثیر حاصل ہو سکتی ہے۔

نوٹ:۔ اب رہا بونے کا طریقہ تو جس طرح زمین میں دانہ بونے کا طریقہ کسی اہل زمین سے سیکھتے ہو اس طرح جسم میں دانہ بونے کا طریقہ کسی صاحب دل سے پوچھ لو۔ کیا خوب کہا ہے اقبال نے۔

حدیثِ دل کسی درویشِ بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

نادر شاہ افغان

حضورِ حق سے چلا لے کے لولوئے لالا
وہ ابر جس سے رگِ گل ہے مثلِ تارِ نفس
بہشت راہ میں دیکھا تو ہو گیا بے تاب
عجب مقام ہے جی چاہتا ہے جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے ترا
ہرات و کابل و غزنی کا سبزۂ نورس
سرشک دیدۂ نادر بہ داغِ لالہ فشاں
چناں کہ آتشِ او را دگر فرو نشاں

•

اس نظم میں اقبال نے نادر شاہ افغان مرحوم شاہ افغانستان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے اس نظم کی نگارش سے پہلے ۱۹۳۳ء میں انہوں نے مسافر میں شاہ مرحوم سے اپنی ملاقات اور ان کے بعض اوصاف

کا بیان بڑے مؤثر پیرایہ میں کیا ہے۔

شاہ مرحوم کا اصلی نام محمد نادر خاں تھا ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ملٹری کالج دہرہ دون (یوپی) میں ہوئی تھی بعد ازاں مزید فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے اور امیر امان اللہ خاں (معزول شاہ افغانستان) کے عہد میں افغانی فوج کے سپہ سالار مقرر ہو گئے اور ۱۹۱۹ء میں جب امان اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تو جنرل نادر خاں نے تھل کے معرکہ میں اپنی قابلیت اور ذاتی شجاعت کا پہلا روشن ثبوت دیا۔ بعد ازاں ان کے اور امان اللہ خاں کے مابین اختلافات رونما ہو گئے چنانچہ امان اللہ خاں نے انہیں فرانس میں سفیر مملکت مقرر کر کے بھیج دیا۔

جب ۱۹۲۹ء میں بچہ سقہ نے کابل میں دور خسروی شروع کیا۔ تو نادر خاں افغانستان واپس آئے اور بچہ سقہ کا خاتمہ کر کے خود تخت افغانستان پر قابض ہو گئے۔

اکتوبر ۱۹۳۲ء میں انہوں نے علامہ مرحوم ڈاکٹر سر راس مسعود مرحوم اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ کو کابل آنے کی دعوت دی جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے مشوروں سے افغانوں کے لئے نظام تعلیم مُدوّن کیا جائے۔ چنانچہ یہ تینوں بزرگ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ لیکن افسوس کہ نومبر ۱۹۳۳ء میں کسی بدخواہ نے اسی دیدۂ ہوش مند اور خیر خواہ قوم کو اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا۔

علامہ مرحوم اور جناب سید صاحب قبلہ دونوں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ شاہ مرحوم کے دل میں دین اور ملت کا درد کوٹ کوٹ کر

بھرا ہوا تھا۔ اور وہ نہایت شیریں اخلاق نہایت منکسر مزاج اور رقیق القلب تھے ان کی آنکھیں مولانا محمد علی جنت آشیانی کی طرح اشکباری کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ (سفر نامہ سید صاحب قبلہ ص۲۲)

مسافر میں علامہ مرحوم اقبال نے بھی شاہ مرحوم کی سیرت کے اس پہلو کو واضح کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نشۂ حرفم بخونِ او دوید ۔۔۔ دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت نادر در جہاں بیچارہ بود ۔۔۔ از غم دین و وطن آوارہ بود
غیر قرآں غمگسارِ من نہ بود ۔۔۔ قوتش ہر باب را بر من کشود

گفتگوئے خسروِ والا نژاد
باز با من جذبۂ سرشار داد

اس مختصر تمہید کے بعد نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔

واضح ہو کہ اس نظم میں اقبال نے حسب معمول تمثیل۔ استعارہ کنایہ اور مجازات لغوی و عقلی کی دوکان آراستہ کی ہے لیکن میں محاسن شعری سے قطع نظر کر کے صرف مفہوم پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

" ابر۔ کنایہ ہے شاہ مرحوم سے۔

" رگِ گل کو تارِ نفس سے تشبیہ دینے سے مراد یہ ہے کہ اس ابر کی بدولت پھولوں میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔

" رگِ گل۔ کنایہ ہے ملت اسلامیہ سے۔

کہتے ہیں کہ وہ ابر جس میں پھولوں کو زندگی بخشنے کی طاقت ہے اللہ کے حضور سے موتیوں کا ذخیرہ لے کر چلا یعنی بوقت رخصت اللہ نے اسے کثیر تعداد میں۔ موتی عطا فرمائے۔

راستہ میں بہشت نظر آیا تو اس نے خیال کیا کہ لاؤ یہیں برس جاؤں اور اسی خطہ کو سیراب کر دوں۔

لیکن بہشت نے یہ کہا کہ اے ابر! تیری ضرورت یہاں سے زیادہ افغانستان کی سرزمین کو ہے تو ہرات۔ کابل اور غزنی کو سیراب کر۔

نادر شاہ کی آنکھوں سے جس قدر آنسو قوم اور وطن کی محبت میں نکلے ہیں ان کو گل لالہ کے دانوں پر چھڑک دو تاکہ اس کی آگ کبھی ٹھنڈی نہ ہوسکے یعنی افغانوں کے قلوب میں وہی جذبات ملی و دینی پیدا کر دو۔ جو شاہ مرحوم کے قلب میں موجزن تھے۔

نوٹ:۔ اس نظم کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علامہ مرحوم کے دل میں شاہ مرحوم کی کس قدر عظمت اور محبت جاگزیں تھی اور وہ افغانستان کو کس قدر خوش حال اور سربلند دیکھنا چاہتے تھے کاش اس ملک کے حکمراں مسافر کا مطالعہ کرکے اقبال کی آرزو ئی تکمیل میں ساعی ہوں۔

خوشحال خاں[1] کی وصیت

قبائل ہوں ملّت کی وحدت میں گم | کہ ہو نام افغانیوں کا بلند
محبت مجھے ان جوانوں سے ہے | ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
مغل سے کسی طرح کمتر نہیں | قہستاں کا یہ بچّہ ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات | وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مغل شہسواروں کی گردِ سمند

•

اس نظم میں اقبال نے سرحد کے مشہور وطن دوست شاعر خوشحال خاں کے جذبات کو اپنے انداز میں نظم کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ خوشحال خاں نے مرتے وقت سرحد کے افغانی قبائل کو یہ وصیت کی کہ اے مسلمانو! تم نے اپنے آپ کو قبائل میں تقسیم کر کے اپنی قوت کو منتشر کر دیا ہے۔ علاوہ بریں یہ قبائلی زندگی اور جماعتی تقسیم مذہب و ملت کے اصول کے بھی خلاف ہے اس لئے تم سب قبائلی امتیازات کو مٹا کر

---

[1] خوشحال خاں خٹک پشتو زبان کا مشہور وطن دوست شاعر تھا جس نے افغانستان کو مغلوں سے آزاد کرانے کے لئے سرحد کے افغانی قبائل کی ایک جمعیت قائم کی۔ قبائل میں صرف آفریدیوں نے آخر دم تک اس کا ساتھ دیا تھا اس کی دو ایک سو نظموں کا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۲ء میں لندن میں شائع ہوا تھا۔

ایک قوم بن جاؤ۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ کوہستان کا ہر نوجوان اپنے اندر عزم بلند پیدا کرے اور اس حقیقت کو ذہن نشین کرے کہ میں مغلوں سے کسی طرح کم نہیں ہوں اس لئے ان کو مجھ پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

آخری وصیت یہ ہے کہ دوستو! تم مجھے ایسی جگہ دفن کرنا جہاں مغل شہسواروں کے گھوڑوں کی گرد نہ پہونچ سکے۔

نوٹ:۔ کاش! ایسی ہی نفرت مسلمانوں کو اس قوم سے ہو جائے جس نے ۱۸۵۷ء میں فرخ آباد (یوپی) کے مسلمان مجاہدوں کو شکست دینے کے بعد ان کے سردار کو پہلے سور کا گوشت کھلایا پھر اس کی چربی جسم پر ملی اس کے بعد پھانسی دی۔ کاش وہ دن جلد آجائے جب قوم کا ہر فرد نشۂ جہاد سے سرشار ہو جائے۔

تاتاری کا خواب

کہیں سجادہ و عمّامہ رہزن
کہیں ترسا بچوں کی چشم بیباک

ردائے دین و ملّت پارہ پارہ
قبائے ملک و دولت چاک در چاک

مرا ایماں تو ہے باقی ولیکن
نہ کھا جائے کہیں شعلے کو خاشاک

ہوائے تند کی موجوں میں محصور
سمرقند و بخارا کی کفِ خاک

بگردا[1] گرد خود چندانکہ بینم
بلا انگشتری و من نگینم

---

[1] یہ شعر معلوم نہیں کس کا ہے نصیر الدین طوسی نے شرح اشارات میں اسے نقل کیا ہے

یکایک ہل گئی خاکِ سمرقند — اٹھا تیمور کی تربت سے اک نور
شفق آمیز تھی اس کی سفیدی — صدا آئی کہ "میں ہوں روحِ تیمور
اگر محصور ہیں مردانِ تاتار — نہیں اللہ کی تقدیر محصور
تقاضا زندگی کا کیا یہی ہے — کہ تورانی ہو تورانی سے مہجور

خودی را سوز و تابے دیگرے دہ
جہاں را انقلابے دیگرے دہ

○

اس نظم میں اقبالؔ نے تمثیلی رنگ میں ترکستان کے باشندوں کو وحدت واتحاد اور تنظیم کا درس دیا ہے۔ پہلے بند میں انہوں نے ایک تاتاری کی زبان سے ان مصائب کی تفصیل بیان کی ہے جو باشندگانِ ترکستان پر روسیوں کے تسلّط کے بعد نازل ہوئے۔

سجّادہ اور عمّامہ سے وہ صوفیاء اور علماء مراد ہیں جنہوں نے آڑے وقت میں قوم سے بے وفائی کی۔

ترسابچہ۔ فارسی لٹریچر میں بہت مشہور ترکیب ہے۔ چنانچہ حافظ لکھتے ہیں

دلم از صومعہ وصحبت شیخ است ملول
یار ترسابچہ کو خانہ خمار کجا است

"ترسا۔ رومی زبان کا لفظ ہے۔ بمعنی نصرانی یا آتش پرست۔

ترسابچہ۔ اس لڑکے کو کہتے ہیں جو میخانوں میں ساقی کا فرض انجام دیتا ہے۔ ایران میں دستور تھا کہ پارسیوں اور ارمنی عیسائیوں کے لڑکوں کو میخانوں میں ملازم رکھتے تھے مغ بچہ یا مغ زادہ بھی اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔

تاتاری کہتا ہے کہ آج کل میرے ملک میں آفات کا نزول ہو رہا ہے اغیار نے دین و ملت دونوں کو تباہ کر دیا۔ حکومت۔ عزت اور آزادی ہر چیز ختم ہو گئی۔ صرف ایمان باقی ہے لیکن حالات ایسے ہیں کہ اس کی بھی خیر نظر نہیں آتی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ روس ملاحدہ (حاشاک) اسلام (شعلہ) کو اس ملک سے بالکل ختم کر دیں گے۔ سمرقند اور بخارا یہ دونوں شہر کسی زمانہ میں مسلمانوں کی حکومت اور تہذیب کے مرکز رہ چکے ہیں دشمنوں کے ہاتھوں تباہ ہو رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ قوم آفات میں اس طرح محصور ہے جس طرح نگینہ انگشتری میں۔

دوسرے بند میں یہ مذکور ہے کہ اس تاتاری نے یہ خواب دیکھا کہ تیمور کی تربت سے ایک نور بلند ہوا اور اس میں سے یہ صدا آئی کہ میں تیمور کی روح ہوں اور اس نے یہ پیغام دیا کہ اگر ترکستان کے باشندے اس وقت دشمنوں میں محصور ہیں تو ہمت نہ ہاریں اپنے اندر وحدت ملی پیدا کریں اور سب مل کر دشمن کا مقابلہ کریں اگر وہ اپنے اندر مرمٹنے کا جذبہ پیدا کر لیں گے تو یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔

———(ن)———

حال ومقام

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ
ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

•

یہ نظم بڑی دلکش اور پرتاثیر ہے۔ اقبالؔ نے نہایت بلیغ پیرایہ میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ قوموں کی ترقی ان کے باطنی حالات اور روحانی مدارج یعنی ان کی قلبی کیفیات پر موقوف ہے ترقی کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ دل زندہ ہو یعنی دل میں ترقی کا دلولہ موجزن ہو اگر کسی قوم کے افراد میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو وہ ضرور ترقی کرتی ہے۔

احوال وا قوال۔ تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ حال سے مراد ہے وہ کیفیت جو سالک کی شخصیت میں اس طرح راسخ ہو جائے کہ کسی وقت زائل نہ ہو اس لفظ کو ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کرو۔ زید نماز تو پڑھتا ہے مگر کبھی کبھی ناغہ بھی ہو جاتی ہے۔ تصوف کی زبان میں اس کو یوں ادا کریں گے

کہ نماز زید کے لئے ابھی حال نہیں بنی : مقام، سے مراد ہے سلوک کی کوئی خاص منزل جس پر پہنچ کر سالک بلند تر منزل کے لئے مجاہدہ کرتا ہے مثلاً مقام قطبیت یا مقام غوثیت وغیرہ اب اقبال اس نکتہ کو دو مثالوں سے واضح کرتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ یوں تو ملاّ اور مجاہد دونوں اپنی زبان سے ایک ہی لفظ ادا کرتے ہیں۔ یعنی اللہ اکبر لیکن جب ملاّ اللہ اکبر کہتا ہے تو اس میں یا اس کے ماحول میں کوئی انقلاب برپا نہیں ہوتا۔ وہ اللہ اکبر کہنے کے بعد بھی اسی حالت میں ہوتا ہے جس میں کہنے سے پہلے تھا لیکن جب مجاہد یہ لفظ اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو اس کی حالت میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے یعنی یا تو وہ شہادت کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے یا غازی بن کر واپس آتا ہے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ملاّ اور مجاہد کے حال و مقام میں تفاوت ہے اور اسی تفاوت کی بدولت ان دونوں کی زندگیاں ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتی ہیں اسی طرح کرگس اور شاہین دونوں ایک ہی فضا میں ایک ہی سے پروں کی بدولت اڑتے ہیں۔ پرواز میں کوئی فرق نہیں ہوتا اس کے باوجود کرگس مردار پر گرتا ہے لیکن شاہین ہمیشہ زندہ جانور کا شکار کرتا ہے۔ کیونکہ۔

ع شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

●

ابوالعلا معرّی

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گذر اوقات
اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات
یہ خوانِ تر و تازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران[1] و لزومات[2]
اے مرغکِ بیچارہ، ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

●

اس نظم کا عنوان ہے "ابوالعلا معرّی"
یہ غیر معمولی دماغی قابلیت کا شخص جیسے میں حکیم عمر خیام و والٹر—

---

[1] غفران۔ رسالۃ الغفران معرّی کی ایک مشہور کتاب کا نام ہے۔
[2] لزومات۔ اس کے قصائد کا مجموعہ ہے۔

(۷۵ نمبر ۲) اور شوپن ہادر کا پیشرو یا استاد سمجھتا ہوں۔ عربی ادبیات کی تاریخ میں گوناگوں خصوصیات کی بنا پر اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا اس کا پورا نام ابوالعلا احمد بن عبداللہ بن سلیمان تنوخی التنوخی تھا۔ معرہ نعمان میں جو حلب ملک شام میں ہے ۳۶۳ھ ۹۷۳ء میں پیدا ہوا تھا۔ قوت حافظ کا یہ عالم تھا کہ جو بات ایک دفعہ سن لی۔ ساری عمر کے لئے دل پر نقش ہو گئی چھتیس ۳۶ سال کی عمر میں بغداد آیا اور دو سال کے بعد وطن واپس چلا گیا اور بقیہ عمر وہیں گذار دی ۴۴۹ھ ۱۰۵۷ء میں روانہ ملک عدم ہوا۔

اپنے وقت کا بہت بڑا ادیب۔ لغوی۔ نحوی۔ شاعر۔ فلسفی طنز نگار معلم اخلاق۔ قنوطی۔ لاادری۔ زاہد خشک۔ تارک الدنیا اور تارک حیوانات گذرا ہے۔ تکثیر نسل انسانی کو سب سے بڑا جرم (گناہ) تصور کرتا تھا اسی لئے ساری عمر مجرد رہا اور مرتے وقت وصیت کر گیا کہ یہ شعر میری لوح مزار پر ثبت کیا جائے۔

هٰذَا جَنَاهُ أَبِي عَلَيَّ
وَمَا جَنَيْتُ عَلَىٰ أَحَدٍ

لفظی ترجمہ یہ ہے کہ میرا وجود وہ ظلم ہے جو میرے باپ نے مجھ پر کیا لیکن میں نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ یعنی میرا وجود وہ غلطی ہے جو میرے باپ نے کی تھی لیکن میں نے ایسی غلطی کر کے کسی دوسرے کو مصیبت میں مبتلا نہیں کیا۔ ارباب نظر اسی ایک شعر سے اس کی ذہنیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ شوپن ہادر بھی اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھ سکا اس کے عقائد کا اندازہ ان دو شعروں سے بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ وہ لکھ رہا ہے۔

ضَحِکْنَا وَکَانَ الضِّحْکُ مِنَّا سَفَاهَةً
وَحَقَّ لِسُکَّانِ الْبَسِیطَةِ اَنْ تَبْکُوا
تُحَطِّمُنَا الْاَیَّامُ حَتّٰی کَاَنَّنَا
زُجَاجٌ وَّلٰکِنْ لَّا یُعَادُ لَنَا سَبْکُ

یعنی ہم ہنستے ہیں اور بلاشبہ یہ ہماری حماقت کی دلیل ہے مناسب تو یہ ہے کہ روئیں اور خوب روئیں کیونکہ ہم میں سے ہر ایک کو زمانہ شیشہ کی طرح چکنا چور کر دیتا ہے اور اس کے بعد ہم دوبارہ کسی نئے قالب میں نہیں ڈھالے جاتے۔

نوٹ: جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو وہ الفاظ یاد آجاتے ہیں جو وزیر اعظم بھارت نے اپنی "تزک" اپنی رفیقۂ حیات کے نام منسوب کرتے وقت لکھے تھے۔

"کملا کے نام جو معدوم ہو چکی ہے۔"

ان الفاظ میں خوبی یہ ہے کہ ان سے مصنف کے مذہبی عقائد بھی واضح ہو سکتے ہیں اس کی تصانیف رسالۃ الغفران (معافی نامہ) اور لزومیات بہت مشہور ہیں۔ رسالۃ الغفران میں شاعر نے جاہلیت کے بعض شعراء کو جنت میں مصروف مکالمات دکھایا ہے جن کو خدا کی طرف سے معافی مل گئی ہے۔ یہ رسالہ شاعر کی طنز نگاری کی بہترین مثال ہے اور بعض لوگوں کی رائے میں ڈانٹے (DANTE) نے اپنی غیر فانی کتاب طربیہ ایزدی (DIVINE COMEDY) اسی کو دیکھ کر لکھی تھی۔

لزومیات کا پورا نام "لزوم مالا یلزم" ہے اقبالؒ نے ضرورت شعری کی بنا پر لزومیات باندھا ہے ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے

معلوم ہوتا ہے کہ معرّی ایک ایسا لا ادری یا متشکک تھا جو ساری عمر متحیر اور سرگشتہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں متضاد خیالات پائے جاتے ہیں۔

اقبال کو مذہبی نقطۂ نظر سے المعری کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ وہ عاشق رسولؐ تھے اور یہ نابینا راہب خدا ہی کا منکر تھا انہوں نے اس کا تذکرہ محض اس لئے کیا ہے کہ وہ اپنی قوم کو درس قوت و اقتدار دینا چاہتے ہیں اور معری کے اس قوم سے کہ۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ان کے مسلک کی تائید ہوتی ہے اور اقبال نے یہ نظم دلپذیر اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے لکھی ہے۔

سینما

وہی بت فروشی وہی بت گری ہے — سینما ہے یا صنعت آذری ہے

وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا — یہ صنعت نہیں شیوۂ ساحری ہے

وہ مذہب تھا اقوام عہد کہن کا — یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے

وہ دنیا کی مٹی یہ دوزخ کی مٹی

وہ بت خانہ خاکی یہ خاکستری ہے

•

اس نظم کا عنوان سینما ہے جو نوے فیصدی پاکستانی طلباء اور طالبات کی زندگی کا محبوب مشغلہ ہے اور مقام مسرت ہے کہ اقبال کی نصیحت

"گرگان برگنبد" کا مصداق ثابت ہو رہی ہے، زنانہ اسلامیہ کالجوں کی طالبات باقاعدہ برقعہ پہن کر اپنی استانی کی زیر نگرانی سینما دیکھنے جاتی ہیں اور وہاں سے غیرت اور حیا کی جھولیاں بھر بھر کر لاتی ہیں۔

نہ حالی کی مناجاتوں کی کی پروا زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رُکے یارانِ خود آرا

اندریں حالات مجھے توقع تو نہیں کہ فرزندان و دختران ملت پر اس نظم کا کوئی اثر ہوگا تاہم ضابطہ کی خانہ پری کے لئے اس نظم کا مطلب چند لفظوں میں بیان کئے دیتا ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ جسے تم سینما (cinema) سمجھتے ہو سینما نہیں ہے بلکہ بت فروشی۔ بت گری۔ بت پرستی یعنی صنعت آذری ہے (آذر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تھا) فرق صرف اتنا ہے کہ اس صنعت کا مقصد کافری کا فروغ تھا اور اس صنعت کی غرض یہ ہے کہ ساحری کو فروغ حاصل ہو۔ ساحری سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ سینما کا خاصہ یہ ہے کہ دیکھنے والا اس سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے اور اس تاثیر کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ خودی مردہ ہو جاتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ سینما بھی بت پرستی ہی کی ایک ترقی پسند شکل ہے پہلے زمانہ کی مہذب اقوام بت پرستی اور بتوں کی تجارت کرتی تھیں اس زمانہ میں مہذب اقوام سینما پرستی اور سینما کی تجارت کرتی ہیں۔

عہد قدیم کے بت۔ دنیا کی پیداوار تھے۔ لیکن یہ سینما چونکہ فحاشی عریانی اور بے حیائی کی تعلیم دیتا ہے اس لئے اس کا ساز و سامان دوزخ سے آتا ہے بالفاظ دگر مسلمان کو اس۔ فن لطیف سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئے۔

سینما اور صنعت آذری دونوں بتخانے ہیں اور بت پرستی سکھاتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ وہ خاکی ہے اور یہ خاکستری ہے۔
اقبالؔ نے خاکی اور خاکستری سے مصرع میں بڑی دلکشی پیدا کردی ہے کیونکہ ان دونوں لفظوں میں صوتی اور املائی مناسبت پائی جاتی ہے۔
خاکی سے مراد ہے وہ شئے جس کا تعلق خاک سے ہو یعنی مادی یا دنیادی بت جو دنیا کی مٹی سے بنے ہیں یعنی ان کی اصل خاکی ہے۔
خاکستری سے مراد ہے وہ شئے جو راکھ ہو۔ یعنی سینما دراصل دوزخ کی آگ ہے جو دنیا میں آکر راکھ کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہے۔

پنجاب کے پیرزادوں سے

حاضر ہوا میں شیخ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیِ احرار

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں ولیکن نہیں بیدار

آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار

عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلہِ فقر سے ہو طرّۂ دستار

باقی کلہِ فقر سے تھا ولولۂ حق
طرّوں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار

یہ عجیب و غریب نظم ہے کیونکہ اقبالؔ نے اشعار کے پردہ میں بت شکنی کا مومنانہ فریضہ انجام دیا ہے۔

مرشد رومی کے بعد اقبالؔ مرحوم حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے روحانی کمالات کے سب سے زیادہ معترف تھے اسی لئے انہوں نے اپنے خیالات حضرت موصوف کی زبان سے ادا کئے ہیں تاکہ پڑھنے والے غیر معمولی طور پر متاثر ہو سکیں۔

علامہ مرحوم چونکہ "عارفانہ مذاق" اور تصوف کا ذوق رکھتے تھے اس لئے تمام بندگان دین سے انہیں بڑی عقیدت تھی چنانچہ جب وہ ۱۹۰۵ء میں حصول تعلیم کے لئے یورپ گئے تھے جب کہ ان کی عمر ۳۲ سال کی تھی تو دہلی پہنچ کر وہ بڑی عقیدت کے ساتھ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہیؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئے تھے ۱۹۳۵ء میں ان کو حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی اور مزار مبارک پر مراقب ہو کر جو روحانی فیض ان کو حاصل ہوا اور یہ کیفیت ان پر طاری ہوئی۔ اس کا کچھ تذکرہ انہوں نے مجھ سے بھی کیا تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے کمالات علمی اور روحانی اور جہاد قلمی و لسانی کی بنا پر بزرگان اسلام کی صف میں نہایت ارفع مقام پر فائز ہیں اور موصوف کا نام نامی غایت شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں ہے ہندوستان پاکستان۔ ترکستان۔ ماوراء النہر۔ بدخشان۔ افغانستان۔ عراق۔ کردستان شام و لبنان۔ وہ کونسا اسلامی ملک ہے جہاں حضرت کے خلفاء او ر عقیدت مند موجود نہیں ہیں؟ مثلاً حضرت نور المشائخ ملائے شور بازار کابل۔ جن کی عظمت تمام افغانستان میں مسلّم ہے۔ اسی سلسلہ عالیہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن میں

اپنی اس ناچیز تالیف کو حضرت موصوف کے ذکر سے مزین کر کے اپنے لئے سرمایۂ سعادت بہم پہنچانا چاہتا ہوں۔

حضرت موصوف ۹۷۱ھ / ۱۵۶۴ء میں بمقام سرہند (مشرقی پنجاب) پیدا ہوئے تھے اور اسی شہر میں ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۵ء میں رحلت فرمائی اور حضرت کا مزار آج بھی مرجع انام بنا ہوا ہے اس کتاب میں حضرت کے علمی اور روحانی کمالات کے اظہار کا موقع ہے نہ گنجائش ہے صرف اس شعر کی تشریح کے لئے چند سطور سپرد قلم کرتا ہوں۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

اقبالؒ کے اس شعر سے یہ بات واضح ہے کہ ہندوستان میں کوئی ہستی ایسی پیدا ہو گئی تھی جو "سرمایۂ ملت" کو برباد کر دینا چاہتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو بروقت خبردار کر دیا اور انہوں نے بتائید ایزدی اس قیمتی سرمایہ کو تباہی سے بچا لیا۔

ارباب دانش سے مخفی نہیں ہے کہ وہ ہستی اکبر مرتد کی تھی جس نے ۱۵۸۱ء میں دین الٰہی کا فتنہ برپا کیا تھا اور اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان سے اسلام کا وجود ختم ہو جائے چنانچہ اس دشمن اسلام نے اسلام اور مسلمانوں کو اس قدر ضعف پہنچایا کہ اگر حضرت موصوف بحکم ایزدی اس فتنہ کا سدباب نہ فرماتے تو آج ہندوستان کے طول و عرض میں ایک مسلمان بھی نظر نہ آتا۔

جب اکبر مرتد کی وفات ہوئی اس وقت حضرت کی عمر شریف ۴۲ سال کی تھی اور یہ فتنہ اپنے شباب پر تھا۔ جہانگیر کی پرورش چونکہ غیر اسلامی ماحول میں ہوئی تھی اس لئے اس نے اس فتنہ کے استیصال کی کوئی کوشش نہیں کی نتیجہ یہ نکلا کہ ملت اسلامیہ کا وجود معرض خطر میں آگیا۔ اندریں حالات حضرت

مجددؒ نے اللہ کا نام لے کر تن تنہا اس فتنے کے استیصال پر کمر باندھی۔ مخالفوں نے ان کی کوششوں کو جہانگیر کے سامنے بغاوت کے رنگ میں پیش کیا جس پر اس زن مرید بادشاہ نے حضرت کو دربار میں طلب کیا۔

جب حضرت دربار میں تشریف لائے تو اسلامی طریقہ کے مطابق بادشاہ سے اَلسَّلَامُ عَلَیکُمْ فرمایا۔ جہانگیر تاریک ضمیر کے لئے یہ بالکل نئی بلکہ اہانت آمیز بات تھی اس لئے اس نے دریافت کیا کہ دستورِ جاہلیت کے مطابق مجھے سجدۂ تعظیمی کیوں نہیں کیا؟ حضرت نے جواب دیا کہ شریعتِ اسلامیہ کسی مسلمان کو دوسرے انسان کے سامنے سر جھکانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس جواب باصواب کو سن کر جہانگیر اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ چونکہ حضرت مجددؒ نے اس غیر اسلامی فضا میں حریت نفس کی اسلامی تعلیم کا اثبات کر کے تجدید دین کا پہلا فرض انجام دیا اس لئے اقبالؔ نے یہ شعر لکھا:

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

میں اس شرح میں اس داستان کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ حضرت مجددؒ کی مساعیٔ جمیلہ سے اس فتنہ کا استیصال کلی ہو گیا۔ اور حضرت کا یہ کارنامہ اتنا عظیم الشان ہے کہ ملّت اسلامیہ قیامت تک ان کے احسان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔

اقبالؔ نے اس نظم میں پنجاب کے پیرزادوں پر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے کمالات سے کیوں بے نصیب ہو گئے یہ صحیح ہے کہ ان بزرگوں نے ابھی تک اس نظم کا مطالعہ نہیں کیا لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ لوگ اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی طرف راغب ہو جائیں گے۔

کہتے ہیں کہ جب میں حضرت مجدّد کے مزار پر حاضر ہوا تو میں نے حضرت سے یہ عرض کی کہ مجھے بھی دولت فقر عطا فرمائیے تاکہ میرا دل بیدار ہو جائے اور میں حقیقت سے آشنا ہو جاؤں۔

یہ سن کر حضرت نے جواب دیا کہ اے اقبال! تجھے معلوم نہیں کہ سلسلۂ فقر بند ہو چکا ہے کیونکہ بزرگان دین (اہل نظر) کشور پنجاب سے سخت بیزار ہیں؟ اس خطہ میں تو ضمیر فروشی اور اقتدار پرستی کا یہ عالم ہے کہ آج کل جو لوگ بزرگانِ دین کے جانشین بنے بیٹھے ہیں وہ اپنے بزرگوں کا نام بیچ کر خطابات خرید رہے ہیں یعنی کلاہ فقر کو طرۂ دستار میں تبدیل کر رہے ہیں اندریں حالات پنجاب میں دولت فقر کسی شخص کو نہیں دی جا سکتی کیونکہ وہ اس کے ذریعہ سے حکومت میں عہدہ حاصل کرے گا یعنی فقیری کے نام کو بٹہ لگائے گا کلاہ فقر کا مقصد تو یہ تھا کہ اس کو پہن کر انسان کلمۂ حق کہہ سکے لیکن آج کل پنجاب میں یہ حالت ہے جن کو یہ کلاہ بزرگوں سے ورثہ میں ملی تھی انہوں نے اس کو طرۂ دستار سے بدل لیا اور طرۂ دستار نے ان میں خدا پرستی کے بجائے سرکار پرستی کا جذبہ پیدا کر دیا۔

سیاست

اس کھیل میں تعیینِ مراتب ہے ضروری
شاطر کی عنایت سے تو فرزیں میں پیادہ
بیچارہ پیادہ تو ہے اک مُہرۂ ناچیز
فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں سیاست بالکل شطرنج بن کر رہ گئی ہے کیونکہ ارباب سیاست بھی شطرنج کی سی چالیں چلتے رہتے ہیں دل میں کچھ ہوتا ہے عمل کچھ اور ہوتا ہے۔

چونکہ اس کھیل میں تعیین مراتب ضروری ہے یعنی بعض مہرے بلند مرتبہ پر ہوتے ہیں بعض کم مرتبہ پر۔ اسی طرح ارباب سیاست (انگریزوں) نے ہندوستان کی بساط سیاست میں بعض کو وزیر (فرزین) بنا دیا ہے بعض کو پیادہ۔ مثلاً کوئی تو وائسرائے کی کونسل کا ممبر ہے اور کوئی میونسپل کمیٹی کا۔

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ پیادہ کی تو حیثیت ہی کیا ہے شاطر (حاکم) کا ارادہ تو فرزین سے بھی پوشیدہ ہے یعنی جو لوگ سرکار کی ناک کا بال بنے ہوئے ہیں۔ ان کو بھی علم نہیں کہ مثلاً ریڈکلف نے گورداسپور کا ضلع کیوں تقسیم کر دیا؟ یا شہید گنج کی مسجد کو گرانے کے لئے انگریزوں نے سکھوں کو کس قانون کی رو سے کرپان (...) مہیا فرمائے تھے؟ یا شردھانند کو وقت سے پہلے ۱۹۲۳ء میں کیوں رہا کر دیا تھا؟

نوٹ:۔ اسی قسم کی صدہا مثالیں میرے حافظہ میں محفوظ ہیں لیکن اقبال کا مطلب واضح کرنے کے لئے یہ تین مثالیں ہی بہت کافی ہیں۔

فقر

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

•

اس نظم کا عنوان ہے (فقیر) واضح ہو کہ جس طرح اقبال کی رائے میں مذہب اور اذان کی دو قسمیں ہیں اسی طرح فقر بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو کافر میں پایا جاتا ہے۔ دوسرا وہ جو مومن میں نظر آتا ہے یعنی نام ایک ہی ہے لیکن نتائج مختلف ہیں۔ اقبال نے مثنوی "پس چہ باید کرد" میں بھی فقر کی ان دونوں قسموں کی وضاحت کی ہے صرف ایک شعر یہاں درج کرتا ہوں۔

فقر کافر خلوتِ دشت و دراست
فقر مومن لرزۂ بحر و براست

یعنی کافر جب فقر اختیار کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ترک دنیا کر کے کسی جنگل میں خلوت نشین ہو جاتا ہے لیکن جب مومن میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے تو وہ خشکی اور تری یعنی ساری دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ ایک فقر تو وہ ہے جو انسان کو عیاری اور فریب کھاتا

ہے جس کی بدولت وہ صیادی کا پیشہ اختیار کر کے اپنی قوت لایموت مہیا کرتا ہے لیکن ایک فقر ایسا بھی ہے جو انسان کے دل میں جہانگیری اور کشورکشائی کا ولولہ پیدا کر دیتا ہے تاکہ وہ دنیا میں آوازۂ حق بلند کر سکے اور دنیا والوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نجات دے سکے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فاروق اعظمؓ کی حکومت بنی آدم کے حق میں سراسر رحمت ہے کوئی مسلمان کسی دوسرے کا غلام نہیں تھا۔

ایک فقر وہ ہے جس کی بدولت قومیں دوسروں کی غلام بن جاتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی ذلت و مسکنت میں بسر ہوتی ہے۔

لیکن ایک فقر ایسا بھی ہے جس کی تاثیر سے مٹی سونا بن جاتی ہے یعنی غلام قوم دنیا میں سربلند ہو جاتی ہے یہ فقر وہ ہے جس کا نمونہ حضرت امام حسینؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا یہی وہ فقر ہے جس کے حصول کے بعد انسان دنیا میں سرداری کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے اور اسلام مسلمانوں کو اسی سرمایۂ شبیری کا وارث بنانا چاہتا ہے اسلام کا منشا اور مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمان جناب شبیرؓ کے نقش قدم پر چل کر دنیا میں حق و صداقت کے علم بردار بن جائیں امام حسینؓ کی زندگی قرآن مجید کی تفسیر ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

رمز قرآں از حسینؓ آموختیم
ز آتش او۔ شعلہ ہا افروختیم

خودی

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض
یہ کہتا ہے فردوسیِ دیدہ ور
عجم جس کے سُرمے سے روشن بصر
"ز بہرِ درم تند و بد خو مباش
تو باید کہ باشی درم گو مباش"

•

اقبال کا مسلک جیسا کہ ان اشعار سے واضح ہے جو انہوں نے ساقی نامہ اور اس نظم میں لکھے ہیں جس میں جاوید سے خطاب کیا ہے۔ یہ ہے کہ دولت حاصل کرنے کے لئے اپنی خودی کو قربان مت کرو بلکہ اس دولت سے جو خودی بیچ کر حاصل ہو۔ غریبی بدرجہا بہتر ہے۔

اس نظم میں بھی انہوں نے فردوسی کے ایک شعر سے اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کلام اقبال کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ انہیں کسی شاعر کے کلام میں اگر کوئی شعر اپنے مسلک کی تائید میں مل جاتا ہے تو وہ اسے بلا تامل لے لیتے ہیں اور اس پر تضمین کر کے اپنا مطلب واضح کر دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ اے مخاطب! دولت کے لئے اپنی خودی کو تباہ مت کر خودی دے کر دولت مت لے کیونکہ کوئی شخص شعلہ دے کر شرر نہیں خریدتا۔ پائیدار

چیز دے کر ناپائیدار چیز نہیں لیتا۔

چنانچہ فردوسی کہتا ہے کہ درم (دولت) حاصل کرنے کے لئے اپنی خودی کو ذلیل مت کرو۔ اپنی سیرت کو تباہ مت کرو۔ کیونکہ خودی مستقل بالذات اور پائدار شئے ہے اور دولت تو سراسر ناپائدار چیز ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اگر دولت ضائع ہو جائے تو پھر حاصل ہو سکتی ہے لیکن اگر کریکٹر (سیرت) ضائع ہو جائے تو پھر انسان کا عدم اور وجود دونوں برابر ہو جائیں گے۔

نوٹ:۔ فردوسی۔ فارسی زبان کا مشہور شاعر جس کی تصنیف "شاہنامہ" دنیا کی غیر فانی کتابوں میں سے ہے غالباً ۹۴۰ء میں بہ مقام شاداب متصل طوس (ایران) پیدا ہوا تھا۔ رقیقی کی وفات کے بعد سلطان محمود غزنوی کی فرمائش پر تیس سال کی مدت میں شاہنامہ کو تکمیل تک پہونچایا ۱۰۲۰ء میں بمقام طوس وفات پائی۔

جُدائی

سورج بُنتا ہے تارِ زر سے
دنیا کے لئے ردائے نوری
عالم ہے خموش و مست گویا
ہر شئے کو نصیب ہے حضوری
دریا کہسار چاند تارے
کیا جانیں فراق و ناصبوری
شایاں ہے مجھے غمِ جُدائی
یہ خاک ہے محرمِ جدائی

•

یہ نظم اگرچہ مختصر ہے لیکن اس میں بڑی سنجیدگی اور تاثیر پائی جاتی ہے غور سے دیکھو تو درد سوز بھی اور نیا رنگ نظر آتا ہے۔

کہتے ہیں کہ آفتاب کی روشنی کائنات کی ہر شئے کو زندگی اور نشوونما بخشتی ہے جمادات نباتات اور حیوانات سب اس کی روشنی سے سامان بقا حاصل کرتے ہیں اور اس کی بدولت ان میں مستی و سرور کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے گویا انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم پر فیضان الٰہی نازل ہورہا ہے اور ہم سب اس کے حضور میں حاضر ہیں۔

لیکن اس کائنات میں صرف انسان ایک ایسی ہستی ہے جس کو یہ احساس دامن گیر ہے کہ میں اپنے اصلی وطن سے دور ہوں یا اپنے محبوب سے جدا ہوگئی ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں روح حیوانی کے علاوہ ایک جوہر نورانی بھی ہے جو اپنی بقا کے لئے آفتاب کا محتاج نہیں ہے یہ جوہر عشق ہے جس کی بنا پر انسان تمام مخلوقات سے بالاتر ہے اور اسی کی بدولت وہ جدائی کا احساس کرتا ہے۔ مرشد رومیؒ نے اس شعر میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
در جدائیہا شکایت می کند

خانقاہ

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
"قُم بِاِذنِ اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

•

چونکہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی خانقاہیں اس مقصد کو پورا نہیں کرتیں جس کے لئے بزرگانِ دین نے ان کو قائم کیا تھا بلکہ آج کل ان میں مسلمانوں کو بے عملی کا درس دیا جاتا ہے اور یہ درس اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے اس لئے اقبالؔ نے اس قطعہ میں موجود خانقاہوں کی حقیقت واضح کر دی ہے۔

کہتے ہیں کہ اس زمانہ کے مسلمان چونکہ رمز و ایما کے پردے ہٹا کر حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اس لئے میں مجبور ہوں کہ صاف لفظوں میں ان کو بتا دوں کہ اے مسلمانو! جو لوگ "قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے یعنی جو بزرگ کہ مردوں کو زندہ کر سکتے تھے وہ تو رخصت ہو گئے اب خانقاہوں میں صرف مجاور اور گورکن باقی رہ گئے ہیں۔

مجاور۔ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی قبر کے پاس بیٹھا ہے اور زائرین سے نذرانے وصول کر کے تنور شکم کے لئے لکڑیاں فراہم کرتا رہے۔

گورکن کے لفظی معنی تو سب جانتے ہیں یہاں وہ شخص مراد ہے جو دوسروں

کے سہارے زندگی بسر کرے یا ناجائز طریقوں سے روزی حاصل کرے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خانقاہوں میں اب وہ لوگ باقی رہ گئے ہیں جو بغیر محنت اپنی روزی حاصل کرتے ہیں اور قوم کے حق میں ان کا وجود سراسر ذلت اور رسوائی کا موجب ہے خود بھی بے عمل ہیں اور دوسروں کو بے عملی کی ترغیب دیتے ہیں۔

ابلیس کی عرضداشت

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے
پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب
دل نزع کی حالت میں خِرد پختہ و چالاک
ناپاک جسے کہتی تھی مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک
تجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی
ویرانیٔ جنّت کے تصور سے ہیں غمناک
جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

●

یہ نظم اقبال کی طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ ابلیس نے اللہ سے یہ عرض کی کہ اے خدا! اگرچہ تو نے آدم کو مٹی سے بنایا تھا لیکن اب اس میں ناری عنصر اس قدر غالب ہو چکا ہے کہ اس پر خاکی ہونے کا اطلاق درست نہیں ہے طرز عمل کے لحاظ سے بالکل آتشیں مخلوق معلوم ہوتا ہے یعنی اس کے افعال شیطانی ہو گئے ہیں۔

قلب ماہیت ہو جانے کے بعد اب اس کی حالت یہ ہے کہ اس کی روح تو بہت ضعیف اور ناتواں ہو گئی ہے لیکن جسم نہایت فربہ اور تنومند ہو گیا ہے یعنی روحانیت کا فقدان ہے مادیت کا غلبہ ہے اور وہ اپنی ساری توجہ لباس اور آرائش ظاہری پر مبذول کر رہا ہے وہ تقویٰ اور پاکیزگی کی طرف سے بالکل غافل ہے لیکن اس نے عقل و خرد میں بہت ترقی کر لی ہے۔

مشرقی مذاہب جن باتوں کو مذموم قرار دیتے ہیں مغربی اقوام ان کو قابل تحسین سمجھتی ہیں مثلاً مشرقی اقوام، دروغ گوئی۔ مکر و فریب اور عیاری کو بہت برا جانتی ہیں لیکن مغرب میں تمام عیوب "آرٹ" کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور دنیائے سیاست میں ان برائیوں کو "ڈپلومیسی" کے شاندار لقب سے یاد کیا جاتا ہے چونکہ بنی آدم نے نیکی اور بدی کے ان تمام امتیازات کو جو شریعت نے قائم کئے تھے یکسر مٹا دیا ہے آج ہر برائی اور بدی نیکی اور بھلائی کا قالب اختیار کر چکی ہے سود۔ قمار۔ شراب۔ زنا۔ سب داخل فیشن ہو چکے ہیں اس لئے حوران بہشتی بہت رنجیدہ ہیں کہ جب کوئی شخص بھی نیکی نہیں کرے گا تو جنت یقیناً ویران ہو جائے گی۔ بدکار تو اس میں داخل ہو نہیں سکتے اور نکوکار کوئی نظر نہیں آتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ دوزخ آباد اور جنت سنسان ہو جائے گی۔

پہلے زمانہ میں میری ذریت جمہور کو گمراہ کرنے کا فرض انجام دیا کرتی تھی لیکن اب حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے ہیں کہ یہ معزز پیشہ۔ ارباب سیاست نے اختیار کر لیا ہے اس لئے اے خدا! میں تجھ سے باادب درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھے کوئی اور کام عطا کر دے تاکہ میں اپنی زندگی بیکار بسر کرنے سے بچ سکوں دنیا والوں کو تو اب مطلق میری ضرورت نہیں ہے۔

اس نظم کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ یورپ کی سیاست کو ابلیسی کاروبار تصور کرتے تھے اور جو شخص بھی یورپین اقوام کے سیاسی طرز عمل کا مطالعہ کرے گا وہ یقیناً اقبالؔ کا ہمنوا ہو جائے گا۔

ایک لارنس نے عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکا کر جو فتنہ برپا کیا اور دنیائے عرب کو جن مصائب میں مبتلا کیا۔ دو ہزار ابلیس مل کر بھی اس کام کو انجام نہیں دے سکتے۔

انگریزوں نے گذشتہ تین سو سال میں (۱۶۵۰ء تا ۱۹۵۰ء) اسلام اور مسلمانوں کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کی تفصیل کے لئے تو کئی ضخیم مجلدات درکار ہوں۔

اسے اقرار اغوا ہے یہ اغوا کو چھپاتے ہیں
علیہ اللعن ہے شیطان لیکن ان سے اچھا ہے

اکبرؔ چونکہ مدخولہ گورنمنٹ تھے اس لئے نام کی صراحت نہ کر سکے بلکہ اسم کے بجائے ضمیر سے اپنا کام لیا چونکہ میں بفضل خدا کسی رنگ میں اس قوم کا دست نگر یا محتاج نہیں ہوں اس لئے اس امر کی صراحت کرتا ہوں کہ ان سے اکبرؔ کی مراد انگریز قوم ہے۔

لہو

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
جسے ملا یہ متاعِ گراں بہا اس کو
نہ سیم و زر سے محبت ہے نے غمِ افلاس

•

اس نظم میں اقبالؔ نے لہو کی قدر و قیمت واضح کی ہے لہو سے ان کی مراد وہ خون نہیں ہے جو رگوں میں گردش کرتا ہے یہ تو نظام علی خاں کی رگوں میں بھی دائر و سائر تھا بلکہ عزم۔ ہمت اور حوصلہ ہے جو انسانیت کا جوہر شخصیت کا زیور اور ہر قسم کی مادی اور روحانی ترقی کے لئے شرطِ اولین ہے جس بادشاہ میں ہمت نہ ہو وہ کوئی ملک فتح نہیں کر سکتا۔ جس سالک میں ہمت نہ ہو وہ کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتا جس طالب علم میں ہمت نہ ہو وہ کوئی امتحان پاس نہیں کر سکتا۔ اگر بابر میں یہ جوہر نہ ہوتا تو ہندوستان در کنار وہ فرغانہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔ کولمبس میں یہ یہ خوبی نہ ہوتی تو قیامت تک امریکہ دریافت نہیں کر سکتا تھا اگر عالمگیر میں یہ وصف نہ ہوتا تو وہ ستاسی سال کی عمر میں گھوڑے پر سوار ہو کر فوجوں کی قیادت اور گول کنڈہ کا ناقابل تسخیر قلعہ فتح نہیں کر سکتے تھے۔

اسی لئے اقبالؔ کہتے ہیں کہ جس شخص میں عزم و ہمت کی صفت پائی جاتی ہے اس کے دل میں خوف و خطر راہ نہیں پا سکتا۔ وہ جس کو یہ دولت نصیب

ہوجاتی ہے وہ تونگری اور مفلسی دونوں سے بالاتر ہوجاتا ہے۔ اگر وہ دولتمند ہے تو دولت سے محبت نہیں کرتا اور اگر مفلس ہے تو افلاس سے رنجیدہ نہیں ہوتا کیونکہ عزم و ہمت بجائے خود سب سے بڑی نعمت اور سب سے بڑی دولت ہے۔

پرواز

کہا درخت نے اک روز مرغِ صحرا سے
ستم پہ غمکدۂ رنگ و بو کی ہے بنیاد
خدا مجھے بھی اگر بال و پر عطا کرتا
شگفتہ اور بھی ہوتا یہ عالمِ ایجاد
دیا جواب اسے خوب مرغِ صحرا نے
غضب ہے داد کو سمجھا ہوا ہے تو بیداد
جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اس کا
وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

•

اس دلکش نظم میں اقبال نے تمثیل کے پردے میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جس شئے کا وجود جذبِ خاک سے آزاد نہیں ہے وہ لذت پرواز سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔

جن لوگوں نے اقبال کے فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ حقیقت واضح ہے کہ ان کی تصانیف میں ہر صفحہ پہ جذبِ خاک اور لذت پرواز کا موازنہ

اور آخر الذکر کی فضیلت کے دلائل نظر آتے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اقبال کا سارا فلسفیانہ نظام اسی بنیادی نقطہ پر مبنی ہے کہ خاک کے مقابلہ میں پرواز یا عقل کے مقابلہ میں عشق یا مادہ کے مقابلہ میں روح کی برتری ثابت کی جائے۔

اقبال نے اس مسئلہ کو اپنی فلسفیانہ تصنیف اسلام میں مذہبی افکار کی جدید تشکیل میں بڑی وضاحت کے ساتھ خالص کلامیہ انداز میں بیان کیا ہے لیکن قوم کی خوش نصیبی ہے کہ وہ متکلم کے علاوہ شاعر بھی تھے اس لئے انہوں نے راقم الحروف جیسے کم سواد اور بے مایہ لوگوں کی خاطر اس مسئلہ کو درخت اور صحرا کے مکالمہ کی وساطت سے سریع الفہم بنا دیا۔

اک درخت نے ایک روز ایک پرندے سے کہا کہ اگر خدا مجھے بھی تیری طرح پرواز کی طاقت عطا کرتا تو یہ دنیا اور بھی دلکش ہو جاتی لیکن افسوس کہ اس غمکدۂ رنگ دبو (دنیا) کی بنیاد ظلم وستم پر رکھی گئی ہے یعنی فطرت نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے مجھے قوت پرواز عطا نہیں کی۔

پرندے نے یہ سن کر درخت کو جواب دیا کہ تو اپنی کم فہمی کی وجہ سے داد (انصاف) کو بیداد (ظلم) سمجھتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فطرت نے تیرے ساتھ مطلق ظلم نہیں کیا۔ اگر تو لذت پرواز سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہے تو اپنے وجود کو جذب خاک سے آزاد کرلے کیا تو غور نہیں کرتا کہ تو مادیات سے اس قدر شدید رابطہ رکھتا ہے کہ دن رات بلکہ ہر لحظہ ماحرائے مادی کو اپنے نظام میں جذب کرتا رہتا ہے جب تو ایک لمحہ کے لئے اپنا رشتہ مادہ سے منقطع نہیں کرسکتا تو مادیات اور عالم مادی سے بالاتر ہو کر فضا میں کیسے پرواز کرسکتا ہے؟

اقبال نے آخری شعر میں اپنی شاعری کا کمال دکھایا ہے یہ شعر لفظاً اور معناً دونوں اعتبار سے صحیح ہے چونکہ درخت کی جڑیں زمین میں دور تک پھیلی

ہوئی ہوتی ہیں اس لئے درخت کے لئے پرواز کرنا محال عقلی ہے دوسرے معنی وہ ہیں جو میں نے اوپر بیان کئے ہیں یعنی جب تک کوئی شئے مادہ سے اپنا رابطہ منقطع نہ کرے وہ روحانی ترقی نہیں کر سکتی۔

اس تمثیل سے اقبال کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اگر انسان عالم روحانیت میں مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے عالم مادیات سے اپنا تعلق منقطع کرنا پڑیگا۔ درخت ہوا میں نہیں اڑ سکتا کیونکہ اس کی جڑیں زمین کے اندر مادہ کے ساتھ پیوست ہو چکی ہیں۔ اسی طرح وہ انسان روحانیت میں ترقی نہیں کر سکتا جس کا نفس مادیات کے ساتھ پیوست ہو چکا ہے۔

شیخ مکتب سے

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روحِ انسانی
نکتۂ دل پذیر تیرے لئے
کہہ گیا ہے حکیم قاآنی
پیشِ خورشید بر مکش دیوار
خواہی از صحنِ خانہ نورانی

•

اس چھوٹی سی دلکش نظم میں اقبال نے ملک کے اساتذہ (ماسٹروں، لیکچراروں اور پروفیسروں) کو یہ نصیحت کی ہے کہ آپ حضرات دراصل

معیار میں یہ سب سے بڑی عزت ہے جو کوئی قوم اپنے افراد کو دے سکتی کہ وہ اپنے سرمایہ یعنی بچوں کو یہ کہہ کر ان کے حوالہ کردے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

جس طرح معمار عمارتوں کی تشکیل کرتا ہے آپ حضرات سیرت کی تشکیل کرتے ہیں جس قالب میں چاہیں۔ ڈھال سکتے ہیں خواہ سینما اور تھیٹر کا چسکا لگا دیں خواہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا شیدا بنا دیں چاہے انسان بنا دیں چاہے حیوانوں سے ملا دیں اس لئے میں آپ حضرات کی توجہ حکیم قاآنی کے اس شعر کی طرف مبذول کرتا ہوں۔

پیش خورشید برمکش دیوار
خواہی ار صحن خانہ نورانی

یعنی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارے گھر کا صحن آفتاب کی روشنی سے منور ہو جائے تو اپنے صحن اور آفتاب کے مابین کوئی دیوار (حجاب) کھڑی مت کرو۔ یعنی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ نوجوانوں کے قلوب اسلام کے نور سے منور ہو جائیں اور ان کے سینوں میں عشق رسولؐ کی آگ روشن ہو جائے تو نوجوانان ملت اور قرآن حکیم کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہونے دو اور اگر ہو گئی ہو تو اسے دور کردو۔

نوٹ:۔ قاآنی کی نصیحت اور اقبال کا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن جب نظام و نصاب تعلیم ہی یکسر کافرانہ ہو تو اساتذہ کیا کر سکتے ہیں موجودہ انگریزی تعلیم کا جو اثر مسلمان لڑکیوں پر مرتب ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے ایک مشہور اشتراکیت نواز

انگریزی روزنامہ کے سنڈے ایڈیشن میں مسلمان لڑکیاں اپنے متوقع فلمی دوستوں کی آگاہی کے لئے اپنی دلچسپیوں کی تفصیل میں یہ فقرہ ضرور لکھتی ہیں کہ " مجھے رقص و سرود سے بہت دلچسپی ہے " میں اس کالم کو احترام کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ آج تک کسی مسلمان لڑکی نے یہ نہیں لکھا کہ مجھے نماز اور تلاوت قرآن سے بہت دلچسپی ہے۔ سچ ہے جس چیز سے انسان آشنا ہی نہ ہو اس کا تذکرہ کیسے کر سکتا ہے۔؟

فلسفی

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِّ محبّت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذّت سے بے نصیب رہا

•

اس چھوٹی سی نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ فلسفی اور عاشق میں کیا فرق ہے؟

بلند بال یعنی بلند پرواز مراد ہے وہ شخص جس کی قوت متخیلہ بہت تیز ہو۔ یعنی صاحب فکر (فلسفی)

جسور و غیور۔ بہادر اور غیرت مند۔ کنایہ ہے عاشق سے یعنی صاحب ذکر (عاشق)

کہتے ہیں کہ فلسفی میں قوت فکر تو ہوتی ہے۔ لیکن جرأت اور غیرت (دینی) نہیں ہوتی اس لئے وہ اسرارِ محبت (الٰہی) سے آگاہ نہیں ہو سکتا یعنی اللہ سے محبت نہیں کر سکتا۔

اس کی مثال کرگس کی زندگی سے مل سکتی ہے یوں تو وہ فضا میں شاہین کی طرح پرواز کرتا رہتا ہے لیکن اس میں جرأت نہیں ہوتی اس لئے وہ کسی زندہ پرند کو شکار نہیں کر سکتا مردار ہی کھاتا ہے خلاصۂ کلام یہ کہ

(۱) فلسفی صرف بلندبال ہوتا ہے۔

(۲) عاشق بلندبال بھی ہوتا ہے اور جسور و غیور بھی۔ اس لئے فلسفی گھر میں بیٹھ کر کتابیں لکھ سکتا ہے میدان جنگ میں جا کر جہاد نہیں کر سکتا یہ دولت صرف عاشق کے حصہ میں آ سکتی ہے۔

شاہیں

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارا
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری. نہ گلچیں. نہ بلبل
نہ بیماری نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جوانمردی کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اس نظم میں اقبالؔ نے شاہین کی وہ خصوصیات بیان کی ہیں جن کی بنا پر وہ ان کا محبوب بن گیا ہے مرحوم نے ان میں سے بعض خصوصیت کا تذکرہ اس خط میں بھی کیا ہے جو انہوں نے پروفیسر ظفر احمد صدیقی ایم۔اے کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔

شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے اس جانور میں اصلاحی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہے (۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے۔ (۴) خلوت پسند ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔

اس نظم کے لکھنے سے اقبالؔ کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان نوجوان بھی شاہین کی یہ صفات اپنے اندر پیدا کریں۔

(۱) شاہین دوسرے پرندوں کی طرح شہروں یا دیہاتوں میں نہیں رہتا اور نہ بعض پرندوں کی طرح پنجرہ میں رہ کر دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا کہ دوسرے اسے دانہ پانی دے دیا کریں۔ اور نہ وہ اس دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے۔ جہاں اسے بے محنت و مشقت رزق حاصل ہو جائے۔ اس کا رزق آب و دانہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنا رزق اپنی قوت بازو سے پیدا کرتا ہے۔

(۲) اس کی فطرت چونکہ زاہدانہ ہے اس لئے وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتا ہے۔

(۳) جہاں نہ باغ ہوتے ہیں نہ پھول۔ نہ صیاد نہ بلبل کے نغمے۔

(۴) وہ گلستاں میں رہنے والے پرندوں اور ان کے نغموں سے نفرت

لہ حاشیہ صفحہ ۸۳

کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ عیش و عشرت اور رقص و سرود کی زندگی کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

(۵) اس کے بجائے وہ کوہستان اور بیابان میں رہتا ہے کیونکہ ان کی آب و ہوا سے انسان کے اندر جوانمردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

(۶) اس کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہوتا ہے اس لئے وہ کسی خاص مقام میں زندگی بسر نہیں کرتا۔ شاہین کی اس خصوصیات کو مدنظر رکھنے کے بعد ناظرین یقیناً اقبال سے اتفاق کریں گے کہ اس میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات موجود ہیں اور اسی لئے انہوں نے اس کی زندگی کو نوجوانوں کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۸۲۹ کا)

[1] آب و دانہ سے مراد وہ غذا جو بآسانی مل جائے۔

باغی مُرید

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

•

اقبالؔ نے اس نظم میں ایک باغی مرید کی زبان سے زمانہ کے پیروں کا راز فاش کیا ہے۔

سادہ۔ کثیر المعانی لفظ ہے اس مصرع میں اس سے بیوقوف مراد ہے۔ کعبہ کے برہمن سے پیرانِ سجادہ نشین مراد ہیں۔ خرقہ سالوس کے لغوی معنی ہیں۔ جامۂ مکر و فریب مسندِ ارشاد۔ وہ جگہ جہاں بیٹھ کر کوئی شخص دوسروں کو نیکی کی تلقین کرے۔ ارشاد بمعنی ہدایت کردی۔

زاغ کنایہ ہے۔ نااہل صوفیوں اور پیروں سے۔

عقاب کنایہ ہے۔ سچے مذہبی پیشواؤں سے۔

مرید کہتا ہے کہ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ ہم افلاس کی وجہ سے

اپنے گھروں میں مٹی کا دیا بھی نہیں جلا سکتے لیکن ہمارے پیر روشن ضمیر کے گھر میں بجلی کی روشنی ہوتی ہے۔ ہمارا پیر مریدوں کو ترک دنیا کا سبق دیتا ہے لیکن خود دونوں ہاتھوں سے دنیا سمیٹ رہا ہے۔

اس کے بعد اقبالؔ مرید کی زبان سے ان حقائق کا انکشاف کرتے ہیں کہ مسلمان خواہ شہری ہو یا دیہاتی بڑا ہی سادہ لوح واقع ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ پیروں کی پرستش کرتا ہے۔

جو نذرانہ پیر مریدوں سے وصول کرتا ہے وہ ایسا ہی ناجائز ہے جیسا کہ سود اس لئے ہر وہ پیر جو اپنے مریدوں سے نذرانے کے نام سے ناجائز رقوم حاصل کرتا ہے۔ دراصل مہاجن ہے جس نے ریاکاری اور مکاری کا خرقہ زیب تن کر رکھا ہے۔

یہ لوگ جس مسند ارشاد پر متمکن ہیں اس کے اہل نہیں ہیں وعظ و ہدایت کی یہ مسندیں ان کو ورثہ میں مل گئی ہیں یعنی نااہلوں نے بزرگان دین کی مسندوں پر ناجائز طور سے تصرف کر لیا ہے۔

ہارون کی آخری نصیحت

ہارون نے کہا وقتِ رحیل اپنے پسر سے
جائے گا کبھی تو بھی اسی راہگذر سے
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے

•

ہارون الرشید عباسی خاندان کا پانچواں فرماں روا تھا ۱۷۰ھ/۷۸۶ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۹۳ھ/۸۰۹ء میں وفات پائی۔ اقبال مندی فتوحات اور سطوت و شوکت کے لحاظ سے اس کا شمار دنیا کے نامور سلاطین میں ہے اس کی عظمت و جلالت شان کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جب قیصر روم نے اسے اس مضمون کا خط بھیجا کہ جس قدر خراج تم میرے پیش رو سے وصول کر چکے ہو۔ سب واپس کر دو۔ ورنہ تلوار فیصلہ کرے گی تو اس نے اسی خط کی پشت پر جواب لکھ کر واپس کر دیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ امیر المؤمنین ہارون الرشید کی طرف سے روم کے کتے نقفور (Nicephorus) کو معلوم ہو کہ میں نے تجھ کافر کا خط پڑھا اس کا جواب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

ہارون نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی کہ یہ دن تیرے لئے بھی مقدر ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت۔ ہر انسان (ایک نہ ایک دن یقیناً) موت کا مزہ چکھے گا۔ مومن اور کافر میں یہ فرق ہے کہ کافر اس طرح زندگی

بسر کرتا ہے گویا اسے کبھی خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا نہیں ہوگا لیکن مومن ہمیشہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتا ہے کہ دنیا فانی ہے اور ایک دن مجھے اللہ کے حضور میں حاضر ہو کر جوابدہی کرنی ہے اس لئے وہ جب تک زندہ رہتا ہے اللہ کی نافرمانی سے مجتنب رہتا ہے۔

ماہر نفسیات سے

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گذر جا
ہیں بحر خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے

•

اس قطعہ میں اقبال نے ماہرین نفسیات کو اس نقطہ سے آگاہ کیا ہے کہ علم النفس کی بدولت تم نفس انسانی (خودی) کے افعال و آثار سے تو واقف ہو سکتے ہو لیکن اس کے اسرار و رموز سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

اگر تم خودی کی ماہیت سے واقف ہونا چاہتے ہو تو اپنے اندر "ضرب کلیمی" یعنی شان فقر پیدا کرو اور یہ صفت (طاقت) صرف صحبت مرشد سے پیدا ہو سکتی ہے اقبال نے علم النفس کی اس کم مائیگی اور بیچارگی کو اپنی تشکیل جدید کے ساتویں لیکچر (میں صفحہ ۱۸۱ تا ۱۸۲) پر بالوضاحت بیان کیا ہے اس شرح میں پوری بحث تو نقل نہیں کر سکتا صرف ایک فقرہ صفحہ ۱۹۲ سے نقل کرتا ہوں۔

"جدید علم النفس (Psychology) کو ابھی تک خودی کی مذہبی زندگی کے دامن کی بھی

ہوا انہیں لگی ہے۔

یورپ

تاک میں بیٹھے ہیں مدت سے یہودی سود خوار
جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ
خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ

(ماخوذ از نطشے)

اس قطعہ میں اقبال نے جرمن فلسفی نطشے کے اس قیاس کو نظم کیا ہے کہ یہودی قوم چونکہ حکومت سے محروم ہے اس لئے اپنی بے پناہ دولت کے بل بوتے پر اس کوشش میں ہے کہ عیاری (روباہی) سے کام لے کر (جس کے سامنے چیتا بھی بے بس ہو جاتا ہے) یورپ کی سیاست پر مسلط ہو جائے اور اس طرح اپنی ہوس اقتدار کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔

ایک طرف یہ قوم اپنی یہ کاریوں میں مصروف ہے دوسری طرف یورپ کی بڑی بڑی طاقتیں ہر وقت آپس میں مصروف پیکار ہیں اس لئے قیاس یہ کہتا ہے کہ انجام کار یورپ کی عنان سیاست یہودیوں کے ہاتھ میں آجائے گا۔

نوٹ:۔ چونکہ علامہ مرحوم نطشے کے اس خیال سے متفق تھے اس لئے انہوں نے اس کو نظم کا لباس پہنا دیا نیز ایک گفتگو کے دوران میں خود انہوں نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ تم تو یہ سمجھتے ہو کہ انگلستان میں برطانی عوام

یا برطانی مجلس وزراء کی حکومت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہر معاملہ میں ماہرین فن (Experts) کے مشوروں پر عمل کرتے ہیں مثلاً کوئی معاشی مسئلہ درپیش ہو تو کیبنٹ (مجلس وزراء) ماہرین معاشیات سے مشورہ طلب کرتی ہے اور انگلستان میں جس قدر ماہرین فن ہیں۔ وہ سب برطانوی یہودی سرمایہ داروں کے زیر اثر ہیں اس لئے وہ اپنے مربیوں سے مشورہ طلب کرتے ہیں پس حکومت کی باگ ڈور دراصل یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔

تاریخ عالم کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ طاقت ہمیشہ دولت مندوں کے ہاتھ میں رہی ہے اور دنیا والے شروع سے دولت کو سجدہ کرتے چلے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکہ کا اقتدار باستثنائے روس ساری دنیا پر مسلم ہے۔

آزادیٔ افکار

جو دونیٔ فطرت سے نہیں لائقِ پرواز
اس مرغکِ بیچارہ کا انجام ہے افتاد
ہر سینہ نشیمن نہیں جبریلِ امیں کا
ہر فکر نہیں طائرِ فردوس کا صیّاد
اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

•

اس نظم میں اقبال نے عصرِ حاضر کے ایک اہم مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا ہے یعنی آزادیٔ افکار اچھی چیز ہے یا بری؟

واضح ہو کہ جمہوریت کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ انسانوں میں اپنے افکار و خیالات کو آزادی کے ساتھ پیش کرنے کا جذبہ بھی پیدا ہوا ابتدا میں یہ آزادیٔ افکار صرف اس حد تک تھی کہ ہر شخص اپنے نمائندہ کے انتخاب میں اپنی رائے آزادی کے ساتھ دے سکتا ہے یہاں تک تو کوئی حرج نہ تھا لیکن ابلیس نے اس زریں موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور لوگوں کو یہ سمجھایا کہ جب تم آزاد ہو گئے ہو تو زندگی کے ہر معاملہ میں آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہو اس کے بعد اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور یہ نکتہ ذہن نشین

کیا کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس معاملہ میں بھی اپنی رائے کو مجتہدانہ انداز میں دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے جس کے سمجھنے کی بھی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔

ہمارے زمانہ میں اشتراکی ادیبوں نے جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی اشاعت کو مقصد حیات بنا لیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ہر اخلاقی پابندی کو "رجعت پسندی" سے تعبیر کرتے ہیں اور ارباب علم سے مخفی نہیں کہ اشتراکیت کی لغت میں کوئی لفظ "رجعت پسندی" سے زیادہ مذموم اور مکروہ نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہر اخلاقی پابندی کو اپنے حق میں ایک عذاب جان تصور کرتے ہیں اور نہایت بیباکی کے ساتھ ان مسائل پر رائے زنی کرتے ہیں جن کے سمجھنے کی بھی ان کی صلاحیت نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص علمی یا روحانی مسائل میں گفتگو کرنے یا اظہار رائے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہر شخص افلاطون اور ارسطو کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا یہ قانون فطرت کے خلاف ہے۔

جس قوم کے افراد اخلاقی قیود و حدود سے آزاد اور بے نیاز ہو چکے ہوں اس کے حق میں آزادیٔ افکار بہت خطرناک ثابت ہوتی ہے کیونکہ ان کی گفتگو یا تحریر میں ربط و نظم پیدا نہیں ہو سکتا اور بے ربطیٔ افکار سے قوم میں انتشار رونما ہونا یقینی ہے اور انتشار سے وحدتِ فکر زائل ہو جاتی ہے اور اس کے زوال سے قوم برباد ہو جاتی ہے۔

نوٹ:۔ یہی وجہ ہے کہ آج روس میں کوئی شخص اسٹالین سے اختلاف رائے نہیں کر سکتا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل

وخرد وہ نعمت ہے جس کی بدولت یہ دنیا ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اور اس دنیا میں جس قدر روشنی نظر آرہی ہے یہ سب فکر خداداد ہی کا کرشمہ ہے لیکن "آزادیٔ افکار" کی لعنت ابلیس کی ایجاد ہے تاکہ بنی آدم انسانیت کے مرتبہ سے تنزل کر کے حیوانیت کے دائرہ میں آجائیں۔

ابلیس کا مقصد یہ ہے کہ بنی آدم روحانیت اور اخلاق حسنہ سے معرّا ہو جائیں اس لئے اس نے انہیں سمجھایا کہ چونکہ تم آزاد ہو اس لئے اپنی فکر کو بھی تمام اخلاقی قیود سے آزاد کر دینا چاہیئے۔

اقبالؔ کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا میں حقیقی حسن و جمال اور صحیح ترقی صرف اخلاقی یا فنی قوانین کی پابندی سے ممکن ہے مثال کے طور پر اگر کسی نغمہ یا راگنی کو فن موسیقی کی قیود سے آزاد کر دیا جائے تو اس کا جمال اور دلکشی بالکل غائب ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ کسی مسئلہ میں اظہارِ رائے کا حق صرف اس شخص کو حاصل ہے جس نے اس فن میں مہارت تامہ حاصل کی ہے جس پر وہ مسئلہ مبنی ہے مثلاً اس شخص کو کسی طبیب کے نسخہ پر اظہار رائے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جس نے فن طب باضابطہ حاصل نہ کیا ہو اسی طرح اس شخص کو دینی معاملات میں رائے دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جس نے علوم دینی کی باقاعدہ تکمیل نہ کی ہو۔

لیکن ابلیس کا کارنامہ یہی تو ہے کہ آج وہ لوگ دینی معاملات میں مجتہدانہ انداز سے اظہار رائے کر رہے ہیں جنہوں نے نہ تو علم دین حاصل کیا اور نہ کسی شیخ کی صحبت اٹھائی محض اخبارات رسائل کی ادارت کے وسیلہ سے "امیر جماعت" کے منصب عالیہ پر سرفراز ہو گئے اور آج پاکستان

کے سادہ لوح مسلمانوں کو "صالح نمائندوں" کی معرفت اسلامی حکومت کے قیام کا سبز باغ دکھا کر اپنی دکان چمکا رہے ہیں۔

شیر اور خچر

شیر

ساکنانِ دشت وصحرا میں ہے تو سب سے الگ
کون ہیں تیرے اب وجد؟ کس قبیلے سے ہے تو

خچر

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار! شاہی اصطبل کی آبرو

(ماخوذ از جرمن)

•

شیر اور خچر کے اس مکالمہ کا مطلب یہ ہے کہ جس کی ددھیال ناقص یا ذلیل ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو ننھیال کی طرف منسوب کرتا ہے۔
مثلاً جب شیر نے خچر سے پوچھا کہ تو کس خاندان سے ہے؟ تیرے باپ دادا کون تھے؟ تو خچر نے اپنے باپ (حمار) کا ذکر کرنے کے بجائے اپنے ماموں (گھوڑے کا نام لیا)

چیونٹی اور عقاب

چیونٹی

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

•

چیونٹی نے عقاب سے پوچھا کہ میں تو اس قدر ذلیل و خوار اور پریشان ہوں۔ رات دن لوگ مجھے پامال کرتے رہتے ہیں اور تو اس قدر بلند مرتبہ ہے کہ انسان تیری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا اس کی وجہ کیا ہے۔؟

عقاب نے جواب دیا کہ تو ہو یا کوئی اور۔ جو بھی اپنا رزق خاکِ راہ میں تلاش کرے گا وہ پامال اور ذلیل و خوار ہو گا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر زاویۂ نگاہ پست ہو گا تو زندگی میں ترقی اور عروج یا سربلندی کا رنگ ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔

———•••———

قطعہ

فطرت میری مانند نسیم سحری ہے
رفتار ہے میری کبھی آہستہ کبھی تیز
پہناتا ہوں اطلس کی قبا لالہ و گل کو
کرتا ہوں سر خار کو سوزن کی طرح تیز

قطعہ

کل اپنے مریدوں سے کہا پیر مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے در ناب سے دہ چند
زہراب ہے اس قوم کی حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خود دار ہنرمند

•

مولانا رومؒ
کی
مختصر سوانح حیات

چونکہ بالِ جبریل میں متعدد مقامات پر مرشد رومیؒ کا نام آیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مختصر سوانح حیات بطور ضمیمہ اس شرح کے آخر میں شامل کر دیئے ہیں۔

مولانا کا نام محمد تھا لیکن دنیا ان کو مولانا روم یا مولوی روم کے نام سے جانتی ہے۔ علامہ اقبال نے چونکہ انہیں اپنا پیر و مرشد بنایا اور ہر جگہ مرشد یا پیر روم کے لقب سے یاد کیا ہے اس لئے اقبال کے حلقہ میں اب یہی لقب مروج ہوتا جاتا ہے۔

مولانا کے والد کا نام بھی محمد تھا لیکن ان کا لقب بہاؤ الدین تھا۔ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے۔ بلخ (افغانستان) وطن تھا مولانا سنہ ۶۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۶۱۰ھ میں جب ان کی عمر چھ سال کی ہوئی تو والد بزرگوار نے ترک وطن کر دیا اور بلخ سے چل کر نیشاپور وارد

ہوئے۔ جہاں حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ ان سے ملنے کے لئے آئے وہاں سے بغداد کا رخ کیا اور کئی سال مقیم رہے۔ سنہ ۶۲۲ھ میں لارندہ (شام) پہونچے اور اسی سال مولانا کی شادی ہوئی سنہ ۶۲۳ھ میں قونیہ پہونچے۔ یہیں سنہ ۶۲۸ھ میں مولانا کے والد نے وفات پائی۔

مولانا اپنے والد کی وفات سے پہلے حلب اور دمشق میں علوم ظاہری میں کمال حاصل کر چکے تھے جو اس زمانہ میں نیشاپور۔ بغداد اور قاہرہ کی طرح علوم و فنون کے مرکز تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے شاگرد اور مرید سید برہان الدین محققؒ نے مولانا کو نو سال تک طریقت اور سلوک کی تعلیم دی۔

سنہ ۶۳۸ھ میں مولانا کی ملاقات شمس تبریزی سے ہوئی جنہوں نے ان کے اندر انقلاب عظیم پیدا کر دیا یعنی خاک کو اکسیر بنا دیا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

جب تک مولوی روم نے غلام شمس تبریزی کی غلامی اختیار نہیں کی "مولائے روم" مرتبۂ علیا پر فائز نہ ہو سکے۔

سنہ ۶۴۵ھ میں غلام شمس تبریزی کو مولانا روم کے بعض جاہل مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل کر دیا جس کی وجہ سے ان کو بہت صدمہ ہوا اور کئی سال تک ان کے فراق میں بے قرار رہے حسن اتفاق سے کچھ عرصہ کے بعد مولانا کی ملاقات صلاح الدین زرکوب سے ہو گئی جنہوں نے اپنی دکان کھڑے کھڑے لٹوا دی اور نو سال میں شبانہ روز مولانا روم کی خدمت میں حاضر رہے ان کا انتقال سنہ ۶۶۲ھ میں ہوا ان کی وفات کے بعد

مولانا روم نے شیخ حسام الدین چلپی کو جو ان کے معتقدان خاص میں سے تھے اپنا ہمدم و ہمرازبنایا اور انہیں کی درخواست پر مثنوی لکھنی شروع کی۔ مولانا روم نے ۶۷۲ھ میں وفات پائی۔ ان کی ہردلعزیزی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جنازہ کے ساتھ مسلمانوں کے علاوہ مجوسی یہود اور نصاریٰ بھی تھے۔ مولانا روم کا مزار مبارک قونیہ میں آج بھی زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔

مولانا روم کی مثنوی دنیا کی غیر فانی کتابوں میں سے ہے دنیا میں کوئی تعلیم یافتہ آدمی ایسا نہیں ہے جو مثنوی کے نام سے واقف نہ ہو اس کے چھ دفتر ہیں۔ اس کے کل اشعار کی تعداد ۲۶۶۶ ہے۔

پہلا دفتر غالباً ۶۶۰ھ میں ختم ہوا تھا اور آخری دفتر غالباً ۶۷۰ھ میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ مثنوی کو مقبولیت اور شہرت اور تاثیر کے متعدد اسباب ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں قرآن حکیم کے حقائق و معارف کو دلپذیر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

دوم یہ کہ ہر مشکل مسئلہ کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کیا گیا ہے۔

سوم یہ کہ فرضی حکایتوں کے پردہ میں اعلیٰ اخلاقی مسائل کی تعلیم دی گئی ہے۔

چہارم یہ کہ اس کتاب لاجواب میں تصوف اور اخلاق کے علاوہ فلسفہ۔ عقائد اور کلام کے مسائل بھی بڑی خوبی کے ساتھ حل کئے ہیں۔

پنجم یہ کہ انداز بیان بہت سلیس ہے اس لئے عالم اور عامی دونوں یکساں ہو سکتے ہیں۔

ششم یہ کہ مولانا روم چونکہ صاحب دل تھے اس لئے از اول

تا آخر تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ؎

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

ختم شد

———(※)———